زمانہ

جلد ۸۲ جنوری سنہ ۱۹۴۴ء نمبر

نظیر اکبر آبادیؒ

(از "حق پرست")

حیرت سی معلوم ہوتی ہے کہ باوجود اس انتہائی بے اعتنائی کے جو ادبی دائروں میں نظیر کے ساتھ برتی گئی
باوجود اس کے کہ خود نظیر ایک ایسا لاابالی انسان تھا کہ اُس نے اپنے کلام کے تحفظ و اشاعت کے جانب
[illegible]ق توجہ نہ کی نظیر اکبر آبادی کا نام نہ صرف قائم رہا بلکہ رفتہ رفتہ ادیبوں کی توجہ دن بدن اُسکی جانب زیادہ
[illegible]ل ہوتی جاتی ہے۔ ابھی سال بھر کے اندر اندر تنہا زمانہ میں ایک سے زائد مضامین نظیر پر نکل چکے ہیں، اور یہ صاف
[illegible]یس ہونے لگا ہے کہ زبان سے متعلق جو غلط نظریئے اور غیر فطری عصبیتیں مغلیہ سلطنت کے خاتمے پر جاری ہوگئیں
[illegible]ن کے انحطاط اور زوال کیساتھ (جو لازمی ہے) نظیر اکبر آبادی حقیقی معنوں میں ہندوستانی ادب اور خالص
[illegible]ی اتحاد و اتفاق کا سب سے پہلا علم بردار اور رہبر مانا جائیگا۔

[illegible] کلام، فطری جذبات اور قدرتی مناظر سے خاص لگاؤ، اظہار خیال اور طرز ادا کی سادگی
[illegible] عنصر تھے کہ خود اُس کی زندگی میں اُس کو نہ صرف عوام میں غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل ہوئی، بلکہ درباروں تک
[illegible] توجہ [illegible] کی جانب مائل ہوگئی تھی۔ گو اُس کے ہمعصر اساتذہ اور ادیبوں نے اُس پر پھبتیاں کسیں اور اُس کے
[illegible] کا اعتراف تو کجا جو شعرا کے تذکرے لکھے تو اُنسے بھی اس کو بالکل خارج کر دیا۔ اور اگر کہیں کسی نے ذکر کیا
بھی تو نہایت بخل اور ناانصافی کے ساتھ۔

یہ صورت حال نہ معلوم کب تک قائم رہتی، لیکن ۱۸۴۹ء میں ڈاکٹر فیلن (Fallon) کی شہرہ آفاق اینگلو [illegible]
[illegible]

ہندوستانی ڈکشنری بنارس سے شائع ہوئی جس کے نہایت قابلانہ اور دلچسپ دیباچہ میں ڈاکٹر معز
موصوف نے ہمارے ادبیات پر تنقید کرتے ہوئے نظیر کے متعلق نہایت پُرزور اور جاذبِ توجہ خیالات کا اظ
اور نظیر کو شیکسپیئر اور چاسر جیسے شہنشاہانِ ادب میں شمار کیا ہے (ڈاکٹر فیلن کی رائے کے معتدبہ حصہ کا ترجمہ نا
کرام نے زمانہ ماہ جولائی ۱۹۳۳ء میں مسٹر سلیم جعفر کے قابلانہ مضمون میں ملاحظہ فرمایا ہے) ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ
کی اب آنکھیں کھلیں کہ نظیر بھی واقعی کوئی چیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر فیلن کے اظہار رائے سے پیشتر بھی نظیر کے
کافی مداح تھے لیکن اُن کی رائے محض صدا بصحرا تھی۔ بہرحال ڈاکٹر فیلن کی اُس رائے کے اظہار کے بعد لوگ نظیر
کی جانب متوجہ ہوئے چنانچہ منشی سید احمد صاحب فرہنگ آصفیہ کہتے ہیں:۔

"بعض دہلی کے تذکرۂ شعرا جمع کرنے والوں نے صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ ایک ملا مکتبی اصحیت الفاظ سے عرا
پرگو اور عوام الناس کی بلکہ جُہلا کی زبان لکھنے والا تھا۔ لیکن میری رائے میں وہ ہندوستان کا شیکسپیئر اور
فطرتی اور قدرتی مضامین کے بیان میں ید طولیٰ رکھنے والا تھا، اُس نے ادنیٰ ادنیٰ اور رکیک مضمونوں کو اس
خوبی سے باندھا اور عمدہ نتیجہ نکالا ہے کہ دوسرا نہیں نکال سکتا۔"

اور محمد عبدالغفور شہباز پروفیسر اورنگ آباد کالج نے انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں نظیر پر ایک مبسوط
کتاب "زندگانی بے نظیر" کے نام سے شائع کی جو واقعی قابل دید ہے۔ شہباز نے نظیر کا نہایت گہرا اور وسیع مطالعہ
کیا ہے۔ اور یہ بتلایا ہے کہ موجودہ مطبوعہ کلیات پر نظیر کا کلام ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اُن کا ایک اردو دیوان علاوہ
بھی تھا جو شہباز کے ہاتھ آسکا۔ فارسی دیوان بھی ہے۔ سعدی اور حافظ کی قریب قریب تمام غزلوں پر تضمین بھی
اور نثر میں بھی چند کتابیں ہیں جو خود شہباز کو حاصل ہوئیں (غیر مطبوعہ) لیکن یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انھوں نے ان تصانیف
کی اشاعت کا کیا انتظام کیا اور اب وہ کہاں ہیں۔ اس کے بعد بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں کسی بزرگ نے
"ادیب" الہ آباد میں نظیر پر ایک سلسلۂ مضامین جاری کیا تھا جو "ادیب" کے بند ہو جانے سے ناتمام رہ گیا۔

لیکن اس سب کے باوجود نظیر کی جانب ادبی طبیعتیں پھر بھی نہ گرائیں۔ اس کے دو اسباب ہیں اور
دونوں خاص۔ ایک تو نظیر کے مطبوعہ کلیات میں غلطیوں کی وہ بھرمار، جس کی جانب مسٹر سلیم جعفر نے اپنے مضمون
میں اشارہ فرمایا ہے، اور دوسرے وہ جذبات اور عصبیتیں ہیں جن کی جانب میں نے اوپر اشارہ کیا ہے اور جن
کے متعلق اسی مضمون میں آئندہ وضاحت ہوگی۔

کہا جاتا ہے کہ نظیر نے لگ بھگ دو لاکھ اشعار کہے۔ لیکن ان کے منجملہ اب صرف چھ ہزار اشعار مطبوعہ شکل میں
ملتے ہیں، اور وہ بھی نہایت خراب اور خستہ حالت میں۔ ان تلف شدہ اشعار کا خون در اصل ہمارے ادیبوں کے سر
ہے۔ خود شہباز کی غیر معمولی محنت و جستجو کے ادبی اداروں نے نظیر کے کلام کو جمع کرنے کی جانب توجہ کی۔

جہاں کلام ہی کا یہ حال ہوا ہو تو زندگی کے حالات کا میسر آنا ظاہر ہے کہ کس درجہ مشکل تھا۔ لیکن شہباز نے خوب جستجو کی، جا بجا گھومے پھرے اور قدیم لوگوں کا پتہ لگایا۔ اسی سلسلہ میں نظیر کی نواسی سے بھی ملاقات کی جو آگرہ ہی میں رہتی تھیں۔ ان سب سے نظیر کی زندگی کا ایک خاکہ میسر آگیا جس سے پتہ چلا کہ نظیر نے اپنی زندگی کا نقشہ ہو بہو اپنے کلام میں کھینچا ہے

نظیر اور اس کی شاعری پر لکھنے سے قبل یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نظیر جیسے شاعر کو سمجھنے کے لئے جس کے متعلق ڈاکٹر فیلن جیسے ماہر نظر اور غیر معمولی قابلیت کے یوروپین ادیب نے ادبی نقطۂ نظر سے اس قدر بلند رائے کا اظہار کیا ہو (بعض فرنچ وقائع نگار نے بھی اپنی کتابوں میں نظیر کا تذکرہ کیا ہے۔) اور جس کے کلام کا معتدبہ حصہ اہل ہنود میں اور سادھو سنت اور فقیر قلندروں میں حیرت انگیز طریقہ پر مقبول ہوا ہو، لیکن جس کے متعلق با اثر مسلم ادیب ہمیشہ سرد مہر رہے ہوں یہ ضروری ہے کہ اس دور کے یعنی میاں نظیر کے زمانہ کے عام حالات اور خیالات کا نقشہ سامنے رہے۔ بہ الفاظ دیگر اس کی شاعری کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کے لئے اس کے تاریخی پس منظر کا جاننا ضروری ہے۔

نظیر کا عرصۂ حیات تقریباً سو سال کا ہے، وہ سنہ ۱۷۳۰ یا ۳۲ء میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۸۳۰ یا ۳۲ میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ یہ ایک نہایت پر آشوب اور انقلابی دور تھا۔ اورنگ زیب کی حکومت ابھی ختم ہوئی ہی تھی، اس کی حکومت نے اہل ہنود میں ایک نیا احساس اور نئی زندگی پیدا کر دی تھی، سب سے زیادہ اورنگ زیب ہی کے سر اس کا سہرا ہے کہ دکن میں مرہٹے اور پنجاب میں سکھ اپنے میں ایک قومی تنظیم پر مجبور ہوئے۔ اس تنظیم نے ان میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی اور وہ ترقی کے ایک ایسے راستہ پر لگ گئے کہ رفتہ رفتہ وہ ہندوستانی سامراج پر مغلوں کے جانشین ہو گئے خواہ کتنے ہی قلیل عرصے کے لئے کیوں نہ ہو۔

غرضکہ مسلمانوں کے تعصب اور مذہبی ناروا داری نے مغلیہ سلطنت کو زوال کے راستہ پر ڈال دیا تھا۔ اس زوال کا باعث جو جذبات اور خیالات تھے، انھوں نے سلطنت کے خاتمہ پر خاص صورت اختیار کر لی۔ اکبر نے حاکم اور محکوم کے فرق کو مٹانے کی، اور ایک متحدہ قوم کی بنیاد ڈالنے کی کوشش میں ہندو اور مسلم کے جو تجزیہ کو موقوف کر دیا تھا، اورنگ زیب کے زمانہ میں وہ پھر جاری ہو گیا، اور تمام تکلیف وہ تمیزوں کے ساتھ جب تک حکومت رہی یہ امتیاز ہر صورت قائم رہے، لیکن جب حکومت مٹنے لگی تو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ ہندوستان کے مسلمان جو فی صدی سے زائد ہندوستانی ہیں کہیں ہندوؤں میں پھر مدغم نہ ہو جائیں۔ اس کے لئے یہ تجزیہ ہی کافی تھا

[illegible] کے بعد معلومہ مکتب کی بنیاد ڈالی گئی تھی جس میں مسلمانوں کو یہ آمادگی ہے کہ وہ تواریخ وغیرہ مضامین کا نصاب [illegible] سے [illegible] بر الفیہ پر مسلم ہیں [illegible] ہندو مسلمانوں [illegible] اور [illegible] سے نفرت پیدا کرنے کے جذبات پیدا کئے جائیں

کہ مسلمانوں کو بالخصوص زبان کے معاملہ میں ایک ایسی علیحدہ اور ممیز ہستی بنا دیا جائے کہ یہ جماعت ہندوؤں ہی سے علیحدہ کر لی گئی تھی، اپنے اس نئے لسانی تہذیب و تمدن کو فروغ دیتی ہوئی اسلامی اقدار کی وسیع اور تبلیغ میں ممد و معاون ثابت ہو۔ یعنی ایک متحدہ قومیت کے جو امکانات اورنگ زیب کے قبل اور اورنگ زیب کے کچھ بعد پیدا ہو رہے تھے، اُن کے سدِ باب کی کوشش تھی جو کارگر ثابت ہوئی جیسا کہ واقعات سے ثابت ہے۔

انھیں جذبات اور خیالات کے زیر اثر زبان سے متعلق یہاں کی ہر چیز مردود قرار دی گئی۔ یہاں کے عروض، یہاں کے اصطلاحات، استعارات، تشبیہات، قدرتی مناظر، حتیٰ کہ یہاں کے الفاظ تک کو چُن چُن کر خارج کیا گیا۔ مُبادا کہ مجھ پر تعصب اور مبالغہ کا الزام عائد ہو، میں کچھ مسلم مشاہیر ہی کی تحریریں ثبوت میں پیش کرتا ہوں۔

شمس العلما مولانا الطاف حسین حالیؔ، اہلِ اسلام کا ہندو ادبیات سے بے اعتنائی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"جس سنسکرت کو یورپ کے محقق لاطینی اور یونانی سے زیادہ وسیع، زیادہ فصیح اور زیادہ با قاعدہ بتاتے ہیں اور جس کی تحقیقات میں عمریں بسر کر رہے ہیں، مسلمانوں نے عام طور پر کبھی اُس کو قابلِ التفات نہیں سمجھا۔ اگر کہا جائے کہ سنسکرت کا سیکھنا آسان کام نہیں ہے، تو برج بھاشا جو بمقابلہ سنسکرت کے نہایت سہل الحصول ہے اور جس کی شاعری نہایت لطیف اور شگفتہ اور فصاحت و بلاغت سے لبریز ہے اُس کو بھی وہ بیگانہ وار نگاہوں سے دیکھتے رہے"

اِس بے اعتنائی کی تہ میں دراصل وہ جذبہ کارفرما تھا جو اقتباس ذیل میں "زبانِ اوباشاں" سے ظاہر ہے۔ مولانا عبد السلام ندوی کے "شعر الہند" میں ایک جگہ آتا ہے:-

"...... چنانچہ میر صاحب عارف علی خاں عاجز کے تذکرہ میں لکھتے ہیں" زبان بھاکھا زبان اوباشان است کہ اکثر ریختہ در بحر کبت (कवित्त) می گوید۔"

غرضکہ انھیں جذبات نے مسلم ادیبوں کو متروکات کی جانب مائل کیا، اور ہندی الفاظ چُن چُن کر خارج کئے گئے۔ اس کے متعلق مولانا عبد الحق صاحب ایک جگہ سخت احتجاج کرتے ہوئے فرماتے ہیں (یہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے) کہ الفاظ کی حالت بھی جانداروں کی سی ہے کہ گھٹتے بڑھتے ہیں، حیثیت میں فرق آتا ہے اور بعض ایک مدت کے بعد مر جاتے ہیں، لیکن دانستہ گلا گھونٹنے کا (یعنی کسی لفظ کو متروک گردانے کا) حق کسی کو حاصل نہیں۔" اس سلسلہ میں اُنھوں نے چند ہندی الفاظ کی معنی خیزی اور خوبصورتی سے بحث کی ہے۔

شمس العلما محمد حسین آزاد اپنی "آبِ حیات" میں لکھتے ہیں کہ "آنکھ کی تعریف میں یہاں ہرن کی آنکھ اور

اور کنول کے پھول اور مولا کی اچپلاہٹ سے تشبیہ دیتے تھے۔ اردو میں آہو چشم رہے مگر مرگ نا ہوا ہو گئے اور کنول کی جگہ ساغر لبریز اور نرگس شہلا آگئی جو کسی نے یہاں دیکھی بھی نہ تھی۔ رفتار کے لئے بھاشا میں ہتنی اور ہنس کی چال ضرب المثل ہے، اب ہنس کے ساتھ ہاتھی اڑ گیا، فقط کبک دری، شور محشر اور فتنۂ قیامت کے آفت بپا کر رکھی ہے۔" ایک جگہ اور فرماتے ہیں :-

"بعض اشخاص یہ بھی کہتے ہیں کہ خالی بھاشا میں کچھ مزہ نہیں، اردو خواہ مخواہ دل کو بھلی معلوم ہوتی ہے مگر میری عقل دونوں باتوں میں حیران ہے، کیونکہ جب کوئی کہے کہ "ایک شخص آیا تھا یا یہ کہیں کہ ایک منش آیا تھا، تو دونوں یکساں ہیں، کیونکر کہوں کہ منش "مخالف طبع ہے"

آخر میں شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی کے دو الفاظ رسم الخط کے متعلق بھی ملاحظہ ہوں :-

"اردو بھی منجملہ ان بدنصیب زبانوں کے ہے جس کا خط ایک غیر قوم کا قرار دیا ہوا ہے اور جس خط کو کوئی طبعی مناسبت زبان کے ساتھ نہیں ہے۔"

"اردو بھی اس خاندان کی زبان ہے جس کو خاندان آریوی کہتے ہیں۔ یعنے اصل یہ ہندی یا بھاشا ہے۔"

الغرض ہندی اور اردو میں فرق یہی تو ہے کہ ایک میں دیسی خصوصیات ہیں اور دوسرے میں بدیسی۔ ایک میں دیسی الفاظ ہیں جو زیادہ تر سنسکرت سے ماخوذ ہیں اور دوسرے میں زیادہ تر بدیسی یعنی عربی اور فارسی وغیرہ۔ اور جو دیسی الفاظ اردو میں ہیں بھی تو اس طرح کہ اکثر اُن کی صورت مسخ کی ہوئی ہے یعنی انھیں معرب اور مفرس بنایا گیا ہے۔ اردو کے عروض تو بالکل ہی فارسی ڈھانچہ میں ڈھالے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بدیسی خصوصیات خاص کوششوں کا نتیجہ ہیں جن کی تہ میں وہ جذبات اور خیالات تھے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

نظیر کا زمانہ وہ تھا جبکہ یہ کوششیں شد و مد سے جاری تھیں۔ نظیر کا دور حیات جیسا اوپر عرض کیا جا چکا ہے ۱۷۳۲ء سے ۱۸۳۲ء کا ہے۔ ناسخ جن کا دعویٰ ہے کہ اُنھوں نے لکھنؤ کو شیراز اور اصفہان بنا دیا ۱۸۳۹ء میں رحلت فرمائی اور غالب جن کی پرستش کا ایک خاص سبب دراصل اُن کی مفرس زبان اور مفرس اوزان ہیں، کہا جاتا ہے کہ کچھ عرصہ تک نظیر کی صحبتوں میں بھی رہے۔ غرضکہ سودا اور آتش سے لیکر ناسخ اور غالب تک کا زمانہ نظیر کے دور حیات میں گذرا ہے، اور یہی وہ دور تھا جس میں اردو نے تیزی سے دیسی خصوصیات کو ترک کیا۔

اس تمہید سے مراد یہ ہے کہ اس دور کے اس مرقعے کو سامنے رکھکر نظیر اور اُس کے کلام کا مطالعہ کیا جائے

کیونکہ نظیر نے دیسی خصوصیات کی طرف نسبتاً زیادہ توجہ کی ہے، اور یہی مشاہیر اُردو کا ان سے ناراضگی اور بے اعتنائی کا باعث ہوئی۔

ولی محمد نظیر محمد شاہ رنگیلے کی رنگینیوں کے زمانہ میں دہلی میں پیدا ہوئے، ابھی بچے ہی تھے کہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کا دہلی پر حملہ ہوا۔ محمد شاہ رنگیلے گرفتار کر لئے گئے اور بعد میں رہا بھی ہوئے تو دہلی میں قتل عام سے خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ وہ لوٹ مار مچی کہ الاماں، اور تخت طاؤس مع تمام عزت و آبرو کے ہندوستان سے رخصت ہوا۔ نظیر کا ذیب گھرانا تھا، کسی طرح نادری زد سے بچ گیا۔

اِس ہنگامۂ نادری کی دہشت ابھی دلوں سے دُور نہ ہونے پائی تھی کہ اٹھارہ سال بعد دوسرا ہنگامہ بپا ہوا یعنی احمد شاہ دُرانی کے حملہ کا۔ لوگ دہلی چھوڑ چھوڑ کے بھاگے۔ نظیر نے بھی اپنی ماں اور نانی کے ساتھ دہلی کو الوداع کہا اور آگرہ آبسے۔

یہ اُس کے عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا۔ خداوند کریم نے شاعری اوس کی فطرت میں ودیعت کی تھی، اور محمد شاہ رنگیلے کے دور دورہ میں وہ دہلی کی رنگین صحبتیں اور مشاعرے دیکھ چکا تھا۔ آگرہ آئے تو یہاں اُس وقت میر تقی میر موجود تھے، اور اُن کے ہر چہار طرف چرچے تھے۔ ایک مشاعرہ میں یہ بھی شریک ہوئے اور ایک غزل پڑھی جو بہت مقبول ہوئی، کہتے ہیں کہ خود میر نے پیٹھ ٹھونکی اور کہا "عمرت دراز باد"۔ بہرحال وہاں اُن کے بھی اُسی دن سے چرچے ہونے لگے، بالخصوص اس لئے کہ طبیعت چُلبلی پائی تھی اور غزل قدرتاً ٹھہر کا نسوالی تھی۔ لیکن میر کی محفلیں بہت سنجیدہ ہوتی تھیں، وہاں اُن کی طبیعت کو کُھل کھیلنے کا پُورا موقعہ نہ تھا۔ چنانچہ نظیر نے اپنے رنگ کی محفلیں گرم کیں، وہ کچھ طبیعت سے ایسے خوش خلق اور ملنسار واقع ہوئے تھے کہ پڑھے لکھے اور اَن پڑھ گنوار ہر قسم کے جوان اُنھیں گھیرے رہتے تھے۔ اکھاڑوں میں زور ہوتے، میلے ٹھیلوں اور باغ بغیچوں کی سیر ہوتی، ہولیاں کھیلی جاتیں، بسنت منائے جاتے، دیوالی اور شب برات ہر دو کے لطف اُٹھائے جاتے۔ ہندو اور مسلمان دونوں کا ساتھ اور سب سے مخلصانہ تعلقات۔ ہر رنگ میں بلا امتیاز قوم و ملت شریک رہتے، لطف اُٹھاتے اور لطف بڑھاتے۔ طبیعت تو خداوند کریم نے موزوں دی ہی تھی، اُس پر جوانی کی اُمنگیں اور اپنے نوجوان ساتھیوں کی واہ واہ، نظموں کی فرمائشیں ہوتیں، اور ہر فرمائش کی تعمیل ہوتی۔ آناً فاناً بیسیوں اشعار موزوں کر کے پھینک دیتے، پھر خبر بھی نہ ہوتی کہ یہ نظمیں کہاں گئیں اور کیا ہوئیں۔ مگر ان کے کلام کے شیدائی ان نظموں کو ازبر کر لیتے اور گلی گلی، کوچہ کوچہ گاتے پھرتے۔ ایک مدت تک نظیر کی نظموں کی اسی طرح حفاظت ہوتی رہی، لیکن یہ ازبر کرنے کا سلسلہ کہاں تک چلتا، پھر زمانہ کے ردّ و بدل کے ساتھ عوام کے مذاق بھی بدلنے لازمی تھے نئی چیزوں کی طرف رغبت بڑھی اور رفتہ رفتہ یہ گانے بند ہوگئے۔ اس طرح نظیر کے جواہر پاروں کا ایک

بہت بڑا ذخیرہ تباہ اور برباد ہو گیا، محض اس لئے کہ ادیب اور اساتذہ نظیر کے کلام کو زبان کے لحاظ سے اپنے معیار کا نہیں سمجھتے تھے، اور اُس کی حفاظت اپنے منصوبوں کے لئے خطرہ جانتے تھے۔ مگر نظیر کا کلام پھر بھی کچھ نہ کچھ باقی رہا، اور بعض نظمیں جیسے "سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ" والی نظم یا "کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ" لافانی ہو گئیں، اور اب بھی ہندو مسلم اور اردو۔ ہندی کے فصل کو پاٹتی ہیں۔

قسامِ ازل نے نظیر کو خوبصورت دل اور طبع موزوں کے ساتھ جسم بھی نہایت جاذب نظر عطا فرمایا تھا، میانہ قد، چوڑا سینہ، صراحی دار گردن، کھلا رنگ، بیضوی چہرہ، کشادہ پیشانی، ستواں ناک بھرے رخسار اور رسیلی آنکھیں جن سے فہم و ذکا کا نور برستا تھا۔ اس پر ورزش اور سپاہیانہ کسرتوں کا شوق۔ جسم کو واقعی نظر لگتی تھی۔

نظیر بچپن ہی سے اچھی صورتوں کے عاشق تھے۔ گودوں ہی سے یہ کیفیت تھی کہ خوبصورت اور صاف ستھرے لوگوں کی گود میں بڑے چاؤ سے چلے جاتے تھے۔ کوئی میلا کچیلا، بری بھدی شکل کا آدمی گود میں لے لیتا تو رو مچل کر جلدی سے الگ ہو جاتے۔ لیلیٰ و مجنوں والی نظم میں نظیر نے مجنوں کے بچپن کا جو نقشہ کھینچا ہے کہ وہ ہمیشہ روتا رہتا تھا، اور جب ہر قسم کی تدبیر کی ناکامی کے بعد اُس کو ایک فقیر کے یہاں لے گئے تو فقیر کا حسب ذیل ارشاد خود نظیر پر خوب منطبق ہوتا ہے:۔

لڑکا تیرا یہ عاشقِ سرشار ہوئے گا	محفل میں عاشقوں کی نمودار ہوئے گا
زلفوں میں نازنیں کے گرفتار ہوئے گا	چشم کرشمہ ساز کا بیمار ہوئے گا
رمزوں سے عاشقی کے خبردار ہوئے گا	رسوائے شہر و کوچہ و بازار ہوئے گا

تدبیر یہ نہ رونے کی اس کی کیا کرو
تم گل رخوں کی گود میں اس کو دیا کرو

چنانچہ جوانی میں یہ بڑے عاشق مزاج اور بانکے نکلے، پھینک پٹا، بنوٹ، کشتی وغیرہ کا بڑا شوق تھا جو بڑھاپے تک قائم رہا، اُن کا یہ ایقان تھا بلکہ ایمان کہ

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تن درست

اس موقع پر اُن کی ایک دلچسپ (گیارہ بندکی) نظم کے یہ چند بند نہ صرف باعث دلچسپی ہونگے بلکہ ان سے اُن کے کس بل اور طبیعت کا اندازہ لگے گا۔ یہ نظم ظاہر ہے اُس وقت کی معلوم ہوتی ہے جب جوانی بیت چکی تھی۔

جو نوجوان ہیں اُن کے دل میں گمان کیا ہے — جو ہم میں کس ہے اُن میں تاب اور توان کیا ہے
بوڑھا اُدھر، اِدھر ہر اک کا فلان کیا ہے — ہم سے جو ہو مقابل پٹھے میں جان کیا ہے
اب بھی ہمارے آگے یار و جوان کیا ہے

ہر وقت دل ہمارا محمد رہی جانتا ہے — تیرا پتلک ہمارا تو دے ہی جانتا ہے
ہر شوخ گلبدن سے گہری ہی چھانتا ہے — اس بات کو ہماری اللہ ہی جانتا ہے
اب بھی ہمارے آگے یار و جوان کیا ہے

کھانے کے بھی بڑے شوقین تھے، اپنی نظموں میں کھانوں کے بڑے مزے مزے کے تذکرے کئے ہیں۔ جب بڑھاپے میں دانتوں نے جواب دیدیا اور خوراک کم ہوگئی تو کھچڑی کھایا کرتے تھے، جس میں روزانہ صرف آدھ سیر گھی سما جاتا تھا!

شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ موسیقی سے بھی طبیعت کو خاص لگاؤ تھا۔ اچھی صورتوں کی چاہ اور گانے بجانے کا شوق اُنھیں کوٹھوں تک پہلے جاتا تھا۔ کہتے ہیں ایک طوائف موتی جان سے ان کا تعلق بھی ہو گیا تھا نظیر بقول خود اپنی کھال میں مست تھے، ہندی اصطلاح میں "آنندی جیو" تھے جنھیں ہندو مسلمان پڑھے لکھے، اَن پڑھ گنوار سبھی گھیرے رہتے تھے۔ بات یہ تھی کہ وہ خود آدمی کا متوالا تھا۔ آدمی کا بلا امتیاز و قیود بچوں کا وہ شیدائی تھا، بوڑھوں سے اُس کا میل ملاپ تھا، جوانوں کے ساتھ اُس کی رنگ رلیاں تھیں۔ مسلمان تو وہ تھا ہی اور اعتقادات سلیم کے ساتھ، ہندوؤں کا بھی وہ اسی طرح دلدادہ تھا، اُن کے مذہب سے اُس کو کوئی پرخاش نہ تھی، حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنے مسلک کو ایک سے زیادہ جگہ پر صاف کیا ہے۔ اُس کی ایک نو بند کی نظم سے یہ چند بند اِس خصوص میں خاص طور پر قابلِ ملاحظہ ہیں:۔

تنہا نہ اُسے اپنے دلِ تنگ میں پہچان — ہر باغ میں، ہر دشت میں، ہر سنگ میں پہچان
بے رنگ میں، با رنگ میں، نیرنگ میں پہچان — منزل میں، مقامات میں، فرسنگ میں پہچان
نت روم میں، نت ہند میں، اور زنگ میں پہچان — ہر راہ میں ہر ساتھ میں، ہر سنگ میں پہچان
ہر عزم ارادہ میں، ہر آہنگ میں پہچان — ہر دھوم میں، ہر صلح میں، ہر جنگ میں پہچان
ہر آن میں ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

جاتا ہے حرم میں کوئی قرآن بغل مار — کہتا ہے کوئی دیر میں پوتھی کے سما چار
پہونچا ہے کوئی پار، بھٹکتا ہے کوئی وار — بیٹھا ہے کوئی عیش میں پھرتا ہے کوئی خوار

عابد کوئی، بیکس کوئی، ظالم کوئی [illegible] — مفلس کوئی، ناچار کوئی، تونگر کوئی زردار
زخمی کوئی ماندا کوئی اچھا، کوئی بدکار — جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں سب اسرار

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

اِس موقع پر تلسی داس جی کا یہ دوہا بھی ملاحظہ ہو:۔

تلسی یا سنسار میں سب سے ملیئے دھائے
نا جانے کس بھیس میں نارائن مل جائے

اوس کی نظموں کا ایک حصہ رندانہ اور عاشقانہ بلکہ سوقیانہ رنگ سے بھرا پڑا ہے، اور شہباز نے جو حالات جمع کئے ہیں اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظیر نے ابتدائی زندگی بیباکانہ آزادی سے گذاری لیکن نظر اُس کی ہمیشہ خاص رہی ہے۔ اُس کے دل کے گہرے پردوں سے نکلا ہوا یہ شعر اِس خصوص میں خوب روشنی ڈالتا ہے۔

بتوں کی ناز برداری میں بھی تیری عبادت کی
مری اس بندگی کا اب تو ہی شاہد ہے معبودا

اخلاقی اور عارفانہ نظمیں اُس کی بہت مشہور ہوئیں، اور یہی بہت کچھ محفوظ بھی رہیں لیکن ان سے ایک چیز بخوبی واضح ہوتی ہے کہ اُس کا ایمان اُس طریقے پر نہیں ہے جو انسان کے دل کی قدرتی پیاسوں کو مارنے کی تلقین کرتا ہے، وہ اس طریق کا پیرو ہے جو کہتا ہے کہ طبیعت کی قدرتی مانگوں کو پورا کر کے چلو۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ نہ بجھی ہوئی پیاس نہایت خطرناک راستوں میں بھٹکا سکتی ہے۔ وہ ہندو اصطلاح میں "پوشٹی مارگ" کا پیرو ہے۔ اس موقع پر اُس کے یہ اشعار قابلِ توجہ ہیں:۔

زردار ہے تو ہرگز مت مار اپنے من کو — تن زیب، تن سکھوں سے ترسا نہ اپنے تن کو
جو نرچلن چلے ہیں چل تو بھی اُس چلن کو — مرشد کا ہے یہ نکتہ رکھ یاد اس سخن کو

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے بچوں کا وہ بڑا عاشق تھا، جو ہمیشہ اُسے گھیرے رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض [illegible] "یا" ریچھ کا بچہ" یا "گلہری کا بچہ" وغیرہ اُس نے اِن بچوں ہی کے بہلانے کے لئے نظم [illegible] شہباز سے کہتی تھیں کہ نانا کی [illegible] میں بہت چھوٹی تھی جب کبھی [illegible]

جاتی تو مجھ کو دیکھکر باغ باغ ہوجاتے اور گانے لگتے "موہن میرے آئے، للن میرے آئے گنگن میرے آئے" ایسی محبت کرتے تھے کہ اس قسم کی محبت کرتے میں نے کسی بزرگ کو نہیں دیکھا'۔

اخلاق کا یہ عالم تھا کہ چھوٹا سا چھوٹا آدمی بھی سلام کرتا تو دونوں ہاتھوں سے اس کا جواب دیتے یہاں ایک واقعہ کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا جو نظیر کی خلیق طبیعت پر خوب روشنی ڈالتا ہے۔ نظیر روزانہ تاج گنج سے آگرہ (شہر) جاتے، گھوڑے کی سواری ہوتی تھی اور ایک خدمتگار ساتھ ہوتا تھا۔ راستہ میں جو کہیں گھوڑا کھڑا ہوجاتا، نہ کوڑا مارتے نہ ایڑ کرتے، گھوڑے کی مرضی پر چھوڑ دیتے، خود چلا تو چلا ورنہ میاں ایاز خدمتگار باگ تھام پکڑ کر گھوڑے کو آگے بڑھا دیتے۔ جب شہباز نے نظیر کی نواسی سے دریافت کیا کہ آخر اس قدر احتیاط کی وجہ کیا تو فرمائیں کہ "ایک دفعہ چلتے چلتے ان کا گھوڑا اُرکا، کوڑا جو مارتے ہیں تو پیچھے آرہا تھا کوئی راگیر اُس کے لگا فوراً گھوڑے پر سے اُتر پڑے اور قدموں پر گر پڑے، بہت معذرت کی، غضب تو یہ اصرار تھا کہ کوڑا حاضر ہے تو بھی مجھے کوڑا مار لے مجھ سے بیشک تقصیر ہوئی۔ جب تک تو کوڑا نہ مارے گا میں کل نہیں پانے کا۔ یہ ادا دیکھکر کسی کے دل میں غصہ کب رہ سکتا ہے مارنا تو کجا۔ مگر اصرار جب حد سے بڑھا تو کچھ یوں ہی رسم اُس نے ادا کردی۔ اُسی دن سے اُنھوں نے ہاتھ میں کوڑا رکھنے ہی سے توبہ کی۔" غرضیکہ دل شکنی اور دلآزاری سے ہمیشہ بچتے رہے، اور یہی وجہ ہے کہ اُس زمانہ میں ہجو لکھنے کا عام رواج ہونے کے باوجود اُنھوں نے ہمیشہ اپنے قلم کو اس گندگی سے پاک رکھا۔ اُن کی طبیعت میں ظرافت ضرور تھی، لیکن لوگوں کو خوش کرنے کے لئے دل آزاری کے لئے نہیں، اُن کی ظرافت عموماً اس رنگ میں نظر آتی ہے:-

جگمگٹ کو ہماری اگر اسواری گئی ہے ۔۔۔ تو واں بھی لگی ساتھ میں یہی خواری گئی ہے
سُنتے ہیں کہ کہتی ہوئی بہاری گئی ہے ۔۔۔ لو دیکھو بڑھاپے میں کیا مت ماری گئی ہے

اُوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ ایام جوانی میں نظیر کے شوق ہمہ گیر تھے، اس کے باوجود وہ طبیعت کے بڑے قانع واقع ہوئے تھے۔ روپیہ پیسے کے پیچھے کبھی نہ دوڑے، گو روپیہ پیسہ کی تعریف میں بہت کچھ لکھا ہے کہتے ہیں:-

پیسہ ہی رنگ و روپ ہے، پیسہ ہی مال ہے ۔۔۔ پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں ۔۔۔ کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:-

اب جن کے گھر میں ڈھیر ہے سونے کے دام کے ۔۔۔ سب مل کے پاؤں چومتے ہیں اُن کے غلام کے
کیا رتبے ہیں طلائے علیہ السلام کے

مگر اُن کا اپنا اصلی مسلک اور ایمان کیا تھا وہ فقیروں کی صدا "میں یا" جب لاد چلے گا بنجارہ "جیسی [illegible] نظم میں اور جا بجا ظاہر کرتے ہیں۔ روپیہ کی تعریف میں جو کچھ لکھا ہے وہ واقعاتی نظر سے لکھا ہے [illegible] کی صدا میں وہ کہتے ہیں :-

زر کی جو محبت تجھے پڑجائے گی بابا
دُکھ اس میں تری روح بہت پائیگی بابا

یہ کوری شاعری کی باتیں نہ تھیں، جب وقت آیا، اور دولت کی دیوی نے کواڑ کھٹکھٹائے تو نظیر نے اندر ہی سے جواب دیدیا "دیوی یاکرمیں تمھارے قابل نہیں." لکھنؤ کے نامدار نواب سعادت علی خاں کے دربار سے اور بعض کہتے ہیں کہ بعد میں نواب واجد علی شاہ کے دربار سے بھی بلاوے آئے، بھرتپور کے راجہ نے بھی بڑے شوق سے بلوایا، لیکن اُنھوں نے اپنے خاص انداز خوش خلقی کے ساتھ سبھی کو جواب دیدیا اور اپنی کھال میں مست پڑے رہے. اگر نظیر ان درباروں میں پہونچ جاتے تو شاید ہمیں یہ نظیر نہ ملتے، اُس نے قصیدہ خوانی یا ضمیر فروشی سے روپیہ نہیں کمایا، اپنے آپ کو ہمیشہ آزاد رکھا. گذر اوقات کے لئے کچھ پڑھالیا کرتے تھے. آگرہ میں عرصۂ دراز تک لک کھتری رئیس لالہ رام بلاس صاحب کے لڑکوں کو تعلیم دیتے رہے جہاں سے اُنھیں ستر روپیہ ماہانہ ملتے تھے، اسی پڑھانے کے سلسلہ میں وہ کچھ عرصہ متھرا جی بھی رہ آئے تھے شہباز لکھتے ہیں کہ نظیر کی نواسی کہتی تھیں کہ " نانا جان بڑے ہی سخی مزاج تھے، انھوں نے تمام عمر اپنے ہاتھ سے روپیہ نہیں چھوا، جہاں کہیں سے روپیہ آیا، روپیہ لانے والے سے کہا کہ اس کو رومال میں باندھ دو. پھر اُس رومال کا سرا پکڑ کر جیسے کوئی نجس چیز ہو گھر میں ڈال جاتے. یا کسی آدمی سے کہتے گھر پہنچوا دو. نانی کا جس طرح جی چاہتا خرچ کرتیں، وہ پوچھتے بھی نہیں کیا ہوا کدھر گیا. ؟

نظیر جیسے جسم سے توانا اور تندرست تھے اُسی طرح اُن کا مذاق اور دلی جذبات بھی نہایت قوی اور صحیح واقع ہوئے تھے. اُن کی ہمدردیاں عالمگیر تھیں، وہ قدرت میں ہر جگہ خوبصورتی دیکھ سکتے تھے، اور ہر طبقے کی خوبیوں پر نظر ڈال سکتے تھے. تنگ دائروں میں اُن کا بناؤ ممکن نہ تھا، خواہ وہ دائرے درباروں کے ہوں جہاں داخل ہو کر وہ دولت وحشمت حاصل کر سکتے تھے، خواہ ادبی ہوں جہاں جبہ سائی سے اُنھیں دفعۃً عزت و [illegible] مطبوعہ شکل میں نظیر کی جو تھوڑی سی نظمیں ملتی ہیں اُن میں بھی مضامین عالمگیر ہیں. عاشقانہ رنگ تو شاعری کی جان ہے ہی، اور نظیر کا کلام اُس سے اوت پروت ہے لیکن نظیر اسی میں پھنس کر نہیں رہ جاتا. اُس کے لئے دنیا کی ہر چیز شاعری کا ایک مضمون بنی کھڑی ہے. کوڑی، ککڑی، آٹا دال، کورا برتن، چپاتی. ریچھ کا بچہ، گلہری کا بچہ، ہرن کا بچہ، مرغ بازی، کبوتر بازی، ہولی، بسنت، برسات، جاڑا، گرمی [illegible] [illegible] کہاں تک گنائے جائیں. غزلوں کا تو زمانہ ہی تھا، غزلیں بھی لکھیں لیکن اُس میں اُنکا اپنا رنگ صاف جھلکتا ہے

زیادہ تر موسموں اور قدرتی نظاروں پر لکھا ہے جس کی جانب اُردو میں اُس وقت تک کسی نے توجہ نہ کی تھی۔ ہولی، بسنت اور برسات کے بیان میں وہ انتہا سے زیادہ مست ہو جاتے ہیں۔ بسنت اور ہولی پر نظمیں بھی کہی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ انسان کی مختلف حالتوں کے نقشے کھینچتے ہیں اور خوب کھینچتے ہیں۔ جوانی پر ایک طویل مسدس سے تین بند ملاحظہ ہوں:۔

اللہ نے جوانی کا وہ عالم ہے بنایا — کہ ہر کہیں عاشق کہیں رسوا کہیں شیدا
پھندے میں کہیں جی ہے کہیں دل ہے تڑپتا — مرتے ہیں سسکتے ہیں، بلکتے ہیں ہا ہا
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے، اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

الفت ہے کہیں مہر و محبت ہے کہیں چاہ — کرتا ہے کوئی چاہ کوئی دیکھ رہا راہ
ساقی ہے صراحی ہے، پری زاد ہیں ہمراہ — کیا عیش ہیں کیا عیش ہیں کیا عیش ہیں واللہ
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

کیا تجھ سے نظیر اب میں جوانی کی کہوں بات — اس سن میں گذرتی ہے عجب عیش سے اوقات
محبوب پریزاد چلے آتے ہیں دن رات — سیریں ہیں، بہاریں ہیں تواضع ہے مدارات
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے، عجب رنگ جوانی

اسی سلسلہ میں ہولی کا ایک بند ملاحظہ ہو:۔

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی — اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی — ساغر مے سے چھلکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشہ میں جھکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

ہولی پر ایک اور نظم۔

آ جھمکی عیش و طرب کیا کیا جب حسن دکھایا ہولی نے — ہر آن خوشی کی دھوم ہوئی، یوں لطف جتایا ہولی نے
ہر خاطر کو خورسند کیا، ہر دل کو لبھایا ہولی نے — دف رنگیں نقش سنہری کا جس وقت بجایا ہولی نے
بازار گلی اور کوچوں میں غل شور مچایا ہولی نے

کچھ طبلے کھڑکے، تال بجی، کچھ ڈھولک اور مردنگ بجی — کچھ چھڑ بین ربابوں کی، کچھ سارنگی کچھ چنگ بجی

کچھ تار طنبوروں کے جھنکے، کچھ دھمدھی اور مرچنگ بجی ۔ کچھ گھنگرو چھم چھم چھم بجے کچھ گت پہ آہنگ بھی

ہے دھوم ناچنے گانے کا، یہ تار بندھا یا ہولی نے

اسی طرح برسات پر بھی ایک سے زیادہ نظمیں ہیں۔ ایک کے یہ چند بند ملاحظہ ہوں :-

اہل سخن کو ہے گا اک بات کا تماشا ۔ اور عارفوں کی خاطر ہے ذات کا تماشا

دنیا کے صاحبوں کو دن رات کا تماشا ۔ ہم عاشقوں کو ہے گا سب گھات کا تماشا

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

جب یہ نوید پہونچی صحرا میں ایک باری ۔ ہونے لگی وہاں پھر برسات کی تیاری

چشموں میں کوہ کے بھی ہوئی سب کی انتظاری ۔ موسم کے جانور بھی آتے ہیں باری باری

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

ساون نے بادلوں سے پھر آ گھٹا جو چھائی ۔ بجلی نے اپنی صورت پھر آن کر دکھائی

ہو مست رعد گرجا، کوئل کی کوک آئی ۔ بدلی نے کیا مزے کی رم جھم جھڑی لگائی

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

جن صاحبوں کے دل کو کچھ عیش سے ہے بہرہ ۔ وہ اس ہوا میں جا کر دیکھے ہیں کوہ و صحرا

ہر طرف آب و سبزہ اور گلبدن سنہرا ۔ جنگل میں آج منگل کس کس طرح کا لہرا

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

اب اس کے آگے نظیر کی جوانی کی بدمستی ہے۔

نظیر کی جوانی ہر چیز میں معشوقانہ ادائیں دیکھتی ہے اور ہر جگہ اُس کو معشوقوں کی یاد آتی ہے۔ چنانچہ کورے برتن کی تعریف میں سنئے۔ جلد (۱۲) بند سے یہ تین بند ہیں۔

کورے برتن ہیں کیاری گلشن کی ۔ جس سے کھلتی ہے ہر کلی تن کی

بوند پانی کی ان میں جب کھنکی ۔ کیا وہ پیاری صدا ہے سن سن کی

تازگی جی کی اور تری تن کی

واہ کیا بات ہے کورے برتن کی

کوزہ پنہاری کا جو ہے مٹکا ۔ اُس کا جوبن کچھ اور ہی مٹکا

لے گیا جان پاؤں کا کھٹکا ۔ دل گھڑے کی طرح سے دے پٹکا

تازگی جی کی اور تری تن کی ۔ واہ کیا بات ہے کورے برتن کی

کوروں پہ جو نظر جوبن ہے　　　جو جوبن میں کہاں وہ کھن کھن ہے
جس گھڑونچی پہ کورا باسن ہے　　　وہ گھڑونچی نہیں ہے گلشن ہے
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات ہے کورے برتن کی

ککڑی کی تعریف میں فرماتے ہیں (۹ بند کی نظم ہے)

کیا پیاری پیاری میٹھی اور پتلی پتلیاں ہیں　　　گنّے کی پوریاں ہیں ریشم کی تکلیاں ہیں
فرہاد کی نگاہیں، شیریں کی ہنسلیاں ہیں　　　مجنوں کی سرد آہیں، لیلیٰ کی انگلیاں ہیں
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

چکھو نے میں برگِ گل ہے کھانے میں کرکری ہے　　　گرمی کے مارنے کو اِک تیر کی سری ہے
آنکھوں میں سکھ کلیجے ٹھنڈک ہری بھری ہے　　　ککڑی نہ کہیئے اس کو ککڑی نہیں پری ہے

جب پیرنے پر آتے ہیں تو بیسیوں طرح کے پیرنے گناتے ہیں۔ کھڑی۔ چادر۔ بند۔ ناند۔ چکوا۔ پینڈا بھنور۔ اُچھالن۔ چکر۔ سمیٹ۔ مالا۔ مینڈا اگھمیر۔ کستی پچھاڑ۔ گترا وغیرہ وغیرہ۔ پرندوں کا ذکر ہے تو سیکڑوں ہی نام گنا جاتے ہیں۔ اکیلے کبوتر کی کوئی پچاس قسمیں گنائی ہیں بغیر گہرے شوق کے اس قدر واقفیت ممکن نہیں، اور یہ شوق اُن کی زندگی زندہ دلی جسم کے کس بل اور طبیعت کی ہمہ گیری پر دلالت کرتا ہے۔ چمن کی سیر کو گئے تو پھول پھول پتّے پتّے سے لطف اندوز ہوئے، اور ایسے ہوئے کہ سیکڑوں ہی کا اُن کے دل پر نقش ہوگیا۔

شب کو چمن میں واہ واہ کیا ہی بہار تھی مچی　　　پھول کھلے تھے پھول پھول غنچے کھلے کلی کلی
بیلا چمیلی، رائے بیل، موتیا، جوہی سیوتی　　　بادِ صبا بھی چلتی تھی، عطر گلاب میں بسی
رات کو کیا ہی عیش کی ٹھہری تھی آ کے انجمن　　　تارے کھلے تھے تو رتن پھول کھلے چمن چمن
نرگس و بار و یاسمن، سوسن و طرّے نسترن　　　کبکِ تدرّو خندہ زن بلبل و قمری نغمہ زن
(ایک اور جگہ کہتے ہیں)
سرو سہی کھڑے ہیں قرینے سے سبز تن　　　کوکو کرے ہیں قمریاں ہو کر شکستہ تن
رابیل سیوتی سے بھرے ہیں چمن چمن　　　گلنار، لالہ و گل و نسرین و نسترن
فوارے چھوٹ رہے ہیں رواں جوئے بار ہے

میلوں کا ذکر ہے تو گویا پڑھنے والے کے سامنے ایک سینما جاری ہوگیا۔ بلدیو جی کے میلے سے

دو شعر اس کا کچھ اندازہ دیں گے۔

ٹوٹے پھوٹے گنواری اور گنوار ❊ جس گنواری کو چلیے دھکا مار
پھر کے دے گالی یوں کہہ ہی پکار ❊ کیسوا اٹھلا چلے ہے ڈاڑھی جار

یہ چار چار اشعار کے چھپیس بند کی نظم ہے۔ ہر بند ایک چلتی پھرتی تصویر آپ کے سامنے پیش کرتا ہے۔

ہندو مسلم تہواروں، مسلم پیر پیغمبر اور ہندو دیوی دیوتاؤں وغیرہ پر بھی جی کھول کر لکھا ہے۔ اس سلسلہ میں کنھیا جی اور "مہادیو جی کے بیاہ" پر اُن کی نظمیں بہت مشہور ہیں۔ نظیر کی اخلاقی اور عبرت انگیز نظمیں تو اب بھی زبان زد خاص و عام ہیں اور یہی اس کے نام کے بقاء کا موجب بھی ہوئیں ورنہ جن تعصبات کا وہ شکار رہا ان کے زیر اثر اب تک تو قصہ ختم ہو چکا ہوتا۔ ان اخلاقی نظموں میں دو بہت زیادہ مشہور ہیں، ایک "کلجگ" اور دوسری "بنجارہ نامہ" ہر دو سے ایک دو بند ملاحظہ ہوں:۔

"کلجگ"

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی ساتھ لے ❊ نیکی کا بدلا نیک ہے بد سے بدی کی بات لے
میوہ کھلا میوہ ملے پھل پھول دے پھل پات لے ❊ آرام دے آرام لے، دکھ درد دے آفات لے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

"بنجارہ نامہ"

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا ❊ قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گونیں پلا سر بھارا ❊ کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارہ
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

مغرور نہ ہو تلواروں پر مت بھول بھروسے ڈھالوں کے ❊ سب پٹا توڑ کے بھاگیں گے منہ دیکھ اجل کے بھالوں کے
کیا ڈبے موتی ہیروں کے کیا ڈھیر خزانے مالوں کے ❊ کیا بقچے تاج مشجر کے کیا تختے شال دوشالوں کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

غرض کہ نظیر کا کلام پڑھ جائیے (کاش کہ اس کا کوئی صحیح ایڈیشن شایع ہوتا) اور آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ ایک ایسی حیرت انگیز ہستی کے ساتھ ہیں۔ جو ابھی بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہے اور

ابھی جوانوں کے ساتھ ڈنڈ پیل رہا ہے، کہیں تیر رہا ہے، کہیں کبوتر اڑا رہا ہے، مرغ لڑا رہا ہے کہیں میلے ٹھیلے اور باغ بغیچوں کی سیر کر رہا ہے، کہیں رنگیلی چھبیلیوں سے نوک جھونک ہے۔ کہیں ہولی کھیلی جا رہی ہے، عبیر اور گلال اڑ رہا ہے، پچکاریاں چل رہی ہیں۔ دوسرے ہی لمحہ میں وہ سنجیدہ غور و فکر میں غرق ہے، راہ حق اور فرائض زندگی پر غور کر رہا ہے۔ ذکر رسول ہے، علی کی یاد ہے، تو ادھر کہیں درگا جی کے درشن ہیں اور کہیں کنھیا جی کی بھگتی میں مست ہے، اور کہیں گرو نانک جی کے نام کا سمرن ہے۔ پھر کہیں ذرہ بھر بھی محسوس نہیں ہوتا کہ محض تقاضی ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ تہ دل سے جذبات اُبلے پڑ رہے ہیں۔ اس کا دل قدرت کی طرح وسیع ہے جو نہ صرف انسان سے بلکہ شجر و حجر، پرند، چرند، پھول، پتے ہر ایک سے اُنس رکھتا ہے، اس کا وسیع دل محدود دائروں میں بندھ نہیں سکتا۔ وہ اپنے آپ کو ہر حالت اور کیفیت میں تصور کر سکتا ہے اور ایک طلسم باندھتا ہے، جس کے زیر اثر نہایت خلوص کے ساتھ اس کے دل سے اُنس و محبت کے جذبات رواں ہو جاتے ہیں۔ وہ انسان کی مختلف کیفیتوں میں اختلاف نہیں بلکہ مدارج دیکھتا ہے اور ان کی حقیقت اور اہمیت کو خوب سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسان کی جسمانی دماغی یا روحانی ہر پہلو کی مختلف کیفیتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اور انہیں کے مدارج کے تنوع پر چیں بہ جبیں نہیں ہوتا۔ بلکہ انھیں ضروری جانتا ہے۔ اور اپنے آپ کو اُن سے ہم آہنگ کرتا ہے۔

وہ سب کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ اور سب سے مل جل کر زندگی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اوس کو اپنے اطراف و جوانب کی ہر چیز سے پیار ہے۔ یہاں کی مٹی سے، یہاں کے پھول پات سے، یہاں کے ہر جاندار اور ہر انسان سے بلا تفریق مذہب و ملت، انتہا یہ کہ وہ اعلیٰ و ادنیٰ اور نیک و بد کی تمیز کو بھی یہ کہہ کر اٹھا دینا چاہتا ہے۔

اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو برا ہے سو وہ بھی ہے آدمی
(آدمی نامہ)

زبان کے معاملہ میں بھی اُس کی یہی کیفیت ہے، فارسی، عربی سے اُسے کو بیر نہیں۔

جاتا ہے کہ اوس کا فارسی میں بھی ایک دیوان ہے۔ اور موجودہ کلیات میں بھی کئی ایک نظمیں فارسی کی ہیں۔ اور اوس کے اردو کلام میں ایسی بھی چیزیں آئی ہیں جیسے:-

قسمت میں گر ہمارے یہ مے ہے تو ساقیا
بے اختیار آپ سے شیشہ کرے گا جست
کچھ ہم کو امتیاز نہیں صاف و دُرد کی
اے ساقیانِ بزم بیارید ہر چہ ہست

یا

کیا کیا مگس عقل کے باندھے ہیں پر و بال
کر کے شکر خندہ بہم لب شکرے چند

لیکن اس کے ساتھ ہی اوس کی یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں کے لوگوں اور یہاں کی خصوصیتوں سے کیوں بیر رکھا جائے۔ لہذا وہ ٹھیٹھ عربی، فارسی الفاظ برتتے برتتے پھر اس دیس کے الفاظ کی طرف جھک جاتا ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ محض اپنی سربلندی کے لئے کسی کو مار کر اس کی لاش پر کھڑا ہوا جائے۔ اس لئے وہ یہاں کی زبان میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور اسمیں بھی اسی دیس کی کتھائیں کہتا ہے اور یہیں کے ریت رسم بکھانتا ہے۔ سنئے کنھیا جی کے جنم پر لکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہے ریت جنم کی یوں ہوتی جس گھر میں بالا ہوتا ہے
اس منڈل میں ہر من بھیتر سکھ چین دو بالا ہوتا ہے

سب بات بِتھا کی بھُولی ہے جب بھولا بھالا ہوتا ہے
آنند منڈیلی باجت ہے، نِت بھون اُجالا ہوتا ہے

جب جنم ہوگیا اور رات ہی رات سری کرشن جی گوکل[1] پہونچا دیئے گئے۔ تو علی الصبح نند جی کے یہاں کا حال سنئے:-

---

[1] فوٹ دوسرے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

سب ناری آئیں گانے کو اور پاس پڑوسن آ بیٹھیں
کچھ ڈھول بجیرے لاتی تھیں کچھ گیت بچا کے گاتی تھیں
کچھ ہوم مکھ اُس بالک کا بلہاری ہو کر دیکھ رہیں
کچھ تھال پنجیری کے رکھتیں کچھ سونٹھ ستوڑا کرتی تھیں

کچھ کہتی تھیں ہم بیٹھے ہیں نیگ آج کے دن کا لینے کو
کچھ کہتیں ہم تو آئے ہیں، آنند بدھاوا دینے کو

کوئی گُھٹی بیٹھی گرم کرے کوئی ڈالے اسپند اور بھوسی
کوئی لائی ہنسلی اور کھڑوے کوئی کُرتہ ٹوپی، میوہ، گھی
کوئی دیکھے روپ اُس بالک کا کوئی ماتھا چومے مہر بھری
کوئی بھنوؤں کی تعریف کرے کوئی آنکھوں کی کوئی پلکوں کی

کوئی کہتی عمر بڑی ہووے اُس بیر تمہارے بالے کی
کوئی کہتی بیاہ ہو لاؤ اِس آس مرادوں والے کی

پھر بال لیلا کا بکھان کیا ہے، بانسری کی کرشمہ سازیاں دکھلائی ہیں، بیاہ کا نقشہ کھینچا ہے، وغیرہ وغیرہ جو بات دھیان میں رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ نظیر ہندی لکھتا ہے لیکن اُس میں تعریف، مہر، مراد، جیسے الفاظ گُھس آتے ہیں، ایسے زمانے میں رہتے ہوئے جس کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے۔ نظیر کو زبان سے متعلق اُن اثرات سے بچنا مشکل تھا، لیکن اُس نے مقابلہ کیا۔ زمانہ نے بہت کچھ پچھاڑنا چاہا نہ پچھڑا۔ ان اثرات سے بچنے کے لئے اُس نے عوام کا سہارا لیا اور انھیں کی زبان لکھی اور درباروں اور ادبی دائروں میں جلنے سے انکار کر دیا۔ قدرتی تھا کہ اُس میں ایسے چار الفاظ آ جاتے جو اُس وقت مسلمانوں کے منہ پر چڑھے ہوئے تھے۔ اگر ہندوستانی زبان کوئی اُس وقت وہاں ہو سکتی تھی تو نظیر کی وہ زبان تھی جس کا نمونہ میں نے اوپر دیا ہے، یا جو بنجارہ والی، کلجگ والی، ککڑی اور کورے برتن والی اور دوسری اسی قسم کی نظموں میں ہے۔ آپ نظیر کی اس زبان کو ناسخ اور غالب، مومن، ذوق وغیرہ اُس دور کے اردو شعرا کے کلام کے مقابلہ میں رکھ دیکھئے، صاف ظاہر ہو گا کہ اُس زمانہ میں یو۔پی کے لئے کوئی صاف سیدھی سی زبان ایسی ہو سکتی تھی جس کو ہندو مسلمان دونوں سمجھ سکتے تو وہ نظیر کی یہ زبان تھی، اس طرح نظیر پہلا ہندوستانی شاعر ہے جس نے مستقل مزاجی سے اُن منصوبوں کو ٹھکرایا جن سے یہ زبان مسلمانوں کی اپنی علیحدہ ملک بن جائے۔ وہ ہندو مسلمانوں کے میل اور اتحاد کو دیکھنا چاہتا تھا اور زبان کی حد تک اُس نے وہی کام کیا جو شہنشاہ اکبر نے حکومت کے ذریعہ کرنا چاہا لیکن مسلم دنیا نے دونوں ہی کی بے قدری کی اور دونوں کے نیک ارادے ناکام رہے اور مسلمانوں کے فخر و اعزاز کیلئے ایک زبان پیدا کی گئی جو اردو کہلائی جسکو کیا شبلی، کیا سلیمان ندوی، کیا ڈاکٹر عبداللطیف وغیرہ سب مسلم ادیبوں اور مفکرین نے اسلامی زبان کہا ہے لیکن آج سیاسی مصلحتوں سے اسکو مشترکہ زبان منوانے کی فکر میں زمین اور آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں۔

سلہ سری کرشن جی کا جنم اُس زمانہ کے مشہور ظالم راجہ کنس (جو کرشن جی کے ماموں تھے) کے قید خانہ میں ہوا تھا۔ قید میں کرشن جی کے والدین اس لئے رکھے گئے تھے کہ یہ پیشین گوئی ہوئی تھی کہ دیوکی کے بطن ہی سے کنس کے مظالم کا خاتمہ کرنے والا پیدا ہوگا۔ جب کرشن جی کا جنم ہوا تو اس خوف سے کہ حسب معمول اس کا بھی خاتمہ کر دیا جائیگا کرشن جی کے والد وسودیو پہرہ داروں کی نظر بچا کر انہیں راتوں رات گوکل میں اپنے دوست نند کے پاس پہونچا آئے اور نند کی لڑکی کو جو تھوڑی دیر پہلے پیدا ہوئی تھی کنس کے پاس لا کر شمار دیا جو صبح کو قتل کر دی گئی۔

کنول کا پھول

ایک تمثیل

(از خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی، ہوم منسٹر ریاست کشمیر)

تو پھول ہے کنول کا، اسرار کا خزانہ — تیرا جو دم نہ ہوتا، اندھیر تھا زمانہ
پاکی و سربلندی تجھ کو ہوئی ودیعت — اے سرخوشِ حقیقت! اے شاہدِ یگانہ
ایک ایک پنکھڑی میں ہیں جمع حسن لاکھوں — موجِ ہزار نغمہ، ترتیبِ صد ترانہ
بادِ سموم تجھ کو چھونے مجال کیا ہے — تیری بہارِ دائم اے نقشِ جاودانہ
طوفان سر سے گزریں، کھائے نصیب ملٹا — ہر انقلاب تیرا بن جائیگا فسانہ
اللہ رے پائداری، قائم ہے تو جہاں تھا — کیا کیا نہیں نکالا بدبیں نے شاخسانہ
تیری جڑیں در آئیں خود وقت کے جگر میں — خود وقت بھی ہوا ہے تمکین کا نشانہ

بھونروں کے غول آئے
اُڑ کر کہاں کہاں سے
تھے جن کے ہونٹ پیاسے...
رس کے؟
نہیں لہو کے!

وحشی ہوائیں دوڑیں نفرت کا زہر لے کر — دیتی ہوئی تھپیڑے معجز نما عُلو کو
رعنائیِ ابد کی رنگینیاں جھلسنے — شعلوں کی نذر کرنے شادابیِ نمو کو
چاہا کہ پھر نہ اُبلے چشمہ شگفتگی کا — پھنکار کردے ٹھنڈا کھولتے ہوئے لہو کو
حیلے تراشے کیا کیا، نفرت کے ہو کے درپے — انجام کار خود ہی کھو بیٹھے آبرو کو
جانیں کھپائیں کیا کیا، پایا نہ بھید تیرا — مکڑائی چال والے نکلے تھے جستجو کو
ہو تربیت میں جس کی روحِ دوام شامل — کیا واسطہ فنا سے اُس جانِ آرزو کو
ہر چند تو ہمیشہ سچ اور شانتی کا — پیغام لحظہ لحظہ دیتا رہا عدو کو
لافانیت کی مورتی، انسانیت کے دیوتا — تجھ سا جو خود نہیں ہے کیا سمجھے تیری خو کو

اپنا ہوا نشانہ ہر شاطرِ زمانہ
"تو پھول ہے کنول کا اسرار کا خزانہ"

(بیادِ مسز سروجنی نائیڈو)

لوری

(از محمد ہادی حسین صاحب، انڈین سول سروس (آسام)

سو جا، باپ کے پیارے، سو جا۔ سو جا، ماں کے دُلارے، سو جا
دونو کی آنکھ کے تارے، سو جا۔ سو جا، لال ہمارے، سو جا۔

جاگ کے کیا دیکھے گا، پیارے! اس سنسار میں ہے کیا، پیارے؟
چار طرف ہے اندھیرا، پیارے۔ دیکھ نہ یہ نظّارے، سو جا۔

سو جا! نیند کی پریاں آئیں۔ میٹھے میٹھے سپنے دکھائیں
دُور اس جگ سے تجھے لیجائیں اپنے پَروں کے سہارے۔ سو جا۔

وہ جو ہے دنیا ایک خیالی، اِس دنیا کے دُکھ سے خالی،
سپنوں میں نظر آنے والی، اُس دُنیا کے کنارے سو جا۔

تو ابھی دُور اُس سے نہیں آیا، تیرے سر پہ ہے اُس کا سایا،
تاروں بھرے آکاش سا چھایا۔ اے آکاش کے تارے، سو جا۔

ہم تو اُس کو کھو چکے کب کے! جانے اُسے رو دھو چکے کب کے!
دُور اُس سُورگ سے ہو چکے کب کے! تیرے وہ مَن میں ہیں پیارے۔ سو جا۔

بحر النجات

(از مسٹر سلیم جعفر)

یادش بخیر! ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان میں فارسی کا دور دورہ تھا، اس کے مکتبوں سے فارسی کی صدائیں بلند ہوتی تھیں، اس کی عدالت کی کرسیوں پر سے حق و انصاف فارسی میں اپنا اعلان کرتے تھے اس کی محفلوں میں جدت و جودت فارسی رنگ میں اپنے کرشمے دکھاتی تھی، اس کے شعراء و ادبا کے فلک پیما طائرانِ خیال فارسی میں نوا سنجی کرتے تھے۔ "الناس علیٰ دینِ ملوکہم" قدم قدم پر اپنی صداقت کے مادّی و محسوس ثبوت پیش کرتا تھا۔ اس نے تفرق مذہب و ملت کو مٹا دیا تھا، ملک پر فارسی اسی طرح چھائی ہوئی تھی جیسے آج انگریزی۔ اور اس کے تسلط و اقتدار کے وہی اسباب تھے جو اس وقت انگریزی کے ہیں۔

کسی ملک میں اجنبی عنصر کا داخلہ محض سیاسیات و اخلاقیات ہی کے تختے کو نہیں تہ و بالا کر دیتا بلکہ زبان و خیالات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، اور اُن بے انتہا مظاہر میں سے جو رونما ہوتے ہیں، ایک مظہر یہ بھی ہے کہ اجنبیوں کے خیالات کو اپنی زبان میں یا اپنے خیالات کو اُن کی زبان میں ظاہر کیا جائے۔ اس سے ایک رسم مبادلۂ خیالات وجود میں آتی ہے جسے عرفِ عام میں ترجمہ کہتے ہیں۔ غیر زبان سے جو خیالات اپنی زبان میں لائے جاتے ہیں اُن کی غرض و غایت اکثر یہ ہوتی ہے کہ وہ ہم وطنوں کے دائرۂ علم میں داخل ہو جائیں اور اپنے خیالات کے لئے اجنبی آلۂ اظہار اختیار کرنے کا مدعا کبھی اجنبیوں تک اپنے خیالات کا پہونچانا ہوتا ہے تو کبھی اظہارِ تبحر یا ان لوگوں کے مذاق کی تشفی جو بیگانوں کی ادا اوڑھ پر مٹ کر اپنی خصوصیات کھو بیٹھتے ہیں۔

کتاب زیرِ عنوان جس سے ناظرین کا تعارف مدِنظر ہے اسی دور کی یادگار ہے جب فارسی ہندوستان میں کوسِ لمن الملکی بجا رہی تھی مگر اس دور کی جب اس کے آفتابِ اقبال کی روشنی غبارِ انگریزی سے قدرے ماند پڑنے لگی تھی۔ یہ کاشی مہاتم "کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتا ہے جسے "گوسائیں آنند گھن درفارسی تخلص جوش" نے تصنیف کے نام سے بتاریخ ششم شہر محرم الحرام سنہ ۱۲ ہجری "پیش کیا۔ اور بندۂ درگاہ جے سکھ رائے کائست سری باستہ ساکن کلوی کہ از چند مدت در مہونہ استقامت و قیام دارد" نے "برائے خاطر عزیز لالہ منسی پرشاد جیو طول عمرہٗ" لکھا تھا یہ گوہر بے بہا میرے ہاتھ اس طرح لگا کہ ایک دن ایک شہر کی گزری میں گزر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ خاک آلودہ و دست و پا بریدہ نیرنگیِ زمانہ سے حیران دکان کے ایک گوشے میں پڑا بزبانِ حال سے "عزیز منسی پرشاد جیو طول عمرہٗ" کے اخلاف کی قدر ناشناسی کا شکوہ کر رہا ہے۔ میں نے اسے اٹھا کر آنکھوں سے لگایا اور دیکھا تو معلوم ہوا کہ تین تہائی سے

بلکہ اس کے ساتھ ایک رسالہ مشتمل بر بیان ترکیب تیار کردن اطعمہ واغذیۂ ہر یک قسم" بھی ہے۔ جس کے خاتمہ پر عبارت ہے" انچہ کہ در کتاب جناب عموی صاحب عموی جھاؤلال صاحب بہ نقل برداشتہ شد بتاریخ ہفتم ماہ جولائی ۱۸۴۴ء عیسوی مطابق سودی دویج ماہ ساون اول سمت ۱۹۰۱ المطابق جمادی الثانی تاریخ سوم شہر مذکور بخط کمترین گیا پرشاد ولد گنگا پرشاد ساکن بانگرمو دار السلطنت لکھنؤ سرکار صوبہ اختر نگر اودھ در مقام ادرے تمام شد"۔ بحر النجات کو ذوقِ روحانی عرصۂ وجود میں لایا تھا لیکن اس رسالہ کا باعثِ تحریر اس کا مصنف یوں بیان کرتا ہے" بجھو انام خرد و چاشنی چشیدہ گان آفرینش پوشیدہ مباد چونکہ طبع اقدس صاحب عالی عزت جوہر شناس معتی قانون دان ہندستان قدر شناس علم عرب و عجم والا خبرت سراپا فہم کپتان ناکس صاحب بہادر زاد اللہ جوہرہٗ بسوئے طعمہائے لذیذہ واغذیہ لطیفہ ہندستانی بسیار مائل است لہذا حسب استرضائے صاحب موصوف الصدر چند اقسام طعام نفیسہ واغذیہ لذیذ بسبیل مختصر تجویز شدہ"۔ ان دونوں کے ساتھ ایک اور تالیف یا تصنیف کے دو ورق منسلک ہیں جن کا موضوع اخلاق وآداب سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ رسالہ تمہید و دیباچہ کے بار سے سبکدوش ہے۔ نفسِ مضمون سے ابتدا کرتا ہے "چوں در محافل اربابِ دولت و صاحبانِ والا منزلت وارد شود حفظ مراتب مقدم داشتہ بقدر پایۂ خویش جا گزیند وازدرجۂ خویش فراز و فرو تر ننشیند واگر سہو تجاوز واقع شود بعد وقوف بریں معنی درجائے کہ موافق درجۂ او بود رجعت نماید"۔ اس کے بعد "بیان فوائدِ تحصیل علوم" شروع ہوتا ہے اور وہ نامکمل رہ جاتا ہے۔ افسوس!

ان تینوں میں بحر النجات کو اہمیت حاصل ہے، لیکن میں کہہ چکا ہوں کہ یہ جلد مجھے دست و پا بریدہ ملی ہے۔ یہ لفظ میں نے دانستہ استعمال کئے ہیں" پا بریدہ" کی تشریح اوپر کی جا چکی" دست بریدہ" سے میری یہ مراد ہے کہ بحر النجات کے بھی شروع کے آٹھ ورق دست بردِ زمانہ نے ضائع کر دیئے۔ اس لئے صحت کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ گوسائیں آنندگھن نے اس کا باعثِ تصنیف کیا لکھا ہے۔ قیاساً کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اُن لوگوں کے لئے ایک ذریعۂ تسکین روح بہم پہونچایا ہے جو سنسکرت اور ہندی سے بے بہرہ ہیں۔ اس کتاب میں چار باب ہیں جن کے خاتمہ پر لکھا ہے:۔

(۱) ایں طور سری مہادیو جی با پاربتی ارشاد کردند سری بیاس بھگوان باسوت بیان نمودند وسوت باسونک وغیرہ عابداں گفت.... تمام شد ادھیائے اول پنچ کوسی مہاتم پراچیت مرنے نام از برہم بیورت پران۔

(۲) ایں طور سری مہادیو جی با پاربتی ارشاد کردند۔ سری بیاس بھگوان باسوت فرمودند سوت باسونک وغیرہ عابداں گفت..... تمام شد ادھیائے دوم در پنچ کوسی مہاتم از برہم بیورت پران۔

(۳) ایں طور سری مہادیو جی با پاربتی جی فرمودند۔ سری بیاس بھگوان باسوت ارشاد کردند سوت بہ سونک با عابداں گفت..... تمام شد ادھیائے سیوم در کاشی مہاتم از برہم بیورت پوران۔

(۴) ایں طور مہادیو جی با پاربتی فرمودند سری بیاسس جی کہ آن باسرت اشاد کرده بود باسیک وغیرہ عابدان گفت
.... تمام شد ادھیائے چہارم از برہمہ بیورت پوران از فضل سری مہادیو جی۔ ا

ابواب کے خاتمے خیال کو اس طرف لے جاتے ہیں کہ کتاب تصنیف نہیں ترجمہ ہے۔ اگر یہ تصنیف ہوتی تو جس انداز سے حوالے دیئے گئے ہیں اُس کی ضرورت نہ تھی۔ پنچ کوسی اور کاشی دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ چونکہ کاشی پانچ کوس کی لمبائی اور اتنی ہی چوڑائی میں آباد ہے اس لئے ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ لغات پنچ کوس نہ کہ پنچ کوسی کو کاشی کا مترادف بتاتے ہیں۔ لیکن خود صاحب کتاب کا بیان ہی ہمارے خیال کی تائید کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے: "ایں کاشی صورت گیان است در عرصۂ پنج کروہ سرحد کاشی است۔ بغیر کاشی آں زمین را دیگر خیال نہ باید کرد" غرض یہ کہ تمام کتاب (عظمت کاشی) کاشی مہاتم "برہمہ بیورت پوران" کے چار بابوں کا ترجمہ ہے۔

اب اس سے پہلے کہ کتاب کے بارہ میں کچھ لکھا جائے یہ بتانا ضروری نظر آتا ہے کہ "پُرَان" اور "بَرَہم وَیوَرت پُرَان" کیا ہیں۔ اس کے بغیر جو کچھ کتاب کے بارہ میں لکھا جائے گا، اُس پر کافی روشنی نہیں پڑ سکتی، اس کے لئے ہم ایک مستند لغت کے ممنون ہیں۔

"پُران کے معنی ہیں، (۱) قصص قدیم، کائنات، انسان، دیوؤں، راجاؤں، مہاتماؤں وغیرہ کے ایسے حالات جو آغاز ہستی سے بیان کئے جاتے رہے ہوں (۲) ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والی وہ تصانیف جن میں کائنات، قیامت، قدیم زمانے کے رشیوں، مُنیوں اور راجاؤں کے حالات درج ہوں۔ پُران اٹھارہ ہیں[۱۵] وشنو پُران کے مطابق ان کے نام یہ ہیں: سوِشنو۔ پدم۔ برہم۔ شیو۔ بھاگوت۔ نارد۔ مارکنڈیہ۔ اگنی۔ برہم ویورت۔ لنگ۔ وراہ۔ سکند۔ وامن۔ کورم۔ متسیہ۔ گرڑ۔ برہمانڈ۔ اور بھوشیہ.....

وشنو پُران کے علاوہ آج کل جو پُران ملتے ہیں، اُن کے بارہ میں شک ہوتا ہے کہ وہ اصل پُرانوں کے نہ ملنے پر بعد میں بنا لئے گئے ہیں۔ بہت سے پُران تو فرقہ وارانہ اختلاف کے مظہر ہیں جن میں ایک فرقے نے دوسرے پر چوٹیں کی ہیں، کوئی کسی دیوتا کی فوقیت ثابت کرتا ہے اور کوئی کسی کی۔ برہم ویورت پُران کی نسبت جو کچھ متسیہ پُران میں لکھا ہے اُس کی رو سے اس میں رتھنتر [رتھنکر (۹)] کلپ۔ اور۔ وراہ اوتار کا قصہ ہونا چاہیئے لیکن جو برہم ویورت پُران آج کل ملتا ہے اُس میں یہ قصہ نہیں ہے۔ کرشن جی کے بندرابن کے راس سے جن عقیدتمندوں کی تسلی نہیں ہوئی اُن کے لئے یہ پُران جنت میں رقص دائمی کا وعدہ کرتا ہے۔ زمانۂ موجودہ کا یہ پُران مسلمانوں کے کئی سو برس بعد کی تصنیف معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں اس کا ذکر بھی ہے کہ جلاہوں کی ذات کیونکر پیدا ہوئی۔ برہم پُران میں برہمنوں اور اُن کی عظمت کا ذکر بہت زیادہ ہے...... اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پُران کس نے بنائے؟ شیو پُران کے اُس حصے میں جو ریوا مہاتم (عظمت) کے نام سے موسوم ہے لکھا ہے

کہ سب پرانوں کے راوی بیاس جی ہیں۔ عام لوگوں میں بھی یہی مشہور ہے لیکن متسیہ پران میں صاف لکھا ہے کہ پہلے ایک ہی پران تھا اُسی سے اٹھارہ پران بنے۔ برہمانڈ پران میں لکھا ہے کہ وید بیاس نے پرانوں کی تدوین کی۔ اس کے بعد کا حال وشنو پران سے معلوم ہوتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ بیاس جی کا ایک شاگرد تھا جس کا نام لومہرشن اور اُس کی ذات سوت تھی۔ بیاس جی نے اپنا مجموعۂ پران اُس کو دیا۔ لومہرشن کے چھ شاگرد تھے سُمتی۔ اگنی ورچا۔ متری۔ شانشپاین۔ اکرت ورن۔ اور ساورنی۔ اس میں سے پچھلے تین نے بیاس جی سے اُن کا مجموعۂ پران پڑھکر ایک ایک مجموعہ خود بھی تیار کیا جس کا ماخذ بیاس جی کا مجموعہ تھا۔۔۔ اُٹھارہ پران وید بیاس کے بنائے نہیں ہیں۔۔۔ برہم ویورت پران کے چار حصے ہیں، تیسرے حصے کا نام گنیش کھنڈ ہے اس میں اور باتوں کے علاوہ اس کا بھی ذکر ہے کہ شیوجی نے گنگا کے کنارہ پر پاربتی جی کو تلقین کی۔"

گوسائیں آنند گھن جو تش جنھوں نے یہ ترجمہ کیا کون تھے اس کا پتا اسی صورت میں لگ سکتا ہے کہ بحرالنجات کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ ہاتھ لگے بشرطیکہ اُنھوں نے دیباچے میں اپنا کچھ حال لکھا ہو یا اُن کے خاندان کا کوئی فرد اگر موجود ہے وہ اُن کے حالات پر کچھ روشنی ڈالے، ورنہ اُن کی شخصیت ہمیشہ پردۂ خفا میں رہے گی، جہاں اس وقت وہ خود مستور ہیں۔

کتاب کی عبارت سہل اور رنگینی سے جو فارسی کا عام طرۂ امتیاز ہے بالکل پاک ہے، اس کو مصنف کی تنگیٔ وسعت علم یا کمزوریٔ خیال پر محمول نہیں کر سکتے کیونکہ یہ عظمت ترصیع وسجع اور غلو کی تاب نہیں لاسکتی۔ وہ اپنے اثر کے واسطے ادبی صناعیوں کی محتاج نہیں۔ دلوں میں اُتر جانے کے لئے اسے اٹل صداقت اور اُس ایمان وایقان کی ضرورت ہے جو عبد اور مالکِ روح کے درمیان تعلق صحیح کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اسی لئے کتاب کی عبارت افسانے کی سادگی کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس میں ناگوار تصنع کی بو آتی۔ کیونکہ مہادیوجی نے پاربتی جی کو زبانی تلقین کی ہے، اور گفتگو میں بیشتر وہ آرائش لفظی ناگوار خاطر ہوتی ہے جو معمولی سے معمولی تحریر کا حُسن ہے۔ اب اول کے آخری حصے سے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے، طرز عبارت معلوم ہو جائیگی:۔

"ہرکس کہ در مدت یک سال یک مرتبہ یا دو مرتبہ دیا سہ چہار مرتبہ پنج کوسی می کند، اوشاں زندہ نجات ہستند وجملہ گناہاں پاک شدند ورو ئے سختی گاہے ندیدہ باشد، ہمیشہ بہ رام نام بودہ باشد و بوقت آخرآں کس را ہیچ تصدیع ویخ نیست بوقت رحلت آں کس از زبان ماباں تارک منتر[1] مسموع می کند۔ لنگ دیہہ یعنی قالب دیگر دریں قالب ایم موجود می باشد و در دوزخ وبہشت آں می رود، نام آں لنگ دیہہ است، نہایت باریک است بنظر نمی آید آں وقت آں لنگ دیہہ از گفتن تارک منتر من درہم شکستہ می شود وبمیۂ الماں مسل جانند کہ دماں تفصیل قیاسے

---

[1] رام کا سشش حرفی منتر جسے گرو چیلے کے کان میں کہتا ہے اور جس سے انسان کو نجات مل جاتی ہے وہ منتر یہ ہے:۔
"اوم راما ئے نمہٗ" ओम् रामाय नमः

ایں خلاص می شود و بہماں وقت در نور محیط داخل می شود یعنی از جیو آتمان خلاصی یافتہ بر مہ ستناتن یعنی در ذات اصل حق قدیم داخل می شود۔"

اقتباس بالا میں غلطیاں ہیں، واحد جمع کے صیغے خلط ملط ہو گئے ہیں۔ مثال کو مسال اور قفس کو قفص لکھا ہے۔ ان کو ہم کاتب کے سہو پر محمول کرتے ہیں، کیونکہ اس نے اکثر کتابت میں غلطیاں کی ہیں۔ ثواب کو بھی صواب لکھا ہے۔ اس نے سنسکرت کے لفظوں کی صحت کا بھی خیال نہیں رکھا۔ مثلاً آتما کو آتمان، اور برہم ویورت کو برمہہ بیورت لکھا ہے لیکن خود مصنف بھی ایک فروگذاشت کا مرتکب ہوا ہے جس نے کتاب کی افادیت کا دائرہ تنگ کر دیا ہے۔ یہ تسلیم ہے کہ کتاب اُن ہندوؤں کے لئے لکھی گئی ہے جو اپنے مذہبی مصطلحات سے واقف ہیں لیکن اس کو فارسی میں پیش کرنے سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ غیر بھی اس کا مطالعہ کر سکیں۔ اصطلاحاتِ سنسکرت کو اکثر مقامات پر بغیر تشریح چھوڑ جانے سے، غیروں کے واسطے یہ ایک رازِ سربستہ بن گئی ہے۔

تیرتھوں کی عظمت کے بیان کا حال زیادہ تر برہم پُران" ہے اور قیاس یہی چاہتا ہے کہ بحر الحیات کا ماخذ یہی پُران ہو۔ لیکن اس وجہ سے کہ ہر باب کے آخر میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ اس کو مہادیو جی (یہ شیو جی کے ناموں میں سے ایک نام ہے) نے پاربتی جی سے بیان کیا اور ان دونوں کی گفتگو برہم ویورت پُران کے تیسرے حصے گنیش کھنڈ میں منضبط ہے، اس کے ماننے میں پس و پیش نہ ہونا چاہیئے کہ مترجم کتاب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ اس نے "برہم ویورت پُران" ہی کے چار بابوں کا ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ لفظی معلوم ہوتا ہے۔ مصنف شاعر بھی تھا چنانچہ خاتمۂ کتاب میں اپنی عقیدت کا اظہار یوں کرتا ہے:۔

یقیں داں تو خوش کہ ایں ادصاف کاشی ۔۔۔ بیاں کردی ہمیشہ خوش تو باشی
کہ ایں کاشی دہندۂ مُکت جائے ست ۔۔۔ ز جملہ تیرتھاں ایں با صفائے است
دریں شہر معظم ہر کہ بائید ۔۔۔ نصیب سعد آں کس بر آید
کند اعمالِ نیک ہر کس دریں شہر ۔۔۔ نمی افتند آں کس ہائے در قہر
بعالم جاوداں جائے بیابد ۔۔۔ سوئے جنت بخورسندی شتابد
نصیحت گوش کن از من تو اے دل ۔۔۔ اگر خواہی کہ گردد حل مشکل
بکن از جان و دل بھگت مہا دیو ۔۔۔ زنیت صدق وہم بے شب بیدا
دہندہ شوکت بھولا ناتھ نام است ۔۔۔ عطا سازِ مقاصد ہا تمام است
نمایم تا کجا وصفِ بنارس ۔۔۔ کہ ہست ایں شہر چوں پاکیزہ بادش
بخواہم ہر کہ ایں را از دل و جاں ۔۔۔ شود آں پاک از جملہ گناہاں

درین دنیا بیابد گنج و فرزند — نجات آخر بیابد زآن خرومند
ہمیشہ خوش شود از تندرستی — نگاہے بیند و سحق و سستی
بماہ ماگھ شکل پنجمیں داں — بسمبت ہیژدہ صد و چہل و ہشت آں
بسنت روز فرخ ہندوان است — خوشی و خرمی پیر و جوان است
بماہ جانبر تاریخ سلخ است — فتح انگریزیاں بر چین و بلخ است
بسال ہفتدہ صد و نود و دو آں — ہمیں سنہ مبارک عیسوی خواں
شدہ اتمام ایں بحر النجات — ہمیں موصوف شد اشرف صفات
بخواند ہر کہ ایں برمن دعائے — کند از جان و دل آں باوفائے
شدہ اتمام در شہر بنارس — ہمیں بحر النجات اکسیر و پارس

ترجمہ کی صحت میں شک نہ کرنا چاہیئے، مترجم کے جوش عقیدت اور مذہب پرستی نے جو تحریری ثبوت ہم پہونچایا ہے، وہ اس بدگمانی کی اجازت تو دے سکتا ہے کہ اُس سے سہو ہوا ہو لیکن اس خیال کا قطعی مانع ہے کہ اس نے کسی غرض یا وجہ سے اصل کا مسخ ہونا گوارا کیا ہو۔ اس لئے اس مسئلہ پر خامہ فرسائی تحصیل حاصل ہے۔ ہمیں یقین کر لینا چاہیئے کہ اس نے انحراف اصل سے دامن بچانے کی انتہائی کوشش کی ہے۔

آنندگھن جوش کا شاعری میں کیا رتبہ ہے اس پر بھی رائے دینا خلافِ اُصول نظر آتا ہے۔ اُن کے چند شعر پیش نظر ہیں اور وہ بھی کاتب کی بے پروائی سے مجروح معلوم ہوتے ہیں۔

اس قلمی نسخہ پر جتنی توجہ کی گئی ہے آیندہ اس سے زیادہ مدنظر ہے۔ اس لئے اگر ناظرین زمانہ میں سے کوئی صاحب ہماری مدد فرمائیں اور یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں کہ اُن کے پاس اس ترجمہ کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ ہے تو ہم ممنون ہوں گے۔

رباعیاتِ گلشن

(۱)
آج آئے ہیں کچھ اہل حرم اے ساقی — کھائے ہوئے پینے کی قسم لے ساقی
کر آنکھ سے پینے کا اشارہ ان کو — کھل جائیں ذرا ان کے بھرم لے ساقی

(۲)
تدبیر سے انسان کو عاری دیکھا — وقفِ ستم ذلت و خواری دیکھا
افسوس ہے افسوس ہے پھر بھی گلشن — ہم نے اسے قسمت کا پجاری دیکھا

وادیِ کانگڑہ

(از جناب بشن داس، گلشن۔ منشی فاضل نادونوی، ایڈیٹر کانگڑہ دیپک)

اے جلوۂ باغِ جناں اے حسنِ فطرت کے نشاں
اے نکہتوں کے کارواں

آغوشِ رنگیں میں تری پلتے ہیں انوارِ ازل
تو اہلِ عالم کے لئے ہے آئینہ دارِ ازل
ہر سنگ کوہِ نور ہے
ہر ذرّہ کوہِ طور ہے

تو ہے جہانِ رنگ و بو تو ہے نشانِ رنگ و بو
تو ہے جہانِ رنگ و بو

سیرابیِ ذوقِ نظر تیرے ہی نظاروں سے ہے
تازہ مشامِ جان و دل تیرے ہی گلزاروں سے ہے
تو شاہدِ گلپوش ہے
فردوس در آغوش ہے

یہ آبشاروں کی صدا سُن کر مجھے دھوکا ہوا
یعنی کوئی سیمیں لقا

بربط لئے آغوش میں ٹیلے پہ نغمہ ریز ہے
جس کی صدا میں موجزن صہبائے کیف انگیز ہے
مستی بداماں ہے فضا
لغزش میں ہے پائے صبا

ہر ایک وادی پُر فضا ہر ایک منظر دل رُبا
ہر ایک گھاٹی خوش نُما

راہیں تری گیسو صفت صد پیچ و خم کھاتی ہوئیں
اور اک سرودِ سرمدی یہ ندیاں گاتی ہوئیں
دل ان پہ ہوتا ہے فدا
اے مرحبا صد مرحبا

تو پیکرِ اعجاز ہے　　اِک خوبصورت راز ہے
قُدرت کو تجھ پر ناز ہے

ہر منظرِ دلکش میں ہے　　تیرے نمودِ حُسن یار
تو خامۂ فطرت کا ہے　　اِک روح پرور شاہکار
کاشانۂ رحمت ہے تو
میخانۂ رحمت ہے تو

تیری ہوا سحر آفریں　　پانی ترا ہے انگبیں
تو عشرتِ خلدِ بریں

ہر سنگریزہ پُر صفا　　گویا کہ اِک مہ پارہ ہے
شادابیٔ طلعت تری　　میخانۂ نظارہ ہے
ہیں سبز پوشانِ جناں
آگے ترے خجلت کناں

تو رشکِ ایمن تھا کبھی　　رشیوں کا مسکن تھا کبھی
مُنیوں کا مامن تھا کبھی

پاتے تھے مردانِ خدا　　تسکیں گپھاؤں میں تری
کیفِ مئے توحید تھا　　رقصاں فضاؤں میں تری
عرفاں میں مشہورِ جہاں
سطحِ زمیں پر آسماں

تیرے نظاروں کے لئے　　اِن کوہساروں کے لئے
اِن سبزہ زاروں کے لئے

رکھتے ہیں اہلِ خلد بھی　　اپنے دلوں میں حسرتیں
بخشی ہیں قدرت نے تجھے　　وہ روح پرور نعمتیں
کیونکر کروں اُن کا بیاں
اے جلوۂ باغِ جناں

تو اک حسیں احساس ہے　　تو میرے دل کی آس ہے
تیرا ہی مجھ کو پاس ہے

مذہب مرا، ایماں مرا　　تو ہے، کہ ہے میرا وطن
رہتا ہوں گلشن میں ترے　　ہم رنگِ بلبل نغمہ زن
تیرے لئے جینا مرا　　تیرے لئے مرنا مرا

اثرؔ کے تاثرات

(از ڈاکٹر م. حفیظ سیّد، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ)

شاعر کا ادراکِ حقیقت کی اُس منزل تک پہونچ چکا ہے جس کے بعد حصولِ مقصد کے لئے صرف ایک قدم باقی رہ جاتا ہے. شاعر کا ذہن ایک مخصوص کمی کے شدید احساس سے لبریز ہے. اس شئے کی مخصوص کمی جس کی تلاش میں وہ سرگردان وحیران ہے. اب منزلِ مقصود اور خود اُس کے درمیان بہت تھوڑا فاصلہ گیا ہے جسے وہ "کوئی کمی ہے" کے الفاظ سے یاد کرتا ہے، اور جسے طے کر لینے کے بعد وہ کائنات کے پس پردہ چھپے ہوئے خاموش مگر بصیرت افروز راز کو عُریاں دیکھ لے گا۔

ایک ظاہر بیں انسان بیخودی کے کیف سے ناآشنا ہے، کائنات کی ظاہری نمود و نمایش سے مطمئن ہوتا ہے اور اسی کو سب کچھ سمجھتا ہے، اس کی روح کسی مقصد کی تلاش کے سوز اور تڑپ سے خالی ہے، اِس لئے زندگی میں وہ کوئی کمی نہیں پاتا، وہ اسے مکمل معلوم ہوتی ہے. لیکن شاعر جو "عرفانِ بیخودی" کی انتہائی بلندیوں پر نازاں ہے، اس تصویرِ رنگ و بو میں کسی مخصوص اور ناقابلِ بیان شئے کی کمی محسوس کرتا ہے، ایسی ایک کمی جس کے علم کے بغیر اس کی روح سکون و اطمینان کی دولت سے محروم رہیگی، وہ مخصوص کمی کیا ہے؟ ابدی جمال، جو بیک وقت سکوت بھی ہے اور نغمہ بھی، جو عُریاں بھی ہے اور پوشیدہ بھی، جو کائنات کے پھیلے ہوئے نقوش میں رنگ بھرتا ہے اور پھر بھی ہمارے دیدۂ ادراک سے پرے ہے، شاعر اس شئے کا حاصل کئے بغیر زندگی میں اور خود اپنے ذہن میں ایک خلا سا محسوس کرتا ہے. یہ "احساسِ خلا" نتیجہ ہے عرفانِ بیخودی کی انتہائی بلندیوں تک پہونچ جانے کا؛ علوم انسانی کی ابتدائی منازل میں اس خلا، اس کے احساس یا تو قطعی نہیں ہوتا یا بالکل مدھم سا ہوتا ہے. کائنات میں کسی شئے کی کمی کا احساس دلیل ہے ہی ادراک کی فلک بوس چوٹیوں تک پہونچ جانے کا. اس تصوّر کو کس تکمیل کے ساتھ اور کس پُر اثر انداز شاعر نے پیش کیا ہے۔

عرفانِ بیخودی کی منزل وہ آگئی ہے
محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی کمی ہے

انسان کے بیخودی کا مسئلہ جس قدر اہم ہے اُسی قدر پیچیدہ اور نازک بھی ہے. خودی کے صحیح ادراک

کے لئے اور خاص طور پر اس پر صحیح معنوں میں عمل پیرا ہونے کے لئے بلند نظر اور بسیط و سلیم ذوق کی ضرورت ہے ورنہ ذراسی لغزش یا غلط فہمی اُسے خودی کی بلندیوں سے گرا کر خودسری کی عمیق گہرائیوں میں پہونچا سکتی ہے خودی اور خودسری کی سرحدوں کو متعین کرنا اور اُن کے درمیان بیّن اور واضح حد فاصل قائم کرنا بلند ترین انسانی شعور کا کام ہے۔ ہرکس و ناکس اس مشکل فرض کو انجام نہیں دے سکتا۔ خودی کے غلط تصور نے بدقسمتی سے اس کے حدود خودسری جیسی ناقابلِ اعتنا چیز سے ملا دئیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض کم فہم حضرات اپنی خودسری کو خودی کا خطاب دیکر اسے اعلیٰ وارفع ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ درا‌صل وہ خودی نہیں ہے بلکہ خودپرستی ہے جو بجائے خود ایک نوع کی بت پرستی ہے۔ اس اہم حقیقت کو شاعر نے کتنے پیارے پُراثر انداز میں پیش کیا ہے ؎

یہ خود پرستیاں ہوئیں، یہ بُت پرستیاں ہوئیں
خودی کو خودسری کا آئینہ اگر بنا دیا

ایک طرف ہماری آنکھوں سے پرے اور ہماری عقلیت پرست ذہن سے پوشیدہ کچھ اسرارِ حیات ہیں۔ وہ اسرارِ حیات جو اِن تاروں کے مبہم اور ناقابلِ فہم تبسم میں بند ہیں، جو ہماری سطحی آنکھوں اور زمان و مکان کے پابند ذہن سے دُور بہت دُور خاموش و خوابیدہ ہیں۔ ابتدا و انتہا کے عظیم راز جس کی تلاش میں ہمارا تصوّر ناکام و نامراد آوارہ پھر رہا ہے..... اور دوسری طرف یہ "دیدۂ بے اعتبار" ہے، جسے کائنات کی کسی حقیقت پر یقین نہیں آتا جس کے اندر اتنی "قوتِ بینش" نہیں کہ اِن زرکار ریشمیں پردوں کی تھرتھراہٹ کے اندر سے چھپے ہوئے رازوں کو چُرا سکے۔ وہ اتنا بے اعتبار اور ناتوان ہے کہ وہ تلاشِ حقیقت کی کوشش کو موہوم سمجھکر ٹھکرا دیتا ہے، وہ زندگی کے ہر راز کو موہوم اور ناقابلِ اعتبار کہہ کر اُسے ہماری تلاش و جستجو سے پرے پھینک دیتا ہے، اِسی "دیدۂ بے اعتبار" نے شاعر کو "اسرارِ حیات" سے بیگانہ کر دیا ہے، وہ اس لئے بیگانہ ہے کہ زندگی کے ان اسرار پر اس کی آنکھوں کو یقین نہیں آتا:۔

اسرار سے حیات کے بیگانہ کر دیا
موہوم کہہ کے دیدۂ بے اعتبار نے

اگر ہمت اور ارادہ بالجزم ساتھ نہ چھوڑے تو شاہراہِ زندگی پر چلنے والے مسافر کو کسی چیز کا خوف و خطر نہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز، راستے کی بلندیوں اور پستیوں سے گھبراہٹ اور خوف محسوس کرنا ہمت مردانہ کا کام نہیں۔ انسان منزلِ مقصود تک پہونچنا چاہتا ہے تو اس کے لئے نشیب و فراز کو عبور کرنا لابد ہے۔ بیشمار مشکلات اور لاتعداد مصائب کا سامنا کئے بغیر کامیابی معلوم! کامیابی کی اوّلین شرط [illegible]

اور مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہے۔ حصولِ مقصود کے تصور کے ساتھ نشیب و فراز کا تصور بھی وابستہ ہے۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ نشیب و فراز بجائے خود منزلِ مقصود کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ پھر ایک پختہ ارادہ رکھنے والے انسان کے لئے ان سے ڈرنا کیا! ؎

ہمت ہے استوار تو رہرو کو خوف کیا
منزل کا جزو ہے جو نشیب و فراز ہے

کسے خبر ہے کہ حقیقت کیا ہے اور مجاز کیا۔ حقیقت اور مجاز کی واضح اور بیّن تقسیم بجائے خود مشکوک ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ حقیقت کے حدود کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور مجاز کے کہاں سے۔ مجاز بھی ایک ایسی پوشیدہ حقیقت ہے جو ہمارے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ مجاز بھی اس حقیقت کا ایک لازمی جزو ہے جو اب تک ہماری آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔ مجاز و حقیقت سب ایک ہی عظیم الشان اور لامتناہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں، اور انھیں جدا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ پوری کائنات ایک بسیط راز ہے، ایک حیرت ہے جو خود حیرت کا منھ تک رہی ہے۔ مجاز حقیقت کا تماشا ہی نہیں بلکہ خود حقیقت حقیقت کی تماشا بیں ہے، خود راز، راز کی تلاش و جستجو میں ہے۔ ہر طرف سوائے راز اور حیرانی کے کچھ نہیں۔ اس عظیم الشان حیرت کا شاعر نے خوب احساس کیا ہے ؎

کس کو خبر کہ کیا ہے حقیقت، مجاز کیا
اک راز ہے جو محوِ تماشائے راز ہے

اہلِ نیاز کی رفعت کا پوچھنا کیا، اُن کی شخصیت کا درجہ ستاروں سے زیادہ بلند اور آفتاب سے زیادہ درخشاں ہے۔ یہاں تک کہ کعبے کی رفعتیں بھی "اہلِ نیاز" کی بلندیوں کے سامنے "سرِ نیاز" خم کر دیتی ہیں۔ کعبے کی بلندی ہر طرح سے مسلّم، پھر بھی اہلِ نیاز کی رفعت اس سے زیادہ بلند ہے۔ اسی حقیقت کے باب میں شاعر کا ارشاد ہے:۔

کعبہ کی رفعتیں ہیں مسلّم، اثرؔ، مگر
اس سے بلند رفعتِ اہلِ نیاز ہے

زندگی اپنی پوری رفتار سے رواں دواں ہے، ایک کارواں ہے جو اُفق کی تاریک حدوں تک پھیلے ہوئے ریگستان میں ایک نامعلوم وقت سے حرکت میں ہے، اور ایک نامعلوم زمان تک حرکت میں رہے گا۔ کارواں ماضی کی گرد آلود اور دھندلی فضاؤں میں اپنے نقوشِ قدم چھوڑتا چلا جا رہا ہے، اور ایک لمحے کے لئے بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔ اس کا ہر لمحہ نہایت سرعت سے وقت کی دھندلی پرچھائیوں میں گم ہوتا ہے اور اپنے پیچھے لاتعداد واقعات کا ایک لامتناہی سلسلہ بناتا چلا جا رہا ہے۔ انسان کا بھی فرض ہے کہ وہ

زندگی کی طرح اپنی نظروں کو اُفق کی آخری حدوں پر مرکوز رکھے اور حال کے مضبوط بازوؤں پر پرواز کرتا ہوا ان روشن حدوں کی سمت بڑھتا رہے، اور کبھی ایک لمحے کے لئے بھی ماضی کے تاریک غاروں میں جھانکنے کی کوشش نہ کرے ...... وہ ماضی جو مُردہ حالات اور واقعات کے ڈھانچوں کا ایک طومار ہے جسے موت ہمیشہ کے لئے اپنے بھیانک اور مضبوط بازوؤں میں سمیٹ چکی ہے، جس کے ہونٹوں پر ابدی سکوت کی مہریں ثبت ہو چکی ہیں ...... انسان کی نظریں ہمیشہ مستقبل پر جمی رہنی چاہیئں۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ "حال" کی واقعیتوں کو بھی وہ فراموش نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ دفعتاً چھلانگ مار کر مستقبل تک نہیں پہونچ سکتا۔ اسے حال کی مدد سے مستقبل کو حاصل کرنا ہے۔ وہ اس کی حقیقتوں اور واقعیتوں کے بل بوتے پر ہی مستقبل کی روشن فضاؤں میں پہونچ سکتا ہے۔ زندگی کی اس اہم حقیقت کے اظہار کے لئے شاعر نے کیسا بلیغ پیرایہ اختیار کیا ہے ؎

سوئے مستقبل رواں ہو شہپروں پر حال کے
بھول جا ماضی کو نقشِ کہنہ اک مدفن میں ہے

دراصل یہ شعر ایک رجائی نظریۂ حیات کا حامل ہے۔ اور ان قدامت پرستوں کے لئے ایک زبردست تازیانہ ہے جو ماضی کے بوسیدہ اور مُردہ واقعات میں مستقبل کی اُمید تلاش کرتے ہیں۔ دراصل اُن کا یہ طرزِ عمل کائنات اور زندگی کی فطری رفتار کا مخالف ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی سعی و کوشش میں ہولناک حد تک ناکام رہتے ہیں۔

شاعر اپنی بے شمار آرزوؤں اور تمناؤں کو سینے میں دبائے سخت اور جانکاہ کوششوں کے بعد اپنے محبوبِ حقیقی کے در پر پہونچتا ہے، ایسے وقت میں ظاہر ہے کہ وہ اپنی مطلوب شے کے حصول کے لئے ہاتھ پھیلائے گا لیکن ہم کیا دیکھتے ہیں، شاعر اپنا ہاتھ آستین سے باہر تک نہیں نکالتا، آخر وہ کس لئے ہاتھ پھیلائے، اُسے تو پہلے ہی سب کچھ مل چکا ہے۔ اس کے محبوب نے پہلے ہی اُسے لاانتہا کیف و دولت سے مالا مال کر رکھا ہے ...... ظاہر ہے کہ جب اس کا محبوب اُسے مل چکا ہے تو پھر آخر وہ مانگے کیا، یہ زمین و آسمان، یہ ستارے، یہ روشنی یہ کائناتی مناظر، سب کچھ اسی کا ہے، پھر وہ مانگے کیا، اسی لئے کہتا ہے ؎

کیا کریمی ہے کہ جب در پہ ترے آ بیٹھا
آستیں سے نہ کبھی ہاتھ گدا کا نکلا

عشقِ حقیقی کی کئی منزلیں ہیں، ان میں سے ایک اہم منزل وہ ہے جب عاشق اپنی تلاش و جستجو میں محو ہو جاتا ہے۔ عشق کی کیف پرور لذتوں میں کھو جاتا ہے، اس کی نگاہیں خود اپنے عشق کی حیرانیوں میں

س طرح گم ہو جاتی ہیں کہ وہ اپنا مقصد تک کھو بیٹھتا ہے، وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا چاہتا ہے جس شعلۂ رخسار نے اُس کی روح میں عشق کے شعلے بھڑکائے تھے وہ خود اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، لیکن اس سے بھی مشکل وہ منزلِ عشق ہے جہاں عاشق گوہرِ مقصود تو کیا خود اپنے آپ کو کھو بیٹھتا ہے۔ محبوب سے اس کا احساسِ عشق شدید سے شدید تر ہوتا ہے، پھر اتنا پختہ اور کامل ہو جاتا ہے کہ وہ خود اپنی ہستی کو اپنے وجود کو محبوب کی ہستی میں مدغم کر دیتا ہے، اور اس طرح اپنا انفرادی وجود کھو دیتا ہے، اور خود اپنے عشق کی حیرانیوں کا حصّہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس منزل تک ہر شخص کا قدم نہیں پہونچتا ۔

کوئی ایسا نہ ملا آپ جو گم ہو جائے
عشق کی راہ میں گم کردۂ مقصود بہت

شاعر نے اپنے محبوب کے عشق میں اپنی ہستی کو کچھ نہیں سمجھا۔ عشق میں اُس کی انفرادیت کو اُس کے ذاتی وجود کو جتنے صدمے پہونچے وہ انھیں برداشت کرتا چلا گیا۔ محبوب کی انفرادیت، اور اُس کی ذات کے سامنے اپنی انفرادیت اور اپنی ذات کو قربان کر دیا۔ یہاں تک کہ اپنی ہستی کو اُس کی ہستی میں فنا کرنے کے لئے بھی تیار ہو گیا۔ اپنے آپ کو ریگِ رواں (یعنی ذرات خاکی) اور بہتی ہوئی چشمِ موج کے مانند ہمیشہ سرگرداں و پریشاں رکھا ۔

صورتِ آبِ رواں، موجِ رواں، ریگِ رواں
شوق میں تیرے کیا آپ کو نابود بہت

یہ مسلّم امر ہے کہ اگر عبادتِ الٰہی میں، خواہ وہ کسی مذہب کی رُو سے ہو، خلوص شامل ہے تو وہ با اثر ہوتی ہے خلوصِ دل سے جو شخص اپنے حقیقی محبوب کی بندگی میں اپنے اوقات بسر کرتا ہے، خواہ وہ کسی حالت میں اور کہیں ہو اپنی منزلِ مقصود پر ضرور پہونچ جاتا ہے۔ بندہ اور خدا کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں۔ خدا کا دیدار یا اُس کی قربت حاصل کرنے کا بہترین اور آسان ترین ذریعہ خلوص ہے۔ جہاں یہ موجود ہے وہاں انسان کی روحانی مرادیں یقیناً بر آتی ہیں۔ چنانچہ اس مضمون کو ہمارے بصیرت افروز شاعر نے کس خوبی سے ادا کیا ہے فرماتے ہیں ؎

خلوصِ بندگی نے آستاں ترا بنا دیا
جہاں بھی ہم ٹھہر گئے۔ جہاں بھی سر جھکا دیا

معرفتِ الٰہی کے حاصل کرنے کا شوق چند ہی نفوسِ انسانی کے دل میں پیدا ہوتا ہے، اور ان میں سے بھی معدودے چند ہستیوں کو "صحبتِ سرمدی" اور جاں افزا نغمات کے سننے کی سعادت نصیب

ہوتی ہے، اگر کوئی شخص ایسی برگزیدہ ہستی سے یہ پوچھے کہ تم نے کیا دیکھا اور کیا سُنا، تو اس کا جواب وہ سکوت اور خاموشی سے دیگا۔ یہ وہ حالت ہے جو حیطۂ بیان میں نہیں آسکتی اور نہ جس کو وہ الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر ہی کرسکتا ہے۔ جس شوریدہ دل کو اس ناقابل بیان منزل تک رسائی کی طلب ہو اُسے یاد رکھنا چاہیئے کہ اپنی منزلِ مقصود پر پہونچکر وہ اس عظیم الشان راز اور خاموشی کا حصہ بن جاتا ہے جسے وہ ظاہر نہیں کرسکتا۔ اس حقیقت کو ہمارے شاعر نے یوں ادا کیا ہے، ؎

عشق شوریدہ کو سودا ہے اسی منزل کا

راز بنتا ہے جہاں راز کا عرفاں ہونا

اِس عالمِ اسباب میں اسباب وعلل کا سلسلہ انسانی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے، کوئی شے بلا وجہ اور بلا سبب معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔ جو کچھ انسان کو حاصل ہوچکا ہے یا حاصل ہوسکتا ہے وہ سب اس کی ذاتی یا اجتماعی کوشش کا نتیجہ ہے۔ جد وجہد، فکر و محنت کے بغیر ادنیٰ سے ادنیٰ شے میں بھی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس کلیے کی بنا پر انسان کوشش بلیغ کے ذریعے ظاہر و باطن دونوں عالم میں اپنی مقصد برآری کرسکتا ہے۔ بعض کم فہم انسانوں کا خیال ہے کہ جو ہماری تقدیر میں ہے وہی ہوکر رہیگا۔ ہاتھ پاؤں توڑکر بیٹھ رہنے کو توکل اور قناعت سمجھ لیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ اسباب وعلل کے نہ مٹنے والے قانون کے منافی ہے۔ چنانچہ ہمارا شاعر ہمیں اس کلیے کی تعلیم اِن الفاظ میں دیتا ہے:۔

اپنی ہستی محو کردے کشت زارِ جہد میں

بارور ہوتا نہیں وہ دانہ جو خرمن میں ہے

ہندوستان کے قدیم فلسفے کے مطالعے اور اُس پر عمل پیرائی کا ماحصل یہ ہے کہ انسان تمام علائق دُنیوی، خواہشات و تعینات اور کمزوریوں اور خامیوں سے مُکتی (آزادی) حاصل کرنے، اور یہ اُسی وقت ممکن ہوتا ہے جبکہ وہ اپنی اعلیٰ اور ارفع فطرت کو پہچان لے، اور اپنی روحانی حقیقت سے واقف ہوجائے۔ ہر انسان کی فطری خواہش یہی ہوتی ہے کہ جس طرح ممکن ہو وہ پابندیوں سے نجات پاجائے۔ اس لئے وہ اپنی شخصی اور ملّی آزادی کے لئے ہر ممکن طریقے سے کوشش کرتا ہے۔ دُنیا میں جو قدم آگے بڑھاتا ہے اور جو جس جد وجہد میں مصروف ہوتا ہے، اور جس طرح کے قیود اپنے اوپر عائد کرتا ہے، ان سب کی غرض حصول آزادی کے سوا اور کچھ نہیں۔ چنانچہ اس خیال کو اثر نے ایک نہایت پُرکیف انداز میں یوں ظاہر کیا ہے ؎

ہر جہد کا، ہر جبر، ہر اقدام کا حاصل

اِک فطرتِ آزاد ہے، معلوم نہیں کیوں

ہر زمانے میں مذہب کا دور دورہ رہا ہے، اور مذہب نے سماج اور تمدن کے ارتقا میں کافی حصہ لیا ہے۔ مذہب کی خدمات سے متشکک اور لاادری بھی انکار نہیں کرتا۔ آثر جس مذہب کو مانتے ہیں وہ ظاہری مذہبی رسوم اور عقائد سے بالاتر ہے، وہ اس مذہب کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے جس میں اس کے حقیقی اور ضروری اجزا پس پشت ڈال دیئے جاتے ہیں۔ صحیح معنوں میں مذہبی شخص نفس پرستی، منافقانہ اور ذاتیات سے گریز کرتا ہے۔ فی زمانہ جس مذہب کو دنیا میں ہم دیکھ رہے ہیں وہ اس کی صحیح تصویر نہیں بلکہ اس کا مسخ شدہ چہرہ ہے۔ آثر صاحب اسی اعتقاد کی حمایت فرماتے ہیں :۔

آثر کا سلام ایسے مذہب کو جس میں
پرستش فقط نفس کی ہو رہی ہے

جو شخص حقائقِ اشیا کو سمجھنا چاہتا ہو اور اس کی تہہ تک پہونچکر اس کی کُنہہ اور ماہیت کو جاننا چاہتا ہو وہ کسی مذہب کے تحکمانہ اوامر کی بنا پر اپنے ارادہ سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ عام خیال ہے کہ مذاہب عالم عقل کی دخل اندازی اور تنقید کو برداشت نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اکثر مذاہب کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اس نے محققین اور مفکرین کو قابلِ سرزنش و عتاب سمجھا، اور باغیوں کو تہ تیغ کیا۔ جو شخص آزاد رائے رکھتا ہے اور اپنی شخصی آزادی کو قائم رکھنا چاہتا ہے وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا اور اپنی تحقیق و تدقیق کے راستے کو ترک نہیں کرتا بلکہ عزم بالجزم کے ساتھ اپنی کوشش اور روش پر قائم رہتا ہے۔ ایسے شخص کے پائے استقلال کو کوئی مذہب، خواہ وہ کفر ہو یا اسلام ہلا نہیں سکتا۔ اس حقیقت کو ہمارے شاعر نے ایک خاص انداز میں ظاہر کیا ہے ؎

ممکن نہیں کہ جادۂ تحقیق ترک ہو
گمراہ مجھ کو سبحہ و زنّار کیا کریں

رباعیاں

(از جناب گلشن)

افسوس کہ اب عہد جوانی نہ رہا | اے وائے کہ لطفِ زندگانی نہ رہا
جس دردِ نہانی سے تھی دل کی ہستی | افسوس کہ وہ دردِ نہانی نہ رہا

معلوم تو ہے ضرر رسانی تیری | ہے وردِ زباں پھر بھی کہانی تیری
دنیا میں قدم قدم پہ ہوں خوار و ذلیل | اے طولِ امل یہ مہربانی تیری

ترانۂ تخریب

از جناب حسن یحییٰ صاحب عندلیب ایم اے، ایل ایل بی (علیگ)

ہر شے پہ جہاں کی طاری ہے اِک خوف سا صبح و شام مرا
دیکھو گے جسے پاؤ گے اسیر خطرۂ زیرِ دام مرا
اِک تہلکہ سا، اِک زلزلہ سا، ہوتا ہے ہر ہر گام مرا
مشرق میں قدم پہونچا تا ہے، یہ مغرب تک پیغام مرا
بیدردی و خوں ریزی و تخریبِ جہاں ہے کام مرا

آہٹ سے مری مچ جاتی ہے، ہلچل محلوں ایوانوں میں
شعلوں کے سمندر بہتے ہیں صحراؤں میں کاشانوں میں
شورش میری وحشت افزا حیوانوں میں انسانوں میں
جو زور ہے میرا زور کہاں وہ آندھی میں طوفانوں میں
مست و بےخود ہو جاتے ہیں، جو پی لیتے ہیں جام مرا

آبادیوں میں، ویرانوں میں، دریا کی طرح میں بہتی ہوں
مُلکوں کی سیاحت کرتی ہوں، قوموں کو مٹاتی رہتی ہوں
مَیں طعن و ملامت، ظلم و ستم، دُنیا میں سبھی کچھ سہتی ہوں
خوابیدۂ غفلت قوموں سے پر بات کھری مَیں کہتی ہوں
قوموں کو جگانے آتی ہوں، ہے گرچہ تباہی نام مرا

صدیوں کے خمار آلودہ بھی ٹھوکر سے مِری اُٹھ جاتے ہیں
ہر چند مچلتے، روتے ہیں، گھبراتے ہیں، چِلّاتے ہیں
مسدود مگر راہیں سب، جب اپنے لئے وہ پاتے ہیں
میدانِ وغا میں تیغ بکف ناچار چلے ہی آتے ہیں
بازاروں میں، گلیوں میں، برپا ہر جا ہے کہرام مرا

مہمل ہیں سب حال و ماضی، رہتی ہے نظر مستقبل پر
رکتا ہے سفینہ کب میرا، کاشانۂ موج ساحل پر؟
سب جور و جفا سہہ جاتے ہیں، جو کچھ بھی گزرتی ہے دل پر
ڈھاتی میں شکستہ تعمیروں کو جا لگتی ہوں منزل پر
پیغام نظامِ نو کا ہے تخریب کا یہ ابرام مرا

تاریک اندھیری راتوں کو تنویرِ سحر میں دیتی ہوں
ہاں تشنہ لبِ اسکندر کو بھی آبِ خضر میں دیتی ہوں
عصفور کے نازک سینہ کو، شاہیں کا جگر میں دیتی ہوں
یخ پاروں کو بادل کی گرج، بجلی کا اثر میں دیتی ہوں
آغاز مرا تخریب سہی، تعمیر ہے پر انجام مرا

صیّاد کے رخشاں خنجر سے اب، مرغِ بسمل پھڑکے کیوں؟
لو شمعِ بزمِ عشرت کی اب، خوفِ سحر سے بھڑکے کیوں؟
گلزارِ جہاں میں موجِ صبا سے بستہ کوئی کھڑکے کیوں؟
پیکانِ شعاعِ مہر سے آخر سینۂ شبنم دھڑکے کیوں؟
سایہ افگن سب پر یکساں ہوتا ہے لطفِ عام مرا

دیوانۂ راحت ڈرتا ہے، کلفت کے فسانے باقی ہیں،
پنہاں ہے نظر سے آبِ بقا، ظلمت کے فسانے باقی ہیں،
پر ہے یہ حقیقت میرے سبب، بہجت کے فسانے باقی ہیں،
عشرت کے ترانے قائم ہیں، جرأت کے فسانے باقی ہیں،
محمودِ طرب کر دیتا ہے اک جامِ مئے آلام مرا

ہر قطرۂ اشکِ رنگیں میں، اِک موجِ تبسم لرزاں ہے
ہر کرب و بلا کے دامن میں، اِک روحِ مسرت خنداں ہے
ہر ضرب میں طبلِ جنگ کی مضمر نغمۂ سازِ شبستاں ہے
ہر سلسلۂ تخریب میں بس تعمیر کا شعلہ رقصاں ہے
ہاں جوئے شیر ہی لاتا ہے، یہ تیشۂ خوں آشام مرا

تسکینِ قلوبِ مضطر ہوں، خوں ناب مری تصویر سہی
ہوں موجِ سحر، پروردۂ صد ظلم مری تنویر سہی
پیغامِ حیاتِ نو ہوں میں، آلودۂ خوں شمشیر سہی
جاں و تن ہوں میں آزادی کی، آوردۂ صد زنجیر سہی
تحریرِ مسرت ہے نقش پائے فرخ فرجام مرا
مایوسیوں کو، محرومیوں کو، امید سے ٹکر لینے دو
ضحاک فرومایہ کو بھی، جمشید سے ٹکر لینے دو
مریخ اجل پیغام کو بھی، ناہید سے ٹکر لینے دو
اب عہد ہے میرا ذرّہ کو خورشید سے ٹکر لینے دو
اک سیلِ کرم ہو جائے گا غم پرور یہ ادغام مرا

غزل

(از حضرت بیتاب بریلوی بی۔اے، ایل ایل۔بی)

کاروانِ عمرِ رفتہ گوش بر آواز تھا
موت کے ہاتھوں میں گویا زندگی کا ساز تھا

بربطِ ہستی ابھی تک کیف سے معمور ہے
ان سُبک پردوں میں کوئی زمزمہ پرداز تھا

لے اڑی تھی بیخودیِ شوق منزل کی طرف
کس قدر دلکش مرے انجام کا آغاز تھا

اُلجھنوں کے پیچ و خم سے وا ہوئے عقدے تمام
زندگی کی کشمکش میں زندگی کا راز تھا

دل کے سو ٹکڑے ہوئے پھر بھی نہ یہ سمجھا کوئی
نغمۂ شیریں شکستِ ساز کی آواز تھا

لیکے بوسے جامِ گل کے پی گئے خوناب اشک
ادعائے اتقا کا یہ بھی اک انداز تھا

اک معمہ ہی رہا رازِ نشاطِ زندگی
سوز تو نغمہ میں تھا نغمہ مگر بے ساز تھا

نیم وا غنچوں سے رنگ و بو کی کیا کھلتی گرہ
خندۂ گل سے بھی جب پنہاں چمن کا راز تھا

حُسن کی معجز نمائی ہم سمجھتے تھے مگر
جلوۂ بیتاب سوزِ عشق کا اعجاز تھا

منجھلی دیدی[۱]

(ایک افسانہ)

(از حضرت بیتاب بریلوی، بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

(۶)

دوسرے دن صبح کھڑکی کھولتے ہی ہیما نگنی کے کانوں میں جیٹھانی کے کرخت لہجہ کی جھنکار پہونچی، وہ بن کو مخاطب کرکے کہہ رہی تھی۔ "لونڈا کل سے بھاگا ہوا ہے، ذرا اُس کی خبر تو لیتے"

نوین نے جواب دیا۔ "ڈھونڈھ کر بھی کیا کریں گے، مارو بھی گولی۔"

سارے محلے کو سُناتے اور ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہوئے کادمبنی نے کہا۔ "تب تو لوگوں کو ہنسی اڑانے کا اچھا موقع ملے گا۔ لاج اور بدنامی کی چوٹیں ہمارا گاؤں میں رہنا اجیرن کردیں گی۔ چو طرف دشمن ہی دشمن تو رہتے ہیں۔ میں کہے دیتی ہوں اگر لونڈے نے کہیں گر پڑ کر جان دیدی تو گھر بھر کو کیا بچے کیا بوڑھے جیل جانا پڑے گا۔"

ہیما سب سمجھ گئی، وہ اُسی دم کھڑکی بند کرکے ایک گہرا سانس لیکر دوسری طرف کو ہٹ گئی۔

دوپہر کا وقت تھا، ہیما رسوئی کے سامنے والے چبوترے پر بیٹھی تھی، وہ ہاتھ کا لقمہ منہ تک لے ہی گئی تھی کہ چور کی طرح چپکے چپکے، دبے پاؤں آتے ہوئے کشن پر اُس کی نگاہ جا پڑی۔ کشن نزدیک آگیا، اُس کے پریشان بال اور خشک منہ پر نظر ڈال کر ہیما نے پوچھا "کہاں بھاگ گیا تھا؟ رے!"

"بھاگ تو نہیں گیا تھا۔ شام کے بعد نیند کے مارے دوکان میں سو گیا تھا۔ آنکھ کھُلی تو دیکھا آدھی رات ہوچکی تھی۔۔۔ بھوک لگی ہے دیدی!"

"اُس گھر میں جاکر کھا۔۔۔ جا!" کہہ کر ہیما نگنی نے کھانا شروع کردیا۔

ایک لمحہ کے لئے ٹھٹک کر کشن جانے لگا مگر ہیما نے اُسے واپس بُلا اور اپنے پاس ہی جگہ کرکے بٹھا لیا مہراجن سے فوراً دوسری تھالی دے جانے کی تاکید کرکے اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔

ابھی کشن بمشکل آدھے پیٹ کھانے پایا ہوگا کہ باہر کی بیٹھک سے گھبرائی ہوئی اُما دوڑی آئی اور چپ چاپ اشارے سے یہ اطلاع دے گئی کہ بابو جی ادھر ہی آرہے ہیں۔

---

[۱] اس افسانہ کی پہلی قسط ماہ دسمبر ۱۹۴۳ء میں شائع ہوچکی ہے۔

لڑکی کی گھبراہٹ، اُس کا اُڑا ہوا چہرہ اور مشتبہ نگاہیں دیکھکر ماں کو کچھ کم حیرت نہ ہوئی "ادم آتے ہیں تو اس کے لئے تو اس طرح سہمی کیوں جا رہی ہے؟"

اُما کشن کے پیچھے کھڑی تھی، ماں کی بات کے جواب میں اس کو اُنگلی سے دکھا کر آنکھ اور منھ کے عجیب وغریب حرکات سے اُس نے بتایا کہ یہ کھا چور رہا ہے۔

ہیمانگنی کس سے کیا باتیں کر رہی ہے؟ یہ جاننے کے لئے کشن نے گردن موڑی۔ اُما کی بہن گھبراہٹ اور خاموش اشارے دیکھکر اُس کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا، اُسی وقت اُس کا مُنھ فق اُتر گیا، جیسے بدن کا سارا خون پانی ہو کر بہہ گیا ہو، اُس کے دل میں کس بات کا اتنا ڈر بیٹھ گیا؟ یہ وہی جانے .... "منجھلی دیدی! بابو جی آتے ہیں!" کہہ کر اُسی طرح تھالی چھوڑ کر وہ رسوئی کے کواڑوں کی آڑ میں جا کھڑا ہوا۔ اُس کے دیکھا دیکھی اُما بھی دوسری طرف بھاگ گئی۔

اچانک مالک مکان کے آجانے سے چوروں کا گروہ جیسی حرکتیں کرتا ہے، اِن لوگوں سے بھی ویسی ہی حرکتیں سرزد ہوئیں۔ ہیمانگنی نے پہلے تو شش و پنج میں مبتلا ہو کر ایک بار اِدھر اُدھر نظر ڈالی اور اس کے بعد ہی تکان سے چُور مسافر کی طرح دیوار کا سہارا لے کر بیدم سی کھڑی ہو گئی۔ غیرت و ندامت، خفت و سُبکی کا بھالا جیسے اُس کے کلیجہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پار نکل گیا۔

ایک لمحہ میں وپن وہاں آ کھڑا ہوا۔ ہیما کی حالت غیر دیکھکر پیچ و تاب کھا کر نئے نئے شکوک کے جال میں پڑ کر اُس نے پوچھا "کیوں کیا ہوا؟ تھالی سامنے رکھے اس طرح سُست کیوں بیٹھی ہو؟"

ہیمانگنی نے کچھ جواب نہ دیا، وپن پنجرے میں پھڑ پھڑا کر گر پڑنے والے پرند کی طرح بیتاب ہو کر کہنے لگا "کہیں پھر وہی پرانا بخار تو لوٹ نہیں آیا؟ اس تھالی میں اتنا کھانے کا سامان اسی طرح ڈال کر کون اُٹھ گیا؟ جی!.... للت ہی تھا نہ؟ اُسی پاجی کے یہ کرتوت ہونگے! اور کون ایسی حرکت کر سکتا ہے؟"

ہیما تن کر سیدھی ہو گئی "نہیں جی! وہ نہیں ہے۔ اس گھر کا وہی کشن کھانے بیٹھا تھا کہ تم آ گئے تھے ڈر سے اُٹھ کر اُدھر کواڑوں کی آڑ میں چھپا کھڑا ہے۔"

"یہ کیوں؟ مجھ میں ڈرنے کی ایسی کیا بات ہے؟"

"یہ تو تمھیں کو معلوم ہوگا، صرف وہی نہیں تمھارے آنے کی اطلاع دے کر اُما بھی چمپت ہو گئی۔"

وپن نے دل میں سمجھ لیا کہ اس وقت ہیما کی بات چیت سیدھا راستہ چھوڑ کر ٹیڑھی راہ پر چل رہی ہے۔ اس لئے شاید اس کو راہ پر لانے کے لئے ہنستے ہوئے کہا "شاید اُسے یہی ڈر ہوگا کہ ماں کا اُپمان آنکھوں سے دیکھ بھاگ جانے کا یہی ایک کارن معلوم ہوتا ہے۔" تھوڑی دیر تامل کر کے اور ایک لمبا سانس لیکر اُس نے کہا

بچے پیٹ کی لاتی تک جب [illegible] اس کی ماں کسی کو بلا کر ایک مٹھی آٹا دے سکتی ہے۔۔۔۔ اس کو اتنا اختیار ہے، تو پھر کشن تو بہت دور کا۔۔۔ ایک طرح سے فقیر ہی ہے۔ اس کا ڈر کر بھاگ کھڑا ہونا تعجب کی بات نہیں ہے؟

اب وپن کو خیال آیا۔۔۔ کہ بات تو واقعی کچھ بے ڈھنگی ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے یہ سوچ کر کہ بڑھتے بڑھتے وہ کہیں حد سے نہ بڑھ جائے، اس نے اس معاملہ کو تمسخر کا رنگ دیکر آنکھ چھپاتے ہوئے کہا "نہیں، تمھیں تو جیسے کوئی حق نہیں ہے، بھکاری کو ایک چٹکی آٹا دے سکو، تمھاری اتنی بھی مجال نہیں ہے۔۔۔۔ خیر اس جھگڑے کو بھی تک رہنے دو۔۔۔ بتاؤ کل سے سر کا درد کچھ کم ہوا یا نہیں؟ میں سمجھتا ہوں شہر سے بڑے ڈاکٹر کیدار بابو کو بلا بھیجوں۔۔۔ یا پھر تمھیں کو کلکتہ۔۔۔۔۔"

بیماری اور اس کے علاج کا مشورہ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ہیما نے بات کاٹ کر پوچھا "تم نے اُما کے سامنے کشن سے کچھ کہا۔۔۔ سُنا تھا؟"

"میں نے؟۔۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں کہا۔ اوہ!۔۔۔۔ ہاں یاد آگیا، اس دن شاید اتنا کہا تھا۔۔۔۔۔ یاد آتا ہے۔۔۔۔ بھابی ناراض ہوتی ہیں۔۔۔۔ دادا بگڑ بیٹھتے ہیں۔۔۔۔ اُما غالباً وہاں موجود تھی۔۔۔۔ جانتی ہو؟"

"جانتی ہوں۔۔۔۔۔" ہیمانگنی نے بات یہیں دبا دی۔

وپن نے مردانے کمرے میں پہونچکر کشن کو اپنے پاس بلا بھیجا، اور اس کے آنے پر اس سے کہا "کشنو یہ چار پیسے لو اور جا کر کسی دوکان سے چبینا لے کر کھا لو،۔۔۔ بھوک لگنے پر دوبارہ یہاں نہ آنا یاد رکھنا، تیری دیدی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی غیر شخص کو روٹی کا ایک ٹکڑا تک دے سکے۔"

کشن چپکا چلا گیا۔ بیٹھک کے اندر کھڑے ہو کر وپن ادھر ہی دیکھ دیکھ کر دانت پیستا رہا جدھر وہ متوالے شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا جا رہا تھا۔

(۷)

پانچ چھ روز کے بعد، ایک دن شام کو وپن بالکل متوحش سا، گھبرایا ہوا گھر میں آیا اور آتے ہی کہنے لگا۔ "تم نے یہ سب کیا شروع کر دیا منجھلی! کشنو تمھارا کون ہوتا ہے؟ کیوں ایک غیر لڑکے کے پیچھے دن رات انہوں سے لڑائی مول لئے رہتی ہو۔۔۔۔ میں نے آج دیکھا دادا بہت خفا ہو گئے ہیں۔"

کچھ ہی دیر پہلے اپنے گھر میں، بیٹھکر بڑی بہو نے وپن کو شاید اور منجھلی دیورانی کو ضرور نشانہ بنا کر جو تلخ اوچھے اور زہر میں بجھے ہوئے تیر چھوڑ کر زبان کی صفائی دکھائی تھی، وہ سب بے خطا نکلے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی رائگاں نہ گیا۔ سب ہی آکر ہیمانگنی کے کلیجے میں بیٹھ گئے۔ اور ہر تیر اپنے منھ میں جتنا زہر لیکر آیا تھا اتنی ہی [illegible] ہی جلن بھی دیتا گیا تھا۔ لیکن درمیان میں وپن کے حائل ہونے کے سبب سے ہیما کے لئے

منھ سے اُف کئے بغیر لہو کے گھونٹ پیتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ بڑی بہو ان دنوں خاوند کی موجودگی کی آڑ لیکر منجھلی بہو کو جی بھر کر تنگ کیا کرتی تھی۔

وپن کی بات سُنتے ہی ہیمانگنی جل بھن کر بولی" کہتے کیا ہو، جیٹھ جی تک غصہ ہوکر بگڑ بیٹھے، اتنی بڑی اچنبھے کی بات سُنکر یکبارگی یقین تو نہیں ہوتا، اب بتاؤ کیا کریں کہ اُن کے مزاج کا پارہ اترے۔ طیش کی آگ ٹھنڈی ہو۔"؟

وپن اس مسخر آمیز مختصر مگر مکمل جواب سے دل میں کٹ کر، کرُاہ کر رہ گیا۔ لیکن غیظ وغضب، غم وغصہ کا اظہار کرنا اُس کی فطرت میں داخل ہی نہ تھا۔ اس لئے حسب معمول سنجیدگی سے بولا" کچھ ہو، اپنے بڑوں کے متعلق..... کیا....."

"سب جانتی ہوں"! قطع کلام کرکے ہیمانگنی نے کہا، منھ سے دودھ نہیں ٹپکتا کہ بڑوں کا لحاظ بھی نہ کرسکوں، لیکن بات تو یہ ہے کہ میں جو اس بن ماں باپ کے بچے سے ہمدردی رکھتی ہوں اسی لئے گویا وہ لوگ مجھے دکھا دکھا کر اس پر نت نئے پہاڑ توڑا کرتے ہیں۔"

ہیما کی آواز جیسے کچھ نرم اور نم سی ہو گئی۔ جوش میں آکر ابھی ابھی اُس کے منھ سے جیٹھ کی شان میں جو کچھ معیوب و مکروہ الفاظ نکل پڑے تھے اُن کی چوٹ اُس کے دل پر اتنی گہری لگی تھی کہ وہ خود بخود شرم و ندامت سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ لیکن اُس کا دل تو آتشکدہ بنا ہوا تھا جس کے مشتعل شعلے آسمان کو بھی لپیٹ لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سوزش، اس تپش سے کسی کروٹ چین نہ تھا، پناہ مانگنے سے بھی نہ ملتی تھی کوشش کرنے پر بھی وہ اپنے آپ کو روک نہ سکی۔ وپن در پردہ دوسرے فریق کا طرفدار تھا۔ پرائے پیٹ کی خاطر وہ گھر میں مہا بھارت بپا کرنا پسند نہ کرتا تھا۔

بیوی کو خجالت کے بھنور میں پھنس کر پست ہوتے دیکھکر اور اس سے کچھ سہارا پاکر، زور دیتے ہوئے وپن بولا" اس میں لاگ ڈانٹ، مان ایمان کی کوئی بات نہیں ہے، وہ اپنے کسی عزیز کو قابو میں رکھنے کے لئے اس کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں، کام سکھاتے ہیں، اس سے تمھیں چوٹ پہونچے۔ بغض و کدورت، حرص و حسد کی آگ بھڑکے، تو بھلا کیسے کام چل سکتا ہے؟ اس کے علاوہ، وہ اس کے عزیز ہونے کے باعث اس کے حق میں جو چاہے کرسکتے ہیں۔"

ہیما نے خاوند کے منھ پر نگاہ کی تو پہلے اُسے کچھ حیرت ہوئی، ان دونوں کا پندرہ سولہ سال کا ساتھ تھا، اس عرصہ میں اُس نے وپن کا ایسا برادرانہ خلوص پہلے کبھی نہ دیکھا تھا لیکن ایک ہی لمحہ میں، تعجب، حقارت آمیز غصہ سے بدل گیا اور وہ آگ بگولا ہوکر بول اُٹھی" وہ اس کے عزیز ہیں تو میں بھی ماں ہوں، بڑے لوگ اگر

اپنی آبرو کی گردن پر اپنے ہی ہاتھوں کند چھری پھیرنے لگیں تو میں کس طرح اسے بچا سکتی ہوں۔ اپنی غرت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے، اور جب وہی اپنا ہاتھ کھینچ کر اُسے بے لگام چھوڑنے کو تیار ہوں تو میرے پاس اسکا کیا علاج؟"

دین جیسے کچھ جواب دیتے دیتے ٹھہر گیا۔ باہر دروازے کے پاس سے کسی کی دھیمی تھرتھراتی ہوئی آواز نے یک بیک اندر گھس کر سب کے کان کھڑے کر دیئے۔ جیسے کوئی پکار رہا تھا — منجھلی دیدی!

میاں بیوی دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں، دین ذرا مسکرا دیا، لیکن اُس خشک مسکراہٹ میں پیار کی جھلک نہ تھی۔ رس کا بھی نام نہ تھا، تھی وہ بوند تلخ اور تند شراب، عجب وغرور کے شیشہ میں ڈھلی ہوئی۔

ہیما نگنی نے ہونٹ دبا کر چپ چاپ کشن کے منہ پر نگاہ ڈالی۔ اُس کے دیکھتے ہی وہ فرطِ مسرت سے جھوم کر بے خود ہو گیا، اور سب سے پہلے جو منہ میں آیا وہی کہہ اُٹھا "کیسی ہو دیدی؟"

ایک لمحہ کے لئے ہیما نگنی کو چپ لگ گئی۔ جس کی وجہ سے ابھی ابھی میاں بیوی میں اتنی تکرار ہو چکی ہے حسن اتفاق سے اُسی کا سامنا ہو جانے سے سارا غبار اُس کے سر آ پڑا۔ ہیما نے بڑے درشت لہجہ میں زور زور سے چلا کر کہا "یہاں کیا رکھا ہے، تو کیوں روز روز پھٹکارے جانے کے لئے آتا ہے؟ بول!"

منجھلی دیدی کی یہ جھاڑ واقعی اتنی کرخت اتنی کریہہ نظر آئی کہ اس کا سبب چاہے جو ہو وہ بات دجہ آفریں دل لگی نہیں ہے۔ یہ سمجھ لینے میں اس نوعمر قسمت کے مارے لڑکے کو بھی کچھ دیر نہ لگی۔ ڈر جھجک تعجب اور غیرت کے مارے اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ بولا "دیکھنے آیا ہوں، دیدی!"

دین قہقہہ لگا کر پہلے ہی بول اُٹھا "دیکھنے آیا ہے..... تمھیں....."

اس ہنسی میں ہیما نگنی کو بہت بڑی توہین چھپی ہوئی دکھائی دی، وہ محسوس کرنے لگی جیسے کسی نے منہ چڑا کر اُس کا مذاق اُڑایا ہے۔ پیروں سے کچلی ہوئی ناگن کی طرح بل کھا کر خاوند کی طرف دیکھنے کے ساتھ ہی ہیما نے آنکھیں پھیر کر کشن سے کہا "خبردار جواب کبھی..... کسی دن آیا..... جا..... نکل یہاں سے!"

"بہت اچھا!" کہہ کر کشنو نے سر پیٹ کر روتی ہوئی ہنسی کے پردے میں سیاہی کو ڈھک لینے کی کوشش کی۔ لیکن اور بھی زیادہ سیاہ، بے نور اور بگڑا ہوا چہرہ لے کر وہ کسی طرح وہاں سے نکل آیا۔

مغموم و ملول تاریکی کے سائے کو اپنا کر، اداس منہ اوپر اُٹھائے، خاوند کو کنکھیوں سے دیکھتی، ہیما بسرعت وہاں سے چلی گئی..... دُور، بہت دُور..... کا دمینی کی پہونچ سے بھی باہر.....

(۸)

ہیما نگنی کو بخار میں پڑے پانچ چھ دن ہو گئے۔ لیکن حرارت پیچھا چھوڑنا ہی نہیں چاہتی۔ کل ڈاکٹر نے کہا "سینہ پر سردی کا حملہ ہے۔"

شام ہو چکی، چراغ جل گئے۔ للت نہایت نفیس پوشاک زیب تن کئے ماں کے پاس آیا، اور بڑے اصرار کے ساتھ بولا۔ "ماں! دت بابو کے دروازہ پر کٹھ پتلی کا ناچ ہے، جا کر دیکھ آؤں؟"

ماں نے مسکرا کر کہا "ہاں رے للت! تیری ماں ادھر پانچ چھ دن سے کھاٹ پکڑے پڑی ہے تو ذرا دیر کے لئے ایک دفعہ بھی آکر پاس نہیں بیٹھتا؟"

للت شرما کر سرہانے جا بیٹھا۔ ماں نے پیار سے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کہا: "میں اس بیماری سے اگر اچھی نہ ہوئی اور مر ہی گئی تو تو کیا کرے گا؟ بتا! ــ خوب روئے گا..... نا؟"

"واہ! ہٹو بھی.... اچھی ہو جاؤ گی"... للت نے ماں کے سینہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ لڑکے کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لئے ماں دیر تک خاموش پڑی رہی۔ بخار کی تپش سے جھلسے ہوئے تمام جسم میں اس سُبک سرد لگاوٹ سے ٹھنڈک سی پڑ گئی۔ ہیما کا ہاتھ ہٹانے کو کسی طرح جی ہی نہ چاہتا تھا، مگر للت کی بےچینی بڑھتی جا رہی تھی۔ لڑکے کے دل کی کیفیت کا اندازہ کر کے ماں نے سمجھا، کٹھ پتلی کا ناچ شاید اب شروع ہو گیا ہو گا، اور دل ہی دل میں ہنس کر کہا "اچھا! اب تو جا۔ دیکھ آ، مگر بہت رات نہ کر دینا۔"

"نہیں ماں! میں ابھی لوٹ آؤں گا۔" للت ایک ہی چھلانگ میں ڈیوڑھی کے پار ہو گیا۔ مگر فوراً لوٹ کر بولا "ماں ایک بات کہوں؟"

ماں نے ہنس کر کہا "روپیہ چاہیئے؟ یہی نا! اس طاق پر رکھے ہیں، جا لے لے، مگر ایک ہی لینا۔"

"نہیں ماں! روپیہ نہیں چاہیئے۔ تم میرا کہا مانو گی؟ بولو!"

ماں نے محو حیرت ہو کر کہا "روپیہ نہ لے گا تو پھر اور کونسی بات ہے؟"

للت نے اُس کے بالکل نزدیک آکر چپکے چپکے کہا۔ "کشنو ماما کو تھوڑی دیر کے لئے ذرا ایک دفعہ آنے دو گی؟ کمرے کے اندر نہیں آئیگا۔ اس دروازہ کے پاس سے ایک نظر تم کو دیکھ کر ہی چلا جائیگا، کل باہر آکر بیٹھا رہا تھا، آج بھی بیٹھا ہوا ہے۔"

ہیما گنی جھٹ پٹ اُٹھ بیٹھی۔ بولی "جلدی جا للت! ابھی اُسے بلا لا... بیچارا بیٹھا ہوا ہے۔ تم لوگوں میں سے کسی نے آکر مجھ سے کہا کیوں نہیں؟"

"وہ تو ڈر کے مارے نہیں آتا" کہہ کر للت چلا گیا۔ کوئی ایک منٹ بعد کشنا کمرے کے اندر داخل ہوا وہ زمین پر نظر جمائے دیوار سے چپکا کھڑا رہا۔

ہیما نے بلایا "کشن بھیا! آؤ بیٹھو... مگر وہ ہلا تک نہیں، اسی طرح بت بنا کھڑا رہا۔ ہیما [illegible]

خود اُٹھکر قریب آئی، اور ہاتھ پکڑ کر بچھونے پر گھسیٹ لائی۔ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "ہاں رے کشنو! میں نے اُس دن تجھے پھٹکار دیا تھا، اسی لئے تو اپنی منجھلی دیدی کو شاید بھلا بیٹھا ہے۔ کیوں؟"

خلافِ اُمید کشنا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، ہیمانگنی کی حیرت کی انتہا نہ تھی۔ آج تک کبھی کسی نے اُسے روتے نہ دیکھا تھا۔ انتہائی تکلیف، حد سے زیادہ صدمہ ہونے پر بھی وہ اپنے آنسوؤں کی موتی سی آب کھونا نہیں چاہتا تھا۔ ہیمانگنی یہ بات جانتی تھی اسی سے اُس نے کہا "ہائیں! روتے کیوں ہو؟ آدمی کہیں رویا کرتے ہیں؛ مرد کو رونا نہ چاہیئے — سمجھے!"

اس کے جواب میں وہ موتی کا سر امنہ میں ٹھونس کر جی جان سے آنسوؤں کا سیلاب روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کشنو بولا "ڈاکٹر جو کہتا ہے کہ تمھارے سینہ میں سردی بیٹھ گئی ہے۔"

ہیمانگنی ہنسنے لگی۔ بولی :- "اسی لئے تم روتے ہو؟ چھی چھی! کیسا پاگل لڑکا ہے تو؟" کہنے کو تو وہ یہ کہہ گئی لیکن خود اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ دو بوندیں آنسو کی ٹپک پڑیں۔ بائیں ہاتھ سے آنسو پونچھکر کشنو کے سر پر ہاتھ رکھکر وہ تمسخرانہ انداز میں کہنے لگی "اگر سردی بیٹھ گئی، ڈاکٹر نے یہ کہہ بھی دیا تو کیا ہوا۔ جو میں مر ہی جاؤں تو تو اور للت دونو کندھے پر اُٹھا کر گنگا تک پہونچا آنا کیوں پہنچا آئیگا نا؟"

"کیوں منجھلی بہو آج کیسی ہو؟" کہتی ہوئی بڑی بہو کادمبنی اُسی وقت دروازہ کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ ایک ساعت کے لئے کشنو کی طرف تیز تیز نگاہوں سے دیکھکر اُس نے کہا "یہ لو! آپ یہاں پدھار رہے ہیں، اور یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے؟ منجھلی بہو کے آگے رو رو کر نخرے بگھارے جا رہے ہیں خوب! یہ مکار کیسے کیسے چھل جانتا ہے....."

ہیمانگنی تکان اور علالت کی کمزوری کے باعث ابھی ابھی تکیئے کے سہارے پڑ رہی تھی۔ اب یہ زہر کا گھونٹ پی کر تیر کی طرح سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور بولی۔ "دیدی! میں کئی دن سے بخار میں پڑی تڑپ رہی ہوں، تمھارے پاؤں پڑتی ہوں.... تم اب جاؤ!"

پہلے تو کادمبنی سٹپٹا گئی لیکن پھر کچھ سنبھل کر بولی "تم کو تو میں نے کچھ کہا نہیں منجھلی بہو! اپنے بھائی کو راہ پر لانے کے لئے سختی کرتی ہوں تو اس کے لئے تم اس طرح کیوں چھاتی ٹھوک کر سامنے ہو جاتی ہو، جیسے ماں ہی تو بیٹھو گی!"

"یہ بڑ زوریاں تو رات دن ہوا کرتی ہیں۔ گھر سے جا کر جی بھر کے اشاروں پر نچانا، یا دھول جھانا میرے سامنے اس سب کے کرنے کی ضرورت نہیں، اور نہ میں کرنے ہی دونگی۔

"کیوں، تم مجھے اپنے گھر سے گردن پکڑ کے، دھکے دیکر نکال باہر کرو گی کیا؟"

ہیمانگنی ہاتھ جوڑ کر بولی، "میرا جی نڈھال ہے، کچھ تو ترس کھاؤ، چُپ ہی رہو نہیں تو پدھار جاؤ! میں اپنے بھائی کو کچھ نہیں کہہ سکتی کیا؟"

"گھر لے جا کر جا ہے جو کہو سُنو، اس جگہ نہیں"

"یہ تو آج خوب اچھی طرح سے ہوگا ہی، یہ لگانے بجھانے کا دیکھنا کیا مزہ چکھاتی ہوں، بدذات، پاجی، حرام زادہ، چغل خور کہیں کا! میں نے کہا گائے کے گلے کی رسّی کھو گئی ہے کشنو تھوڑا سا سَن لے کر بٹ دے، تب تو کہنے لگا، نہیں دیدی! تمھارے پاؤں پڑتا ہوں... آج ذرا کٹھ پتلی کا ناچ دیکھ آؤں بھی تیرا کٹھ پتلی کا ناچ ہے؟ کیوں رے!....." اسی طرح بکتی جھکتی کادمبنی دھم دھم پاؤں پٹکتی چلی گئی۔

ہیمانگنی دیر تک پتھر کی مورت بنی بیٹھی رہی، پھر گُم سُم بستر پر پڑ کر بولی "کٹھ پتلی کا ناچ دیکھنے کیوں نہ گیا کشنو؟ وہاں چلا جاتا تو یہ بکھیڑا کیوں ہوتا۔ وہ لوگ جب تجھے یہاں آنے نہیں دیتے، تو تجھے آنا ہی نہ چاہیئے۔ اب کبھی میرے پاس نہ آنا... اچھا!"

کشن نے منھ تک نہ کھولا، اُٹھ کر آہستہ آہستہ وہاں سے چلا گیا، مگر پھر پیچھے پھر کر بولا "ہمارے گاؤں کی دشالاشی دیوی کی بڑی کرامات ہے دیدی...... اُن کی منت ماننے سے... پوجا بھینٹ چڑھانے سے سارے دُکھ درد دُور ہو جاتے ہیں۔ ان کی پوجا بول دو نہ دیدی!"

ابھی گھڑی بھر پہلے فضول کا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہونے سے ہیمانگنی کی طبیعت بہت مضمحل ہو گئی تھی۔ یہ قصّے قضیئے تو روزانہ کا معمول تھے، ہوا ہی کرتے تھے۔ یہ بدمزگی اس کے سبب سے نہ تھی، بلکہ اس کی وجہ تو اور ہی کچھ تھی۔ ایسا ایک دلچسپ بہانہ ہاتھ لگ جانے پر اس راندۂ تقدیر، نو عمر لڑکے کی کیسی دُرگت ہوگی، اسی فکر اور پریشانی کے عالم میں ہیمانگنی کا دل اندر ہی اندر دُکھ درد اور بے بس خفگی کی آگ سے جل اُٹھا۔ کشنو کے لوٹ آتے ہی ہیمانگنی اُٹھ بیٹھی اور اُسے پاس بٹھا کر جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے رو پڑی۔ پھر کچھ سنبھل کر بولی "میں جب اچھی ہو جاؤنگی تو تجھے چپکے سے پوجا چڑھا آنے کے لئے تیرے گاؤں بھیجدونگی۔ اکیلا جاسکے گا؟"

"بڑے مزے سے" انتہائی جوش اور آمادگی کے ساتھ آنکھیں پھاڑ کر کشنو نے کہا "تم آج ہی ایک روپیہ دیکر مجھے بھیج نہ دو؟ منجھلی دیدی! میں کل سویرے ہی چڑھاوا چڑھا کر پرساد لیتا آؤنگا، جس کے کھاتے ہی تم بالکل ٹھیک ہو جاؤگی۔ لاؤ دے نہ دو منجھلی دیدی! آج ہی بھیجدو مجھے"

ہیما نگنی نے دیکھا، اب ایک پل کا تامل بھی اس پر کس قدر گراں گزر رہا ہے، کسی طرح تاب ہی نہیں ہے۔ اگر ابھی اُڑ کر جا سکے تو کچھ اطمینان ہو۔ اُس نے کہا، "مگر کل جب تم لوٹ کر آؤ گے تو یہ لوگ مار پیٹ کر تمھاری ہڈی ہڈی چور کر دیں گے؟ یہ بھی سوچ لیا ہے!"

پٹنے کے ڈر سے اُس کی ہمت ٹوٹ گئی، مگر یہ عارضی خدشہ زلزلہ کی طرح فوراً سکون و سکوت کی آغوش میں روپوش ہو گیا، اور اُس نے بشاش چہرہ کے ساتھ کہا "ماریں گے تو بھی کچھ ہرج نہیں، جا ہیں کر لیں، تم تو اچھی ہو جاؤ گی۔"

پھر ہیما کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے، بولی "اچھا کشنا! میں تو تیری ناتے رشتے کی بھی کوئی نہیں ہوں، پھر تجھے میرا اتنا درد کیوں ہے؟"

کشن اس بیڈھب سوال کا جواب کیا دیتا؟ اگر دل چیر کر دکھایا جا سکتا تو وہ کتنی آسانی سے سمجھا سکتا۔ اس کا ستایا ہوا مجروح دل دن رات رو رو کر جس پیار کی پتلی ماں کو ڈھونڈھتا پھرتا ہے وہ اُسے ماں مل سکتی ہے؟ تھوڑی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھے منہ تکتے رہنے کے بعد کشن نے کہا "تمھاری بیاری جو نہیں جاتی، سینہ میں سردی جو بیٹھ گئی ہے۔"

اب کے ہیما نگنی نے کچھ مسکرا کر کہا "میرے سینے میں سردی بیٹھ گئی تو تجھے کیا؟ تو کیوں تڑپ رہا ہے؟"

کشنو نے متحیر ہو کر کہا "مجھے فکر نہ ہوگی؟ منجھلی دیدی! سینہ میں سردی کا بیٹھ جانا بہت برا ہوتا ہے۔ بیماری بڑھ گئی تو پھر؟"

"تو پھر تجھے بلا لوں گی.... لیکن بن بلائے اب کبھی نہ آنا!"

"کیوں دیدی!"

ہیما نے سختی کے ساتھ سر ہلا کر کہا "نہیں تجھے اب میں یہاں نہ آنے دونگی، تو تو مجھے چین سے مرنے بھی نہ دے گا، اب جو تو اس طرح چلا آیا تو میں بہت ناراض ہونگی۔"

کشنو نے ہیما کا منہ دیکھ کر ڈرتے ہوئے پوچھا "تو پھر بتا دو، کل سویرے کس وقت بلا بھیجو گی؟"

"کل ہی اور وہ بھی صبح کو.... پھر تجھے یہاں آنا چاہئیے؟ کیوں!"

کشن نے بددل ہو کر کہا "اچھا صبح نہیں.... دوپہر ہی کو سہی.. کیوں نہ منجھلی دیدی؟" اُس کے اُداس منہ اور جھکی ہوئی آنکھوں سے ایک ایسی حسرت بھری بےچین التجا کی جھلک پھوٹ نکلی کہ ہیما نگنی کا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر منہ کو آنے لگا۔ لیکن اب تو جیسے بھی ہو چھاتی پر پتھر رکھ کر کم از کم اوپر ہی سے سخت ہونا پڑے گا۔ کلیجہ کو کاٹے بغیر کام بھی تو نہیں چل سکتا۔ سب کے سب مل کر اس تنہا ننھی سی جان پر جو ختیاں

گئے ہیں کسی نہج کسی عنوان سے بھی اُن کی تعداد میں اضافہ ہونے دیتا ٹھیک نہیں۔ وہ اپنی بھاگی کے ہاتھوں شاید اس سے بھی زیادہ کڑیاں جھیل سکتا ہے۔ منجھلی دیدی کے پاس آتے جاتے رہنے کی پاداش میں سخت سے سخت سزا برداشت کرکے بھی اُس کا پاؤں پیچھے نہ ہٹے گا۔ لیکن ہیماگنی خود اپنی آنکھوں سے یہ ظلم، یہ جور، یہ اندھیر کیسے دیکھ سکے گی؟

ہیماگنی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ چلی، پھر بھی منہ پھیر کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی "دق نہ کر کشنا... جاہاں سے! بلانے پر ہی آنا۔ نہیں تو اچھا نہ ہوگا۔ جب دیکھو مجھے دق کرنے، ستانے کے لئے آبیٹھتا ہے، مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"نہیں! دق تو میں نے نہیں کیا، اور نہ کبھی کرونگا ہی" کہہ کر پھیکا منفعل منہ بنا کے فوراً سمٹ سمٹا کر کشن وہاں سے اُٹھ گیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد ہیماگنی کی آنکھوں سے آنسو جھرنوں سے بازی لگا کر بہنے لگے۔ اُس نے آنکھیں کھول کر.... بند کرکے اچھی طرح دیکھ لیا کہ اس بیکس و مجبور، یتیم و مظلوم بچے نے اپنی ماں کا آسرا کھو کر دوبارہ اسی کو ماں سمجھکر اپنا سہارا بنا لیا ہے، اس کے مایوسی و مجبوری... خوف وہراس سے اماں لینے والے دامن کا تھوڑا سا حصہ اپنے سر پر کھینچ لینے کے لئے کنگال کی طرح وہ کیا کیا نہیں کرتا پھرتا ہے؟

ہیما نے آنکھیں ڈھانک کر دل میں کہا "کشنو تو تو ایسا اُترا ہوا اُداس چہرہ لیکر چلا ہی گیا، لیکن یہ نہ جان سکا کہ تیری یہ منجھلی دیدی تجھ سے بھی زیادہ لاچار ہے، اس میں اتنی بھی جرأت نہیں کر وہ بیدردی سے تجھے کھینچکر اپنے سینہ سے لگا سکے۔"

(باقی آئندہ)

رباعیات گلشن

غم کھاتے ہیں ہم اور گزارا کیا ہے | تحریر ازل سے ہیں چارا کیا ہے
کتراتے ہیں تدبیر سے یہ کہہ کہہ کر | قسمت میں بھلا دخل ہمارا کیا ہے

تلخابۂ آلام بھی پینا ہوگا | مر مر کے بھی اس دہر میں جینا ہوگا
صد چاک بھی ہو اگر لباس ہستی | جینے کے لئے آہ سے بھی سینا ہوگا

ہر کام جفاکشی سے کرنا ہوگا | ہر جام کو زہراب سے بھرنا ہوگا
سچ کہتا ہوں سچ مانیئے اس کو گلشن | جینے کے لئے ...

سالِ گزشتہ

(از رادھا رمن سکسینہ شوق اٹاوی)

فضا خموش ہے عالم ہے محوِ لذّتِ خواب   فلک پہ دیدۂ حیراں ہیں انجمِ کمتاب
طلسمِ ابر میں ماہِ مبیں ہوا ہے اسیر   سکوں فزا ہے ہواؤں کا نغمۂ بم و زیر
فلک کی گود میں دریائے نور جاری ہے   فضائے دشت پہ موجِ سکوت طاری ہے
نہ شور شیں ہیں نہ ہنگامہ بزمِ عالم کا   مگر سکوت میں ہے اہتمام ماتم کا

کہیں پہ دُور وہ گھنٹا بجا دریغ دریغ
"تمام سالِ گزشتہ ہوا دریغ دریغ"

اُمید و یاس کی اِک داستاں تمام ہوئی   فلک کے مطلعِ روشن پہ گویا شام ہوئی
گرا زمین پہ تسبیحِ عمر کا دانا   ہوا شراب سے لبریز اور پیمانا

نظامِ ہستیٔ انساں ہے انقلاب پذیر
ہے ذرّہ ذرّہ میں اِک انقلاب کی تاثیر

کبھی ہے کیف و مسرت کبھی ہے سوز و گداز   نظر فریب ہیں ہستی کے یہ نشیب و فراز
سحر سے شام ہوئی شام سے سحر ہو گی   یوں ہی تمام تری عمرِ مختصر ہو گی

ہزاروں سال یوں ہی آخرش تمام ہوئے
ہزاروں روز اسیرِ طلسمِ شام ہوئے

رفتارِ زمانہ

۱۹۴۳ء کا سال ہر پہلو سے جنگ کے لئے فیصلہ کن ثابت ہوا۔ اس سال کے دوران میں اتحادیوں کا پلہ مستقل طور سے بھاری ہو گیا ہے اور محوری طاقتیں حملہ آور ہونے کی بجائے مدافعت پر مجبور ہو گئی ہیں۔ اب جنگ کے نتائج کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے، فقط وقت کا سوال ہے۔ اس اعتبار سے ۱۹۴۳ء کا سال در اصل انجام کا آغاز تھا۔

سال گذشتہ میں محوری شمالی افریقہ سے نکال باہر کئے گئے۔ مسولینی کے اقتدار کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا اور اٹلی اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گیا، اور اس طرح محوری طاقت کا ایک بازو ٹوٹ گیا۔ اتحادیوں کی ہوائی بمباری سے جرمنی کے جنگی کارخانوں اور ذرائع رسل و رسائل کو سخت دھکا لگا اور سول آبادی کے استقلال پر ضرب کاری پڑی۔ آبدوز کشتیوں کا خطرہ بہت کم ہو گیا اور اتحادی بحری بیڑے کو ہر محاذ میں فوقیت حاصل ہو گئی۔ ہندوستان و آسٹریلیا سے جاپانی حملہ کا خطرہ دور ہو گیا اور جاپان کی بڑھتی ہوئی فتوحات کا سلسلہ ختم ہو کر اس کو خشکی و تری میں پے در پے شکست ہو رہی ہے۔ ایک جزوی خطہ کے علاوہ روسیوں نے اپنی سرزمین سے جرمنوں کو مار بھگایا، اور پولینڈ کے اندر داخل ہو گئے۔ روسی محاذ پر جرمنی کو سپاہیوں اور جنگی سامان میں شدید نقصان پہونچا۔

ہندوستان کے اندر بنگال واڑیسہ وغیرہ میں لاکھوں جانیں قحط و امراض کی شکار ہوئیں اور اسی سلسلہ میں خوراک کے مسئلہ میں وہ بے انتظامی دیکھنے میں آئی جس کی نظیر موجودہ زمانہ میں مشکل سے ملیگی۔ سیاسی جمود بدستور قائم رہا، اور نئے وائسرائے کی آمد سے جو توقعات وابستہ تھیں ان سب پر اوس پڑ گئی۔

اس سال طہران میں پریسیڈنٹ روزویلٹ، مسٹر چرچل اور اسٹالن کی پہلی مشترکہ کانفرنس ہوئی اور اسی طرح قاہرہ میں مارشل چانگ کائی شیک، مسٹر چرچل اور پریسیڈنٹ روزویلٹ کے درمیان اہم مشورہ ہوا۔ قاہرہ میں ترکی کے پریسیڈنٹ، مسٹر چرچل اور مسٹر روزویلٹ کے درمیان تبادلۂ خیال ہوا۔

غرضکہ ہر طریقہ سے گذشتہ سال اتحادیوں کے لئے مبارک ثابت ہوا، اور انکی بحری و ہوائی قوت میں کثیر اضافہ ہوا۔ اس کے مقابلہ میں انکے نقصانات بہت کم اور جرمنی کے نقصانات شدید ہوئے۔

اب ذیل میں گذشتہ ماہ کے واقعات پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

روس روس کے محاذ پر گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے، روسی اس کوشش میں ہیں کہ ایک طرف جرمنوں کے سلسلۂ مواصلات کو توڑ دیا جائے اور دوسری طرف دریائے نیپر کے موڑ میں جرمن فوجوں کو گھیر لیا جائے۔ لیکن جرمن جنرل فان مانسٹین نے اب تک اپنی فوجوں کو کئی مرتبہ گھر جانے سے بچا لیا ہے۔ اگرچہ جان و مال کا شدید نقصان اٹھایا ہے۔ جرمن جنرل کو بھی دو فکریں لاحق ہیں۔ ایک تو اپنے سلسلۂ مواصلات کو قائم رکھنا اور دوسرے اپنی فوجوں کو گھر جانے سے بچانا۔ اگر جرمنوں کا سلسلۂ تعلقات منقطع ہو جائے تو ایک طرف تو جرمن فوجوں کو مدد اور سامان نہیں پہونچ سکے گا اور دوسری طرف فوجوں کے بچ کر نکل جانے کا راستہ کٹ جائیگا۔ چنانچہ اب تک یہ ہوتا رہا ہے کہ ضرورت کے وقت جنرل مانسٹین نے مغربی یوکرین سے کہیں کہیں اپنی فوجیں ہٹا لیں لیکن سڑکوں اور ریلوے لائنوں پر بدستور اپنا قبضہ رکھا لیکن اب سلسلۂ مواصلات اس کے ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔ پولینڈ اور جرمنی سے نیپر کے موڑ تک دو ریلوے لائنیں جاتی ہیں ان میں سے ایک لائن روسیوں نے کئی جگہ نزاتیتن، فستاف، بالطا، زرکوف اور بردیشف میں کاٹ دی ہے اور یہ لائنیں جو کیف، چرکسی، کرمنچگ، نیپر و پیٹرووسک اور زاپورزہ کو جاتی ہیں۔ ان پر روسیوں کا مکمل قبضہ ہو گیا ہے، اور نکوپول و نکولائیف پر جرنل کونیف کا دباؤ پڑ رہا ہے، اور دوسری ریلوے لائن بھی جو پولینڈ کے شہر لواؤ سے چلکر تارناپول سے گذرتی ہے سرحد پولینڈ کو پار کرتی ہے اور وہاں سے اوڈیسہ کو چلی جاتی ہے۔ سخت خطرہ میں پڑ گئی ہے۔ کیونکہ روسی جنرل واتوتین بردیشف سے جانب جنوب بڑھ رہے ہیں کہ زمیرنکا پر دباؤ ڈالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت جرمن جنرل فان مانسٹین دریائے برگ کے بالائی علاقہ میں اپنی فوجوں کی جدید تنظیم عمل میں لا رہا ہے، تاکہ دنتسرہ اور زمیرنکا کی طرف چلنے سے روسی فوجوں کو روکے۔ لیکن جنرل [illegible]

انہوا اور روسی فوجیں جرمن صفوں کو توڑتی ہوئی پولینڈ میں داخل ہوگئیں، اور روالگشنو، سارنائی وغیرہ کئی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ جنوبی یوکرین میں روسی فوجوں نے کریوائی گراڈ کو فتح کر لیا ہے، اور کریمیا میں کرچ کے قریب اپنی تازہ دم فوجیں اتار دی ہیں۔ نیپرو گراڈ کے محاذ پر بھی روسیوں کو شاندار کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں، انھوں نے جرمن مورچوں کو توڑ دیا ہے اور آگے بڑھتی چلی جارہی ہیں۔ جرمنوں نے شہر نوو گراڈ خالی کر دیا ہے۔ شمال کی طرف روسیوں نے کراسنوئیہ اور پلیر ہوف فتح کر لئے ہیں غرض جرمن فوجیں روس میں ہر طرف پیچھے ہٹتی چلی جارہی ہیں۔

اٹلی اٹلی میں اتحادیوں کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ کسی طرح اٹلی کے پایہ تخت روما تک پہونچ جائیں، لیکن دشمن راستہ روکے ہوئے ہے۔ اثنائے راہ میں سب سے بڑا مورچہ کاسینو کا ہے جس کی حفاظت کے لئے ولتا فرد کے مغرب سے روکا کے مشرق تک جرمن مورچے قائم ہیں، اور پانچویں اتحادی فوج انھیں مورچوں کو رفتہ رفتہ سر کرتی آگے بڑھ رہی ہے۔ اس محاذ پر پانچویں فوج نے سان ویطرو پر قبضہ کرنے کے بعد مزید پیش قدمی کی اور سان گسطو نامی پہاڑی گاؤں پر قبضہ کر لیا۔ کوہستان ایپی نائن کی مشرقی بلندیوں میں اتحادی فوجیں سروآرو تک پہونچ گئی ہیں، اور انھوں نے حملہ کرکے ماجو نامی پہاڑی پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے سروآرو اور دیگوموکے درمیان بہت گہرا شگاف ڈال دیا ہے۔ پورشیہ، لاچیا پیٹہ، کالیتہ ویکیو اور دی میرتی نامی پہاڑیوں پر پانچویں فوج نے قبضہ کر لیا ہے۔ مغرب کی طرف برطانوی فوج نے دریائے پیسیہ کو عبور کرکے اپنی پوزیشن مستحکم کرلی ہے، اور آگے بڑھ کر دریائے گاریگلیانو کو بھی کئی جگہ پار کر لیا ہے۔ اس کے بعد جو خبریں موصول ہوئی ہیں اُن میں بیان کیا گیا ہے کہ جرمنوں کے شدید جوابی حملوں کے باعث آٹھویں برطانوی فوج کے کچھ دستوں کو اورتونہ کے مغرب میں پیچھے ہٹنا پڑا ہے۔ یہ دستے کناڈا کی فوج کے تھے۔ اس وقت اتحادی فوجوں کی منازل مقصود دو ہیں۔ ایک لسقرہ اور دوسری کاسینو۔ جب یہ دونوں مقامات قبضہ میں آجائیں گے تو روما کی طرف تیزی سے بڑھنے کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔ بایں ہمہ جرمن اس قدر شدید مزاحمت کر رہے ہیں کہ بقول جنرل ولسن اتحادی فوجیں کہیں فصل بہار میں روما کی زیارت کر سکیں گی۔ گویا ابھی اس کے لئے کئی مہینہ جدوجہد کرنی پڑیگی۔ بعد کی خبر سے معلوم ہوا ہے کہ اتحادیوں نے روما کے تیس میل جنوب میں فوجیں اتاردی ہیں اور نٹونو کے بندرگاہ پر قبضہ کر لیا ہے یہ فوجیں سمندر کے راستہ بحری بیڑہ کی مدد سے اُتاری گئی ہیں اور ان کو مزید کمک پہونچائی جارہی ہے شاید اب روما پر جلد قبضہ ہو سکے گا۔

بلقان ریاستہائے بلقان میں روسی فوجوں کی فتوحات اور پیش قدمیوں کے باعث حد درجہ بے چینی پیدا ہو رہی ہے اتحادی ہوائی جہازوں کے متواتر سخت حملوں سے مجبور ہو کر بلغاریہ نے اپنا پایہ تخت سول آبادی سے خالی کرا دیا ہے۔ بلقان سے غیر جانبدار قوم کے جو لوگ واپس آئے ہیں، ان کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اٹلی کی طرح بلغاریہ۔ رومانیہ۔ اور ہنگری بھی جرمنوں سے تنگ آگئے ہیں، اور روسیوں کی بے پناہ کامیابیوں سے بیحد خوف زدہ ہو رہے ہیں، اگر اتحادیوں کی طرف سے ذرا سا بھی اشارہ ہو جائے تو بلقان کی ریاستیں فوراً جداگانہ صلح کرنے پر آمادہ ہو جائیں گی۔

یوگوسلاویہ کے محبان وطن جرمنوں کا سخت مقابلہ کر رہے ہیں۔ بوسینہ اور دیگر علاقوں میں گھمسان کی لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ یونان میں بھی بغاوت کے آثار نمایاں ہو چلے ہیں۔ امید ہے کہ یہاں بھی بہت جلد آگ بھڑک جائیگی۔ اتحادیوں کی طرف سے یوگوسلاویہ و یونان کے محبان وطن کو کافی مدد دی جارہی ہے۔

ٹرکی کی سیاسیات خارجیہ میں بھی کچھ تبدیلی رونما ہونے والی ہے۔ کیونکہ اب مارشل فوزی چقماق جو ٹرکی کے چیف آف جنرل اسٹاف تھے اور ٹرکی کی شرکت جنگ کے مخالف تھے ریٹائر ہو گئے ہیں، اُن کے جانشین جنرل اورب ہوئے ہیں جو اتحادیوں کی طرف مائل ہیں۔ اس کے علاوہ بعض باخبر حلقوں کا بھی یہ خیال ہے کہ عصمت انونو موجودہ وزیر جنگ جنرل علی رضا کی جگہ دوسرا وزیر جنگ مقرر کرنے والے ہیں بہر حال قرائن سے پایا جاتا ہے کہ کچھ دن بعد ٹرکی بھی جرمنی کے خلاف جنگ میں کود پڑیگا۔ جرمنی میں جو ترک طلبا تعلیم حاصل کرنے گئے ہوئے تھے انھیں سوئزرلینڈ چلے جانے کا حکم دیدیا گیا ہے۔

روس و پولینڈ روسی فوجیں پیش قدمی کرتی ہوئی پولینڈ میں داخل ہونے ہی کو تھیں کہ لندن کی پولش گورنمنٹ کے دل میں تشویش عظیم پیدا ہوئی اور یہ سوال اُٹھایا جانے لگا کہ آیا روس پولینڈ میں بحیثیت نجات دہندہ داخل ہو رہا ہے یا

بحیثیت مجموعی یعنی جس قدر پولینڈ پر روسی فوجیں قبضہ کر چکی وہ جنگ کے بعد حکومت پولینڈ کو واپس دیدیا جائیگا یا اسے روس اپنے قبضہ میں رکھے گا۔ واقعہ دراصل یہ ہے کہ پولینڈ کے جس حصے کی نسبت یہ جھگڑا ہے وہ دراصل پہلے روس ہی کا حصہ تھا جسے پولینڈ کے جنرل مارشل پلسوڈسکی نے سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۲۱ء میں حملہ کر کے روس سے چھین لیا تھا اور فرانس و برطانیہ نے روس کے خلاف پولینڈ کی مدد کی تھی۔ چنانچہ روس کی طرف سے پولینڈ کو جواب دیا گیا کہ پولینڈ کا وہ حصہ جو سنہ ۱۹۲۱ء کی کرزن لائن کے مشرق میں واقع ہے چونکہ روسیوں کے غلبۂ اکثریت کے باعث روسی ہے اس لئے اسے روس اپنے قبضہ میں رکھے گا۔ باقی رقبہ پولینڈ کو واپس کر دیا جائیگا۔ اس کے علاوہ اگر اتحادیوں نے چاہا تو جرمنوں سے مشرقی پروشیا کا علاقہ چھین کر بھی پولینڈ کو دیدیا جائیگا۔ علاوہ بریں اگر پولینڈ نے روس کے ساتھ عمدہ تعلقات ہمسائگی قائم رکھے تو شہر ولنا کی واپسی کے لئے بھی گفت و شنید کی جاسکیگی۔ لیکن شہر ولنا بہرصورت لتھوینیا میں شامل رہیگا۔ اس کے جواب میں پولینڈ کی حکومت نے لندن سے یہ بیان دیا کہ برطانیہ و امریکہ کو ثالث بنا کر روس و پولینڈ کے معاملات طے کئے جائیں۔ اس تجویز کو روسی حکومت نے ٹھکرا دیا۔ اور یہ جواب دیدیا کہ روس ایسی حکومت سے کوئی بات چیت نہیں کر سکتا جس سے اس کے سیاسی تعلقات منقطع ہیں۔ اگر روس نے گفت و شنید شروع کی تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ روس نے لندن کی پولستانی گورنمنٹ کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ اب افسوس اس امر کا ہے کہ یہ جھگڑا ایسے وقت میں اُٹھایا گیا ہے جبکہ لڑائی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اگر فتح کے بعد اُٹھایا جاتا تو چنداں فکر کی بات نہ تھی لیکن اب تو اس جھگڑے کی وجہ سے اتحادیوں میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ یہ بات دنیا جانتی ہے کہ فرانس و برطانیہ نے جرمنی کے خلاف محض پولینڈ کو بچانے کی غرض سے اعلان جنگ کیا تھا۔ فرانس تو اس وقت بساط شطرنج پر ایک پٹے ہوئے مہرہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا لیکن برطانیہ موجود ہے جس نے پولینڈ کی آزادی و خودمختاری اور شیرازہ بندی کی گارنٹی کی تھی۔ اب اگر روس نے مشرقی پولینڈ کا الحاق کر لیا تو کیا برطانیہ روس کے خلاف اعلان جنگ کریگا۔ غالباً نہیں کیونکہ اس وقت برطانیہ روس سے بگاڑ نہیں کر سکتا ہے۔ اس لئے امید یہی ہے کہ یہ مرحلہ باہمی گفت و شنید سے طے کیا جائیگا۔ امریکہ میں رائے عامہ پولینڈ کے حق میں ہے۔ روسی اخبارات نے اسے محسوس کر کے بطور پیش بندی سٹر وینڈل ولکی پر سخت و بیجا نکتہ چینی کی ہے جس سے امریکن حلقوں میں حیرت و استعجاب پیدا ہو گیا ہے۔ روسی اخبار پرودا نے یہ خبر بھی مشہور کی ہے کہ قاہرہ میں برطانوی و امریکن نمائندوں نے فان ربن ٹراپ وزیر خارجہ جرمنی سے گفت و شنید کی مگر اس خبر کی کوئی اصلیت نہیں ہے اور کسی مصلحت سے یہ جھوٹی خبر بغرض پیش بندی گھڑی گئی ہے۔

برما اتحادیوں نے جنوب مشرقی ایشیا کی کمانڈ جداگانہ قائم کر کے لارڈ لوئس ماؤنٹ بیٹن کے سپرد کر دی ہے جن کا صدر مقام فی الحال ہندوستان میں ہے وہ سرحد برما کا دورہ کر چکے ہیں۔ اراکان کی سرحد پر جاپانی و برطانوی فوجی دستوں کی جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں پچھلے دنوں برطانوی فوجوں نے حملہ کر کے جاپانیوں سے مانگڈو اور دو دیگر دیہات چھین لئے تھے۔ ابھی تک جھڑپیں جاری ہیں لیکن اتحادیوں کی طرف سے ہوائی سرگرمیاں زیادہ دکھائی جا رہی ہیں۔ جاپانی ہوائی جہاز بھی ہندوستان کے مختلف سرحدی مقامات پر آ کر حملے کرتے رہتے ہیں۔ چاٹگام کو زیادہ نشانہ بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں بندرگاہ وزیگاپٹم پر بھی گرائے گئے تھے جس سے کچھ نقصان نہیں پہنچا۔ برما کے جاپانی ٹھکانوں پر اتحادی ہوائی جہازوں کے مسلسل حملے ہوتے رہتے ہیں اور سخت نقصان پہنچایا جاتا ہے۔

چین ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چین میں لڑائی سرد پڑ گئی ہے کیونکہ وہاں سے لڑائیوں کی خبریں بہت کم آتی ہیں۔ تازہ ترین اطلاع سے معلوم ہوا ہے کہ جاپانیوں نے شنگھائی کے مستقر سے جو نانکنگ اور ہانگ کو کے درمیان واقع ہے وادی دریائے یانگسی میں جو نانکنگ کے اوپر دریائے یانگسی کے جنوبی کناروں پر ہے نیا حملہ شروع کر رکھا ہے۔ جاپانی فوجوں نے تین مرتبہ پے در پے حملے کر کے شہر چانگ تہ کو فتح کر لیا ہے جس پر اب چینی فوجیں جوابی حملے کر رہی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب سے چین کے تعلقات بیرونی دنیا سے منقطع ہوئے ہیں اس وقت سے چین کو کافی مدد نہیں پہنچتی۔ جو کچھ بھی مدد مل رہی ہے وہ ہندوستان سے برطانیہ و امریکہ بذریعہ ہوائی جہازوں کے بھیج رہے ہیں لیکن یہ ناکافی ہے۔

بحرالکاہل جنوب مغربی بحرالکاہل کے جزیروں میں جاپانیوں سے خشکی کی لڑائیاں بہت کم مگر بحری اور ہوائی لڑائیاں زیادہ ہو رہی ہیں جن میں جاپانیوں کو کافی نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ خشکی کی لڑائیوں کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ اتحادی فوجیں

اور نیو برٹین میں ترقی کر رہی ہیں لیکن جزیرہ نیو گنی میں جہاں اتحادی فوجیں بونا و رابول کی طرف پیش قدمی کر رہی تھیں
بہت کوئی تازہ اطلاع نہیں آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اتحادی ہائی کمانڈ جزیروں کے اندرونی علاقوں میں صرف اتنی
قدمی کافی سمجھتا ہے جتنی کہ قدم جمانے اور ہوائی و بحری اڈے بنانے کے لئے ضروری ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ
میک آرتھر کے لئے فقط نیو گنی میں غلبہ حاصل کر لینا کافی ہے۔ اگر وہ سالامانگ و ویواک کے جاپانی اڈوں پر قبضہ نہیں کر سکے
تو بھی۔ انہیں نیو برٹین انتہائی مغربی حصہ پر جب غلبہ حاصل ہے یعنی خلیج بودجن آدہ اور گاسماتا ان کے قبضہ میں ہیں تو پھر رابول
کی جانب مشرق بڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جو گینڈ ٹال میں خلیج آگستا کے مشرق اور جنوب میں جنرل میک آرتھر
کے پاس بہت اچھے اڈے ہیں جہاں سے وہ رابول پر شدید حملے کر سکتے ہیں۔ اگر رابول جاپانیوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو پھر انہیں
سو میل جانب شمال جزائر کیرولائن میں پناہ مل سکیگی۔

ہندوستان سال آخر میں ہندوستان کی تین سیاسی جماعتوں کے سالانہ اجلاس ہوئے۔ نیشنل لبرل فیڈریشن کا جو اجلاس
بمبئی میں منعقد ہوا جسکے صدر سر مہاراج سنگھ تھے۔ سر مہاراج سنگھ نے اپنے تقریر کے دوران میں لبرل کی ایک نئی تشریح کی بقول انکے ہر
ہندوستانی جو سیاسی طور سے بیدار ہے اور موجودہ کانگریس، ہندو مہاسبھا یا مسلم لیگ سے تعلق نہیں رکھتا ہے لبرل ہے خواہ وہ اس سے
بھی کیوں نہ ہو۔ اس نئی تشریح کا ایک فائدہ تو ضرور ہے کہ کانگریس مسلم لیگ و ہندو مہاسبھا کی ہار کامیابی لبرل جماعت کی کامیابی قرار
دی جا سکتی ہے چنانچہ انگریزی کے روزنامہ ٹائمس آف انڈیا نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ موجودہ لبرلزم میں پولیٹیکل سرکشی کا کوئی موقع نہیں ہے
نہ ہی اس جماعت کے افراد کو اعتدال یا افراط کی تلقین دینے کی کوئی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علاوہ گورنمنٹ کی شکایت کے لبرل
لیڈروں کا نقطۂ سخن کانگریس مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا کی جانب رہتا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ انکی آواز متفقہ نہیں ہے۔ سر مہاراج سنگھ نے
کانگریس لیڈروں کی غیر مشروط رہائی کا مطالبہ کیا اور اس پر زور دیا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کو اپنے اختلافات بالائے طاق رکھکر مرکزی گورنمنٹ کے
کے خلاف احتجاج کرنا چاہیئے لیکن استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین سر کاؤس جی جہانگیر نے اپنی تقریر میں کہا کہ جنگی مساعی کی بنا پر کل ملک کو
متحد ہو جانا چاہیئے لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ حالات میں اسکا امکان نظر نہیں آتا ہے۔ ہندوستان کے حالات چین، روس
برطانیہ اور امریکہ سب سے مختلف ہیں۔ ان ممالک کے لئے یہ جنگ جنگ آزادی ہے۔ ہندوستان تو اٹلانٹک چارٹر کے اطلاق سے بھی خارج کر دیا گیا ہے
سر کاؤس جی جہانگیر نے دوران تقریر میں کرپس مشن کا ذکر کرتے ہوئے اسکو قطعی نظر انداز کر دیا کہ جدید انکشافات سے یہ بخوبی ثابت ہو گیا ہے
کہ کرپس مشن کی ناکامیابی کی وجہ خود سر اسٹیفورڈ کرپس تھے۔ سر کاؤس جی نے کانگریس پر اتہامات لگانے کے بعد یہ کہا کہ خیر ہو گزشتہ را صلوٰۃ
اصول پر کاربند ہونا چاہیئے۔ انکی تقریر کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ کانگریس کے تمام لیڈر جو انکو جواب دے سکتے تھے اسوقت جیل میں ہیں
سر کاؤس جی کی تقریر جو اسٹیفورڈ کرپس کی پیشکش قبول کرنیکے حق میں تھی اس سے انکی جماعت کے سیاسی نکتۂ نظر کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے
در اصل یہ ہے کہ لبرل پالیسی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ برطانیہ کی پیشکش منظور کی جائے خواہ وہ کتنی ہی ناکافی کیوں نہ ہو۔ لبرل پارٹی نے کبھی اپنے
نظریہ نہیں ڈالی۔ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس کراچی میں بڑی شان و شوکت سے منایا گیا۔ مسٹر جناح کی صدارتی تقریر میں کانگریس اور گورنمنٹ
نکتہ چینی کے علاوہ کوئی نئی بات نہ تھی البتہ پاکستان کا اعادہ کیا گیا۔ معزز معاصر سوشل ریفارمر کی رائے میں خوراک و ڈیفنس کے مسئلے
نے پاکستان کی اسکیم کو ناقابل عمل قرار دے دیا ہے۔ آج ہر ایک عام طور سے اس پر متفق ہے کہ خوراک کا مسئلہ کل ملک کو ایک یونٹ قرار دیکر ہی حل کیا جا سکتا ہے
اسی طرح ملک کی حفاظت کا انتظام اسکو ناقابل تقسیم سمجھکر ہی ہو سکتا ہے۔ شاید برٹش گورنمنٹ پاکستان کے مطالبہ کو قبول کر لیتی لیکن
حالات مطالبہ کو ایسا کرنے سے روکتے ہیں۔ چنانچہ قاہرہ اور طہران میں اتحادیوں کی جو اہم کانفرنسیں ہوئیں وہ انہیں واقعات کا آئینہ تھیں
مسٹر سید چیرمین استقبالیہ کمیٹی نے اپنی تقریر میں کہا کہ اصل ہند اور سند دو علیحدہ علیحدہ ملک تھے اور سندھ کے حدود جو بجز پاکستان
کے حدود تھیں سیاسی چالبازیوں سے سندھ کے حدود میں کمی واقع ہو گئی اور پاکستان کا مطالبہ بجز اسکے اور کچھ نہیں ہے کہ سندھ
کے اصلی حدود پھر سے قائم کئے جائیں۔ بقول سوشل ریفارمر مسٹر سید کا دعویٰ نہ فقط غلط بلکہ [illegible] کے ابتدائی اصول کی عدم واقفیت پر مبنی ہے
در اصل سندھ اور ہند ایک ہی لفظ ہیں۔ سندھ سنسکرت کا لفظ ہے جو [illegible] میں ہند ہو گیا ہے کیونکہ سنسکرت کے "س" نے "ہ" کی شکل
اختیار کر لی ہے۔ ہندو مہاسبھا کا اجلاس مسٹر شیاما پرشاد مکرجی کی صدارت میں امرتسر میں ہوا۔ صدارتی جلوس کے [illegible]
[illegible] والنٹیر [illegible] خالی [illegible]



معجون شباب آور چند خاص جوہروں اور مشک عنبر اور موتیوں کا ایک سائنٹی فک مرکب ہو جسے جدید تحقیقات کی روشنی میں جدید ترین مشینری سے تیار کیا گیا ہے۔ یہ دل و دماغ اور اعصاب کو قوت پہنچا کر قوتِ باہ بے انتہا پیدا کرتا ہے اور اسکی حفاظت کرتا ہو۔ بیس دن کا استعمال ناامیدیوں اور مایوسیوں کا یقینی طور پر خاتمہ کر دیتا ہے۔ شادی سے نہ گھبرائیے۔ آج ہی سے معجون شباب آور کا استعمال شروع کر دیجیے۔

ہمدرد دواخانہ، لال کنواں، دہلی

نوٹ:۔ مقامی حضرات ہمارے ایجنٹ چورا مول گنج نئی سڑک سے دوائیں طلب فرمائیں۔

زمانہ

جلد ۷۸ — فروری سنہ ۱۹۴۲ء — نمبر ۲

شمالی ہند کی موسیقی

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی، بی۔اے۔ ایل ایل۔بی۔ وکیل)

ہندوؤں کے تمام علوم و فنون کی طرح موسیقی بھی مذہبی پس منظر سے مستثنیٰ نہیں ہے سنگیت (موسیقی) دراصل گیت، سور یا لحن اور نرتیہ یا رقص کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس کے آغاز کی کہانی اساطیر قدیمہ کے پردے میں مستور ہے۔ روایت ہے کہ برہما کے پانچ شاگردوں میں سے ایک بھرت مُنی بھی تھے جنھوں نے اُن سے اس فن لطیف کی تحصیل و تکمیل کر کے اپسراؤں (مقدس رقاصاؤں) اور گندھرو وں (مقدس مغنیوں) کو اس کی موشگافیوں سے روشناس کیا اور یہی گندھرو اور اپسرائیں بنٹ راج شِو کے روبرو ان کی پسندیدگی کی سند حاصل کرنے کے لئے اپنے فنی کمالات کا اظہار کرتے رہے۔ ایک قصہ یہ بھی ہے کہ مہادیو نے اپنے برہما، وشنو، رُودر، مہیشور، اور سدا شِو، ان پانچ چہروں سے پانچ دُھنیں نکالیں۔ اور بقیہ دو کی ابتدا اُن کی رفیقۂ حیات اُما سے ہوئی۔ اس طور سے بھی بنیادی راگوں کا موجد شِو ہی کو مانا گیا ہے۔

آریہ قوم کے وہ بزرگ جنھوں نے ویدوں کے راگ گائے پنجاب کے ساکن تھے۔ ان کے وہ اولین مذہبی گیت جو صفحۂ قرطاس کی زینت ہیں، تین مختلف دُھنوں میں گائے جاتے ہیں۔ رگ وید کے منتر، تو نے شروع اور رسوم کی تفاصیل ہنوز اپنے اُسی قدیم لب و لہجہ کے ساتھ مروّج ہیں۔ ویدوں کے بعد برہمنوں اور اُپنشدوں کا نمبر آتا ہے۔ یہ سب بھی گانے ہی کے لئے مخصوص ہیں لیکن وہ اپنے زمانۂ تصنیف و تالیف میں کن راگ راگنیوں میں گائے جاتے تھے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں۔

راماین اور مہابھارت جیسی طویل نظمیں بھی گائی جاتی تھیں۔ ان دونوں نظموں میں جگہ جگہ موسیقی کا ذکر موجود ہے۔ ان حوالوں کی موجودگی کی بنا پر استدلال کیا جاتا ہے کہ ان کے عہد تصنیف سے پہلے علم موسیقی اپنے عروج و ارتقاء کی دشوار گذار منازل طے کر کے معراج کمال کو پہونچ چکا تھا۔ ولیم ہنٹر اپنی "دی انڈین امپائر" نامی تصنیف میں رقمطراز ہے کہ پانتی کے عہد (۳۵۰ ق م) سے پہلے حلبہ راگ راگنیوں کی سرلیپی یا صوتی تقطیع کے قاعدے وضع ہو چکے تھے۔ اور تمام راگوں کے نام اُن کے ابتدائی حروف کے تحت تجویز ہو چکے تھے۔

موسیقی کی کتابوں میں اس کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں۔ ایک مارگی اور دوسری دیشی، مارگی دیوتاؤں سے متعلق ہے اور دیشی ادنیٰ طبقہ سے۔ کہا جاتا ہے کہ راجہ رامچندر جی کے لڑکوں لو اور کش نے اشومیدھ یگیہ میں والمیک کی ساری رامائن مارگی طرز میں گائی تھی۔

سام وید کے زیادہ تر منتر رگوید کے نویں باب سے ماخوذ ہیں اور قربانی کے وقت گائے جانے کے لئے مخصوص ہیں۔ سام سوتروں میں ویدوں کے گانے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ لیکن انتہائی تلاش و تحقیق کے باوجود ابھی تک اس کا صحیح وقوف حاصل نہ ہو سکا ہے۔ صرف ویدوں ہی پر کیا منحصر ہے ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ راگ راگنیاں کس طرح الاپی جاتی ہیں، جن کے گانے کے قاعدے مابعد کی ان تصانیف میں مذکور ہیں جن کا موضوع ہی موسیقی ہے۔

وہ مخصوص گانے جو صدیوں سے عام ہیں دُھرپد، ہوری، دھمار، خیال، ترانہ، ٹھمری، قوالی، ٹھپہ اور غزل ہیں۔ بھرت ناٹیہ شاستر میں جو غالباً دوسری صدی عیسوی کی تصنیف ہے۔ مارگی سنگیت کا تذکرہ موجود ہے اور گیت گانے کے قواعد بھی مندرج ہیں۔ گیت، چھند، جگل بند، پربندھ اور دھرو یہ نام بہت سے پرانے دھرپد گیتوں میں بھی ملتے ہیں۔ تیرھویں صدی عیسوی کی تصنیف سنگیت رتناکر میں بھی پربندھ نامی صنف و وضع کا ذکر آیا ہے۔

بعض اہل الرائے کے نزدیک دُھرپد کا موجد راجہ مان والی گوالیار (۱۴۸۶ء تا ۱۵۱۶ء) ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ دھرپد اور دھمار اس سے بہت پہلے سے رائج تھے۔ جیسا کہ پیشتر کہا جا چکا ہے۔ دھرپد کی گیت کی طرز بھرت ناٹیہ میں موجود ہے۔ دھرپد کی چھند نامی طرز میں چھند ہمیشہ غالب رہتا تھا۔ اور پربندھ میں تال کو خصوصیت حاصل تھی۔ اس وضع کا مقلد کئی کئی تالوں کا استعمال کر سکتا تھا۔ جگل بند ایک طرح کا کورس ہوتا تھا۔ جیسے دو آدمی ملکر گاتے تھے۔ ایک کے منھ سے بول نکلتے تھے اور دوسرا تان لیتا تھا۔ دھرو دھرپد کی ایک ایسی قسم تھی جس میں راگ موضوع چھند اور تال سب کو مساوی درجہ حاصل تھا۔

دھرپد اور دھمار علاء الدین خلجی کے عہد میں بھی رائج تھے۔ نائیک گوپال، امیر خسرو، نائیک بجو باورے اور

دیگر اہلِ کمال اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ ان کے تمام گانے دُھرپد ہی میں لکھے گئے ہیں۔ امیر خسرو کے ایک گانے کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے " چلو سب خواجہ سنگ کھیلیئے دھمار " دھمار ہولی یا بہار کے موسم کی چیز ہے۔ دھمار ہی کے بولوں کو ہوری کہتے ہیں۔ امیر خسرو کے مذکورہ الفاظ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دھمار اور ہوری ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اُن دنوں میں اور تان سین کے وقت تک دُھرپد شدھ بانی یا صحیح بولی سمجھا جاتا تھا۔ دُھرپد یا دُھروپد راگ کی ہر سطر دُھرو تارے کی طرح مستقل مانی جاتی تھی، اور اُس کے گانے میں یکسانی برتی جاتی تھی۔ اس میں کہیں اُتار چڑھاؤ یا ایزاد و اخراج کی گنجائش نہ تھی۔

دُھرپد کے بولوں کے چار ارکان ہوتے تھے جو موسیقی کی اصطلاح میں تک کہلاتے تھے۔ اُن کے نام یہ ہیں (۱) استھائی (۲) انترا (۳) آبھوگ، اور (۴) سنچے۔ دُھرپدیہ یا دھرپد گانیوالا پہلے الاپ شروع کرتا تھا۔ اور تا نا دری وغیرہ مُہمل الفاظ سے راگ کی صوتی تشکیل کرتا تھا۔

قدیم اہلِ فن پیشہ ور گویّے نہ تھے۔ بلکہ اُن کے لئے اکتسابِ فن بمنزلہ عبادت و ریاضت تھا۔ گیتا میں خود کرشن جی کا ارشاد ہے کہ " نہ مَیں جنّت میں ہوں، اور نہ کسی زاہد خشک کے دل میں۔ میں صرف اُنھیں کے دلوں میں رہتا ہوں جو میرے راگ گاتے ہیں۔ اور مَیں ویدوں میں سام یا مجسّم موسیقی ہوں "۔

الاپ میں جو الفاظ مستعمل تھے وہ یہ ہیں:۔ تو اَم اَننت ہَری (یعنی اے خدا تو لافانی اور لازوال ہے) چنانچہ نی ستے۔ رے۔ ری۔ نی۔ نا۔ توم۔ انھیں کے مخفف ہیں، اور ایک باقاعدہ سلسلے کے ساتھ منھ سے نکالے جاتے ہیں۔ دُھرپد کی طرح الاپ کے بھی وہی مذکورہ بالا چار ٹکڑے ہوتے ہیں، راگ الاپ کے بعد بول نکالے جاتے ہیں۔ دھرپد خالص مردانہ راگ ہے اور اسی انداز میں گایا جاتا ہے جس میں دُھنوں کی فنّی آمیزش کے سوا اور کسی قسم کی رو رعایت نہیں کی جاتی۔ دُھرپد میں تان لگانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

دُھرپد کے لئے بہت وزنی اور زوردار آواز نیز سانس پر پورا ضبط دعبور حاصل ہونا ضروری ہے۔ اس کا موضوع بالعموم دینیات یا شجاعت کے کارناموں تک محدود رہتا ہے۔ دھرپد کی ایک دوسری صنف کھنڈری بانی ہے کھنڈ کے معنی جزو یا ٹکڑے کے ہیں۔ شدھ اور کھنڈری بانی میں امتیاز قائم رکھنے کے لئے " گمک " کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کی الاپ میں بھی تسلسل قائم نہ رکھ کر اُسے ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا۔ تان سین اپنے گرو (اُستاد) ہری داس کی طرح صرف شدھ بانی کا پیرو تھا۔ لیکن اس کے بعد کھنڈری بانی کو غیر معمولی فروغ ہوا۔ دُھرپد بہت ٹیڑھا اور پیچیدہ راگ ہے، اس کا سیکھنا اور سکھانا دونوں مشکل ہیں۔ اس کے لئے آواز کی

له یہ گانا بجانے والوں اس حقیقت کا معترف ہے کہ ریختہ یا اُردو سے پہلے کھڑی بولی (ہندی) معرضِ وجود میں آئی۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو صحیح نتیجہ تک پہونچنے کے لئے ہندی اُردو شعرا کے ساتھ ساتھ قدیم ہندوستانی مغنّیوں اور گانا لکھنے والوں کی بھی تلاش لینا ہوگی۔ (مصنف)

بڑی گہری تربیت و مزاولت کی ضرورت ہے، اور یہ ایک ایسا پیدائشی اور خاندانی جوہر ہے جو صرف باپ سے بیٹے کو مل سکتا ہے۔ اب اس راگ کے جاننے والے عنقا ہیں۔ دھرپد کے آخری نام لیوا اُستاد اللہ بندے اور ذاکرالدین خاں تھے، جو نامرالدین خاں مرحوم اندور کے سابق درباری گویّے کو اپنا وارث چھوڑ کر راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ اب اگر اس میدان کا مرد کہیں کوئی چھپا رستم ہو بھی تو اُسے دنیا نہیں جانتی۔

دھرپد سے ملتا جلتا دادرا ہے جو قدرے سرعت کے ساتھ گایا جاتا ہے۔ اس میں جھپ تال لگتی ہے اور دھرپد کی طرح اس کا موضوع بھی جوشیلا اور ڈرامائی ہوتا ہے۔ دادرا میں تانیں بھی ممنوع ہیں، اور وہ اپنی سادگی اور خوبصورتی کے لحاظ سے آپ اپنا جواب ہے۔

لفظ دھمار کا بہت کچھ غلط استعمال ہو چکا ہے۔ دھرپد راگ ہے لیکن دھمار ایک نہایت پیچیدہ تال کا نام ہے، پھر بھی دھرپد اور دھمار ملتی جلتی چیزیں ہیں۔ ان کے رنگ ڈھنگ میں گہری مطابقت ہے، تاہم دونوں دو مختلف جنسیں ہیں۔ دھمار تال کے گانے ہوری کہلاتے ہیں لیکن دھمار بجائے خود کوئی راگ نہیں ہے حالانکہ برسوں سے انھیں معنوں میں مستعمل ہے۔ اس تال کی پیچیدگی تانوں کو دشوار تر بنا دیتی ہے۔ دھرپد میں تو تان قطعاً ممنوع ہے۔ لیکن دھمار میں ایک قسم کی مختلف تانیں جو اصطلاحاً بول اُپج کہلاتی ہیں، لگانے کی عام اجازت ہے۔ دھمار تال میں ہوری یا بہار کے گیت گائے جاتے ہیں گو اس کا مخصوص موسم ہولی کی رنگینیوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ لیکن ہوری اور ہولی میں بُعد مشرقین ہے۔ ہوری سے بہار کا صرف وہ راگ مراد ہے جو دھمار تال میں گایا جاتا ہے لیکن ہولی سے ایسے بہاریہ گانے منسوب ہیں جو دھمار تال کے علاوہ دیپ چندی، چاچر یا کسی دوسری تال میں گائے جاتے ہوں۔

مغلوں کے عہد سے دھرپد کا زوال شروع ہوا اور بالآخر بگڑتے بگڑتے خیال بن کر رہ گیا۔ مسلمان فاتحین کے نزدیک فنِ موسیقی صرف دلچسپی و دلبستگی اور عیش و نشاط کا ذریعہ تھا، اسی لئے رفتہ رفتہ وہ تمام تبدیلیں ٹوٹتی گئیں جو اس فنِ لطیف کی روحِ رواں تھیں اور اصل کے بجائے بہت سی بگڑی ہوئی نقلی صورتیں سامنے آنے لگیں۔

امیر خسرو نے دھرپد کو کاٹ چھانٹ کر خیال بنایا، قوالی اور گل نقش کی طرح ڈالی۔ حسین شاہ والیِ جونپور نے پندرھویں صدی عیسوی میں خسرو کے خیال کی اصلاح کر کے اُسے نیا اور پائدار جامہ پہنایا۔ تان سین کے دم تک برابر دھرپد اور دھمار کا طوطی بولتا رہا، اور اکبر کے ساتھ اُن کا جنازہ بھی نکل گیا۔

آگے چل کر خسرو کے خیال کی بھی دو قسمیں ہو گئیں (۱) جلد خیال (۲) دھیما یا بڑا خیال۔ جلد خیال میں تیزی اور طرّاری تھی۔ دھیما خیال اس سے ایک متضاد چیز تھی۔ اس تقسیم کا سہرا محمد شاہ رنگیلے (۱۷۱۹ء تا

ے درباری گویّوں سدا رنگ اور ادا رنگ کے سر ہے۔ غالباً دھرپد کے مردانہ جلال و استقلال اور ہندی
رسی جلد خیال کی نسائی تزئین و نزاکت کی آمیزش ہی اس طرز کی پیداوار کی ضامن ہے۔ جلد خیال کا میدان
ت وسیع ہے، اور اس میں گانوں کی صوتی تشکیل کی کافی گنجائش ہے۔ دھیما خیال کی ابتدا دھرپد کی طرح
اپ ہی سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد خیال کے بولوں کے ادا کرنے کا نمبر آتا ہے۔ یہ ایک بہت مختصر
چیز ہے، اور اس کے استھائی اور انترا صرف یہی دو رکن ہوتے ہیں۔ گانے والا راگ کی تشکیل کرنے میں پوری
طرح آزاد ہوتا ہے۔ البتہ راگ کی بنیادی قیود کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو مختلف
انوں کا ماخذ ہے۔ ہر گھرانے کی گائیکی یا راگ کی طرزِ ادا ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ بسا اوقات
یک ہی گھرانے کی گائیکی کی طرز میں بھی یکسانیت نہیں ہوتی ہے۔ آجکل تو صرف فنِ قدیم کی نقالی اور گلے بازی
رواج عام ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس نقالی اور گلے بازی کی ابتدا مغلوں کے عہدِ زوال کی یادگار ہے۔
جس طرح مغل سلاطین کی فرمائش کے مطابق بیگمات کی چال کی نقل اُتار کر فنِ رقص کو بگاڑا گیا غالباً اسی طرح
پرندوں، جانوروں اور پہلوانوں کی چیخ پکار کی نقالی کر کے موسیقی کی بھی مٹی پلید کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ مغلوں
کے بعد ہی سے تانوں کی اس قدر بہتات نظر آنے لگی، اور اب جو جتنی سرعت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تانیں
لے سکتا ہے وہی باکمال سمجھا جاتا ہے۔ چاہے اس کی تانوں کا راگ سے کتنی ہی دور کا واسطہ کیوں نہ ہو۔
سدا رنگ اور ادا رنگ دراصل خیال گانے والے نہ تھے۔ صرف انھیں کی ذات پر کیا مخصوص
ہے تان سین کے کسی بھی نام لیوا نے ایسی غلطی نہیں کی۔ وہ یا تو دھرپدیہ تھا یا سازندہ۔ تان سین کے
مقلدوں کے (۱) بین کار، اور (۲) رُبابیے یہ دو فرقے تھے۔ ریاست رامپور کی دریا دلی کی بدولت یہ
دونوں فرقے ابتک بقیدِ حیات ہیں۔ بہادر سین بین کار اور وزیر خاں رُبابیہ ہنوز دربار رامپور کی زینت ہیں
ان دونوں سازوں میں تان کے لئے مطلق گنجائش نہیں ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ خیال گائیکی موسیقی
کے ادبار کی نشانی ہے۔

ترانہ کی ابتدا کے متعلق بہت سی روایتیں عام ہیں۔ امیر خسرو کو اس طرح سے اس کا موجد بتایا جاتا ہے
کہ نائیک گوپال نے علاء الدین خلجی کے دربار میں گیت کی طرز پر اپنا ایک نو ایجاد گانا سنایا۔ خسرو نے وہ
گانا چھپ کر سنا۔ اس کا مطلب تو وہ زبان کی اجنبیت کے باعث سمجھ نہ سکا مگر دوسرے دن تانن تانا دِر
تانا دانی دیم وغیرہ چند بے معنی الفاظ میں اس نے اس کی لے کی نقل اُتار کر رکھ دی اور ترانہ کا موجد بن بیٹھا
لیکن آچاریہ اے۔ سی۔ پانڈے کی تحقیق کے مطابق یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ترانہ دراصل تان سین کی
جدتِ طبع کا منت کش ہے جس طرح کتھا کلی گونگا ناچ ہے اسی طرح ترانہ بھی مہمل بولوں کا راگ ہے ترانہ

در اصل ہندی کے تا، را اور نا سے مرکب ہے۔ تا، تان، را، راگ اور نا، نام کا مخفف ہے۔ نام سے مراد تنوم اور تانن دو یتیم لڑکیاں ہیں، جو بندرابن کے سوامی ہری داس کی دھرم پتریاں مشہور ہیں۔ ہری داس تان سین کے استاد تھے اور یہ لڑکیاں میگھ راگ کی بے بدل ماہر تھیں۔ ایک دفعہ تان سین نے اکبر کے اصرار پر دیپک راگ گایا تھا، دیپک کی تاثیر ہے کہ اس کے گانے سے آدمی جل جاتا ہے، اور جب تک میگھ راگ نہ گایا جائے یہ جلن دور نہیں ہوتی، چنانچہ تان سین کا بھی یہی حال ہوا، اور چونکہ وہ خود میگھ راگ سے ناواقف تھا اس لئے اسے ان لڑکیوں کی پناہ میں آنا پڑا۔ اور انھوں نے اپنے فنی کمال سے اُسے اچھا کیا رخصت کے وقت تنوم اور تانن نے تان سین سے عہد کرا لیا تھا کہ وہ اکبر کو اپنی بحالیٔ صحت کا راز نہ بتائے گا۔ مگر دربار میں آکر اُسے بادلِ ناخواستہ عہد شکنی کا مرتکب ہونا پڑا۔ چنانچہ تنوم اور تانن طلب ہوکر دربار اکبری میں آئیں اور وہاں انھوں نے تان سین کی بدعہدی کی مذمت کرکے اپنے اپنے خنجر سے خودکشی کرلی۔ تان سین اس واقعہ سے بغایت ملول و متاثر ہوا، اور اُس نے بیلو راگ میں یہ گانا شروع کردیا۔

"تنوم تنا دے رے ناتدارے دانی تی دانی"

جس کا مطلب یہ ہے تنوم اور تنا تیری قدر میں نے نہ جانی۔

انھیں دونوں بہنوں کی یاد تازہ کرنے اور ان کی شرافت کا اعتراف کرنے کے لئے تان سین نے ایک نئی اور پیچیدہ طرز نکالی جو ترانہ کہلائی۔ چنانچہ آج تک ترانوں میں تنوم اور تانن کے راگ گائے جاتے ہیں، مثلاً، "بیٹھے شو کیلاش پر کریں گن گان تن نام تنو...." وغیرہ

امیر خسرو اور نائیک گوپال کی کہانی کا ترانہ کی ایجاد سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ امیر خسرو نے گوپال کی طرز کی نقل اُتاری تھی۔ مگر وہ ترانہ یا اور کوئی نئی ایجاد نہ تھی۔ امیر خسرو گوپال نائیک کا شاگرد ہوگیا تھا، اور اُس نے نائیک کی امداد سے موسیقی کی بعض کتب کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا تھا، اور دھنوں میں سنسکرت کی بجائے فارسی کے گانے لکھے تھے۔ اُس نے اپنے استاد سے اظہار عقیدت کرنے کے لئے الاپ کی ابتداء کی بجائے نا سے کی تھی۔ "آ" اوم کا مخفف تھا لیکن خسرو نے اس کے بجائے اپنے استاد نائیک کا مخفف نا استعمال کیا۔ آجکل کے ترانوں میں پرن اور ناچ کے وقت کی پاؤں کی حرکات شامل کرلی گئی ہیں، مثلاً:۔

"دھا دھا کٹ تھرک تھرک دھم کٹ کردھان کردھا یونا تنا....

چھتر منڈٹ تان لگا دیں۔ دھا دھیں دھیں دھا تن سے من سے تنوم تنا...." وغیرہ

اسی نوع سے ترانہ کا رنگ بدلتا چلا جارہا ہے۔ بہادر سین رامپوری نے ترانہ کے میدان میں بہت کا

وہ اس اعتبار سے ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔

قوالی، قول، قول بانا اور گل نقش، ہندی راگوں میں سموئے ہونے کے باوجود فارسی کی امانت ہیں۔ صوفی ار اور صوفیہ نے انھیں دل کھول کر اپنایا ہے۔ ان کا موضوع بالعموم حمد خدا، وحدت الوجود اور "من خدایم من خدایم من خدا" کا والہانہ نعرہ ہوتا ہے۔ اکبر کے عہد میں ترانہ اور قوالی کا بہت کچھ بول بالا رہا۔ ابوالفضل نے ن اکبری میں انھیں "دلّی کی دیسی طرز" لکھا ہے۔ مغلوں کے ساتھ ساتھ موسیقی بھی معرض زوال میں آگئی۔ ابان اودھ کے عروج کے ساتھ اس کو بھی دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش ہونے لگی۔

واجد علی شاہ نے ٹھمری ایجاد کی۔ ابتدائی ٹھمریاں تو ناپید ہو چکی تھیں، مگر اساتذہ نے اس نئی جنس کو بھی ے کا جامہ پہنا کر چھوٹا یا جلد خیال کے مشابہ بنا دیا۔ اور امتیاز قائم رکھنے کے لئے پیلو، سوہنی، تلنگ، کاموو یش وغیرہ اسفل راگوں کا استعمال روا رکھا۔

ٹھمری بہت دلچسپ چیز ہے، اسے مختلف راگوں کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ بعض ٹھمریاں بھیروں، درباری ڑہ اور شری وغیرہ اعلیٰ اور مشکل راگوں میں بھی گائی جاتی ہیں، مگر ان کا رواج بہت کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے یہ راگ مردانہ شکوہ کے حامل ہیں اور ٹھمریاں ایک جذباتی چیز ہے جس میں عشقیہ مضامین کی بہتات ہے۔ مروج یاں زیادہ تر رادھا کرشن کی عشقیہ روایتوں پر مشتمل ہیں، جو وام مارگ کی تلقین کا نتیجہ ہیں۔ ٹھمری میں راگ سے اس کے موضوع کو اہمیت دی گئی ہے، اور گویئے کو ایک سے زیادہ راگوں کے آزادی کے ساتھ استعمال نے کی اجازت بھی دے دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر دیش کی ٹھمری میں تلک کاموو، کھماچ اور دیگر متعلقہ و مشابہ ا کی لے کا بھی موضوعی مطابقت کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بعض جگہ ٹھمری میں ایک اور جدت پیدا ئی ہے، اور اُسے کجری، چیتی اور ساونی وغیرہ عام گانوں کی لے سے مرتب کیا گیا ہے۔

ٹپّا کی ایجاد کا سہرا نواب آصف الدولہ والیِ اودھ کے درباری گویّے میاں شوری پنجابی کے سر ہے، یہ اسفل راگوں کا رہین ہے۔ اس کے بول بھی مختصر ہوتے ہیں۔ ٹپّا کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر مسلسل اور غیر مختتم تانوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ یہ طرز مغربی تاثرات کی آئینہ دار ہے۔ ناٹک کمپنیوں کا نظر ہونے کے باعث ٹپّا تھیٹر کی طرز بھی مشہور ہے۔ ٹپّا کے لئے ایک جدید تال کی بھی ضرورت تھی انگریزی والٹز کے تتبع میں "دادرا" تال کی ترویج ہوئی مگر ماہران موسیقی نے دادرا کو ہمیشہ لعنت ہی سمجھی۔

مغلوں کے زمانہ میں تو قوالی صوفی شعرا کا تختۂ مشق تھی۔ لیکن جب فارسی شاعری کا غلغلہ ہوا اور دل میں غزلوں کی دھوم مچی تو ادنیٰ طبقہ میں غزل کا سکّہ چلنے لگا۔ کہتے ہیں کہ ابتداءً غزل کسی راگ یا لی محتاج نہ تھی، لیکن جب شاہی حلقوں تک اس کی رسائی ہوئی تو راگ اور تال کی زنجیروں میں جکڑی گئی

پڑنے لگیں۔ شاہی حرم میں باریاب ہونے کے لئے آئین وقواعد کی پابندی ایک لازمی چیز تھی۔ چنانچہ غزل اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ رہی۔ سینما کے ساتھ گیت اور بھجن وغیرہ بھی عام ہوگئے۔

دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح موسیقی بھی مغربی رنگ میں رنگی گئی، تقلید وتجدید، تخلیق وترمیم کی اس ا تفری کے عہد میں دلیپ کمار رائے جیسے ماہرین نے بڑا کام کیا ہے، اور اسی کے طفیل میں اب پیر ہینڈ ڈ کا کام ہونے لگا ہے۔ بہر حال موسیقی کا روشن مستقبل سامنے ہے اور کوشش کی جارہی ہے کہ اس بھولے بسرے اصناف کو دوبارہ حیاتِ نو بخشی جائے۔

"مَیں اُس دُنیا میں رہتا ہوں"

(از پنڈت اندرجیت شرما، ماچھرہ ضلع میرٹھ)

جس دیس میں گل کا نام نہیں ۔۔۔ بھونرے کا جہاں کچھ کام نہیں
ہنسی کی نہیں آواز کہیں ۔۔۔ عشرت کا نہیں ہے ساز کہیں
ہے بحرِ تلاطم خیز عیاں ۔۔۔ ملتا ہی نہیں ساحل کا نشاں
ہر سمت خزاں کا منظر ہے ۔۔۔ جو گھر ہے مصیبت کا گھر ہے

"مَیں اُس دُنیا میں رہتا ہوں"

ہمدردی آنسو بن بن کر ۔۔۔ کرتی ہے جہاں آنکھوں میں گھر
مفقود جہاں ہے شام وسحر ۔۔۔ قربان دلِ شاعر جس پر
کرنوں کے نہیں کھلتے غنچے ۔۔۔ چھائے ہیں ظلمت کے پردے
پُرہول بلائیں آتی ہیں ۔۔۔ وحشت کی گھٹائیں چھاتی ہیں

"مَیں اُس دُنیا میں رہتا ہوں"

بسنت

(از حضرت برق موسوی، حیدرآباد دکن)

پھر بسنت آیا، گئے جاڑے ہوئی رُت خوشگوار
مسکراتی، ناچتی، گاتی ہوئی آئی بہار

چپّہ چپّہ بن گیا میرے وطن کا رنگ پاش
اللہ اللہ دید کے قابل ہے سرسوں کا نکھار

جاگتا ہے جس طرح نوخیز کوئی خواب سے
یوں اُٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی، صبحِ بہار

گل بداماں رُت پھر آئی ناز کرتی اِس طرح
مسکراتا جس طرح آ لے، کوئی جانِ بہار

بھینی بھینی موتیا کی بُو ہوئی پھر عطر بیز
مہکی مہکی چل رہی ہیں پھر ہوائیں خوشگوار

کھلتے کھلتے یوں کھلی اس سرد موسم کی کلی
دھیرے دھیرے صبح وا ہوتی ہے جیسے چشمِ یار

"لے" یہ گجرے موتیا کے "سنترے" "لے سنترے"
ہر گلی کوچہ سے پھر شام و سحر اُٹھی پکار

عطر افشاں نیم کے پھولوں کی خوشبو دن کو ہے
رات کی رانی کی نکہت رات کو ہے مشکبار

پھاگ اُڑاتا آیا پھاگن ماس پھر اِس دھوم سے
ہر طرف گرنے لگے بھارت میں رنگیں آبشار

واہ کیا رنگینیاں ہیں اِن دنوں صبح و مسا
واہ کیا دلچسپیاں ہیں آج کل لیل و نہار

گاؤں کے بھولے حسیں کھیتوں میں نکلے سیر کو
شہر کے ترکانِ شوخ و شنگ ہوں جن پہ نثار

کیوں نہ موضوعِ سخن ہو یہ بھی شاعر کے لئے
کوئی دیکھے تو بسنتی پوش پریوں کا سنگار

رُخ پہ ہلدی، مانگ میں سیندور، ماتھے پر تلک
زرد کپڑے سب کے سب اور زرد ہی پھولوں کے ہار

[illegible] بالکل اسی طرح [illegible]

رنگ رلیاں اک طرف ہولی کی آبادی میں ہیں — اک طرف جنگل میں منگل ہے، یہ سرسوں کی بہار
مختلف رنگین پوشاکیں پہن کر تتلیاں — کر رہی ہیں رقص کس انداز سے طاؤس وار
اڑ رہے ہیں بن پہ تلیر کارواں در کارواں — چر رہی ہیں کھیت میں بھیڑیں قطار اندر قطار
آم کی شاخوں میں نکلی ننھی ننھی کیریاں — گر رہی ہیں جھوم کر باغوں پہ کیا طوطوں کی ڈار

پتے پتے پر ہے رقصاں فصلِ گل کی تازگی
ڈالی ڈالی پر غزل خواں مطربانِ نوبہار

چاندنی کا لطف شب کو، صبح کو کھیتوں کی سیر — کس مزے سے کٹ رہے ہیں پھر مرے لیل و نہار
کیا بتاؤں کس خوشی سے گنگناتا اٹھتا ہوں میں — صبح جب بجتا ہے، سورج کی شعاعوں کا ستار
کروٹیں لیتی ہے کس کس رنگ سے دلہن امنگ — جھٹ پٹے کو پھولتا ہے جب شفق کا لالہ زار
رات کو جب آسماں پر مسکراتا ہے قمر — من کی پھلواری پہ پڑتی ہے مسرت کی پھوار
تو کبھی پورب میں یہ کوئی اڑاتی ہے گلال! — آج کل اس رنگ سے ہوتی ہیں صبحیں آشکار
تو پکارے ہو نہ ہو پچھم میں یہ مچتا ہے پھاگ! — یوں شفق کے شام کو بن جاتے ہیں نقش و نگار
چہرۂ خوباں سے روشن تر ہے رخسارِ سحر — گیسوئے جاناں سے بڑھ کر زلفِ شب ہے مشکبار
یہ مرا دیوان ہے، یا صبح کی رنگینیاں — گلشنِ کشمیر ہے، یا شام کے نقش و نگار

صبح کو گیتی پہ بہتی ہیں سنہری ندیاں
رات کو گردوں سے گرتے ہیں روپہلے آبشار

کڑکڑاتی سردیوں کی گرم بازاری گئی، — اب نہ سردی ہے نہ گرمی کیسی رت ہے خوشگوار
اس طرح بدلا ہے موسم جس طرح کوئی حسیں — "سرد مہری" چھوڑ "گرم مہر" ہو پایانِ کار
دیکھتے ہی دیکھتے آجائیں گی اب گرمیاں — ہائے کیا جلدی چلا جاتا ہے، یہ عہدِ بہار!

روک لیتا کوئی دن اس جانے والی رت کو اور
کاش برقِ موسوی! ہوتا یہ میرا اختیار

حالی کی غزل گوئی

(از جناب عبدالرزاق قریشی)

حالی مرحوم پر مختلف حیثیتوں سے اور خصوصاً اُن کی نثر پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اُن کی شاعری سے متعلق بھی بحیثیت مجموعی کافی لکھا گیا ہے، لیکن اُن کی غزل گوئی سے متعلق، جہاں تک میرا علم ہے، بہت کم لکھا گیا ہے۔ اِس مضمون میں ہم اُن کی اِسی خصوصیت پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

حالی کا درجہ بحیثیت ایک غزل گو کے بہت بلند و ارفع نہیں ہے۔ لیکن اتنا پست بھی نہیں کہ اُن کو غزل گو شعرا کے حلقہ میں کوئی جگہ ہی نہ دی جائے۔ اُن کے یہاں میر کی سی لطافت و نزاکتِ بیان، غالب کی سی بلندیٔ تخئیل اور درد کا سا تصوف یقیناً نہیں ہے۔ لیکن اُن کی غزلیں اتنی گری ہوئی بھی نہیں ہیں کہ اُن کو سرے سے پڑھنے ہی سے انکار کر دیا جائے[1]۔

حالی کے کلام کو قدیم غزلیات اور جدید غزلیات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، قدیم غزلوں سے مُراد وہ ہیں جو انھوں نے "مقدمہ" سے پہلے کہیں، اور جدید سے وہ غزلیں مُراد ہیں جو "مقدمہ" کے بعد لکھی گئیں۔ ہماری زبان کے مشہور ادیب و انشاپرداز سجاد علی انصاری مرحوم نے حالی کی شاعری کے سلسلہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "میں تو اُس حالی کا پرستار ہوں جس نے "مقدمہ" سے پہلے شاعری کی اور شاعری کے بعد "مقدمہ" لکھا"۔ سجاد کی اس تنقید کو مکمل طور پر تو نہیں لیکن بڑی حد تک صحیح مانا جا سکتا ہے: "مقدمہ" کے بعد کی شاعری میں حالی شاعر سے زیادہ

---

[1] اِس سلسلہ میں سر شیخ عبدالقادر کی یہ تحریر دلچسپی کے ساتھ پڑھنے کے قابل ہے وہ لکھتے ہیں۔ "مجھے اپنے ایک دوست کا قول یاد ہے کہ جب میں نے کہا "آپ نے مولانا حالی کا دیوان دیکھا ہے؟" تو اُنھوں نے جواب دیا "نہ دیکھا ہے، نہ دیکھنے کا ارادہ ہے"۔ میں نے تعجب سے پوچھا "یہ کیوں؟" تو بولے میں مولانا حالی کے مسدس کا قائل ہوں، وہ قومی رنگ میں خوب کہتے ہیں مگر ان کو غزل گوئی سے کیا واسطہ"۔ یہ اُس زمانہ کی بات ہے جب دیوان حالی پہلے پہل شائع ہوا، میں نے اُسے نہایت شوق سے پڑھا تھا۔ حالی کی غزلوں کی تاثیر میں ڈوبی ہوئی سادگی نے میرے دل پر ایک خاص اثر کیا تھا۔ میں نے اپنے دوست کی رائے کو تعجب سے سُنا۔ مگر بحث میں اُلجھنے کے بجائے میں نے اُن سے کہا کہ "مجھے کچھ شعر پسند آئے ہیں، وہ سُناتا ہوں"، اور جو شعر یاد رہ گئے تھے اُنھیں سُنائے۔ میرے دوست منصف مزاج تھے، اُن اشعار سے متاثر ہوئے اور کہنے لگے "یہ شعر تو واقعی خوب ہیں، آپ کے انتخاب کی داد دیتا ہوں"۔ میں نے کہا ایسے ہی اور بہت سے اشعار ملیں گے، آپ دیوان حالی دیکھیں تو سہی! اُنھوں نے دیوان منگوایا اور اُس کے مطالعہ کے بعد حالی کی غزل گوئی کے معترف ہو گئے۔"

واعظ اور ناصح معلوم ہوتے ہیں۔

غزلیاتِ حالی میں بحیثیت مجموعی آپ کو لطافتِ تخئیل، جدتِ بیان اور سادگی و سلاست ملے گی جو کچھ کہنا چاہتے ہیں نہایت صاف شستہ و سلیس زبان اور سلجھے ہوئے اندازِ بیان کے ساتھ پیش کرتے ہیں اُن کے یہاں سوز، چبھن، درد، ٹیس سب کچھ ہے۔ ہاں رنگین تشبیہیں اور دور از کار استعارے اُن کے یہاں بالکل نہیں ہیں لیکن بعض اوقات اُن کی سادگی تکلیف دہ حد تک پہونچ جاتی ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ اُن کے یہاں بیدل اور ناصر علی کی بھول بھلیاں بھی نہیں ملیں گی۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کی قدیم غزلوں میں ہجر و وصال کے افسانے اور محبوب کے ظلم و ستم کی داستانیں آپ کو ملیں گی، اور جدید غزلوں میں، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے تغزل سے زیادہ پند و موعظت پایا جاتا ہے۔ لیکن وہ کون ایسا شاعر ہے جس کا سارا کلام اول سے آخر تک ایک ہی انداز اور معیار کا ہو۔ دنیائے غزل کے بادشاہ میر کی نسبت بھی کہا گیا ہے کہ "پستش بنایت پست است" اور اس کے صحیح ماننے میں کسی صاحبِ ذوق کو کوئی عذر نہیں۔ پھر حالی جنھوں نے غزل کو کبھی اپنا ادبی سرمایہ فخر و مباہات نہیں سمجھا، بلکہ غزل خوانی کو بے وقت کی راگنی[1] جانا۔ اگر پستی کی حالت میں بہت نیچے اُتر گئے تو اُن کو اتنی سخت سزا کیوں دی جائے کہ غزل گوئی کے قلمرو ہی سے اُن کو خارج کر دیا جائے۔ خود اُن کے اُستاد غالب بھی تو کبھی کبھی ڈھول دھپا اور مستی پر اُتر آتے ہیں اور اس مستی کی حالت میں جس طرح وہ پستی کی جانب گرتے ہیں، اُس سے ہمارے نقاد اچھی طرح واقف ہیں۔

اس دعوے کی تائید میں دیوانِ حالی کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں آپ انھیں پڑھیں اور دیکھیں کہ ان شعروں میں لطافتِ تخئیل، جدتِ بیان اور تازگیِ خیال بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں یا نہیں۔

جب انسان پر کوئی اُفتاد پڑتی ہے تو اُس کو اکثر چُپ سی لگ جاتی ہے، اور اُس حالت میں اگر اُس سے کچھ پوچھا جائے تو بجائے جواب کے آنسوؤں کا تار بندھ جاتا ہے، یا بعض وقت وہ انتہائی غم و غصہ کا اظہار کرتا ہے یہی کیفیت حالی نے مندرجۂ ذیل شعر میں نہایت خوبی سے بیان کی ہے۔

اُس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا	بھڑک اُٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

بظاہر کتنا سادہ شعر ہے۔ لیکن جذبات سے پُر، ذرا الفاظ کے انتخاب پر بھی غور کیجئے "شعلہ بھڑک اُٹھتا" کہہ کر شاعر نے جو بلاغت پیدا کی ہے وہ کسی دوسرے الفاظ سے ناممکن تھی۔

فراق و ہجر میں سوائے رونے کے اور بھلا عاشق کو کیا کام ہو سکتا ہے، دیکھئے شاعر نے اس کیفیت کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔ ایک ایک لفظ سے درد اور مایوسی و حسرت ٹپک رہی ہے ۔

[1] جو یکے حالی غزل خوانی کے دن + راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا۔

جب دیکھو آنسوؤں سے دامن ہے نم تمہارا   رونا نہ ہوگا حالی شاید یہ کم تمہارا

عشق کیا ہے، اُس کی مختلف کیفیتیں کیا ہوتی ہیں، اُس کی ماہیت کیا ہے، کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس بات کو حالی نے یوں ادا کیا ہے۔ خیال نیا نہیں ہے، لیکن جدّتِ بیان کی داد تو دینا ہی پڑے گی۔

عشق سُنتے تھے جسے ہم، وہ یہی ہے شاید   خود بخود دل میں ہے اِک شخص سمایا جاتا

غالب مرحوم کا شعر ہے:۔

اُن کو دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق   وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

حالی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، وہ معشوق کو دیکھتے ہی صرف دردِ فراق اور غمِ ہجراں ہی نہیں بلکہ ساری مصیبتیں اور درد دُکھ بھول جاتے ہیں۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ خوشی کی حالت میں انسان تھوڑی دیر کے لئے اپنی ہر قسم کی مصیبتوں کو بھول جایا کرتا ہے، حالی کہتے ہیں:۔

ملتے ہی اُن کے بھول گئیں کلفتیں تمام   گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

آسمان کا قافیہ اُردو میں سیکڑوں طرح سے باندھا گیا ہے، لیکن اتنی خوبصورتی اور اتنے بلند معانی کے ساتھ شاید ہی کسی شاعر نے باندھا ہو۔ خواجہ وزیر کا یہ مطلع:۔

چلا ہے اودلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر   زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

بہت مشہور ہے اور حق یہ ہے کہ خوب کہا گیا ہے، لیکن اس کو پڑھ کر محبوب کا جو تخیّل ہمارے دماغ میں آتا ہے وہ کوئی خوشگوار اثر پیدا نہیں کرتا۔ اِس کے برخلاف حالی کے شعر میں جو لطافت و شگفتگی اور معنی کی جو بلاغت ہے وہ سچ یہ ہے کہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ ان خوبیوں کا اندازہ کچھ اصحابِ ذوق ہی کر سکتے ہیں۔ انتخابِ الفاظ کو دیکھئے، ہر لفظ نگینے کی طرح جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پہلے مصرع میں "کلفتیں" کا لفظ جن وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے اُس کے لئے دوسرا کوئی لفظ نہیں۔ دُکھ۔ درد۔ مصیبت۔ رنج۔ الم۔ غرض کسی لفظ سے وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی جو "کلفت" سے ہوتی ہے۔ اِسی طرح دوسرے مصرع میں "گویا" کے لفظ پر غور کیجئے، شاعر کو اس سے انکار نہیں کہ وہ کلفتوں اور مصیبتوں میں مبتلا رہ چکا ہے، لیکن دیدارِ محبوب سے وہ تمام کلفتیں اِس طرح بھول جاتا ہے گویا کبھی اُن سے دوچار ہی نہ ہوا تھا۔ یہ بات بغیر اس لفظ "گویا" کے پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

اُصولِ بلاغت کے لحاظ سے شعر کی ایک خوبی یہ بھی قرار دی گئی ہے کہ سب کچھ شعر میں نہ کہہ دیا جائے بلکہ کچھ پڑھنے والے کے غور و خوض کے لئے بھی چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ اس شعر میں حالی نے بلاغت کے اِس اُصول کو پورے طور پر ملحوظ رکھا ہے، دیکھئے وہ نہیں کہتے کہ "پردہ داری" میں "کوئی معشوق" ہم کو ستا رہا ہے۔

بلکہ وہ صرف اس کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں

عاشق کی سب سے بڑی تمنا یہ ہوتی ہے کہ وہ محبوب کے دیدار سے اپنی آنکھیں سینکے، اُس سے شکایت کرے، اپنا دردِ دل کہے، لیکن جب محبوب سامنے آجاتا ہے تو بقول میر:-

"سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا"

اِسی خیال کو حالی نے نہایت عمدہ اور اچھوتے اندازِ بیان کے ساتھ پیش کیا ہے۔

جی ڈھونڈھتا ہے بزمِ طرب میں اُنھیں مگر   وہ انجمن میں آئے تو پھر انجمن کہاں!

مقصد یہ ہے کہ جی تو ضرور چاہتا ہے کہ محبوب انجمن میں جلوہ گر ہو اور اُس کے دیدار سے آنکھوں کو روشنی اور دل کو سرور حاصل ہو، لیکن اُس کے آجانے کے بعد ہوش کسے رہ جاتا ہے، اور جب ہوش نہیں تو کہاں کا دیدار اور کیسی خوشی۔ کتنا پیارا شعر ہے، کیسے سُبک اور نرم الفاظ!

"اُنھیں" کا لفظ شاعر کے پاکیزہ جذبات پر دلالت کرتا ہے۔ وہ اپنے محبوب کو عزت کے ساتھ یاد کرتا ہے یہاں اگر "اُسے" استعمال کیا جاتا تو وہ لطافت و بلاغت کبھی پیدا نہ ہوسکتی۔ اِسی طرح "انجمن کہاں!" کی بلاغت قابلِ داد ہے۔ شاعر اگر صاف صاف یہ کہہ دیتا کہ ساری انجمن بیہوش ہو جائیگی تو وہ بات کہاں پیدا ہوسکتی تھی جو اس چھوٹے سے فقرے میں ہے۔

اِنسان جب اپنے سے کسی بڑے کے سامنے پہونچتا ہے تو پاسِ ادب اُسے خاموش رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ ایک عاشق کے لئے محبوب سے بڑھکر اور کون ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جب عاشق محبوب کے سامنے پہونچتا ہے تو فرطِ حیرت اور پاسِ ادب سے اُس کی زبان بند ہو جاتی ہے۔ وہ آرزوئیں اور حوصلے تو بہت کچھ لے کر گیا تھا لیکن رُعبِ حُسن اور پاسِ ادب نے اُس کی زبان بند کردی۔ اسی طرح محبوب اپنا وقار اور تمکنت قائم رکھنے کے لئے عاشق سے کچھ پوچھنا پسند نہیں کرتا۔ اِس خیال کو ایران کے مشہور شاعر نظیری نے اس طرح ادا کیا ہے:۔

من از حیرت تو از تمکیں، نہ ایمائی نہ تقریری   بداں ماند کہ ہم بزم ست تصویری بتصویری

شعر بہت اچھا ہے، لیکن بلاغت کا یہ نکتہ کہ سب کچھ نہ کہہ دیا جائے، پڑھنے والے کے غور و فکر کے لئے بھی کچھ چھوڑ دیا جائے، اس میں نہیں پایا جاتا۔ اس کے مقابلہ میں حالی کا یہ شعر سنیئے:۔

نہ واں پرسش، نہ یاں تابِ سخن ہے   محبت ہے کہ دل میں موجزن ہے

بظاہر حالی کا یہ شعر نہایت سادہ معلوم ہوتا ہے، بلکہ ممکن ہے کہ بدذوق لوگ اسے پھسپھسا بھی کہدیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ معنوی حیثیت سے حالی کا یہ شعر بہت بلند، نظیری کے شعر سے بہتر ہے

اس شعر کی مثال سمندر کی ساکن سطح سے دی جاسکتی ہے۔ بظاہر سمندر کی سطح ساکن معلوم ہوتی ہے لیکن غواص سے پوچھئے کہ اُس کے نیچے کیسی طوفانی لہریں اُٹھتی ہیں۔ اسی طرح اس شعر پر جتنا زیادہ غور کیجئے معنوی حیثیت اُتنا ہی بلند نظر آئیگا۔ شاعر نے بلاغت کے اُصول کو پُورے طور پر مدّنظر رکھا ہے۔ اُس نے صرف یہ کہا کہ "واں پرسش نہیں" کیوں؟ یہ پڑھنے والا خود سوچے کہ "تمکنت" کی وجہ سے۔ اسی طرح "یاں تابِ سخن نہیں" کیوں؟ پڑھنے والا غور کرے کہ فرطِ حیرت اور پاسِ ادب سے ایسا ہوا۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی بات جو اِس شعر میں ہے اور حزیں کا شعر اُس سے خالی ہے وہ یہ ہے کہ حالی کے یہاں صرف بے جان تصویریں ہی تصویریں نہیں ہیں بلکہ

"محبت ہے کہ دل میں موج زن ہے"

اس طرح تشریح کہاں تک کی جائے۔ ہم ذیل میں کچھ اشعار نقل کرتے ہیں جن کو پڑھکر ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حالی غزل گوئی کے میدان میں بھی اپنے حریفوں سے بہت پست نہیں ہیں۔

پردہ ہو لاکھ کینۂ شمر و یزید کا
چھپتا نہیں جلال تمھارے شہید کا

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ بیاں سے ہم

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اُس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں[1]

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی
مانا کہ اُس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

رونا یہ تھا کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں
طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا[2]

اُس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

شوق بڑھتا گیا جوں جوں رُکے اُس شوخ سے ہم
یہ سبق وہ ہے کہ بھولے سے سوا یاد رہے

خود حالی کا قول ہے کہ شعر میں کوئی بات ہو یا نہ ہو لیکن سوز ضرور ہو۔ اُن کے اس قول کے ثبوت میں اُن کا مسدس بڑی آسانی سے پیش کیا جا سکتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ غزل گوئی میں اُنھوں نے اپنے اس قول پر کہاں تک عمل کیا ہے۔ جب اس نقطۂ نگاہ سے ہم اُن کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو کسی قدر مایوسی

[1] حسرت موہانی (مرحوم) کا بھی ایک شعر سنتے چلئے:

تسلیم ہم کو تھا کعبہ کی منزلت
سب کچھ سہی مگر وہ ترا آستاں نہیں

[2] حسرت موہانی۔ [illegible] دل حال کا [illegible] اک شعر:
ترے ملنے جو ہے حال یہ رسا بھی

ہوتی ہے، لیکن پھر بھی کچھ اشعار تو ضرور ایسے ہیں جن میں شاعر نے دل کا درد نچوڑ کر بھر دیا ہے، ناظرین پڑھیں اور لطف اندوز ہوں :-

پھر زخم پھوٹ نکلا، حالی نہ چھیڑنا تھا فصلِ خزاں کا قصہ ذکرِ گل دمن میں
رنج اور رنج بھی تنہائی کا وقت پہونچا مری رسوائی کا
قلق اور دل میں سوا ہو گیا دلاسا تمہارا بلا ہو گیا
ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے درد کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا
اک خوشی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا
ہم خوش کبھی ہوئے ہوں تو غم ناگوار ہو ملتا نہیں محل گلۂ روزگار کا
دل سے خوشیاں ہو گئیں سب گوشہ گیر نام تھا شاید جوانی کا نشاط
غنچہ چٹکا اور آ پہونچی خزاں فصلِ گل کی تھی فقط اتنی بساط

غزلیاتِ حالی میں ہم کو اخلاقی اشعار بھی بہت ملتے ہیں، اور بعض بہت بلند خیال کے حامل ہیں اور اخلاقی اشعار ہونے کے باوجود شعریت ان میں بدرجۂ اتم موجود ہے، چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

نیک کہنا، نیک جس کو دیکھنا ہم کو تفتیشِ دروں سے کیا غرض

یہ شعر پڑھکر معلمِ اخلاق سعدی کی ایک کہانی یاد آتی ہے۔ سعدی نے لکھا ہے کہ کسی شخص نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ "فلاں درویش کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؛ لوگ تو اُسے بہت بُرا بھلا کہتے ہیں" اُن فرشتہ سیرت بزرگ نے جواب دیا: "در ظاہرش عیب نمی بینم در باطنش غیب نمی دانم"

جب وقت پڑے دیجئے دستک درِ دل پر جھکئے فقرا سے نہ جھکئے امرا سے
معنی کا تم نے حالی دریا اگر بہایا یہ تو بتائیں حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا
رُکا ہاتھ جب، بن گئے پارسا تم نہیں پارسائی، یہ ہے نارسائی
قفلِ درِ مراد سب اک بار کھل گئے چھوڑا جب آرزو نے بھروسہ کلید کا
دیکھ اے بلبل ذرا گلچین کو آنکھیں کھول کر پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے
کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے
فیصلہ گردشِ دوراں نے کیا ہے سو بار مرو کس کا ہے بدخشان و ختن کس کا ہے
جہاں میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسہ نہ کیجئے گا یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجئے گا

اخلاقی نکات بیان کرنے میں حالی نے کہیں کہیں طنز سے بھی کام لیا ہے اور بعض وقت اُن کے طنز کا

نشتر بہت تیز ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ حالی کی ساری عمر مسلمانوں کی اصلاح میں گزری اور ایک مصلح کو جن دقتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُس سے ہم اچھی طرح واقف ہیں۔ جب دل پر چوٹ لگتی ہے تو اُس سے آہ بھی نکلتی ہے اور آگ بھی۔ چنانچہ ذیل کے ہر شعر سے درد اور تڑپ ظاہر ہے:۔

مشکل بہت ہے گو کہ مٹانا سلف کا نام   مشکل کو ہم ملیں گے نہ آساں کئے بغیر
اُمت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر   اسلام ہے فقیہو ممنون بہت تمہارا
بڑھ گیا ہے رحم انسانی بہت   ہو گئی ایجاد اب نئی توپ و تفنگ

کیا موجودہ جنگِ عظیم نے شاعر کی اس پیشگوئی کو صحیح نہیں ثابت کر دکھایا؟

علم کیا، اخلاق کیا، ہتھیار کیا،   سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ
قوم کو حالی نہیں راس اتفاق   پھوٹ ہی کا بس کھلے گا ہم پہ رنگ
بے قدم وم ہیں خانقاہوں میں   بے عمل علم ہیں مدارس میں

ایران و ہندوستان کے شعرا نے ریاکار واعظوں اور زاہدوں کی بڑی سختی سے مذمت کی ہے جب تک شخصی حکومت کا دور دورہ رہا شعرا کھُل کر تو واعظوں اور زاہدوں کی مذمت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ حکومت کی باگ ڈور بڑی حد تک ان "مذہبی لوگوں" کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی، لیکن جب ان کا اقتدار کم ہوا تو شعرا نے کھُلم کھُلا اُن کی مذمت کرنا شروع کر دی۔ حالی تو ایسے زمانہ میں تھے جب واعظوں کا اقتدار کیا معنی اُن کی عزت و وقار کا بھی جنازہ نکل چکا تھا۔ حالی سرسید مرحوم کے رفیقوں میں ہونے کی وجہ سے خاص طور پر اس گروہ کے مطعون تھے۔ اسی لئے انھوں نے اپنی غزلوں میں ان لوگوں کی اچھی طرح خبر لی ہے۔ ریاکار واعظوں اور زاہدوں کی مذمت میں انھوں نے بکثرت اشعار کہے ہیں، ہم چند اشعار یہاں نمونۃً نقل کرتے ہیں:۔

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار   اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت
دیکھیے شیخ مصور سے کھنچے یا نہ کھنچے   صورت، اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت
واعظو دین کا خدا حافظ   انبیا کے ہو تم اگر وارث
نہ چھیڑے گا زیور گھروں میں نہ زر تو   یہی ہے اگر حسنِ گفتار واعظ
کم سے کم وعظ میں اتنا تو اثر ہو واعظ   بول قوال کے جو دل میں اثر کرتے ہیں
ترکِ دنیا کے علاوہ تو کئے سب واعظ   گر مناسب ہو تو اک ترک یہ اور سہی

زاہد کی مذمت میں تو ایک پوری غزل کہہ ڈالی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ترکِ حق کے لئے کچھ سوز نہاں بھی ہے ضرور   خشک نقلوں میں دھرا کیا ہے بھلا اے زاہد

میں تو سودا ہوں دل نہیں لیتا مجھ سے   تو ہی کہ اس میں کیا میری خطا اے ناصح

غزل پر ایک سخت اعتراض یہ ہے کہ اُس میں خیالات مسلسل نہیں ہوتے۔ حالی کا شمار اُردو شاعری کے مصلحین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے مرحوم آزاد دہلوی کے ساتھ جدید اُردو شاعری کو فروغ دینے میں بہت سرگرمی کی۔ آزاد نے تو غزل کی طرف کوئی توجہ نہ کی، لیکن حالی نے جدید قسم کی نظمیں لکھنے کے علاوہ غزل کی بھی اصلاح کی، اور اس میں اخلاقی، سیاسی، مذہبی نکات بیان کرنے لگے۔ اور غزل کو اس کے محدود دائرے سے نکالنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اسی اصلاحی کوشش کے سلسلے میں اُنھوں نے مسلسل غزلیں بھی کہیں، اور باوجود اس کے کہ ان غزلوں میں اخلاقی نکات بیان کئے گئے ہیں، اُن میں شعریت غایت درجہ پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ غزل پڑھیے جس کا مطلع ہے

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا   جس گھر سے سر اُٹھایا اُس کو بٹھا کے چھوڑا

حالی نے غزل سے جذبۂ قومیت و وطنیت اُبھارنے کا بھی بڑی حد تک کام لیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ

خاور سے باختر تک جس کے نشاں تھے برپا   کچھ مقبروں میں باقی اُن کی نشانیاں ہیں

دیکھا نہیں ابھی کچھ قحط الرجال تم نے   اس سے بھی سخت آنی آگے گرانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا   کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں

ایک دوسری غزل میں اِسی راگ کو اور زیادہ تڑپ اور سوز کے ساتھ چھیڑا ہے۔

گو رو چکے ہیں دکھڑا سو بار قوم کا ہم   پر تازگی وہی ہے اس قصۂ کہن میں

وہ قوم جو جہاں میں کل صدر انجمن تھی   تم نے سُنا بھی؟ اُس پر کیا گذری انجمن میں

حالی کی غزلوں میں ایک ممتاز خصوصیت ہم کو یہ بھی نظر آتی ہے کہ اُنھوں نے محاورے بڑی خوبی سے استعمال کئے ہیں، چند اشعار یہاں مثالاً نقل کئے جاتے ہیں:۔

تھوڑی ہے رات اور کہانی بہت بڑی   حالی نکل سکیں گے نہ دل کے بخار، بس

گھڑیاں زیست کی تھوڑی سی رہی ہیں باقی   یہ مہم بھی جو خدا چاہے تو سر کرتے ہیں

ٹھیرتے ٹھیرتے دل یوں ہی ٹھہر جائے گا   بات جو آج ہے وہ کل غم ہجراں میں نہیں

توبۂ حضرت کی یوں ہی ایک دودھ کا سا ہے اُبال   ہم دکھا دیں گے ذرا دم بھر توقف کیجیے

کہا ہے اُس نے کہتے ہیں سخن ترک   مگر ہم کو ابھی اس میں سخن ہے

عیب سے خالی نہ واعظ ہے نہ ہم   ہم پہ منہ آئے گا، منہ کی کھائے گا

جذباتِ اثر

(غزل حضرت اثر لکھنوی)

قابلِ عفو ستم گر کی جفائیں نکلیں
ایک ہم ہیں کہ وفائیں بھی خطائیں نکلیں

دیکھ تو اپنے تغافل کی ذرا پردہ دری
عشق میں حسن کی مستانہ ادائیں نکلیں

حیلہ جو صلح کے پیغام کا فتنا سمجھا
فتنہ و شر کے لئے تازہ بنائیں نکلیں

آگئی یاد جہاں حسرتِ برباد کوئی
دل کے ہر گوشے سے ماتم کی صدائیں نکلیں

ہجر کی رات بسر ہو تو گئی، سچ ہے، مگر
سونی سونی سی دمِ صبح فضائیں نکلیں

جامہ زیبی کا تری طرز اُڑانا چاہا
دیکھتے دیکھتے غنچوں کی قبائیں نکلیں

دیکھیئے اور دکھاتی ہے محبت کیا کیا
آج دشمن کے لئے دل سے دعائیں نکلیں

آہ وہ ذکرِ وفا پہ یہ کسی کا کہنا
دیکھ لو پھر وہی رنجش کی بنائیں نکلیں

زلف اُس رخ پہ اِس انداز سے بکھری کہ اثرؔ
کرنیں مہتاب کی لینے کو بلائیں نکلیں

کلامِ وحشی

(از منشی کرشن سہائے صاحب اہلکاری، وکیل کانپور)

چلے زمیں پہ تو یوں نقشِ پا جما کے چلے ۔ کہ سجدہ گاہِ ملایک اسے بنا کے چلے
جہاں کو معجزہ عشق یہ دکھا کے چلے ۔ ہر ایک خارِ گلستاں کو گُل بنا کے چلے
نقابِ رخ کی تجلی مجھے دکھا کے چلے ۔ مرے خیال کی دنیا کو جگمگا کے چلے
کچھ اس طرح وہ نظر سے نظر ملا کے چلے ۔ مری نگاہ کو اپنی نظر بنا کے چلے
تمھیں بتاؤ کہ اس خارزارِ ہستی میں ۔ کہاں تک آدمی دامن بچا بچا کے چلے
پہونچ سکے گا وہ کیا گامِ شوق منزل تک ۔ جو ابتدائے سفر ہی میں ڈگمگا کے چلے
ملا نہ خضر کوئی جب رہِ محبت میں ۔ ترے ہی غم کو ترا رہنما بنا کے چلے
زمینِ میکدۂ عشق ہے یہ اے واعظ ۔ جو بے پیئے بھی چلے یاں سے لڑکھڑا کے چلے
ہیں ناتواں بھی پسِ کارواں سفر کے لئے ۔ ذرا کہو کہ نہ اتنا قدم بڑھا کے چلے

جنوں کی راہ میں وحشی سا چاہیئے رہرو
جو چھیڑتا ہوا کانٹوں کو مسکرا کے چلے

عورت کا مرتبہ بروئے رگوید[1]

(از جناب اربدیش)

حضرت عیسٰی سے تین ہزار برس پہلے ایک منچلی، زندہ دل اور جفاکش قوم ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد کو پار کر کے آستانۂ ہند (پنجاب) پر آ کھڑی ہوئی۔ آریوں کی یہ ہندی شاخ، ہند یورپی آریہ قوم کی فتوحات کی مشرقی موج تھی۔ اپنی مفتوحہ زمین پر استادہ ہو کر اس نے اپنے ارد گرد نظر ڈالی تو دیکھا کہ اس کے تیز رو دریاؤں سے سیراب، ہری بھری وادیاں پھیلتی چلی گئی تھیں، جن کی پہنائیاں وسعتِ ہند کی خبر دے رہی تھیں۔ ان شجاع و ظفریاب نوواردوں کو علم نہ تھا کہ انھیں یہاں ترکی بہ ترکی جواب ملے گا اور جواب بھی وہ جو دانت کھٹے کر دے۔ وہ اس سے واقف نہ تھے کہ اس مقناطیسی اثر زمین کا انچ انچ خون کا طلبگار رہے۔ بنیادی دُور تک پہلے جنگلوں میں جگہ جگہ شہر آباد تھے۔ آریوں نے ان شہروں کے اُن حصارہائے آہنیں کو دیکھا جن کی چھتوں کو سو سو ستون سر پر لئے کھڑے تھے۔ ان صد ستون حصارہائے آہنیں کے مالک ہندیوں کا رنگ سیاہ اور ناک چپٹی تھی۔ آریوں نے انھیں "غلام" اور "غیر مہذب" کہہ کر خطاب کیا۔ یہ پستہ قد غلام زیورِ تہذیب سے آراستہ و پیراستہ تھے، اور اُن کی طرزِ معاشرت اِن خوبصورت، صبیح و بلند بالا آریوں کی خانہ بدوشانہ تہذیب سے کہیں ارفع تھی۔ گھوڑوں کی پیٹھ کو اپنا گھر اور تیر و کمان کو اپنی دولت سمجھنے والے آریوں نے چالاکی سے ہندیوں کو اُن کے محلوں سے نکال باہر کیا۔

لیکن آریوں کے نمایاں اوصاف علوئے خیال، مہر و اُلفت اور احسان شناسی تھے۔ بے شمار جنگل جو اُن کے سامنے پھیلتے چلے گئے تھے اُن کے لاتعداد کُنجوں نے انھیں اپنے آغوش میں جگہ دی۔ جہاں ان کے عالمگیر تدبر و تفکر نے اپنی نیرنگی کے کرشمے دکھائے۔ اس ملک نے نوواردوں کے قدموں میں اپنے بے بہا خزانوں کا ڈھیر لگا دیا، اور انھیں ان میں وہ وہ چیزیں ملیں جو خواب میں بھی نصیب نہ ہوئی تھیں۔ اُن کی دشت نوردی نے ان کے قدم کہیں نہ جمنے دیئے تھے، اس لئے اس دلکش سحر آفریں مرزبوم میں انھیں آئندہ مستقل قیام کے آثار نظر آئے۔ انھوں نے اپنے تاریک ماضی کا آستانۂ ہند کے روشن لیل و نہار

---

[1] یہ مضمون جناب بھگوت ... ایم اے کے مضمون کا ترجمہ ہے جو ... "بابت ماہ اپریل ... میں بعنوان "رگوید کی ... شائع ہوا ہے۔ مصنف نے اپنے خیالات کی تاسیس رگوید کے منقول ... سے کی ہے جہاں ... [illegible] ... سے بالعموم استفادہ نہیں کر سکتے۔

سے موازنہ کیا اور اس زرخیز ملک میں خیمہ زن ہو گئے۔ اب کیا تھا کھلے میدانوں میں شہسواری کے جوہر دکھانے لگے، گھروں کے سامنے گائیں جگالی کرنے لگیں اور وادیوں میں بھیڑوں کے گلے چرنے لگے۔ ان بادیہ گردوں کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ ان کی خوش نصیبی انھیں ایسے عیش وعشرت سے ہم آغوش کرے گی۔ احسان وامتنان سے ان کا دل لبریز ہو گیا، ان کا وجدان نغمۂ ستائش بن کر فضاؤں پر چھا گیا۔ لبھاتے مرتعش سے زمزمۂ ثنا وصفت کائنات نکل کر وسعتِ دہر میں گونجنے لگا۔ احسان مندی کے ان نغموں کا محور ستائشِ افرادِ کائنات تھا۔ ان ترانوں کے زیر وبم نے ان میں جوش وولولے کی روح پھونک دی۔ انھیں یقین ہو گیا کہ مستقبل اُن کے سر پر افسرِ جبروت وسطوت رکھنے والا ہے۔ اگر افرادِ کائنات کے ایک رُخ پر دل فریب، روح افزا، سحر آگیں مناظر منقوش تھے تو دوسرا رُخ ہیبت ناک، ظالمانہ، نفرت انگیز مناظر کی آئینہ داری کر رہا تھا، اس لئے اُن کے تماشائی آریے صیدِ بیم ورجا ہو گئے۔ تاریخِ بنی نوع میں انسان نے پہلی دفعہ اپنے ہم شکل دیوتاؤں کی تخلیق شروع کی۔ سر سروپلی رادھا کرشنن کا قول ہے "کارخانۂ دماغِ انسانی نے جو دیوتا بنانے کا کام کیا ہے اُس کا حال جس صفائی سے رگوید میں ملتا ہے اور کہیں نہیں ملتا۔ یہ دماغِ انسانی کی صبح کی تازگی کا وہ منظر پیش کرتا ہے جسے رواج ورسومِ قدیمہ اور امتدادِ زمانہ کی دست برد آج تک محرومِ حیات نہ کر سکی۔" سرود سرایانِ رگوید نے روزانہ ضروریاتِ زندگی کے حصول کے لئے رحیم وکریم دیوتاؤں کی تعریف میں دلآویز راگ الاپے اور نادانستہ جو گناہ سرزد ہو گئے تھے اُن سے نجات حاصل کرنے کے لئے رودر وغیرہ دیوتاؤں سے معافی مانگی۔ رگوید انھیں آریوں کے بیم ورجا سے مملو مناجاتوں کا مجموعہ اور بنی نوع کا صحیفۂ اولین ہے۔

ادبِ رگوید کے ارتقا کا ہمیں قطعی علم نہیں ہے کیونکہ اس سے پہلے کی کسی انسانی تصنیف تک ہماری رسائی نہیں۔ ولسن نے سچ کہا ہے "جب رگوید اور یجروید کے حصے پورے ہو جائیں گے اُس وقت وہ مسالہ ہمارے ہاتھ لگے گا جس سے ماخوذ نتائج سے ہم کوئی اندازہ بخوبی کر سکیں گے۔ اس مسالہ سے ہندوؤں کی سیاسی ومذہبی حالت کا حقیقی علم حاصل کرنا ممکن ہوگا یعنی اس وقت کی حالت کا جو اولین معاشری تنظیم کی اساس ہے جو طلوعِ تہذیبِ یونان سے بھی مقدم ہے جو عبرانیوں کے قدیم ترین مخطوطات سے بھی قدیم ہے اور جو صرف مصری خاندانوں کے بعد کی ہے۔ مگر ان خاندانوں کی بابت بھی تو ہمارا علم محض چند ناموں ہی تک محصور ہے [illegible] تحقیقاتِ ماضی سے تعلق رکھنے والا نہایت دلآویز مسالہ ہمیں ویدوں ہی میں ملتا ہے۔"

رگویدی سماج کی اساس گھر اور کنبہ ہے جن کے نظام اچھی طرح صورت پذیر ہو چکے تھے۔ ان نظاموں کے [illegible] شادی بیاہ کے آئین مقرر کر دیئے گئے تھے اور جو عورت ان آئین کے مطابق حبالۂ عقد میں لائی جاتی تھی وہ عورت [illegible]

کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ رگ وید میں آیا ہے "بیوی گھر ہے" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت خانہ داری کی زندگی کا مرکز تھی۔

رگ وید سمہتا میں جن دیویوں کا ذکر آیا ہے ان کا مطالعہ ہمیں زمانِ رگ وید کی حالتِ نسواں سے آگاہ کرتا ہے یگیہ میں آہوتی دینے والے رشی اور یگیہ کرانے والے راجاؤں کے محلاتِ شاہی میں حکومت کرنے والی عورت ہی ان دیویوں کے جسم میں روح بن کر حلول کرتی ہے جن کے ضو فشاں پیکروں کو رشی دیوتاؤں کی شریکِ زندگی بنا کر عرصۂ وجود میں لاتا ہے اور جن کی تعریف میں وہ منتر گاتا ہے جو اس کی بے انتہا آرزوؤں اور تمناؤں کے مظہر ہیں۔

اِن دیویوں کی سرتاج اَدِتی ہے۔ اس کے ذریعہ تصورِ اُنثیت کی تشکیل و تجسیم کی گئی ہے۔ یہ مصریوں کی ماتا مات اور یونانیوں کی ماتا تھیمِس کی مانند نمونہ و تمثالِ اُنثیت اور اوصافِ مادری سے متصف ہے۔ جب اس دیوی کا تصور مجرد کیا جاتا ہے یعنی ایسا تصور جس میں اُس کا وجود مادہ سے پاک سمجھا جاتا ہے تو یہی اوصاف مرکزِ خیال رہ جاتے ہیں۔ وہ مِتر اَ ورُن۔ آریَمن۔ رُدر رُوں۔ آدِتیوں۔ اِندر، اور راجاؤں وغیرہ کے سے اقبال مند بیٹوں کی ماں ہے۔ مابعد کا ادب بھی اس کو اس مرتبہ سے محروم نہیں کرتا۔ اَتھرو وید کی ایک مناجات اور وَاجَسَنیِی سَمہِتا میں وہ بھگتوں کی ماں۔ رِت کی بیوی، اور طاقت والی، نہ بوڑھی ہونے والی، تیز حافظہ والی، وغیرہ اسمائے صفت سے یاد کی گئی ہے۔ اتھرو وید اسے بھائیوں اور بیٹوں والی کہہ کر خطاب کرتا ہے۔ محض رِگ وید میں اسے آدیتوں کی بہن اور وَشوں کی بیٹی کہا گیا ہے ورنہ جہاں کہیں اس کا ذکر آیا ہے وہ ہمیشہ آدیتوں کی ماں سے تعبیر کی گئی ہے۔ یہی ایک موقع ہے کہ جہاں اس کے اور آدیتوں کے درمیان بہن بھائی کا رشتہ مانا گیا ہے۔ آدِتیہ مشتق ہے اَدِتی سے اس لئے طبعاً دونوں میں ماں بیٹے کا رشتہ ہونا چاہیئے لیکن رگ وید کے رشیوں کا یہ مقصد نہ تھا کہ وہ دونوں کے تعلقات کی تعیین کریں اس لئے یہاں اس سے مفصل بحث کرنا بے محل ہے۔ صرف اتنا ہی بتا دینا کافی ہے کہ جہاں بھی رشی اس کا ذکر کرتا ہے وہاں اس کو فیض اندوز کے منفعت بخش اعمال سے وابستہ کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رگ وید میں اَدِتی کبھی ماں، کبھی بیوی، کبھی بہن اور کبھی بیٹی کے رنگ میں جلوہ گر نظر آتی ہے اور اس کے دَکش کے ماں اور بیٹی دونوں کہے جانے کا باعث بھی یہی ہے۔ "گھر والی" یہ اسمِ صفت بھی اس کے لئے آیا ہے۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ گھر کی حاکم ہے۔ مگر اس زوجیت میں اُنثیت کی جو جھلک موجود ہے اُسے فراموش نہ کرنا چاہیئے۔

اَدِتی کی پرستش زیادہ تر گناہوں سے نجات پانے کے لئے کی جاتی ہے۔ اس کی یہ روش اس کے نام کے اشتقاق سے تعلق رکھتی ہے۔ لفظ اَ۔دِتی کے سیدھے سادے معنی ہیں نجات۔ آزادی۔ رہائی۔

یہ لفظ دِت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں "باندھنے والی" خود - دِت - مادّہ - دَ - بمعنی "باندھنا" سے بنا ہے اسی فعل کی ایک دوسری صورت (دِ - تَ - باندھا ہوا) رگوید میں اس مقام پر ملتی ہے جہاں ہر شچندر نے قربانیِ انسان (نرمیدھ) کے موقع پر شُنہ شیپھ کو ستون قربانی سے باندھا ہے۔ اسی لئے بھگت آدِت سے دعا مانگتے ہیں "ہمیں رہائی بخش ہم چوروں کی مانند بندھے ہوئے ہیں۔" رشی کہتا ہے کہ "اے اَدِت مجھ سے جو خطائیں وَرُن کی جناب میں ہوئی ہیں مجھے ان سے نجات دلا۔ میں ہمیشہ تیرے ارشادات کی تعمیل کروں گا۔" اس کے بالعکس وہ یہ بھی کہتا ہے کہ "اے آدِت گنہگاروں کو تو اپنی محبت و پناہ سے محروم کر" یہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ اگنی سَوِتر - سُوُرِیَ - اُشا - دُیاوا اور پرتھوی وغیرہ دیوتا فقط گنہگاروں کا گناہ معاف کر سکتے ہیں۔ لیکن اَدِت وہ دیوی ہے جو اپنے بیٹے وَرُن کے ڈالے ہوئے پھانسی کے پھندے کو کاٹ کر انھیں آزاد کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ دیوتا جو انسانوں کو جسمانی تکلیفوں اور برائی پیدا کرنے والے کاموں سے بچانے کا اختیار رکھتے ہیں یہ اختیار اُن کی ماں اَدِت ہی نے عطا کیا ہے۔ رشی اس کے فرزندوں (آدِتیوں) سے عرض کرتا ہے کہ وہ ہَوَن کی چیزوں کو گناہ کے نیست و نابود ہونے اور اَن تَ اَدِت یعنی نجات پانے کے لئے قبول کریں۔ اور مقامات میں اَدِت کو آرزوؤں اور خواہشوں کی پورا کرنے والی کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔

دیوتاؤں اور انسانوں کی یہ ماں یعنی اَدِت بذات خود ایک دنیا، کائنات کا ہیولا اور اس کی خالق ہے، اَدِت ہی آسمان ہے، ماں ہے، باپ ہے بیٹا ہے۔ وہی سارے دیوتا اور پنچ جَن (آریوں کے پانچ شاہی خاندان) ہے وہی گذشتہ اور آیندہ مخلوق کی جننے والی انسان ہے۔ میکس مولر کہتا ہے "اَدِت ایک قدیم ترین لفظ ہے جو لامحدود پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے اُس لامحدود کا پتہ لگتا ہے جو حقیقۃً زمین سے پرے ایک فضائے بسیط ہے۔ جو بادلوں سے بھی پرے، آسمانوں سے بھی پرے ہے۔"

اَدِت نے پرِتھا کو جنا ہے، اسی لئے شاعر اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ وہ اس غیر فانی و لازوال پرِتھا کی ثنا و صفت کرتا اور اسے اُشا سے ملقب کرتا ہے۔ وہ مَرُوتوں کے مانند شفیق ہے۔ رشی اُس سے دعا مانگتا ہے کہ اَدِت اُشا کو اپنی پاک، غیر دنیاوی اور بے حد عطایا کا مورد اور خزائن کا امین بنائے۔ وہ انسانوں اُن کی اولاد اور حیوانوں کی حفاظت کرے۔ بعض منتروں میں اَدِت کو "گائے" سے بھی موسوم کیا ہے۔ اس چشمۂ شیر کو ادب ما بعد میں بھی اَدِت کہا گیا ہے۔ ہندوؤں نے گائے کو ہمیشہ ماں کیوں سمجھا اس کی ایک صحیح وجہ ہے۔ وہ دودھ، دہی، گھی اور مکھن کی کان ہے۔ اَدِت اور گائے ہمیں بے انتہا کھانے پینے کی چیزیں دیتی ہیں، اسی لئے تو رشی نے کہا ہے۔

وَالِس اور اولڈن برگ تو میکس مولر کی طرح اَدِت کو تجسیم نجات ہی مانتے ہیں لیکن پشل اور روی

اور کالینٹ کہتے ہیں کہ نہیں وہ "دیوس" کی بیوی پرتھوی ہے۔ یہ دوسرا مذہب یوں معرضِ وجود میں آیا کہ رگوید میں اور نہیں تو ایک جگہ آدِتی ہی کو پرتھوی مانا گیا ہے۔ آدِتی بھی انھیں ناموں سے آراستہ و پیراستہ کی گئی ہے جن سے کہ پرتھوی۔ آدِتی کو کہیں کہیں "دیوی" سے بھی موسوم کیا گیا ہے، اور یہ لفظ بعد کے ادب سنسکرت میں "دانی" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ آدِتی کا ایک نام "اَنَروا" (غیر منقسم) بھی ہے۔ درحقیقت رگوید نے اسے پوری یا دنیاوی شکل سے آراستہ نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر مقامات میں اس کا تصور محض ذہنی و خیالی یعنی غیر مادی ہو جاتا ہے۔ بعض ہندوستانی تصاویر گلی کی نسبت خیال ہے کہ وہ آدِتی یا پرتھوی کی تصویریں ہیں۔ ہندوستانی صنعت کے یہ مجسمے خیال اُمیت کے مظہر ہیں لیکن ان کی شکلوں میں بھی یک رنگی و ہم آہنگی نہیں۔ اتنی بات ضرور ہے کہ رگوید نے اُن کی جو بالصراحت دنیاوی شکل معین کی ہے وہ ان تصویروں میں بالخصوص نظر آتی ہے "پرجاوتی" (امنوّد) اور "جیونا لمنبٹ" (مدارِ حیات) بھی آدِتی ہی کے نام ہیں، اور اس شکل میں وہ کُل کائنات ذی روح و غیر ذی روح کی زایندہ ہے۔ صبح، شام اور دوپہر اس کی عبادت کے وقت ہیں۔

ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اگرچہ رگوید میں آدِتی کا نام قریب قریب اسّی بار آیا ہے مگر شاید ہی کبھی ایک پوری مناجات (سوکت) اس کے لئے وقف کی گئی ہو۔ ہمیشہ اس کا بھجن اس کے بیٹوں، آدتیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ رگوید میں آدِتی کو سراپا ایک ماں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ اُس کا تعلق اُسکی اولاد سے قطع نہ ہونے پائے اور وہ چشمۂ شیر (ماں) کے رنگ ہی میں نمودار ہو۔ اس صورت میں اس کی انفرادی ہستی کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ دایہ بنی نوع ہے اور بچہ ماں سے کبھی الگ نہیں رہتا۔ ماں اور بیٹے کی حیثیتوں میں کسی فرق و امتیاز کا تصور ناممکن تھا۔ اسی لئے رشی نے نعرہ لگایا "کون ہمیں پاکمٹ آدِتی کی بارگاہ میں پھر پہنچائے گا کہ جہاں والدین کی زیارت نصیب ہو سکتی ہے۔"

دِتی بعد کے ادب سنسکرت میں دیوتاؤں کے حریف "دَیتیوں" کو جنم دینے والی ہے۔ یہ لوگوں کے دماغ میں ایک مہیب ناک صورت اختیار نہیں کرتی۔ اس کے اشتقاق سے خیال ہوتا ہے کہ یہ بعد میں منظر پر آئی ہے کیونکہ آدِتی کے خلاف اس کی شکل دِتی بندش و تابعداری پر دلالت کرتی ہے۔ وہ بخشندۂ نجات ماتا آدِتی کی مخالف قوت معلوم ہوتی ہے۔ اسی واسطے یہ طبعی امر تھا کہ خدائے آزادی آریہ اس کے نام سے زیادہ اعتنا نہ کرتے اور اسی لئے رگوید بھر میں صرف تین مقامات پر اس کا ذکر آیا ہے، اور اس میں بھی دو بار آدِتی کے ضمن میں بعد کے ادب پُران میں دیتیوں کے ماں کے نام سے مخاطب کی گئی ہے۔

آدِتی کی طرح پرتھوی کی پرستش کا باعث بھی اس کے اوصاف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ [illegible] احسان شناس [illegible] پرتھوی کو بھول سکتا تھا جس کے سبب [illegible]

جس کے اُوپر وہ عمر بھر اپنے دشمنوں سے نبرد آزما رہا جس کے گھنے جنگلوں میں اُس نے اپنے فلسفہ کا سنگِ بنیاد رکھا اور بالآخر جس کی نرم نرم خاک میں محوِ خواب جاوید ہو گیا۔ مُردے اسی مادرِ مہر آگیں کے آغوش میں سوتے ہیں۔ اتھروید میں ایک بڑا لمبا بھجن پرتھوی کی تعریف میں گایا گیا ہے جس کی مفصل کیفیت سے ڈاکٹر رادھا کمد نے اپنی تصنیف "متمدن ہند میں سیاست" میں بحث کی ہے۔ رگوید میں بارہا اسے ماں ہی کہہ کر خطاب کیا گیا ہے، اور وہ زمین کے جملہ اوصاف سے متصف کر دی گئی ہے۔ باوجود جسیم ہونے کے وہ پہاڑوں کو سر پر اٹھائے پھرتی ہے۔ وہ زمین کو قوتِ پیداوار بخشتی ہے، اور اُسی کے بادلوں کی بجلی سے مینہ برستا ہے۔ وہ وسیع زمین ہے۔ نباتات کا لباس زیب بدن کرتی ہے، مضبوط ہے، صاف و شفاف ہے۔ وہ غلّہ پیدا کرنے والی ہونے کے باعث آریوں کی زندگی کا سہارا ہے۔

اگرچہ اُس کی ذات میں اوصافِ مادری موجود ہیں تاہم اُس کی روش میں زوجیت بھی پائی جاتی ہے اور اس لحاظ سے وہ اپنے شوہر دِیاوَا (دیوس) کی رفاقت میں آتی ہے۔ دِیاوَا سے اُس کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ اگرچہ رگوید میں شوہر سے بھی زیادہ اُس کا نام آیا ہے مگر تنہا وہ فقط ایک ہی بار منظر پر آئی ہے۔ بالعموم اُس کی پرستش اُس کے شوہر دِیاوَا کے ساتھ کی جاتی ہے۔ دونوں کے متعلق نیچے متواتر منا جاتیں کہی گئی ہیں۔ یہ تعلق اتنا غیر منقطع ہے کہ جہاں کہیں اس کا تنہا ذکر آیا ہے وہاں بھی دِیاوَا کے پس پردہ موجود ہونے کا احساس ہوتا ہے کیونکہ وہاں یہ بھی مذکور ہے کہ اُس کے بادل زمین پر پانی برساتے ہیں بصفتِ مرکب عددی۔ دِیاوَا پرتھوی۔ اور کبھی کبھی دِیاوَا کشاما دِیاوَا بھوم سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ دونوں ماں باپ اور جنم دینے والے ہیں۔ جہاں کہیں اِن دونوں کو الگ الگ مخاطب کیا گیا ہے وہاں ان کے لئے ماں باپ کے لفظ استعمال کئے گئے ہیں اور انھیں دِیوُپِتَر وِل کا نمائندہ مانا گیا ہے۔ وہ سب سے پہلے جاننے اور جننے والے ہیں، اور دنیا بھر میں امرت برساتے ہیں۔ یہ حیثیت مادر و پدر بہت ہی ابتدائی زمانہ میں نظر آتے ہیں۔ بعد میں اِیتَرے برہمن میں دنیاوی رسم و رواج کے مطابق ان کا بیاہ بھی ہو جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رگوید نے ابتدا ہی میں مادر و پدر کی ذمہ داری کا سنگِ بنیاد رکھ دیا تھا اور یوں گھر میں گرہستی کی راحت کے ساتھ ہی ساتھ الفتِ اولاد کا چشمہ بھی جاری ہو گیا۔

دِیاوَا پرتھوی ہی نے ذی روحوں کو پیدا کیا اور وہی اُن کی پرورش کرتے ہیں۔ دونوں ہی میں تخمِ تخلیق ودیعت کیا گیا ہے، دودھ، گھی اور شہد کی بے اندازہ مقدار اُن سے بہتی رہتی ہے، اور انھیں سے دیوتاؤں کی غذا۔ امرت پیدا ہوتا ہے۔ دنیاوی ماں باپ کی طرح اپنے بچوں کی حفاظت کے ساتھ ہی ساتھ وہ ذی روحوں کو مصائب و انحطاط سے بچانے کے بھی ضامن ہیں۔ وہ اُن کی شہرت، عزت اور کھیت اور زمین کو مضاعف کرتے اور انھیں بے اندازہ غلہ اور دولت دیتے ہیں۔ رشی نے اِن دونوں کو "سگی بہنیں" بھی لکھا ہے۔

پرتھوی کا ذکر کچھ اور دیوتاؤں کشیتر (کھیت) اور سیتا (کھیت کی ہریالی) کے نام سے بھی آیا ہے

اور بعد ما یعد میں سیتا کو اِندر کی بیوی بتایا ہے۔ اندر بینہ اور بجلی کا آقا ہے، وہ اپنی بارش کی دھاروں سے ہریالی یعنی سیتا کو سینچتا ہے جس سے وہ تخم قبول اور نباتات پیدا کرتی ہے۔ اسی لئے رگوید ہی میں اِندر کا نام اُروَرا پتی بھی آیا ہے۔ شاید رامائن میں جنک (راجہ) کے سیتا کو کھیت کی ہریالی سے پیدا کرنے کا سبب بھی یہی ہو۔ رگوید کی سیتا غلہ پیدا اور دودھ عطا کرتی ہے۔ رشی سیتا سے عرض کرتا ہے کہ اُس کی نوازش سے آریوں کے ہل زمین کو آسانی سے جوت سکیں اور اُن کے گڈریے بیلوں کو خوش ہو ہو کر چرائیں۔

رگوید کی دیویوں میں سب سے خوبصورت تصویر اُشا کی ہے شاعر کا رباب قلب اس کی قربت سے نوا پرداز ہو جاتا ہے اور اُس کی سنجیدہ آواز سوز و گداز میں ڈوب جاتی ہے۔ میکڈانلڈ کا قول ہے "ویدک شاعری کا بہترین شاہکار اُشا ہے۔ کسی اور زبان کی کتب مقدسہ میں اس سے زیادہ خوبصورت تصویر نہیں۔ برہمت کے علاوں سے اس کی روشنی ماند نہیں پڑتی، اور نہ اُس کی شاعری میں یکسانی ہی کی بو ہے۔" قریب قریب بیس نظمیں اس کی تعریف میں کہی گئی ہیں اور وہ سب رگوید کے بہترین مقامات ہیں۔ اس کا نام اِندر سوما سے بھی زیادہ رگوید میں آیا ہے۔ وہ صبح کے وقت کی دیوی ہے، اور شاعر اُس کے نور کی روشنی میں زندگی اور محبت کو موجزن پاتا ہے۔ وہ آسمان کی بیٹی، روشنی کی رانی، اور گایوں اور گھوڑوں کی بے بہا دولت کو حرکت عطا کرنے والی ہے۔ گرستنوں کی سی اُشا، ہر چیز کی خبر لیتی ہے۔ زندگی میں جان ڈالتی اور سب پاؤں والوں کو چلنے کی طاقت دیتی ہے۔ اسی کی نوازش سے پرندے آسمان میں اُڑتے ہیں۔ وہ سارے عالم کی روح اور جان ہے، وہ ہر شخص کو اُس کے کام کے لئے آمادہ کرتی ہے، وہی دشمن اور دشمنی کا ناس کرتی ہے۔

اُشا سے بڑھ کر مذہب پرست آریوں کا کون خیر خواہ ہو سکتا تھا، وہ خود اُنھیں سوم پیش کرتی ... اور سوم کے پینے کے لئے دیوتاؤں کو آسمان سے اُتار لاتی ہے۔ وہی انسانوں کو دیوتاؤں کی زیارت کراتی ہے، وہی آگ کو مشتعل کرتی ہے، عالم محو خواب غفلت ہوتا ہے مگر وہ سب سے پہلے اُٹھ بیٹھتی ہے۔ وہ گھر گرستنوں کی طرح سویرے اُٹھ کر اپنے آسمانی گھر کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ رات ختم ہونے پر جب اُس کا دروازہ کھلتا ہے تو تاریکی فنا ہو جاتی ہے۔ ہر جاندار، ہر ذی روح میں ہل چل پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ سوتوں کو ہوشیار، اور دوپایوں اور چوپایوں میں جوش پیدا کرتی ہے۔ اُشا جب صبح مشرق میں آ کھڑی ہوتی ہے تو پرندے پروں کے سہارے چہکنے کی اور انسان معاش کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ وہ پانچوں عالموں (جنموں) کو بیدار، انسان کی راہ کو روشن اور دُنیا کو نئی زندگی سے معمور کرتی ہے۔ رات کی سیاہی کو دُور کر کے اس کی سیاہ چادر چھین لیتی ہے۔ پست خیالات اور ظلمت کو مٹاتی ہے۔ ظلمت کے مٹنے سے زمین کے خزانے چمک اُٹھتے ہیں اور اُشا اُنھیں دریا دلی سے لٹاتی ہے۔ اُس کے جسم اُٹھتے ہی آسمان کا کونہ کونہ بقعۂ نور بن جاتا ہے۔

اُشا کی چمکتی آنکھیں ماں کی پیار بھری آنکھوں کی طرح نیچے پھیلتی ہوئی خلقت پر پڑتی ہیں۔ وہ دیوی ہے لیکن جب رشی اسے عورت بنا کر پیش کرتا اور اپنے گھروں میں کھینچ لاتا ہے تو اُس کے حُسن دلفریب کا بیان اُسے بلبلِ ہزار داستان بنا دیتا ہے۔ اُشا کے حُسنِ ملیح سے اس کی نظر خیرہ ہو جاتی ہے اور وہ اسے ماں، بیوی، بیٹی غرض مختلف رنگوں میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ وہ اُسے ایک دوشیزہ سی نظر آتی ہے، جسے اُس کی ماں نے بنا سنوار کر بھیجا ہے وہی طمطمی جلوہ فروشی حُسن کرتی ہے۔ وہ ہر جاندار میں ایک کیفیت پیدا کرتی ہے اور ہر ذی روح کی آواز پہچانتی ہے اسے دیکھکر شاعر کا تخیل تیز ہو جاتا ہے اور وہ اُس کے تصور میں ایک ماہرِ فن رقاصہ بن کر آتی ہے۔ رقاصہ اُشا زرق برق زردوز لباس زیب بر کر کے، جیسے گائے اپنے تھنوں کو پیش کرتی ہے، اپنے پستان کو عریاں کر کے اکھڑی ہوتی ہے۔ رشی نے ایک بہت ہی عمدہ بلند خیال منتر میں اس کی تصویر یوں کھینچی ہے "وہ قدیم، بہت ہی قدیم نوخیز ادہی ہر بعد زرق برق لباس پہن کر آسمان کے مشرقی گوشہ پر کھڑی ہوتی ہے اور انسان کی عمر میں سے ایک دن گھٹا دیتی ہے اس کا عمل چنڈال کا سا ہے جو تھوڑا تھوڑا اکر کے پرندے کو کاٹتا ہے۔" ردائے نور میں لپٹی ہوئی اُشا اُفق مشرق پر کھڑی ہو کر، اپنے ضیائے حُسن سے مشتاقانِ دیدار کو محوِ حیرت میں غیرت کر دیتی ہے، وہ لافانی ہے، ازل سے ضو فشاں ہے آج بھی ہے، اور ابد تک شباب کی اسی آن بان کے ساتھ ضو فشاں رہے گی۔ چمکتے ہوئے سنہرے چاک کی طرح وہ ہمیشہ نئے نئے انداز سے گھومتی اور ہر لحظ انسانوں کی عمر گھٹاتی ہوئی طلوع ہوتی رہتی ہے۔ وہ گذشتہ دورِ مسلسل کی صبح آخر اور آیندہ دور کی پہلی کڑی ہے حُسنِ لاثانی سے آراستہ پیراستہ، اپنا سایہ بے فرق و امتیاز شاہ و گدا سارے عالم پر ڈالتی ہے، بے انصافوں کی طرح سوچ سمجھکر ادھر اُدھر نہیں ڈالتی۔ ابھی ابھی نہائی، نکھری دُلہن سی، جب وہ اپنے شمعِ حُسن روشن کر کے نکلتی ہے تو اندھیرے کا پتہ نہیں لگتا۔ شاعر کا بیان حیرت انگیز ہے۔

یہ اُشا جس رتھ پر سوار ہوتی ہے اُسے چندر رتھ کہتے ہیں، اس رتھ سے نور برستا ہے، خوب سجا ہوا ہے، روپہلی اور چوڑا ہے، اس کو جوتنے کی بھی ضرورت نہیں اپنے آپ جُت جاتا ہے، اسے تیز چمکتے ہوئے لال گھوڑے کھینچتے ہیں۔ وہ بیک وقت سو رتھوں میں بیٹھکر نکلتی ہے

آریہ قوم بالخصوص زراعت پیشہ تھی، اُشا اُن کے گھروں کی ملکہ ہے۔ اکثر اس کا تعلق چوپایوں سے رہا ہے گوشالہ کے دروازہ کی طرح وہ بھی اندھیرے کے لئے راستہ بناتی ہے۔ اس کی کرنیں گائیں معلوم ہوتی ہیں وہ جانوروں کو لئے جاتی ہوئی دُور سے نظر آتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ لال کرنوں کا رخ آدمی کی طرف ہے۔ لال گائیں جُت رہی ہیں، اور بیر بہوٹی سی لال اُشا ہمیشہ کی طرح اپنی روشنی کے تار و پود بنتی رہتی ہے۔ صبح ہی گائیں اپنے باڑے سے باہر نکالی جاتی ہیں اس لئے شاعر اُشا کو ماتا گو، اُم کہتا ہے۔

اُشا ہر روز راستہ پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ دیوتاؤں کی روش کے خلاف کبھی نہیں چلتی، اُس سے اس دستور پر عمل کرنے میں کبھی خطا نہیں ہوتی۔ وہ تیز دوڑتی ہوئی اپنے راستہ پر چلتی ہے، تاکہ سورج اُسے دشمن یا چور کی طرح جھلس نہ دے۔ صبح کے وقت اُس کے آتے ہی دیوتا بھی سوم پینے کے لئے آجاتے ہیں۔ اُشا سورج کے لئے راستہ بناتی ہے اور اُس کو افق پر لاکر اس کے خوبصورت بے عیب گھوڑوں کو راہ بتاتی ہے، اپنی ہستی کو فنا کرنے والے سورج کی چمک سے چمکتی ہے، جیسے دوشیزہ کے پیچھے پیچھے نوجوان چلتا ہے، اسی طرح سورج بھی اُوشا کے پیچھے چلتا ہے، اور بالآخر وہ اس پیچھا کرنے والے مشتاق دیوتا کے ہاتھوں میں اپنی جان سونپ دیتی ہے۔ اُشا کا تصوّر سورج کی بیوی اور ماں دونوں شکلوں میں کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں وہ اس کی لڑکی اور بہن بھی مانی گئی ہے۔ وہ بھگ کی بہن اور ورُن کے خاندان سے ہے۔ کبھی کبھی اُشا اور راتری (رات) دونوں کا استعمال صفتِ مرکب عددی کے ذریعہ ہوا ہے، دونوں بہنیں ہیں لیکن اُشا پہلے پیدا ہوئی ہے۔ آسمان سے پیدا ہونے کی وجہ سے اُشا دیوس کی بیٹی ہے اور بادل کے آغوش میں آرام کرنے کے باعث وہ اس کی محبوبہ ہے چونکہ اگنی بھی سورج کی ایک شکل ہے اس لئے اس کو بھی اس کا فنا کرنے والا کہتے ہیں۔ اگنی، خونیں رنگ اُشا سے ملنے جاتا ہے اور اس سے اچھی اچھی چیزیں مانگتا ہے۔ اُشا کا تعلق اشونی کماروں اور سوم سے بھی ہے۔

رشی اُشا سے ہمیشہ عرض کرتا ہے کہ وہ نیکوں کو آل اولاد اور دھن دولت سے مالامال اور اُن کی عمر دراز کرے اور آسا اُشا کی تعریف کرتا اور اس سے مہرِ مادری کی بھیک مانگتا ہے۔ اُشا مُردوں کی روحوں کو اپنی پناہ میں لیتی ہے اور پتر اس کی گود میں بیٹھتے ہیں۔

راتری (رات) کی تعریف میں ایک ہی بھجن ہے۔ وہ بھی اُشا کی طرح آسمان کی بیٹی کہی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وید میں رشیوں نے دیویوں کو جس رنگ میں چاہا جلوہ گر کر دیا۔ آریہ زندہ دل تھے، افسردگی اُن سے کوسوں دور رہتی تھی، اسی لئے راتری بھی اُن میں درد، دکھ اور خوف وہراس پھیلاتی نہیں آئی۔ وہ اس کے تاریک رُخ کا نظارہ نہیں کرتے، صرف تاروں سے چمکتی رات ہی کا بیان کرتے ہیں۔ عقدِ ثریا کی طرح راتری کی بہت سی آنکھیں جگمگ جگمگ کرتی رہتی ہیں، اور ان کی روشنی سے قصروں کی چھتیں اور پہاڑوں کی چوٹیاں چمک اُٹھتی ہیں اور اندھیرا موت کے گھاٹ اُتر جاتا ہے۔ اس کے آنے سے انسان اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے اور پرندے اپنے گھونسلوں کی طرف پر فشاں ہوتے ہیں۔ جہاں اُشا اور راتری کا ساتھ ساتھ ذکر آیا ہے وہاں گرستھ جیون کی اُلفت کا منظر آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ یہ دیویاں جو لافانی دوشیزائیں ہیں دیوس کی لڑکیاں ہیں کہیں کہیں انھیں "شیر ریز" کہہ کر ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ شاعر رگ وید جب ایک بار تصورِ نسوانیت کو پیش کر دیتا ہے پھر وہ اُس کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالتا ہے اور اس کی سبھی حالتیں دکھاتا ہے۔ مثلاً دوشیزہ، مرشلا الفت ہوی

اور دودھ پلانے والی ماں وغیرہ۔ اسی طرح اُشا اور رات دونوں سوتیں ہیں مگر ایک ہی بچے کو دودھ پلاتی ہیں۔
" وہ دونوں بہنیں ہیں، دونوں کے دل ایک سے ہیں، صرف رنگ کا فرق ہے، ایک ہی نہ ختم ہونے والی راہ پر چلتی ہیں۔ دونوں کو دیوتاؤں نے تعلیم کیا ہے، باری باری سے حرکت کرتی ہیں مگر متصادم نہیں ہوتیں، اور نہ ایک لمحہ کے لئے سکون آشنا" دونوں ہی کائنات کے موسموں کی خالق ہیں، اپنی چمکتی کرنوں سے آہوتی کو لے جاتی ہیں۔ اور یگوں کے تاروں کو بنتی ہیں، خوبصورت ہیں اور ہر طرح سے آراستہ، اور یگ کی چیزوں کے بینے کو میدانوں میں بھیجتی ہیں۔ باری باری سے آکر جانداروں کو جگاتی ہیں۔

سُوریا آریوں کی بہو کا نمونہ ہے۔ بہو کے دھرم رشتے آج بھی ہندوؤں کا نصب العین ہیں۔ سُوریا کے بیاہ کے وقت جو منتر گائے گئے تھے اور رگوید میں لکھے ہیں وہی ہندوؤں کے بیاہوں میں اب تک گائے جاتے ہیں۔ سُوریا سورج کی روشنی ہے اسی وجہ سے اُسے اُس کی لڑکی کہا ہے۔ رگوید میں اُس کا بیاہ چاند سے ہوتا ہے۔ مقصد یہ کہ آریوں کو معلوم تھا کہ چاند سورج سے کسب ضیا کرتا ہے۔ روشنی کے اسی نقل مکان کرنے کو یوں بیان کیا ہے کہ سورج کی بیٹی کا بیاہ چاند سے ہوا ہے۔ اس تصور سے آریہ شاعر کے دل میں کچھ بہت ہی اچھے اچھے خیال پیدا ہوئے ہیں۔ سوریہ کا باپ ہونا تو طبعی ہے کیونکہ سُوریا یعنی روشنی سورج ہی سے پیدا ہوئی ہے اور چونکہ وہ اپنے باپ کے گھر سے چاند کے گھر جاتی ہے، سُوم (چاند) کو اس کا شوہر مان لیا گیا ہے۔ رگوید میں سُوریا کا سوم سے بیاہ ہوتا ہے، اس کے بعد جھٹپٹے کے دیوتا اَشونی کمار اُسے صبح و شام رتھ پر بٹھا کر سُوم کے گھر لے جاتے ہیں۔ مقصد یہ کہ دن اور رات کے ملنے کے وقت سورج کی روشنی پھیلتی اور رخصت ہوتی ہے۔ یہ سوریہ اپنی لڑکی سُوریا کو دان میں دیتا ہے۔ سُوم عاشق ہے، اَشونی کمار نہیں ہیں۔ بیاہ کے بعد جب سوم اُس کا شوہر بن چکتا ہے تب کہیں اَشونی کماروں کو اس کا شوہر بننا نصیب ہوتا ہے۔ ایک اور جگہ کہا گیا ہے کہ دیوتاؤں نے اُسے پُوشن کو دیا تھا۔ اکثر اَشونی کماروں ہی کو سُوریا کا شوہر کہا گیا ہے۔ وہ اُس کے دو شوہر کہلاتے ہیں جنھیں اُس نے خود پسند کیا ہے۔ آوارہ سُوریا ان کا رتھ قبول کر کے اس پر سوار ہو جاتی ہے۔ سُوریا، اَشونی کماروں کی سرشار محبت شوہر زوجہ ہے جسے وہ رتھ پر بٹھا کر لے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ سُوریا کے لئے لفظ اَشونی بھی آتا ہے۔

اِندرانی اِندر کی طاقت والی بیوی ہے۔ اُسے شچی اور پُولومی بھی کہتے ہیں۔ وہ ہندوستانی بیوی کا نمونہ ہے۔ گھر میں اُسی اُسی کا راج ہے، گھر جسم ہے تو وہ اس کا دماغ ہے، اس کا شوہر اُسی سے قوت حاصل کرتا ہے اس پر مٹا ہوا اور اُس کا رضا جو ہے۔ اُس کے لڑکے دشمنوں کو مارنے والے اور اُس کی بیٹی دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ ایک بہت ہی دلکش مناجات میں اس کی عالمگیر قوت بیان کی گئی ہے، وہ کہتی ہے " میری کوئی سوت نہیں، میں نے اُن عورتوں کی دولت کا ستیاناس کر دیا جو مجھے نقصان پہنچانا چاہتی تھیں۔ کوئی انسان مجھے نہیں پا سکتا۔

وہ اپنی سوتوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ رگوید کے بہترین بھجنوں میں وہ بھجن ہے جو امبھرن کی بیٹی واک کی زبان سے ادا ہوا ہے۔ اس بھجن کی رشی خود واک ہے۔ وہ خود قوتِ نطق ہے یعنی کلام کی دیوی۔ اس کی معرفت ترنم ریز منتروں میں وحدتِ عالم کا راز بے نقاب کیا گیا ہے۔ وہ کہتی ہے "میں ہی رُدر کی کمان چڑھاتی ہوں تاکہ ملاحدہ کو مار سکے۔ میں ہی جنگ و جدل کے ساز بجتی ہوں، زمین و آسمان میں محیط ہو جاتی ہوں، میں اپنے باپ سورج کو افقِ عالم پر لاکر جلوہ گر کرتی ہوں، میں سمندروں میں رہتی ہوں اور وہاں سے اُٹھ کر دنیا کے کونے کونے میں پھیلتی ہوئی آسمان کو جو میرے سر سے بہت ہی دور ہے اپنے سر سے سہارا دیتی ہوں، میرے سانس سے جو جھونکا نکلتی ہے اس سے ایک بہت ہی مہلک چیز پیدا ہوتی ہے لیکن میں تمام دنیا کی پناہ بن کر اس سے دنیا کا خاتمہ نہیں ہونے دیتی۔ بہت ہی طاقتور واک اُس دنیا سے آتی ہے جو آسمانوں سے پرے، اس دنیا سے پرے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زمانِ مابعد کے ویدوں کا کلام ویدوں سے پہلے کا ہے اور میں وِشو دیوؤں کے ساتھ ساتھ سارے عالم میں پھیل جاتی ہوں۔" وہ اس دنیا کی قوت، سب سے پہلی قوت ہے اور برہم کے ساتھ مارنے اور پیدا کرنے میں اس کا ہاتھ بٹاتی ہے گویا اس کی بیوی ہے۔ اس کے بارہ میں جو مناجات ہے اُسی نے زمانۂ مابعد میں شاکت مذہب پیدا کیا۔ سر سرویلی رادھا کرشن کہتے ہیں کہ واک وہ قوت ہے جو پرماتما کے اندر سے آسمان سے لیکر زمین تک کے سارے عالموں کو نکال کر باہر رکھتی ہے۔ واک کا محیطِ کل آتما سے اس طرح کا جو تعلق رگوید میں نظر آتا ہے وہ بعد میں اُس وحدت کی تخلیق کا باعث ہوتا ہے جو بعد کے ہرگوری کی وحدت کے نصب العین میں مضمر ہے۔ اس بھجن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دیوی کو نظامِ عالم میں اعلیٰ رتبہ حاصل ہے۔ اس کا تصور حقیقت سے معرا نہیں کیونکہ پیدا کرنے اور مارنے کے کام میں قوت سے عاری تنہا برہم کا تصور دشوار ہے۔ رگوید کے ایک منتر میں تو یہاں تک آیا ہے کہ وہ دیوتاؤں کی رانی ہے۔

اِلا، سرسوتی اور بھارتی مخزنِ مسرت و انبساط ہیں۔ بلحاظ اعمال اِلا انسان کی معلمۂ اولین ہے۔ اس نے انسان کو یگ کے اصول سکھائے ہیں، وہ مذہبِ ویدی کی اولین پروہت ہے، چونکہ گھی سامانِ یگ میں خاص چیز ہے اس لئے اِلا کو "گھی کے سے ہاتھوں والی" اور گھی کے سے پاؤں والی کہا گیا ہے۔ وہ سرسوتی اور بھارتی کے ہم مرتبہ مانی گئی ہے۔ اس کے بھی طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ ماؤں کا سا ہے۔ اگنی کو یگ کی چیزیں دیتی ہے اس لئے اسے اگنی دیوتا کی ماں بھی کہا گیا ہے۔ وہ انواع کی بھی ماں ہے۔ اُروشی سے بھی اس کا تعلق بتاتے ہیں۔ زمانِ مابعد میں وہ منو کی بھی بیٹی بنتی ہے، اور اس کا نام میترا ورن کی بیٹی بھی ہو جاتا ہے۔

سرسوتی: پاک کرنے والی ہے وہ ہندوستان کے منروا (یونانیوں کی ایک دیوی) ہے جس نے ودا دیز

موسیقی کو پیدا کیا اور جس سے سارا تخیل پاک اور روشن ہو جاتا ہے، وہ ہر قسم کے علم، فلسفہ، تخیل اور ایجاد کو جنم دینے والی، فنونِ لطیفہ کی محافظ ہے۔ اکثر اس کا تعلق ہندوستان کی سرسوتی ندی سے بتایا گیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ ایک منفرد ہستی کی مالک ہے۔ کیونکہ وہ اِلا، بھارتی اور مہی وغیرہ میں سے ایک ہے اور یہ دیویاں غیر مجسم ہیں اور ان کا تعلق انسان کے اعمالِ دماغی سے ہے۔

بھارتی اظہار و انکشاف کی دیوی ہے، اس کی ذات میں "کیفیت و صدا" مجتمع ہیں۔ مہی اور بھارتی شاید ایک ہی دیوی کے دو نام ہیں۔ ہوترا مشابہ ہے یا وَنا یعنی اگنی کی بیوی کی وَرترِی وہ جو پسند کی جاتی ہے، جس کی خواہش ہوتی ہے۔

سَرنیو۔ توشٹا کی بیٹی وِوَسوان کی بیوی اور ابتدائی جوڑے بھائی بہن یَم اور یَمی کی ماں ہے۔ بلوم فیلڈ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہی سوریا یا اُشا ہے، اور میکڈانلڈ اس رائے سے متفق ہیں لیکن یہ اثبات وحدتِ محکِ تنقید پر کسنے سے ساقط العیار ثابت ہوتا ہے۔ خود رگوید میں سرنیو کو سوریہ (وِوَسوان) کی بیوی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بلکہ زمانۂ مابعد کے ادب میں تو یہ کہانی ملتی ہے کہ سوریہ کی روشنی سرنیو سے برداشت نہ ہوتی تھی اس لیے اس کے باپ توشٹا نے اس کے چھلکے کو تھوڑا سا رَیت کر اس کی چمک کچھ کم کر دی۔ اس کے بعد ہی میاں بیوی کا ایک جگہ رہنا ممکن ہوا۔

سِنی وَالی اور رَاکا دو دیویاں ہیں جو اولاد کے پیدا ہونے میں مدد کرتی ہیں۔ گُنگو انھیں کے طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ سِنی وَالی کو دیوتاؤں کی بہن بھی کہا ہے، اولاد کی خاطر اس کی تعریفیں کی گئی ہیں۔ رگویدی شاعر اس سے خاص طور سے محبت رکھتے ہیں، اور اس کے اعضا کے بیان میں خوب خوب طبع آزمائیاں کی ہیں۔ اس کے کولہے چوڑے چکلے، بازو خوبصورت، انگلیاں سڈول ہیں، وہ گھر کی رانی ہے۔ یجروید کا شاعر اس سے بھی زیادہ اس کی طرف متوجہ نظر آتا ہے۔ وہ اسے خوبصورت چوٹی، دلکش جوڑے اور دلربا زلفوں والی کہتا ہے۔ شاید یجروید کے اسی بیان کو پیشِ نظر رکھ کر موریا خاندان سے پہلے کا صناع اپنی مٹی کی مورتوں کو زلف گرہ گیر، خوبصورت چوٹی، چوڑے چکلے کولہوں اور پتلی کمر سے آراستہ پیش کرتا ہے۔ یہ تصاویر گُنگو، سِنی والی، اَدِتی اور پرتھوی کی تشکیل مانی گئی ہیں۔

رَاکا جس کی تعریف سِنی والی، سرسوتی، گُنگو اور دِھشنا کے ساتھ ساتھ کی گئی ہے، دولت مند اور رحم دل ہے۔ وِرھَدِوَا کا نام ویدوں میں چار بار آیا ہے، وہ بھی اِلا، سرسوتی اور رَاکا کے ساتھ ہی ساتھ وجود میں آئی ہے، اسے ماں بھی کہا گیا ہے۔

سُنرِتا۔ پُرندھی اور دِھشنا۔ دولت و ثروت کی دیویاں ہیں۔ پُرندھی تو زندادستا کی دولت کی

ی یا رَشیندرِ ہی کا سا نام معلوم ہوتا ہے۔ دِھشنا کا ذکر رگوید میں قریب قریب بارہ دفعہ آیا ہے۔ اسمتی
ی بخشتی ہے اور آریوں نے اس کی تعریف عمر، قوت اور توانائی کی خاطر کی ہے۔ رَتریت بوڑھاپے۔ شکار
ورت وغیرہ کی دیوی ہے۔

اِن دیویوں کے علاوہ رگوید نے کچھ ایسی دیویوں کا بھی ذکر کیا ہے جو جسمانیت سے معرا ہیں۔ یہ دیویاں
شرَدھا۔ اَنُمتِ۔ اَرمتِ اور دَمُنیتِ ہیں۔ شرَدھا اس بے حد خواہش کا نام ہے جس کا مقصد دیوتاؤں
نزدیکی حاصل کرنا ہو۔ سب آہوتی اور یگ وغیرہ کے اور کام شرَدھا سے ہی ہونے چاہئیں جس یجن میں وہ شریک
وہ فضول ہے۔ بغیر اس کے منتروں کا جپنا محض بکواس ہے۔ شاعر کہتا ہے " شرَدھا سے آگ روشن کی
جاتی ہے اور اسی سے یگ کی چیزیں دی جاتی ہیں"۔ یگ کرنے والے اس سے استغنا نہیں برت سکتے کیونکہ اسی
بدولت دعائیں درِ قبول تک پہنچتی ہیں لیکن شرَدھا پر قابو پانا دشوار ہے۔ یہ دل کے اضطراب بے پایاں
حاصل ہوتا ہے۔ اسی واسطے شاعر کہتا ہے کہ تو اپنی نوازش سے میری آرزوؤں کو پورا کر۔ اس کی عبادت صبح
دوپہر اور رات کو کی جاتی ہے۔ زمانۂ مابعد میں اُسے سُورَیہ اور بِرہما کے خاندان سے وابستہ کر دیا ہے۔ اور
برہمن اور پُرانوں میں اس کے دیگر تعلقات کا بھی ذکر ہے۔ اَنُمتِ دیوتاؤں کے رحم و کرم کی تجسیم ہے
لیے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ ہمیں عمر دراز عطا کر۔ حفاظت اور پرورش کے لئے اس کی پوجا کی جاتی ہے
ی کی طرح اعتقاد و خیرات کے سے غیر مجسم خیالات کو مادّی جسم سے آراستہ کرنے کے لئے اَرمتِ دیوی
پیدا ہوئیں۔ میکڈانلڈ کہتا ہے کہ یہ وہی ہے جسے زند اَوستا میں اَرمیتِ کہا گیا ہے " وہ زمین اور
عقل کی دیوی ہے"۔ مگر میکڈانلڈ یہ بھی کہتا ہے کہ اس کے مادّی جسم کا اُس زمانہ میں پتا نہیں چلتا جب کچھ
رہے منقسم ہوکر ہندی اور ایرانی نہ بنے تھے۔ آریوں کے ذہن میں " محبت" دَمُنیتِ کے رنگ میں جلوہ گر
ہوتی ہے اَگستی۔ رشی کی بیوی لُوپا مُدرا نے دَمُنیتِ کے بارہ میں ایک سُوکت کہا ہے۔ لُوپا مُدرا (یعنی
انگشتری عشرت جس سے مراد ہے خواہش۔ جاتی رہی) رَت کی تعریف میں شوکت نہ کہتی تو اور کون کہتا۔
پرِتھشنی ایک اور لفظ ہے جو ماں کے لئے آتا ہے۔ آریہ رشی نے اسے ہوا اور بادلوں سے وابستہ
اور " منقش گائے" سے مخاطب کیا ہے۔ اسے مَرُوتوں کی ماں کہا گیا ہے۔ اَرَنیانی جنگل کی دیوی ہے یعنی جنگل
کے نباتات کی مالک، رحم دل کبھی کسی کو نہیں مارتی، اور اسی کے درختوں کے خوش ذائقہ میوے انسان کھاتا
ہے۔ یہ عطر بیز دیوی جنگل کے سب جانوروں کی ماں ہے جس کے فیض سے بن بوئے بن جوتے کھانے
کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ ایک پورا سوکت اس کی شان میں کہا گیا ہے۔ اسی طرح وَرُن کی بیوی وَرُنانی اور اگنی
کی بیوی اَگنایانی بھی دیویاں ہیں جو ماں سے خطاب کی گئی ہیں۔

ان دیویوں کے بعد اُن ندیوں کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے جن کو شیدائے فطرت آریوں نے ماں تصور کر کے اُن کی تعریف کی ہے۔ ایک پورا بھجن "ندی دیوتاؤں" کے لئے وقف ہے۔ ان کے نام اور بھجنوں پر بھی آئے ہیں۔ اکیس ندیوں کے ناموں میں سے انھیں اہمیت حاصل ہے:۔ سَرَسْوَتی۔ سِندھ۔ وِپاشا۔ پَرُشنی۔ آسِکِنی۔ مَرُوْدْ وُرْدھا۔ وِتَسْتا۔ اَرْجِیکِیا۔ کُبھا۔ کُرُمُ۔ گومتی۔ سُشُوما۔ شُتُدْرِ۔ دِرِشَدْوَتی۔ جمنا۔ گنگا اور سرجو۔ سَرَسْوَتی کے باب میں اظہار جوش کی حد نہیں رہی۔ رگوید کے تین پورے بھجنوں میں اور بے انتہا دیگر مقامات پر اس کا ذکر آیا ہے۔ اس کے راستہ اور روانی کے اشاروں کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ مادر مہربان سمجھ کر اس کی پرستش کی جاتی ہے۔ آریہ اس سے دعا مانگتا ہے کہ "اے ماں، ہم ہمیشہ تیرے چشمۂ شیر سے فیض یاب ہوں وہ کبھی کم نہ ہو۔" اس کی سات بہنیں ہیں، وہ ندیوں اور دیویوں کی ماں ہے۔ وہ سَرَسْوَان نامی ایک جری دہاور کی بیوی ہے۔ جنھیں عورت، اولاد، حفاظت، اور قوت وثروت کی آرزو ہے وہ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ یگ میں پتروں کے رتھ میں سوار ہو کر آتی ہے، وہ پاک کرنے والی ہے، اور آریہ اس سے دولت۔ اولاد۔ بقا اور قوت بخشنے کی دعا مانگتا ہے۔ ان دیوتاؤں سے بھی اس کا رشتہ ہے جنھیں کائنات سے تعلق ہے، چونکہ اس نے وَدھیَرشْوَ کو دِوُوَداس نامی بیٹا عطا کیا تھا، شاعر نے اس کی تعریف کا راگ الاپا ہے۔ بہ حیثیت مادر اس سے چشمۂ فیض جاری ہے۔ اور اُس کے پستان سے دولتِ بیکراں پیدا ہوتی ہے۔ دولت وقوت کی بخشنے والی ہے اس لئے اس کا ایک نام سُبھَگا بھی ہے۔ اپنے پرستاروں کو دولت اور قوت سے بہرہ ور کرتی ہے۔ اس کی پرستش وَنْدَنا کی دیوی کے ساتھ ساتھ بھی کی گئی ہے۔ دیوتاؤں کے دشمنوں کو تباہ کرتی ہے۔ اپنے پرستاروں کی حفاظت اور اُن کے دشمنوں کو شکست دیتی ہے۔ سَرَسْوَتی اور دِرِشَدْوَتی کے کناروں پر یگ کی رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ رگوید نے اس کے بعد کی صورت (یعنی فنون لطیفہ کی دیوی) جو پیش کی ہے وہ اِلّا اور بھارتی کا مجموعہ ہے۔ واجسینی سَمہتا اور برہمنوں نے بالکل صاف طور سے اس کا تعلق واک سے قائم کر دیا ہے۔

رگوید میں اَپسَراؤں کا بھی ذکر آیا ہے جو تصورِ مادری کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ ان کا پانی سے تعلق ہے۔ رگوید سمہتا میں صرف پانچ بار ذکر آیا ہے۔ اَپسَرا اپنے آشنا گندھرو کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے۔ یون سمہتا ہی میں اس کا دامن گندھرو سے باندھ دیا گیا ہے، اور ان کا حسن فروش بازاری ہونا بھی ثابت ہے۔ تاہم ان کا بیٹا وَسِشٹھ سا ہے۔ اس کا مسکن بلند ترین آسمان ہے اور اس کی گل گشت آسمانوں ہی میں ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد براہمن میں اَپسَراؤں کا پیشہ رقص وسرود وغیرہ سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ ان کی عشوہ فروشیوں کے مورد صرف گندھرو ہی نہیں ہیں، کبھی کبھی انسانوں تک بھی ان کی

تجلیاں پہونچ جاتی ہیں۔ رگوید میں ان کے نام نہیں بتلائے گئے ہیں صرف اُرُوَشی کا نام ملتا ہے۔ ذکر کچھ مبہم سا ضرور ہے لیکن وسشٹھ کو ایک جگہ اُروشی اور ایک جگہ اپسرا کا بیٹا بتایا ہے۔ اس سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اُروشی مشہور اپسرا ہی کا نام ہے۔ رگوید میں اُروشی اور پُرُورَس میں ایک پرلطف مکالمہ درج ہے۔ پُرُورَس پہلے تو اُروشی کا آشنا تھا بعد میں اسے عزتِ شوہری حاصل ہوگئی۔ شت پتھ براہمن میں یہ کہانی بالتفصیل ملتی ہے، اور ملک الشعراء کالی داس نے اسی قصہ سے اپنی تصنیف "وکرمورو شی" کے لئے سامان بہم پہونچایا ہے۔

بنی نوع کے قدیم ترین صحیفہ رگوید میں دیویوں کو غیر معمولی رتبہ دیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں وہ ہیبت ناکی اور شوق نبرد آزمائی نہیں پایا جاتا جو اُن کے شوہروں اور بیٹوں کی خصوصیت ہے۔ مگر یہ چیزیں اُن میں پائی کیونکر جاتیں، اُن کے نازک خیالوں کی جلوہ گاہیں تو صحنِ خانہ تھے۔ دیوتا درحقیقت کیا ہیں، وہی آریہ جو ہمیشہ اپنے بے شرم دشمنوں سے لڑتے اور انھیں موت کے گھاٹ اتارتے رہے۔ لیکن دیویاں وہ نازنینانِ حور وش تھیں جو دل کی امنگوں اور ترنگوں پر قابو رکھتی تھیں۔ یہ خیال قطعی خلاف قیاس ہوگا کہ چونکہ ان کے نام دیوتاؤں کے نام میں اضافہ کے ذریعہ مشتق ہوئے ہیں اس لئے وہ قابلِ التفات نہیں، علیٰ ہذا یہ بھی درست نہیں کہ چونکہ ان کی قوت انسانی دیوتاؤں سے کم ہے اس لئے وہ کسی توجہ کی مستحق نہیں۔ ان کی اہمیت اسی سے ثابت ہے کہ اکثر ایسا دیوتا آریہ رشی کے تصور میں بھی نہیں آتا جس کی ازدواجی زندگی اس کے ذہن میں نہ آسکے۔ راکشس وِرِتر تک کو اس نے دَنُن نامی ایک "ماں" عطا کی ہے۔ قصہ مختصر جو جو باتیں آریہ رشی کو اوصافِ نسوانی سے تعلق رکھنے والی نظر آئیں انھیں فوراً دیویوں کے جسم عطا کر کے منظرِ عام پر لے آیا۔ اِندر کی حکومت خانہ کی حاکم اس کی بیوی اِندرانی اپنے شوہر کی چشمۂ قوت ہے۔ واگ دیوی (دیویِ نطق) کی قوتِ ناطقہ تو دنیا کے ادبِ مذہبی میں ایک لاثانی چیز ہے۔ حتیٰ کہ ادبِ مابعد میں بھی اس کا پتا نہیں لگتا۔ اِسی طرح اَشا دماغ انسانی کا ایک وقت بہت ہی لطیف اور بہت ہی زبردست تخیل ہے۔ اَشا درحقیقت شاعری ہی کی مخلوقہ ہے۔ آدِت سارے عالم اور دیوتاؤں کی ماں ہے اور پرتھوی اپنے شوہر دِیَوس سے کہیں طاقتور ہے۔ سَرَسوتی جملہ فنونِ لطیفہ کی دیوی اور ان کا انصرام کرنے والی ہے۔ دُندُنا دیویوں کا رنگ اختیار کرتی ہے اور اگرچہ ان کی پوجا دیوتاؤں کی خاطر ہوتی ہے تاہم یگوں میں جن کی پرستش کی جاتی ہے وہ دیویاں ہی ہیں۔ یگ میں صرف دیوتا ہی نہیں بلائے جاتے بلکہ یگ کے تیار ہوتے پر رشی اگنی سے عرض کرتا ہے کہ سوم نوش کرنے کے لئے دیویاں بھی دیوتاؤں کے ہمراہ تشریف [illegible] حد تک اس کا باعث یہ بھی ہے کہ یگ میں دیوتاؤں سے رونق افزوزی کی استدعا کرنے والے صرف [illegible] ہوتے جو یگ کرتے ہیں بلکہ اُن کی محرمات بھی ہوتی ہیں اس لئے یہ امر طبعی ہے کہ دیوتاؤں کے ساتھ ان کی بیویاں بھی یگ میں شریک ہوں۔ اس طرح کی دعوت میں کوئی بات خلاف نہیں یہ دستور کے موافق [illegible] بیٹھنا

(توشٹا) کو مدعو کیا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ اگنی سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ دیوتاؤں کی بیویوں کو بھی بھیجے۔ اس کے بعد نہایت لجاجت سے اس طرح عرض کی جاتی ہے کہ وہ ہوترا۔ بھارتی۔ ورتری۔ دھشنا وغیرہ دیویوں کو بھی دعوت شرکت دے۔ سوم رس پینے کے لئے اِندرانی۔ ورُنانی۔ اور۔ اگنیانی بھی بلائی جاتی ہیں۔

لیکن اس کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ رگویدی دیویاں ضرورت سے زیادہ آزاد بھی نہ تھیں۔ ان کی حد تھی، اور وہ اس حد سے باہر قدم نہ نکالتی تھیں جس طرح زمین پر مرد آریوں کی بیویاں اپنے شوہروں کے زیر سایہ گھر میں حکومت کرتی تھیں، اسی طرح اُن کی آسمانی بہنیں اپنے شوہر دیوتاؤں کے زیر فرمان کاروبار خانہ داری میں مصروف رہتی تھیں۔ بہت ہی خودسر اور بندۂ خواہش اُشا تک کا تصور بھی بس اتنا ہی ہے کہ وہ ایک طاقتور باپ کی بیٹی، ایک زبردست شوہر کی محبوبہ، اور ایک اقبال مند فرزند کی ماں ہے۔ بہت ہی مغرور اِندرانی تک کا شوہر دلاور لشکر (اِندر) ہے۔ اس سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سرشار مذہب آریوں کے مذہبی میدان میں ان کی محرمات ہر فعل میں ان کے دوش بدوش رہتی تھیں۔

بسنت

(از مولانا نشور واحدی کانپوری)

جب سے کہ رُت بسنت کی جاڑوں میں آئی ہے — سرسوں کی طرح دل کی فضا لہلہائی ہے
یہ امتزاجِ حُسن دو عالم دُہائی ہے — بدلی بھی چھائی اور جوانی بھی چھائی ہے
سر تا قدم شباب کی تنویر چھائی ہے — جیسے کہ آب و گل میں کرن پھوٹ آئی ہے
رنگیں جوانیوں میں جو وہ کھیلتے ہیں رنگ — ہولی نہیں یہ دل کی فغاں رنگ لائی ہے
دل میں نہیں تڑپ تو نگاہوں میں کچھ نہیں — دل کی تجلیوں سے نظر جگمگائی ہے
تابِ نظارۂ گل و گلشن نہیں مجھے — جیسے کہ چوٹ میں نے تبسم سے کھائی ہے
ہر جلوہ کائنات کا محوِ سجود ہے — میں تو یہی کہوں گا جوانی خدائی ہے
دونوں طرف لطیف تبسم کی چھیڑ ہے — ظالم جوانیوں کی کلی مسکرائی ہے
بھولا ہوا فسانہ بھی دُہرا رہی ہے رُت — موسم کے ساتھ یادِ جوانی کی آئی ہے
مے پی تو فکرِ سود و زیاں پھر کہاں رہی — یوں بھی نشور ترکِ جہاں پارسائی ہے

منجھلی دیدی

(ایک مسلسل افسانہ)

(از حضرت بیتاب بریلوی بی۔اے۔ ایل ایل بی)

اُما نے باہر سے آ کر کہا "اماں! کل کشنو ماما تقاضہ کرنے نہیں گئے، اور تمہارے پاس آ کر بیٹھے رہے اس لئے کاکا نے رات کو ایسا مارا... ایسا مارا کہ ناک سے......"

ہیما چونک پڑی۔ بولی..." اچھا..... ہوگا، جا یہاں سے۔"

خلاف توقع دھمکائے جانے سے... جھڑکی کھا کر اُما بھی شش و پنج میں پڑ گئی۔ وہ خاموش وہاں سے آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی کہ ماں نے آواز دی "سُن تو! ناک سے کیا بہت خون نکلا تھا؟"

"نہیں، بہت تو نہیں.... پھر بھی کچھ نہ کچھ...."

"اچھا اب تو جا.... رہنے دے۔"

اُما دروازے تک پہونچکر چلا اُٹھی "یہ دیکھو ماں! کشنو ماما یہاں چھپے کھڑے ہیں۔"

کشن نے سُن لیا۔ معلوم ہوتا ہے اسے اُس نے اپنا احترام سمجھ کر جھانکتے ہوئے شرمیلی ہنسی ہنسکر دریافت کیا "کیسی طبیعت ہے اب؟ منجھلی دیدی!"

کسک، ٹیس، غیرت اور غرور کے متحدہ حملہ سے ہیمانگنی باؤلی ہو کر چلا اُٹھی "کیوں آیا تو یہاں... جا۔ جا۔ کہتی ہوں۔ جا.... جلدی جا!.... دُور ہو۔"

کشن بیوقوف کی طرح آنکھیں پھاڑے تکتا رہا.... "گیا نہیں؟" ہیمانگنی نے اور بھی تیز ہو کر کہا۔ "پھر بھی کھڑا ہے کمبخت! جاتا نہیں؟"

کشن سر جھکا کر صرف "جاتا ہوں!" کہہ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ہیمانگنی مُردہ سی ہو کر بستر پر ایک کنارے جا پڑی، اور کچھ مبہم سے الفاظ میں جی کی بھڑاس نکالتی ہوئی بڑبڑانے لگی "سو دفعہ کہہ چکی ہوں، کمبخت سے۔ میرے پاس نہ آنا۔ پھر بھی نہیں مانتا.. منحوس منجھلی دیدی کی ہمدردی نے دیکر جان کا لاگو ہو رہا ہے۔ اُما! شِبو سے کہہ تو دے... اُسے اندر نہ گھسنے دیا کرے۔"

اُما نے جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی، اور آہستہ آہستہ باہر چلی گئی۔

رات کو ہیما گنگتی نے خاوند کو بلاکر دلدوز آواز میں کہا۔ "میں نے کبھی تم سے کچھ نہیں مانگا، آج اس کڑے وقت میں ایک بھیک مانگونگی،..... دوگے؟"

"جسے خود بخود سب کچھ مل جائے اُسے مانگنے کی ضرورت ہی کیا ہے"؟ اپنے تمام شکوک کو دبانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے وپن نے دریافت کیا۔ "اب اور کیا چاہیئے؟"

"کشن کو مجھے دے دو، وہ بیچارا بڑی مصیبت میں ہے، ماں باپ کوئی نہیں، اُسے وہ لوگ مارے ڈالتے ہیں۔ یہ ظلم یہ ستم مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔"

"تو آنکھیں بند کر لیا کرو، سب ٹھیک ہو جائیگا" وپن نے مُسکرا کر جواب دیا۔

خاوند کی اس ستم ظریفی کے بھالے کے وار نے ہیما کے کلیجہ کو چھلنی کر دیا۔ کسی اور موقع پر وہ اس تمسخر آمیز تمسخر کو برداشت بھی نہ کر سکتی لیکن آج اور ہی بات تھی۔ اس وقت روحانی تکلیف سے اُس کی جان پر بنی تھی اس لئے اُس نے یہ، اتنی بڑی چوٹ بھی چُپ چاپ سہہ لی۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہا "میں تمھاری قسم کھا کر کہتی ہوں، کشنو کو میں اپنے پیٹ کے لڑکے کی طرح پیار کرتی ہوں.... چاہتی ہوں... ایک بار اُسے پاکر پال پوس کر بڑا کر کے، کھلا پلا کر اور پڑھا لکھا کر آدمی بناؤنگی۔ پھر تم لوگوں کے جوجی میں آئے کرتے رہنا۔ بڑا ہو جانے پر اس کے بارے میں میں ایک حرف بھی نہ کہونگی... وعدہ کرتی ہوں۔"

وپن کچھ پگھل کر بولا "مگر سوچو تو سہی، وہ کیا میری آڑھت کی دال چاول کی بوری ہے، جو تمھیں لاکر دیدوں؟ وہ غیر ہے... پرائے گھر آیا ہے، تم کیوں اس کے بیچ میں پڑ کر اتنی ہمدردی کرتی ہو؟"

ہیما گنگتی رو پڑی،.... "تم چاہو تو جیٹھ جی سے کہہ کر... دیدی کی خوشامد کر کے، اُسے آسانی سے لاسکتے ہو، یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ تمھارے پاؤں پڑ کر بھیک مانگتی ہوں، اُسے لے آؤ۔ گائے کو قصائی کے کھونٹے سے کھول لاؤ۔"

"اچھا مان لو کہ یہ میں کر سکتا ہوں، مگر میں کیوں ایک اجنبی کو... اتنے بڑے راستہ چلتے سانڈ کے بوجھ کو مفت میں اپنے سر پر لاد لوں؟"

"پہلے تو تم کبھی میری ذراسی بات بھی نہ ٹالتے تھے۔ اب مجھ سے کون سا ایسا قصور ہو گیا ہے۔ بتاؤ!" میں نے اس طرح خوشامد کر کے اپنے دل کا حال کہہ کر اپنی بے لبسی جتادی، کہہ دیا کہ میں سچ مچ اُس کے غم میں گھلی جارہی ہوں، موت کے گھاٹ لگ گئی ہوں۔ تو بھی تم یہ ذراسی بات نہیں مانتے؛ بحث مجھ کرتے ہو؟ وہ ابھاگا ہے، اس لئے کیا تم سب مل کر اُسے مار ہی ڈالوگے؟... اچھی بات ہے میں اُسے روکونگی نہیں، آپ بلاؤنگی.... دیکھتی ہوں وہ کیا کرتے ہیں؟"

اب وتین کو بھی ضبط کرنا مشکل ہوگیا... "اُس نے کہا: میں اُس کو کھلا نہ سکوں گا؟"

"میں کھلاؤں گی، میں کیا اِس گھر کی کوئی ہوں ہی نہیں، جو مجھے اپنے لڑکے کو کھلانے پلانے کا بھی حق نہ ہو۔ میں کیا اُسے کھلا پلا نہ سکوں گی۔ کل ہی اُسے اپنے پاس لے آؤنگی۔ اگر کوئی زبردستی کرے گا روکے گا تو میں اُسے تھانے میں بھیج دونگی.... پولیس کے پاس!"

بیوی کی باتیں سُن کر وتین غم و غصہ کی مدوجزر سے گونگا ہوگیا۔ بڑے تحمل سے اُس نے کہا "اچھا! اِس بارے میں پھر دیکھا جائیگا۔" اور منہ پھیر کر جلدی جلدی گھر سے باہر نکل گیا۔

دوسرے روز صبح ہی سے پانی برسنے لگا۔

ہیا کھڑکی کھولے کھڑے آسمان کی بہار دیکھ رہی تھی۔ یکایک پنچو کی چیخ پکار کانوں میں گونج اُٹھی... "اماں! ذرا اپنے گُنی بھائی کو تو دیکھو.... پانی میں بھیگتے ہوئے... شیطان کی طرح آسمان سے ٹوٹ پڑے ہیں دیکھتی ہوں.... جھاڑو کہاں ہے؟" کادمبنی بپھرتی ہوئی کوٹھری کے باہر آئی اور سر پر انگوچھا لپیٹ کر دوڑتی ہوئی باہر کی ڈیوڑھی میں جا پہونچی۔"

ہیا کا کلیجہ کانپ اُٹھا۔ للت کو بلا کر بولی "دوڑ جا تو بیٹا! اِس گھر کی بیٹھک میں دیکھ تو سہی تیرا کشنو ماما کہاں سے آیا ہے؟" للت دوڑ گیا، اور ایک ہی لمحہ میں واپس آ کر بولا: "پنچو دادا نے ماما کو دونوں ہاتھ گھٹنوں میں سے نکلوا کر دونوں کان پکڑوا کر کھڑا کر رکھا ہے، اور سر پر دو بڑی بڑی جیٹ کی اینٹیں بھی لادی ہیں۔ حکم ہے کہ ایک ایک اینٹ کے گرنے پر ہر بار بیس بیس کوڑوں کی سزا دیجائے گی۔ ہیا نگنی کا کلیجہ منہ کو آگیا۔ بولی۔ "اُس نے ایسی کیا خطا کی ہے؟" للت نے جواب دیا "کل دوپہر کو انھیں تحصیل وصول کرنے کے لئے اہیروں کے پاس بھیجا تھا، وہاں سے تین روپیئے لیکر جمیت ہوگئے تھے سب خرچ کر ڈالے تو آج ابھی لوٹے ہیں"

ہیا نگنی کو اپنے کانوں کا اعتبار نہ ہوا، بولی "کون کہتا ہے وہ روپیئے وصول کر لایا تھا؟"

"لچھمن گوالا خود آ کر کہہ گیا ہے۔" یہ کہہ کر للت پڑھنے چلا گیا۔ دو تین گھنٹے تک پھر کچھ شور و غل سُنائی نہ دیا۔ دس بجے کے قریب مہاراجن تھالی رکھ گئی۔ ہیا نگنی کھانے بیٹھی ہی تھی کہ دروازے پہ کہرام سا مچنے لگا۔ بڑی بہو کے پیچھے پیچھے پنچو کشن کو اُس کے کان پکڑے گھسیٹے لا رہا تھا۔ ہیا کے جیٹھ بھی ساتھ تھے۔ وتین کو بھی دوکان سے بلوانے کے لئے آدمی بھیجا گیا تھا۔

ہیا نگنی جھٹ پٹ آنچل کھینچ کر سر ڈھکتی ہوئی کمرے کے ایک کونے میں دبک گئی۔ وہ ابھی سنبھلنے

بھی نہ پائی تھی کہ جیٹھ جی نے زور زور سے چیخ چیخ کر گولے برسانا شروع کر دیئے۔ "تمھارے کرتوتوں سے تو اب ہمارا گھر میں رہنا دوبھر ہو گیا ہے منجھلی بہو! جس سے کہو ہمارے گھر کے دام دے کر خرید لے تو ہم اور کہیں اٹھ جائیں:"

ہیا حیرت واستعجاب کا مجسمہ بنی کھڑی رہی، بڑی بہو لڑائی جاری رکھنے کی تمام ذمہ داری اپنے سر لیکر دروازے کے بالکل سامنے آکر، منہ بنا بنا کر، ہاتھ مٹکا مٹکا کر کہنے لگی: "منجھلی میں تمھاری جٹھانی ہوں مگر تم مجھے کیتا تلی ہی سمجھتی ہو۔ خیر اچھا ہی کرتی ہو۔ لیکن میں ہزار دفعہ کہہ چکی کہ اپنا بناؤٹی لاڈ پیار دکھا کر میرے بھائی کو برباد نہ کرو۔ کیوں اب وہی بات ہوئی یا نہیں؟ دو دن چوم چاٹ کر الگ ہو جانا بہت آسان ہے مگر ہمیشہ کا بوجھ اٹھانا سہل نہیں۔ تم ہمیشہ کے لئے تو میرے بھائی کی ذمہ داری لے ہی نہیں سکتیں، بھرنا تو مجھی کو پڑیگا۔"

ہیا تے یہ سمجھکر کہ یہ سب کسی بہت بڑے حملے کی تیاری کی صرف ابتدا ہے اور کچھ نہیں۔" کوئل کی سی سُریلی آواز میں پوچھا "کیا ہوا؟" کادمبنی چڑیلوں کی طرح ناچ اٹھی۔ "واہ واہ بہت اچھا ہوا۔۔خوب ہوا۔ اب تم کھڑی کھڑی تماشا دیکھو۔ کتنی اچھی سوجھ بوجھ ہے، کیسی اچھی سیکھ دی ہے۔۔۔۔ تقاضے کا روپیہ تو اڑا ہی لیا دو چار دن اور سکھاتی پڑھاتی رہو پھر آنکھوں میں دھول ڈال کر صندوق توڑنا، سیندھ لگانا سبھی ہنر سیکھ لے گا۔"

ہیا گنی ایک تو ویسے ہی تھکی ماندی ٹھہری، دوسرے اُس پر یہ ذلیل دلدوز طعنوں کی بوچھار۔۔۔ جھوٹی تہمتوں کی بھرمار، پھر اس سے لحاظ، پاس، شرم اور سلیقہ کی کس طرح اُمید کی جا سکتی تھی؟ آج وہ بھی برسوں کے رُکے ہوئے پانی میں تنکے کی طرح بہ گئی۔ اس کے پہلے وہ کبھی کسی ضرورت سے بھی جیٹھ کے آگے نہ بولی تھی۔ "میں نے کیا اسے چوری ڈکیتی سکھا دی ہے؟ دیدی!۔۔۔۔ کہتی کیا ہو؟"

کادمبنی نے بلا کسی پس وپیش کے کہہ دیا۔ "یہ میں کس طرح جانوں کہ تم نے سکھائی ہے یا نہیں پہلے تو اس کی یہ عادت نہ تھی، اب کیوں اور کیسے ہو گئی؟ تم دونوں کی اس طرح چھپ چھپ کر باتیں کرنے کی ایسی کیا باتیں ہی کونسی ہیں؟ اور آتنا دُلار کرنے۔ سر چڑھانے ہی کا سبب کیا ہے؟"

کتنے ہی دنوں کی دبی دبائی سلگتی ہوئی عداوت وکدورت کی چنگاری یہ ذرا سا ہوا کا جھونکا پاکر آج پوری قوت کے ساتھ جل اُٹھی۔ اُسے صرف وہی دیکھ سکے، جو سب دیکھتے رہتے ہیں۔"

گھڑی بھر کے لئے ہیاگنی کے حواس پرّاں ہو گئے۔ آدمی آدمی کو اتنا سخت صدمہ پہنچا سکتا ہے؟ اس کی اتنی بے حیائی۔ اتنی زبردست بے غیرتی سے اس طرح توہین کر سکتا ہے؟ یہ بات کبھی اس کے وہم وگمان میں بھی نہ آئی تھی۔ دم زدن میں خون میں لتھ پتھ گھائل شیرنی کی طرح آنکھوں سے آگ برساتی ہوئی جٹھانی

باہر نکل آئی۔ اور گھونگھٹ مٹا کر کے دبی ہوئی زبان سے سختی سے بولی، "یہ تم تو اتنی اچھی اور کمینی ہو کہ تم سے بات کرتے نفرت آتی ہے۔ ایسی نربج اور ڈائن ہو کر بھی تم کو اُس چھوکرے کو اپنا بھائی کہتے لاج نہیں آتی! آدمی لپیٹو بِنکھی کو بھی پالتا ہے تو اُسے پیٹ بھر کر دانہ چارہ دیتا ہے۔ اور تم اس کمبخت سے سبھی طرح کے نیچے کام لے کر بھی اُسے بھوکا ہی سُلا دیتی ہو۔ مَیں نہوتی تو اب تک یہ کبھی کا پرلوک سدھار گیا ہوتا۔ یہ صرف اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے ہی میرے پاس دوڑ دوڑ کر آتا ہے۔ ناز کرنے یا کرانے کے لئے نہیں آتا۔ اور یہ تم بھی جانتی ہو؟"

بڑی بہو نے کہا "ہم لوگ کھانے کو نہیں دیتے، خالی محنت مزدوری کرا لیتے ہیں، اور تم نے روز خیرات کے ٹکڑے ڈال کر اب تک اُسے مرنے نہیں دیا!"

"ہاں ... بالکل یہی بات ہے۔ آج تک کسی دن تم نے اس کو دونوں وقت کھانے کو نہیں دیا۔ صرف مارا پیٹا ہے، اور جتنا ہو سکا اُس سے کام لیتے رہے ہو۔ تمہارے ہی ڈر سے مَیں اُسے منع کر کے ہار گئی، تھک گئی! مگر اُس نے پیچھا نہ چھوڑا۔ اصل میں اس سے بھوک کی آگ سہی نہیں جاتی، اور میرے ہاں اُسے یہ آگ بجھانے کا سامان مل جاتا ہے۔ اِسی سے بار بار دوڑا آتا ہے۔ چوری ڈاکہ کی صلاح لینے نہیں آتا، اور یہ تمہیں سب سے زیادہ جانتی ہو لیکن تم سب اتنے بڑے لیٹرے، لالچی، قصائی اور دوسروں کو ستانے والے ہو کہ سچ کو دیکھنا نہیں چاہتے ...."

اس کا جواب جیٹھ نے دیا۔ اپنے چھوٹے بھائی کی دلہن کے سامنے کنتنو کو گھسیٹتے ہوئے کھینچ لائے۔ اور اُس کی دھوتی کی لپیٹ کھول کر کیلے کے پتّے کا دونا سا نکال کر ... کہنے لگے: "سب ٹھیک ہے! ہم لٹیرے ہیں، قصائی ہیں سب کچھ ہیں، لیکن ہم کیوں اس کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے یہ تمہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ بھگلی بہو! سچ تو یہی ہے کہ تمہاری سنگت میں اس نے یہ سب چھند سیکھ لئے ہیں۔ تمہارے ہی پھیر میں پڑ کر یہ میرا روپیہ چُرانے لگا ہے، تقاضہ چُکا لایا اور وہ روپیہ خرچ کر کے تمہارے بھلے کے لئے ... تمہارے اچھے ہو کر جلد اٹھ بیٹھنے کی آرزو میں کسی دیوی دیوتا کے مندر میں جا کر بھینٹ چڑھا کر پن میں لے آیا ہے ... یہ لو!"
دونے میں سے کچھ پھول پتّی اور پیڑے بتاسے نکال کر بھیا نگنی کو دکھائے۔

اس کے بعد بھویں چڑھا کر کادمبنی بولی "باپ رے! کیسا بدمعاش ہے ... کتنا بڑا شیطان اور چالباز ہے! اچھا تو بھگلی بہو اب تمہیں کہو۔ وہ اُس نے کس کے لئے یہ چوری کی ہے؟ یہ کیا میرے بھلے کے لئے تقاضے کی رقم لا کر خرچ کر آیا ہے؟"

گناہ کے سہارے دل کو چیر ڈالنے والا چھوٹا اتہام اور نفرت کیک، مذموم الزام اب اور سہا نہ جا سکا بھگلی

کی طرح تڑپ کر، اُچھل کر ہیما کنگنی کشنو کے سامنے آگئی، اور اُس کے گالوں میں چٹ چٹ دو طمانچے جڑ کر کہنے لگی "کیوں رے! میں نے تجھے چوری کرنا سکھا دیا؟ ارے کمبخت ہزار بار تجھے اپنے گھر میں آنے سے منع کر چکی۔ بار بار روکا اور کبھی کبھی دھتکار کر نکال بھی دیا..... اب سمجھی کہ تو چوری کرنے ہی کے ارادہ سے اکثر چھپکے چھپکے آکر جھانکتا رہتا تھا۔"

گھر کے چھوٹے بڑے سبھی اکٹھے تھے۔

پشتو بولا "میں اپنی آنکھوں دیکھ چکا ہوں، ماں! پرسوں رات کو یہ کشن تمھارے کمرے کے سامنے اندھیرے میں چھپا کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بھاگ گیا۔ میں نہ ہوتا تو یہ ضرور کچھ نہ کچھ لے اُڑتا۔"

پنچو نے کہا "جانتا ہے نا کہ کاکی کا جی اچھا نہیں ہے، شام ہوتے ہی سو جاتی ہیں۔ یہ کیا کم چالاکی ہے؟"

ہیما کو سسرال میں آئے سولہ برس ہوئے۔ اتنے دنوں میں کادمبنی کو کبھی اتنی مسرت نہیں ہوئی جتنی آج کشن کے ساتھ منجھلی بہو کا یہ برتاؤ دیکھ کر ہوئی۔ اُس نے بھڑک کر کہا "یہ بگلا بھگت بنا ہوا تھا۔ منجھلی! میں بھلا کس طرح جانتی کہ تم نے اپنے گھر گھسنے کے لئے اسے منع کر دیا ہے۔ یہ تو کہتا پھرتا ہے کہ منجھلی دیدی مجھے ماں سے بڑھ کر پیار کرتی ہیں۔" پھر مع دونوں کے دیوتا کا سارا بھوگ..... سب برسا دھنگ کر بھنکتے ہوئے کہنے لگی۔ "تین روپئے چرا کر کہیں سے دو چار پھول اُٹھا لایا ہے حرامخور!"

گھر لے جا کر مالک مکان نے اپنے ہاتھ سے چور کو سزا دینا شروع کر دی۔ کشن پر جیلخانہ کی سی بیدڑی کی مار پڑی۔ لیکن اُس نے بھی برداشت کی حد کر دی۔ کچھ کہنا تو درکنار پلک تک تر نہ ہونے دی۔ جس طرح بیجد بوجھ سے لدی ہوئی گاڑی لئے ہوئے بیل، دلدل میں پھنس جانے سے لاچار ہو کر چابک کھاتے رہتے ہیں، ٹھیک اسی طرح کشن بھی چُپ چاپ مار کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ کادمبنی کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ بیشک مار کھانا اسے کہتے ہیں، لیکن بھگوان جانتے ہیں کہ یہاں آنے سے پہلے کبھی کسی نے کشن کے بدن کو پھول سے بھی نہ چھوا تھا۔ اس کی عادت ہی ایسی تھی کہ وہ کسی سے کچھ مطلب نہ رکھتا تھا..... نہ کسی کے لینے میں تھا نہ دینے میں!

ہیما کنگنی اپنے کمرے میں جا کر چاروں طرف سے سب کھڑکیاں بند کر کے بُت بنی بیٹھی تھی، اماں مار کا تماشا دیکھنے گئی تھی۔ اُس نے گھبرا کر کہا.. "کاکی کہہ رہی ہیں کشنو بڑا ہو کر ڈاکو ہوگا...... اُن کے گالوں میں کوئی دیوتا ہیں...."

ماں کے آنسو بھرے، بند بند گلے سے "اُماں!" کی پکار سن کر ہیما چونک پڑی۔ اُس نے پاس جا کر ڈرتے ڈرتے پوچھا "کیوں؟ اماں!"

"اں۔ ری! کیا ابھی تک سب مل کر اس کو مار ہی رہے ہیں؟" کہتے کہتے ہیما کنگنی زمین پر لوٹ کر رونے لگی

ماں کو روتے دیکھ کر آما بھی رو پڑی۔ بچھاں کے پاس بیٹھ کر دھوتی کے آنچل سے اُس کے آنسو پونچھتے پونچھتے آما نے کہا۔ "پوستی کی ماں کشتو ماما کو باہر کھینچ لے گئی ہے۔"

ہیما کچھ نہ بولی۔ اسی جگہ اسی طرح پڑی رہی۔ دو تین بجے کے وقت سردی اور کپکپی کے ساتھ بخار چڑھ آیا بخار معمولی نہ تھا۔ آج بہت دنوں کے بعد اُسے کھانا ملنے والا تھا، لیکن تھالی ایک کنارے پڑی سوکھ رہی تھی۔

چراغ جل جانے کے بعد دین گھر واپس آیا اور راستہ ہی میں بھاوج سے کشن کی رام کہانی سن کر بھرا ہوا ہیما کے کمرے میں جا ہی رہا تھا کہ آما نے روک کر آہستہ سے کہا "ماں بخار میں بیہوش پڑی ہیں، بابو جی!"

دین سنکر دنگ رہ گیا..... بولا "کیا کہا؟ ادھر تین چار دن سے تو بخار کا نام نہ تھا، آج کہاں سے آگیا؟"

دین وہ پردہ بیوی پر جان دیتا تھا۔ اُسی کا دل رکھنے کے لئے اُس نے بھائی سے علحدہ رہنا گوارا کر لیا تھا۔

دیوانوں کی طرح کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے دیکھا، ابھی تک ہیما زمین ہی پر لوٹ رہی تھی۔ دین نے اُسے اُٹھا کر چارپائی پر لٹانے کے لئے ہاتھ لگایا ہی تھا کہ ہیما نے آنکھیں کھول کر اُس کی طرف دیکھا اور تھوڑے سے توقف کے ساتھ اُس کے قدموں سے لپٹ کر آنسو بہانا شروع کر دیا۔ بولی "دیکھو کشنا کو اس گھر میں پناہ دو..... ورنہ ہزاروں دوائیں کرو ایک بھی نہ لگے گی۔ حکیم ڈاکٹر میرا علاج ہی کیا کر سکتے ہیں۔ انھیں تو میری بیماری کی گرد بھی نہیں مل سکتی۔ کشنو کا دُکھ دُور کئے بغیر معلوم ہوتا ہے دُرگا ماتا میرا قصور کسی طرح معاف نہ کریں گی۔"

دین نے پاؤں چھڑا لئے پھر پاس بیٹھ کر بیوی کی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر اُسے دلاسا دینے لگا۔ ہیما نے اصرار کیا۔ "بولو! کشن کو لا دو گے؟..... مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے۔"

"تمھیں کس بات کی کمی ہے؟" دین نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا... "پھر بھی تم جو چاہتی ہو وہی ہوگا..... اب جلدی سے اُٹھ کر کھڑی ہو جاؤ۔"

ہیما اور کچھ نہ بولی اُٹھ کر بستر پہ پڑ رہی۔ بخار رات ہی میں ہوا ہو گیا۔ دوسرے دن علی الصبح ہی دین اس حیران کُن تبدیلی کو دیکھ کر پھولا نہ سمایا۔ نہایا۔ ناشتہ کیا اور تمام چھوٹے موٹے کاموں سے فارغ ہو کر دوکان کے لئے تیار ہو گیا۔ اُسی وقت ہیما نے آ کر کہا "کل کی قاتلانہ زدوکوب کی بدولت کشن کو شدت کا بخار چڑھا ہوا ہے، اُسے میں ابھی اپنے گھر لے آتی ہوں..... اجازت ہے؟"

دل ہی دل میں کُڑھ کر دین نے جواب دیا "اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جہاں ہے وہیں کیوں نہیں رہنے دیتیں!"

"لیکن!" ہیما نے بِھنّا کر کہا: "تم کل رات کو زبان دے چکے ہو۔ اب تو اُسے نبھانا ہی پڑے گا۔"

ویرن نے بے پروائی سے سر ہلا کر مخالفت کرتے ہوئے کہا "وہ ہمارا کون ایسا سگا ہے؟ جس کے لئے ہم بیتا میں پڑیں، بیکار تم بھی کہاں کی الجھن میں سر کھپاتی رہتی ہو"

کل شب کو بیوی کی نازک حالت دیکھکر جو وعدہ کر لیا تھا آج اس حالت میں خاطر خواہ تبدیلی یکمل افاقہ دیکھکر اس وعدہ کو ایک بے حقیقت سناک سمجھکر رکھائی کے ساتھ ٹھکرا دینے میں اُسے کچھ بھی تامل نہ ہوا۔

ویرن بغل میں چھتری دبا کر اٹھ کھڑا ہوا اور سمجھانے کا سا ڈھونگ بنا کر بولا۔ "دیکھو پاگل پن مت کرو۔ دادا اور سب لوگ بہت خفا ہو جائیں گے۔"

ہیما نے بڑی لجاجت و متانت کے ساتھ کہا۔ "اور وہ پہلے ہی سے کونسے ایسے خوش ہیں، پھر ادھر بگڑ کر وہ کیا اس کا خون کر سکتے ہیں، یا میں جو اسے لے آؤنگی تو دنیا میں کوئی میرا ہاتھ پکڑ سکتا ہے؟ اب تک میرے پیٹ کے دو بچے تھے۔ کل سے تین ہو جائیں گے، میں اب کشن کی بھی ماں ہوں.... سمجھے!"

"اچھا اس وقت دیکھ لیا جائے گا" ویرن جانے لگا۔ ہیما راستہ روک کر کھڑی ہو گئی "تم اس گھر میں اسکو آنے دو گے یا نہیں؟"

"ہٹو، ہٹو! یہ حماقت ہے جی؟" خشم آلود نگاہوں سے بیوی کو ہدف ملامت، سزاوار عتاب بنا کر خاوند نے منہ پھیر لینا چاہا، مگر ہیما نے اس کی بھی مہلت نہ دی "اگر تم اپنی بات سے پھرنے کی ہمت کر سکتے ہو تو میں بھی دم بھر سکتی ہوں کہ جو چاہوں کر دوں۔ میں اُسے لئے آتی ہوں، کسی طرح اس عذاب سے چھٹکارا تو ملے۔"

"تو تم جاؤ....." چلتے چلتے ویرن کہے گیا.... "مگر میں تمھارے اس اُنچٹ کام میں کسی طرح کا بھی ساتھ نہیں دے سکتا۔ ذرا بھی نہیں....."

"تو تم انکار کرتے ہو؟"

"بالکل"

"اچھی بات ہے....." ہیما نے پلٹ کر زور سے پکارا "بشوا! ابھی جا کر بیل گاڑی تو لے آ... میں اپنے گھر جا رہی ہوں۔"

ویرن نے بھی سن لیا۔ اور دل ہی دل میں ہنس کر کہا "لو! مجھے دھمکی دے رہی ہے!" وہ بے خوف و خطر دوکان چلا گیا۔

کشن دیوی کے مندر میں باہر کے چبوترے پر پھٹی ٹوٹی چٹائی کے سہارے بخار کی گرمی، جوڑ جوڑ کے درد اور شاید دل کی اندرونی چوٹ کی تکلیف سے گٹھری بنا بیہوش سا پڑا ہوا تھا۔ ہیما نے قریب جا کر پکارا "کشنو! کشنو جیسے پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا... فوراً بول اُٹھا.. "منجھلی دیدی!"

اس کے بعد ہی حجاب آلودہ مسکراہٹ کی گلگلوں تابانی سے اس کا چہرہ چمک اٹھا..... جیسے اُسے کوئی غم کوئی تکلیف ہی نہ تھی... وہ اس انداز سے بڑی اُمنگ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور دھوتی کے کونے سے پھٹی چٹائی کو جھاڑتے ہوئے بولا... "بیٹھئیے" ہیما نے اُس کا ہاتھ تھام کر سینہ سے لگا کر کہا... "اب بیٹھوں گی نہیں بھیا! آؤ میرے ساتھ چلو۔ آج تم کو مجھے میرے گھر تک پہنچاتے چلنا ہوگا۔"

"چلو!..... "کشن نے اپنی ٹوٹی ہوئی چھڑی اٹھا کر بغل میں دبالی اور پھٹا انگوچھا کندھے پر ڈال لیا۔

ہیما کے دروازے پر بیل گاڑی کھڑی تھی، وہ اس میں کشن کو لیکر جا بیٹھی۔ گاڑی جب راج گھاٹ کا گاؤں پیچھے چھوڑ کر اس کی آخری حد کو پار کرنے لگی، تو یکایک کسی کے دُور سے پکارتے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاّنے کی آواز سُنکر گاڑی بان کو گاڑی روکنا پڑی پیچھے سے وِپن دوڑتا چلا آرہا تھا، وہ پسینے میں تر تھا۔ چہرہ دھوپ سے تمتایا ہوا تھا، نزدیک پہنچکر ڈرتے سہمتے اُس نے پوچھا... "کہاں جارہی ہو؟ منجھلی!"

"گھر" ہیما نے انگلی سے کشن کی طرف اشارا کرکے کہا "اس کے گاؤں کو...."

کب لوٹو گی؟"

بڑے استقلال سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے جواب دیا "وہ کب لوٹاویں"

"اِس کے معنی؟"

ہیما نے پھر کشن کو دکھا کر کہا "کبھی کسی دن اگر کہیں اس کو سہارا ملے گا تو میں اکیلی لوٹ کر آسکونگی، نہیں تو اسے لیکر مجھے بھی اور کہیں رہنے کی جگہ نہیں ہے۔"

وِپن کو یاد آنے لگا۔ اُس دن اُس نے بیوی کے چہرے کا ایسا ہی رنگ دیکھا تھا، اور بالکل ایسی ہی واز بھی سُنی تھی، جس دن موتی لوہار کے یتیم بھانجے کے باغ کے معاملہ میں اُس کی حفاظت کے لئے وہ اکیلی سب کے ...ن اُس اندھیر، اُس بیداد کے مقابلہ میں جم کر کھڑی ہوگئی تھی.... یاد آیا.... یہ عورت اور ہی قسم کی ہے۔ اسے نھیں دکھا کر راستہ سے پھیرا نہیں جاسکتا۔

وِپن نے جھک کر... رُک کھا کر... نرم ہو کر کہا... "ایک بار مجھے اور معاف کردو ہیما! اب گھر لوٹ چلو!"

ہیما نے ہاتھ جوڑ کر کہا... "بس تمھیں معاف کرو... اپنا کام پورا کئے بغیر میں کسی طرح گھر نہیں لوٹ سکتی۔"

وِپن تھوڑی دیر تک بیوی کے پُرسکون.... عزم و استقلال کے نور سے جگمگاتے ہوئے چہرے کی طرف ...رہا..... پھر بعجلت سامنے آکر اور گاڑی کے گھسیٹتے ہوئے پہیوں تک جھک کر کشن کو جھنجھوڑتے ہوئے بولا ...نو ہی گاڑی کو پھیر لے کشن... میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج سے تم دونوں بھائی بہن کو میرے رہتے کوئی ...نہ کرسکے گا.......!

ایک مسلمان خاتون سے!

(از مسٹر حسن یحییٰ عندلیب، ایم اے ایل ایل بی میرٹھ)

حیا کی موج بن کر تو گذر جاتی تو اچھا تھا
تہِ گرداب گُم ہو کر اُبھر جاتی تو اچھا تھا

چراغِ دامنِ قندیل ہے تو بزمِ ہستی میں
تری قندیل ہی میں ضَو ٹھہر جاتی تو اچھا تھا

ترے نقشِ قدم سے رہگذر رشکِ گلستاں ہے!
شبستاں کی فضا بھی ہاں نکھر جاتی تو اچھا تھا

دمکتی ہے ترے چہرہ پہ افشاں علم کی لیکن
حجابِ شعلہ پرور سے سنور جاتی تو اچھا تھا

نقابِ روئے رنگیں کے اُٹھا دینے سے کیا حاصل؟
نگاہِ شرمگیں دل میں اُتر جاتی تو اچھا تھا

ق

جھکا کر بوالہوس کا سر حجابِ ناز سے اپنے
حیا کی بزم میں تو گل کتر جاتی تو اچھا تھا

نہ تھی اِس کی اگر پابند تیری جلوہ آرائی
سرِ رہ تو بہ اندازِ دگر جاتی تو اچھا تھا

جمالِ آتشیں سے رہگذر پر رنگ برساتی
اُٹھا کر گام بے خوف و خطر جاتی تو اچھا تھا

فضا میں منتشر کرتی شمیمِ عطر ساماں کو
بہ رنگِ شعلۂ گلبرگِ تر جاتی تو اچھا تھا

زمیں کو جگمگا دینے کی خاطر مہر کی صورت
شعاعِ عارضِ تاباں بکھر جاتی تو اچھا تھا

دیارِ ظلمت و افسردگی آباد میں، بن کر
فروغِ چشمۂ آبِ خضر جاتی تو اچھا تھا

مگر یہ کیا؟ کہیں "پیدا" ہے جلوہ اور کہیں "پنہاں"
تری اے کاش! اس پر بھی نظر جاتی تو اچھا تھا

قحطِ بنگال

(نتیجۂ فکر محترمہ بیگم صاحبہ مسٹر عبدالغنی انصاری اسسٹنٹ کمشنر انکم ٹیکس۔ کانپور)

بسترِ عیش پہ آرام و چین سے سونے والو   دردِ انساں سے خبردار نہ ہونے والو!
نامِ انسان کی عظمت کا ڈبونے والو   گوہرِ بیش بہا ہاتھ سے کھونے والو!
قحطِ بنگال بھی کچھ پیشِ نظر ہے کہ نہیں؟
نوعِ انساں کی تباہی کی خبر ہے کہ نہیں؟

جان کس طرح نکلتی ہے ذرا دیکھ تو لو   یہ قیامت کا سماں بہرِ خدا دیکھ تو لو
ملک میں کیسی یہ پھیلی ہے وبا دیکھ تو لو   حالِ ناگفتنیٔ قحط و وبا دیکھ تو لو
کس قیامت کا ہر اک گام پہ نظارہ ہے
اُف یہ بنگال ہے یا موت کا گہوارہ ہے

سرِ نازک کا وہ فاقوں سے لٹکنا دیکھو   ضعف سے شاخِ صنوبر کا لچکنا دیکھو
شدّتِ فاقہ سے بوڑھوں کا سسکنا دیکھو   بھوک کی کرب سے بچّوں کا بلکنا دیکھو
چشمِ پُرنم ہیں کہ دو خون کے فوارے ہیں
داغِ دل ہیں کہ دہکتے ہوئے انگارے ہیں

منسلکِ رشتۂ آدم کے یہ انمول گہر   مادرِ ہند کے یہ نورِ نظر لختِ جگر
ٹوٹ کر رشتہ سے یوں جائیں سرِ راہ بکھر   خود نہ ہو ملک کو ان خاک نشینوں کی خبر
اس سے بڑھکر کوئی کیا شومیٔ قسمت ہوگی
جو تمھاری ہے کسی کی بھی نہ حالت ہوگی

کتنے تھے کلمۂ توحید کے پڑھنے والے   حفظِ ملت کے لئے دار پہ چڑھنے والے
تھے ضیا میں یہی خورشید سے بڑھنے والے   پھول تھے دامنِ وحدت پہ یہ کڑھنے والے
قحط نے خاک میں پر ان کو دیا ایسا سُلا
کون تھے کیسے تھے، یہ راز ابھی تک نہ کھُلا

کتنے ہیں جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ملک و ملت کے لئے جان جو کرتے ہیں نثار
فاقہ کش ہو کے ہوئے آہ وہ یوں زار و نزار اس خزاں دیدہ وطن کی وہ نہ دیکھیں گے بہار
آج زندہ ہیں مگر ضعف سے ایسے لاچار
جیتے جی زاغ و زغن کا ہوئے جاتے ہیں شکار

لشکرِ جور و ستم گو کہ صف آرا ہے ابھی مرکزِ رنج و بلا ملک ہمارا ہے ابھی
آپ کا حسنِ وفا آنکھ کا تارا ہے ابھی ڈوبنے والوں کو تنکے کا سہارا ہے ابھی
اب بھی ہمدردیِ انساں جو فراواں ہو جائے
کیا عجب ہے کہ جو اِس درد کا درماں ہو جائے

اے مسلمانو! تمھیں کعبۂ ایماں کی قسم دَیر والو! تمھیں سرمستیِ عرفاں کی قسم
درد والو! تمھیں ہمدردیِ انساں کی قسم مالدارو! تمھیں گنجینۂ پنہاں کی قسم
جھولیاں بھوکوں کی اس طرح لبالب بھر دو
ملکِ بنگال کو سرچشمۂ رحمت کر دو

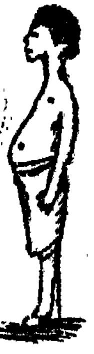
غزل

(از محمد منیر الدین صاحب منیرؔ)

ترانہ خامشی کی انتہا معلوم ہوتا ہے علاجِ درد، دردِ لا دوا معلوم ہوتا ہے
ترا ظاہر ہے کچھ باطن ہے کچھ میں سب سمجھتا ہوں ترے پردے میں کوئی دوسرا معلوم ہوتا ہے
زمین و آسماں کی زینتوں پر غور کرنے سے پسِ پردہ کوئی رنگیں ادا معلوم ہوتا ہے
مغنی رحم کر للہ بربط ہاتھ سے رکھ دے مجھے ہر ساز سازِ بے صدا معلوم ہوتا ہے
کبھی جب غور کرتا ہوں جہاں کی بے ثباتی پر تماشا منظرِ ارض و سما معلوم ہوتا ہے
فریبِ دوستی کھایا ہے میں نے اے منیرؔ اتنا
کہ اب ہر باوفا بھی بے وفا معلوم ہوتا ہے



رام بالک کا روغن سوکھا



بچوں کے سوکھا روگ کی شرطیہ اکسیری دوا

یوں تو دنیا میں ہزاروں بیماریاں ہیں مگر یہ ظالم دشمن جان سوکھا مسان جس کو سوکھا روگ بھی کہتے ہیں بُری بلا ہے اس نے لاکھوں ماؤں کی گودیاں خالی کر دیں۔ ہنستے کھیلتے خوبصورت بچوں کو اس دشمن نے خاک میں ملا دیا۔ اس بیماری کا حال ان غمزدہ دکھیاری ماؤں سے پوچھیے جن کے پیارے بچے سوکھا روگ میں مبتلا ہو کر ان کے ہنستا بستا بھرے دلوں کو داغ دے جاتے ہیں۔ سوکھا روگ کے واسطے ماں باپ طرح طرح کے کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ بچوں کو وطن سے دور لے جاتے ہیں سر کی رگ سے خون نکلوا لیتے ہیں، پیٹھ پر پان میں دوا ڈالکر کیڑے نکلواتے ہیں گنے کے کھیت میں لے جاتے ہیں تالاب میں نہلواتے ہیں۔ جھاڑ پھونک کرواتے ہیں۔ گلے میں گنڈے ڈلواتے ہیں۔ لالٹین تیل اور لال تیل ملواتے اور گدھی کا دودھ پلواتے ہیں۔ بچے کے پاخانہ کے مقام سے کچا انڈا داخل کرتے ہیں۔ چونکہ بہت سے لوگوں کو سوکھا مرض کی پہچان نہیں ہوتی اور ناواقفیت سے طرح طرح کے تدابیر وعلاج سے فائدہ نہیں ہوتا بلکہ مرض بڑھتا جاتا ہے اس لئے اس مرض کی معمولی علامات درج کی جاتی ہیں تاکہ تشخیص مرض میں آسانی ہو اور جن بچوں میں یہ علامتیں پائی جائیں فوراً روغن سوکھا استعمال کر کے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ یہ مرض عام طور سے چیت کے مہینے سے شروع ہو کر ساون بھادوں میں زور پکڑتا ہے اور اگہن کے مہینے تک رہتا ہے اس عرصہ میں لاکھوں بچے اس مرض کا شکار ہو جاتے ہیں سوکھا مرض میں بچہ دن بدن سست رہتا ہے حرارت قائم ہو جاتی ہے آنکھیں ہر وقت نڈھال رہتی ہیں بدن کا خون رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے جس کی وجہ سے بچہ سوکھ کر کانٹا ہو جاتا ہے۔ ہاضمہ بالکل بگڑ جاتا ہے اور بدبودار ہرے پیلے دست آنے لگتے ہیں۔ سرکا تالو خالی ہو جاتا ہے کان کو دبانے سے بچہ روتا نہیں بچہ کے ہاتھ پیر اور گردن پتلی پڑ جاتی ہے اور پیٹ بڑھ جاتا ہے۔ اور چھینک نہیں آتی ہے کھانسی آنے لگتی ہے آنکھیں سفید ہو کر گڈھے میں گھس جاتی ہیں چہرہ پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ کچھ ناک کان کھجلاتا ہے بھوک مر جاتی ہے اور دودھ ڈالنے لگتا ہے۔ جب بچہ متواتر سست نظر آئے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ سوکھا روگ شروع ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں فوراً رام بالک کا روغن سوکھا کھلانا چاہیئے۔ کیونکہ یہ تیل اس روگ کو ہمیشہ کے لئے جڑ سے کھو دیتا ہے چاہے بچے سوکھ کر کانٹا ہی کیوں نہ ہو گئے ہوں۔ اس کے استعمال سے بچے لالوں لال اور موٹے تازے ہو جاتے ہیں۔ اگر سوکھا مرض نہ بھی ہو اور بچے دبلے پتلے ہو رہے ہوں تو بھی اس کے استعمال سے بچے بہت جلد تندرست اور طاقتور ہو جاتے ہیں۔ آج کل سوکھا روگ کے لئے بازاروں میں بہت سے تیل ملتے ہیں جو بدن پر ملنے کے لئے ہوتے ہیں مگر ہمارا روغن سوکھا جسم پر ملا نہیں جاتا بلکہ پلایا جاتا ہے اس لئے اس مرض کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے اور بچہ کے اچھے ہو جانے پر پھر اس مرض کا اندیشہ نہیں رہتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مرض سوکھا دوا سے نہیں جاتا لیکن یہ خیال غلط ہے کیونکہ خدا نے ہر مرض اور درد دکھ کی دوا پیدا کی ہے اور رام بالک کا روغن سوکھا ہزاروں بار کی آزمودہ مجرب دوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سوکھا مرض کی اس سے بڑھکر مفید دوا نہیں بن سکی۔ آزمائش کے بعد آپ خود ہی ہماری صداقت کی شہادت دیں گے۔

روغن سوکھا کا اشتہار نفع کمانے کے لئے نہیں دیا جاتا ہے بلکہ اس مہلک مرض سے بے زبان بچوں کی زندگی کی حفاظت مقصود ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا ہر عیالدار گھر میں رکھنا ضروری ہے اور اسی لئے ہی کے دام بہ سر ضرورت مند کو دی جاتی ہے۔ یعنی قیمت فی شیشی صرف بارہ آنہ (۱۲) ہے جو قریب قریب ایک مہینہ کے لئے کافی ہوتی ہے۔ باہر سے منگانے والوں کو خرچ پیکنگ و ڈاک خود دینا پڑیگا ایک شیشی سے تین شیشیوں تک ۱۰ خرچ پڑتا ہے شیشی پر بھی وہی خرچ پڑیگا اسلئے ایک ساتھ کئی شیشیاں منگانے میں فائدہ ہے۔

روغن سوکھا ہر بڑے شہر میں مل جاتی ہے لیکن اسکی مانگ پوری کرنے کیلئے پھر بھی ایجنٹوں کی ضرورت ہے کمیشن معقول شرائط نہایت آسان ہیں ایجنسی کے لئے خط و کتابت کیجئے۔

المشتہر

رام بالک پنساری وعطار بیگم گنج والے نیا بازار کانپور برانچ آفس بیگم گنج۔ کانپور

فہرست مضامین زمانہ جلد ۸۱ جولائی لغایت دسمبر ۱۹۴۳ء

تصویر:۔ حضرت روشن صدیقی

حصۂ نثر

حصۂ نظم

زمانہ

جلد ۸۲ | مارچ ۱۹۴۴ء | نمبر ۳

اُردو کب اور کہاں پیدا ہوئی

(از مسٹر سلیم جعفر)

اُردو کب اور کہاں پیدا ہوئی، یہ ایک ایسا اہم مسئلہ ہے جو وقتاً فوقتاً معرضِ بحث میں آتا رہتا ہے۔ میرے نزدیک اس کے دو اسکول ہیں، قدیم و جدید۔ قدیم اسکول وہ ہے جو میرامّن اور پروفیسر محمد حسین صاحب آزاد کا متبع ہے۔ میرامّن اپنی تصنیف چہار درویش کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

"حقیقت اُردو کی بزرگوں کے منہ سے یہ سُنی ہے کہ دلّی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجُگی ہے، انھیں کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکھا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ آخر تیمور نے ..... ہندوستان کو لیا۔ اُن کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا، اس واسطے شہر کا بازار اُردو کہلایا۔"

"جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے، تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سُن کر حضور میں آکر جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی۔ جب حضرت شاہجہاں صاحب قرآن نے قلعہ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا ..... اور شہر کو اپنا دارالخلافت بنایا تب سے شاہجہاں آباد مشہور ہوا اور وہاں کے بازار کو اُردوئے معلےٰ خطاب دیا۔"

اس کو تاریخ زبان اُردو کا پرانا ایڈیشن کہنا چاہیئے۔ نئے ایڈیشن کا سہرا پروفیسر آزاد کے سر ہے۔ اس میں ترمیم صرف اتنی ہے کہ طرزِ بیان بدل گیا ہے۔ بغرض اثباتِ دعویٰ مرحوم کی تصنیف آبحیات کے باب تاریخ زبان اُردو کی تاریخ سے کچھ اقتباس پیش کیے جاتے ہیں۔ پورے باب کا مطالعہ اس کو بلاخوفِ تردید ثابت کر دے گا کہ وہ میر امن کے ہم صفیر ہیں:-

"ہماری اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے...... یہاں وہ (ایرانی زبان) ایسی حالت کے ساتھ پہونچی کہ عربی اور ترکی الفاظ اور بہت سی لفظی اور ترکیبی تبدیلیوں کے سبب سے اُس کی صورت نہ پہچانی جاتی تھی...... دھرم دان ہند وسالہاسال تک ملیکش بھاشا سمجھ کر غیر زبان سے متنفر رہے، مگر زبان کا قانون دھرم اور حکومت کے قانون سے بھی سخت ہے، کیونکہ اسے گھڑی گھڑی اور پل پل کی ضرورتیں مدد دیتی ہیں جو کسی طرح بند نہیں ہوتیں۔ غرض آٹھ پہر ایک جگہ کا رہنا سہنا، لین دین کرنا تھا۔ لفظوں کے بولے بغیر گزارہ نہ کر سکے۔ دو قوموں کے ارتباط میں ایسا اختلاط ضرور ہوتا ہے...... شاہجہاں کے عہد میں اقبال تیموری اوج پر تھا۔ شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دہلی دارالخلافہ ہوئی۔ بادشاہ اور ارکان دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے۔ اہل سیف، اہل قلم، اہل حرفہ، اور تجار وغیرہ، ملک ملک اور شہر شہر کے ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اُردو بازار بازار لشکر کو کہتے ہیں۔ اُردو شاہی اور دربار میں ملے جُلے الفاظ زیادہ بولتے تھے، وہاں کی بولی کا نام اُردو ہوگیا۔"

اقتباساتِ بالا سے شاید اس اُصول کا استخراج و استنباط غلط نہ ہوگا کہ محض دو زبانوں کی آمیزش سے ایک تیسری زبان پیدا ہوتی ہے۔ یا یہاں طب کا ذکر بے محل نہ ہو تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس اصول کی تہ میں طب کا یہ مسئلہ پنہاں ہے کہ ہر مفرد کی تاثیر سے مرکب کی تاثیر جداگانہ ہوتی ہے، یعنی امتزاجِ مفردات کا نتیجہ ایک نئی خاصیت، ایک نیا اثر پیدا کرتا ہے۔ اس مسئلہ نے کہ آمیزش و امتزاج ایک نئی صورت، ایک نئی ہیئت، ایک نئی چیز پیدا کرتا ہے۔ جدید اسکول کو اس طرف مائل کیا کہ وہ آغازِ اُردو کا دامن آغازِ عالم سے باندھ دے۔ چنانچہ اُس نے دعویٰ کیا کہ ہندوستان میں پہلے پہل جہاں ہندو مسلمان یک جا ہوئے، اُسی زمین میں اُردو کی تخم ریزی ہوئی اور اس خیال کو مبالغہ غلو کی حد تک پہونچا دیا۔ اگر کہیں کسی ترجمہ میں بھی عربی فارسی کے دو چار لفظ ہونے کا احتمال ہوا تو بے درنگ و بے خوف اعلان کر دیا کہ اس کی زبان بھی ایوانِ اُردو کا ایک سنگِ بنیاد ہے۔ یہ بھی تاریخ اُردو کا ایک باب ہے۔ وہ بھول گیا کہ یہ محض ایک طرح کی عاریت ہے جس نے صرف زبان کی لفظیات میں اضافہ کیا ہے۔ اس نے اس کو بھی نظر انداز کر دیا کہ یہ مظہرِ امتزاج بعض مقامات میں چراغِ طور کی طرح ایک بار چمک کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ عربی فارسی کی آمیزش نے ہندی پر کس حد تک اثر کیا، یعنی اس کا تجزیہ و تحلیل مقصود ہے کہ اس سے ساختِ زبان کہاں تک متاثر ہوئی جس سے مراد یہ ہے کہ اس کے لفظوں کی صورت کس حد تک مسخ ہوئی

اور ہوئی تو اس کا باعث استدادِ زمانہ تھا یا کچھ اور۔ کیا اس کے قواعد بدل گئے

پروفیسر آزاد مرحوم کا شکریہ کہ اُن کی وقتِ نظر نے آبِ حیات کے ایک باب میں جس کا عنوان ہے "بھاشا پر فارسی نے کیا اثر کئے"۔ وہ سب باتیں جمع کر دی ہیں جنھیں اُن مظاہر سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جنھوں نے ساختِ زبان پر دستِ تعدی دراز کیا۔ اُن پر ایک نظر ڈال کر یہ دیکھنا ہے کہ ساختِ زبان کس حد تک بدلی۔ بغرض اختصار زیادہ تر عنوانات پر اکتفا کی جاتی ہے:-

(۱) بہت سی چیزیں ہند میں آئیں اور اپنے نام اپنے ساتھ لائیں۔ ان چیزوں کے نام جو عرب و فارس سے آئیں۔

(۲) بہت چیزیں ہند کی ہیں جو اپنے نام کھو بیٹھیں۔ بہت سے عربی فارسی کے لفظ کثرتِ استعمال سے اس طرح جگہ پکڑ بیٹھے ہیں کہ اب اُن کی جگہ کوئی سنسکرت یا قدیم بھاشا کا لفظ ڈھونڈھ کر لانا پڑتا ہے۔ مگر اس میں یا تو مطلبِ اصلی فوت ہو جاتا ہے یا زبان ایسی مشکل ہو جاتی ہے کہ عوام تو کیا خواص ہنود کی سمجھ میں نہیں آتی۔

(۳) صرف میں فارسی سے کچھ نہیں لیا۔

(۴) اسم فاعل فارسی عربی کے بے شمار لئے اور ان میں "شطرنج باز" کے قیاس پر "جوئے باز" اور "وفادار" کے قیاس پر ظرفاً "سمجھ دار" اور "سمجھ ناک" بھی بول دیتے ہیں۔ "باغبان" کے قیاس پر "گاڑی بان"۔ مگر "بان" اور "دان" حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ کیونکہ اصل میں دونوں زبانیں ایک دادا کی اولاد ہیں۔

(۵) اسم ظرف۔ "قلمدان" وغیرہ کے قیاس پر "پاندان" "مووی خانہ"

(۶) یا حروف کا بھی یہی حال ہے۔ مثلاً حرف تشبیہ کوئی نہیں لیا مگر "چنانچہ" اور "چونکہ" موجود ہیں۔

(۷) حرف شرط "اگر" اور اس سے "اگرچہ" بھی لیا۔

(۸) واو عاطفہ سمیت معطوف اور معطوف علیہ اردو عبارت میں لے لئے۔ مثلاً "آب و ہوا"۔

(۹) حروف استثنا اور عربی کے لفظ "سوا" وغیرہ۔

(۱۰) حروف ایجاب "بجا" "واقعی"

(۱۱) حروف تاکید کی جگہ "ہرگز" وغیرہ

(۱۲) حروفِ تمنا میں سے کوئی نہیں "کاش" فارسی کا حرف ہے۔

(۱۳) حروف ترقی میں "بل" تو نہیں بولتے مگر "بلکہ" اپنے موقع پر آتا ہے۔

(۱۴) موصولات سے کچھ نہیں لیا مگر کاف بیانیہ اس طرح آنے لگا کہ بے اس کے کلام ہی بے مزہ ہو جاتا ہے۔

(۱۵) یائے نسبت کی ترکیبوں میں فارسی عربی کے بموجب نسبتی الفاظ بولنے لگے دکی دال کی جگہ دہلوی بولتے ہیں

(۱۶) باوجودیکہ ہندی کے مصدر موجود تھے مگر صدہا مصادر مرکبہ بنالئے مثلاً منظور کرنا۔ گزرنا وغیرہ۔

(۱۷) نحو میں ترکیب اضافی۔ ترکیب توصیفی۔ دوسرے جمع موصوف ہو تو اسم صفت موصوف کو بھی اس کے ساتھ جمع لاتے تھے۔ اب واحد لاتے ہیں۔ تیسرے مضارع بمعنی حال۔ چوتھے یہ کہ اقسام اضافت میں تشبیہ اور استعارہ کے رنگ سے سیدھی سادی زبان رنگین ہو گئی۔ چنانچہ بھاشا میں کہنا ہو تو کہیں گے۔ راج کنور کے دل کی کملاہٹ مہد کے لوگوں نے دیکھی گئی۔ شہزادے کے غنچۂ دل کی کملاہٹ اہل دربار سے نہ دیکھی گئی۔

(۱۸) بہت سے الفاظ ہیں کہ عربی فارسی نے اُردو کو دیے۔ اُردو نے کہیں تو لفظوں میں کچھ تصرف کیا معنی وہی رکھے، کہیں لفظوں کو سلامت رکھا معنی کچھ سے کچھ کر لئے۔

(۱۹) عربی فارسی کے لفظ لے کر صورت اور معنی میں تصرف کیا۔

(۲۰) محاورات و اصطلاحات فارسی کے ترجمہ ہو گئے۔

(۲۱) ہند کی تشبیہیں جاتی رہیں اور فارس و عرب کی تشبیہیں اور خیالات اُن کی جگہ قابض ہو گئے۔

فہرست بالا سے صاف صاف ظاہر ہے کہ ان اثروں نے قواعد زبان کو مطلق نہیں بدلا۔ لیکن بغرض ازالۂ اوہام آگے بڑھنے سے پہلے اس کی چند باتوں کی نسبت کچھ کہنا ضروری ہے۔ اسم فاعل اور اسم ظرف میں کہا گیا ہے کہ اردو نے فارسی کے لفظوں پر قیاس کر کے لفظ بنائے ہیں۔ اس سے اس خیال کا پیدا ہونا قرین قیاس ہے کہ اس نے فارسی سے کوئی اُصول مستعار لیا ہے۔ یہ غلط ہے۔ فارسی سے کچھ نہیں لیا۔ فارسی اور سنسکرت کا ماخذ ایک ہونے کی وجہ سے دونوں کے اکثر قواعد ایک ہی ہیں۔ اور سنسکرت وہ زبان ہے جو پراکرتوں کو مجلی و مصفا کرنے سے عرصۂ وجود میں آئی۔ بدیں وجہ سنسکرت اور پراکرتوں کے قواعد میں وحدت لازمی ہے۔ اس لئے یہ اسم فاعل ترکیبی اور ظرف مکان اس اصول سے بنے ہیں جو سنسکرت میں تت پُرش سماس بنانے میں کام آتا ہے۔ اس وقت بخوفِ طوالت اس کی تشریح سے احتراز کر کے دعویٰ کی تاسیس نہیں کی جاتی۔ "وان" "بان" اور "وان" کی اصلیت مضامین "سنسکرت اور فارسی قواعد کی مطابقت" میں بے نقاب کی جا چکی ہے۔ واؤ عاطفہ بمعیت معطوف اور معطوف علیہ لئے گئے۔ مگر یہ ہیں کیا۔ فقط دو لفظ مع ایک حرفِ ربط جسے اصطلاح میں واؤ عاطفہ کہتے ہیں۔ مگر اس سے کوئی اصول قواعد اردو اثر پذیر نہیں۔ مرکباتِ اضافی اور توصیفی بھی عبارتوں کے ٹکڑے ہیں، جو جیسے کے تیسے اُردو میں داخل کر لئے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے ان مجموعہائے الفاظ (Phrases) کا وہی مرتبہ ہے جو ایک لفظ مستعار کا۔

اس قسم کی عاریت کچھ اُردو ہی کی خصوصیت نہیں۔ جب اور جہاں مختلف اللسان قومیں جمع ہو گئیں وہاں میزبانوں نے مہمانوں سے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کیا، مگر اس سے میزبانوں کی ہستی کبھی فنا نہیں ہوئی۔ فارسی کی تاریخ پر نظر غائر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ اس نے عربی وغیرہ سے بے تکلف لفظ لئے ہیں اور اُس کی حد یوں گی اس حد تک

پہنچ گئی ہے کہ اس نے عربوں کے ایک آدھ اُصول قواعد بھی اپنے دامن میں سمیٹ لئے مثلاً فارسی اور سنسکرت کے ماخذ وصفت کا تقاضا ہے کہ دونوں میں مفعول غیر لاحقات لگا کر بنائے جائیں (پشتو میں بھی ایسا ہی تھا۔ پشترے۔ سنسکرت) مگر فارسی نے عربی کی تقلید میں بجائے لاحقے کے ایک لفظ بطور سابقے کے استعمال کرنا شروع کر دیا (در پسر) جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ مظہر دارائے اول کے اس کتبے میں موجود ہے جو وادیٔ بیستون کے پہلوؤں پر کندہ ہے میرا حافظہ دھوکا نہیں دیتا تو اس کی عبارت میں عربی کے "من" "عن" موجود ہیں۔[1]

اس پر بھی فارسی فارسی ہی رہی اور اس مظہر کی بنا پر یہ استدلال نہیں کیا گیا کہ وہ ایک نئی زبان بن گئی جس کی ابتدا اس زمانے سے ہوتی ہے جب کہ اس میں اجنبی لفظ داخل ہونے لگے۔ لفظوں کی ہیئت اور معنی کا بدلنا بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ ہر زبان اپنے لفظوں کے ساتھ یہ برتاؤ کرتی ہے۔ بلکہ جب غیر زبان کے لفظوں کو اپنی لفظیات میں داخل کر لیتی ہے تو ان کے ساتھ بھی ویسے ہی پیش آتی ہے جیسے کہ اپنے لفظوں کے ساتھ قصہ مختصر اس عاریت یعنی فارسی لفظوں اور محاوروں کے ہندی زبان میں داخلے سے دو ہی نتیجے مترتب ہوئے۔ یا تو اس نے لفظیاتِ زبان میں اضافہ کیا یا الفاظِ زبان کو اُکھاڑ پھینکا اور خود اُن کی جگہ دبا بیٹھا۔ اس سے ساختِ زبان اور اُس کے لفظوں کی ہیئت میں فرق نہیں آیا۔ درحقیقت فارسی میں اس کی استعداد ہی نہ تھی، یا یوں کہئے کہ اس کی فطرت کا یہ تقاضا ہی نہ تھا کہ وہ ہندوستان کی زبانوں کے قواعد کو بدلے کیونکہ فارسی اور ہندی زبانوں کا ماخذ ایک ہی ہے، مثلاً ہندی کا ایک لفظ "بٹ مار" ایک اسم فاعل ترکیبی ہے جو ایک اسم اور ایک فعل سے مل کر بنا ہے فارسی کے "رہزن" کے بھی یہی عناصر ہیں اور لطف یہ ہے کہ مطابقت کا یہ عالم ہے کہ ہندی لفظ کا پہلا جز مخفف کیا گیا تو فارسی نے بھی "راہ زن" میں "راہ" کا الف اُڑا دیا۔ دونوں زبانوں کے اس اُصول کا ماخذ تلاش کیا جائے تو پھر سنسکرت کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ وہاں اسمائے مرکب (سَماس) کے بنانے کے قواعد میں ایک قاعدہ ملے گا جس کے مطابق ایک اسم اور ایک فعل کو ملا دیتے ہیں۔ جب اس مظہر نے زبان کی ہستی کو ہاتھ ہی نہیں لگایا تو یہ کہنا کہ اُردو کی تخمیر اُس وقت سے شروع ہوئی جب سے مسلمانوں نے اس ملک میں قدم رکھا شاید ایک واقعۂ تاریخ لسانی کی ایک غلط تعبیر ہے۔ اس کے معنی فقط یہ ہیں کہ یہ امتزاج ان کی آمد کے وقت سے شروع ہوا اور رہ مقامات جہاں وہ وقتاً فوقتاً آکر آباد ہوئے اس مظہر کی جلوہ گاہیں ہیں، خواہ وہ سواحلِ بحر پر آکر بسے ہوں خواہ بلند بلند پہاڑوں کو پار کر کے سرسبز، سیراب در یا قطاع ہند میں۔

اچھا تو اُردو کیا ہے۔ اس کے جواب سے پہلے ہند کی تاریخ لسانی پر ایک اُچٹتی نظر ڈالی جاتی ہے۔ آریوں کی آمد سے

---

[1] اس وقت میں حوالہ نہیں دے سکتا کیونکہ جہاں میں ہوں وہاں کوئی معتمد کتب خانہ نہیں۔ ارباب ذوق چاہیں تو Essays on the Sacred Language, writings and Religion of the Parsees by Martin Haug ملاحظہ فرمائیں۔ اس بیان کی صحت یا غلطی معلوم ہو جائیگی۔

پہلے ہند پر دراوڑ قوم قابض تھی۔ ماہران لسانیات کہتے ہیں کہ ان کی اولاد آج جو زبانیں بولتی ہے اس کی دو بڑی قسمیں ہیں، دراوڑی اور منڈا۔ ان میں سے منڈا کی نسبت یہ خیال ہے کہ یہ ہندوستان کی قدیم ترین زبان کا نمونہ ہے۔ دراوڑی کی مختلف شاخوں میں تیلگو۔ تامل اور کناڑی وغیرہ داخل ہیں۔

تاریخ اس کے جواب سے قاصر ہے کہ آریوں نے ہندوستان پر کس وقت سے یورش شروع کی۔ لیکن مورخ اس کو مانتے ہیں کہ وہ کابل کی راہ سے آئے اور شروع شروع میں پنجاب میں بستے رہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کا ایک ہی گروہ یہاں آباد ہو کر اتنا پھلا پھولا نہیں کہ رفتہ رفتہ سارے ملک پر چھا جاتا۔ بلکہ صدیوں کے تفاوت سے مختلف گروہ آتے رہے۔ بعد کے آنے والے اپنے پیشروؤں کو اپنا دشمن اور وحشی سمجھتے تھے اور اکثر اُن کی زبان بھی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ سب سے بعد میں جو گروہ آیا وہ اپنے پیشرو ہم قوموں کو مارتا دھاڑتا پنجاب کھسکے کرتا گنگا جمنا کے دوآبہ میں آکر ٹھہرا۔

رگوید کی تصنیف کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس کے منتر قندھار۔ پنجاب اور جمنا کے کنارہ بنائے گئے۔ تصنیف کے عرصہ بعد ان کی تدوین ہوئی۔ اس تدوین نے صرف زمان و مکان ہی کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ اس کے جامع نے زبان میں بھی تصرف کیا، اور اس کے اختلافات کو رفع کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ یہ کوشش اس قدر کامیاب نہ ہوئی کہ فرق بالکل مٹ جاتا۔ اہل بصیرت کو منتروں کی زبان میں اب بھی اختلاف کی تھوڑی بہت جھلک نظر آ ہی جاتی ہے۔ تاہم لے دے کر رگویدہی بالائی دوآبہ ہند کی متروک زبان کا حامل ہے۔ اسی زبان کے نکھرنے اور سنورنے سے سنسکرت پیدا ہوئی۔ اس کا مسکن مدھیہ دیش یا وسطی ہند تھا۔ جغرافیۂ سنسکرت اس کے حدود اربعہ یہ بتاتا ہے۔ شمال میں ہمالہ۔ جنوب میں وندھیاچل، مغرب میں سرہند مشرق میں دریائے گنگا جمنا کا سنگم۔ یعنی اس میں دریائے گنگا کا دوآبہ اور اس کے شمال و جنوب کا ملک شامل تھا۔ اس خطہ کا اصلی مرکز بالائی دوآبہ کے مضافات اور دریائے سرسوتی کے کنارے تھے۔ مگر یہ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کو اپنے دامن میں نہ سمیٹ سکا۔ اسی قطعہ کے باشندوں کی زبان ترقی کر کے زمانۂ حال کی زبانِ خطۂ وسطی ہو گئی۔

زمانِ ویدہی میں اس خطۂ وسطی کے جنوب، مشرق و مغرب کے ملکوں میں اور آریہ قومیں آباد تھیں۔ اس قطعہ میں زمانۂ حال کے پنجاب۔ سندھ۔ گجرات۔ راجپوتانہ اور اُس کے مشرق کا ملک۔ اودھ اور بہار شامل تھے۔ اسے بیرونی خطہ سے موسوم کرنا چاہئیے۔ اس میں مختلف قومیں آباد تھیں، اور ہر ایک کی بولی الگ الگ تھی۔ ایک سچی بات یہ ہے کہ آپس میں تو یہ بہت ملتی جلتی تھیں مگر خطۂ وسطی کی زبان سے متبائن تھیں۔ غالباً تاریخ لسانِ ہند کے بہت ابتدائی دور میں یہاں ضرور دو طرح کی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ ایک خطۂ وسطی میں اور ایک خطۂ بیرونی۔ اس کے بعد خطۂ وسطی کی آبادی بڑھنے اور پھیلنے لگی، اور اُس نے باقی حصۂ ہندوستان پر گہرا اثر ڈا

خطہ کے بھی دن پھرے، اور اس نے اپنے جنوب و مشرق میں اپنا سکہ جمایا۔ الغرض آج یہ حالت ہے کہ ایک وسطی آریائی زبان ہے جو گنگا کے دوآبہ اور اس ملک کو گھیرے ہوئے ہے جو اس کے جنوب و مشرق میں ہے اس کے تین طرف ایک مخلوط زبانوں کا حلقہ ہے جس کے زیر اثر مشرقی پنجاب۔ گجرات۔ راجپوتانہ۔ اودھ۔ بگھیل کھنڈ اور چھتیس گڑھ ہیں۔ اس سے باہر جو زبانیں بولی جاتی ہیں اُن کا دور دورہ کشمیر۔ مغربی پنجاب۔ سندھ۔ مہاراشٹر اُڑیسہ۔ بہار۔ بنگال اور آسام میں ہے۔ ان میں ہمالیہ کی آریائی زبانوں کو بھی شامل کر لینا چاہئیے۔

سطور بالا میں سنسکرت کی تعریف کی جا چکی، اس کے معنی ہیں شُستہ و رُفتہ زبان۔ اس کی ضد کا نام ہے پراکرت جس کے معنی ہیں فطری یا غیر مصنوع۔ اس لئے لفظ پراکرت ہندوستان کی بول چال کی زبانوں کو ظاہر کرتا اور اُن کے لئے بولا جاتا ہے۔ سب سے پہلی پراکرت جس کا کچھ حال معلوم ہے وہ خطۂ وسطی کا روزمرہ ہے خطۂ بیرونی میں جو روزمرے رائج تھے اُن کا حال قطعی معلوم نہیں۔ تاہم انھیں سب کو پراکرتوں کا دورِ اول کہنا چاہئیے اُس زمانہ میں یہ ترکیبی تھیں۔ اِن کے قواعد خاصے پیچیدہ تھے۔ اور حروفِ صحیح کے حلق شگاف اجتماع پر اعتراض نہ تھا۔ یہی پراکرتیں صدیوں کی کھکھیڑیں جھیل کر دورِ دوم میں داخل ہوئیں۔ اب بھی ترکیبی ہی رہیں مگر دو حرف علت کامل کر ایک آواز کو ظاہر کرنا۔ اور حلق شگاف اجتماع حروفِ صحیح رخصت ہو گئے۔ اس دَور کے ختم ہوتے ہوتے ان میں اچھی خاصی روانی پیدا ہو گئی۔ رفتہ رفتہ ان میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہیں حتی کہ ۱۰۰۰ء سے وہ زمانہ شروع ہوا جسے دَورِ سوم سے موسوم کر سکتے ہیں۔ اس میں وہ زبانیں منظر پر آتی ہیں جو آجکل موجود ہیں۔ گروہ ترکیبی سے تحلیلی ہو گئی ہیں۔

دورِ اول کا تو کچھ یونہیں سا معلوم ہے مگر دورِ دوم ۵۰۰ قبل مسیح سے شروع ہو کر ۱۰۰۰ء پر ختم ہوتا ہے اس پندرہ سو برس میں پراکرتوں نے بہت سی منزلیں طے کیں۔ ان میں سے قدیم ترین کا نام "پالی" ہے۔ یہ بول چال کی زبانیں منازلِ ارتقا طے کرتے کرتے اس اوج پر پہونچ گئیں کہ اعلیٰ پراکرت کہلائیں۔ جب پراکرتوں کا ذکر ہو تو اس سے مراد ہوا کرتی ہے دورِ دوم کے وہ روزمرے جو "پالی" کی منزل سے تو نکل چکے تھے مگر تحلیلی منزل تک نہ پہونچے تھے۔ اسی زمانہ میں پراکرت ان بولیوں میں منقسم ہو چکی تھی جو آج ملتی ہیں۔ پنجاب کی زبان کا تو پتہ نہیں لگتا مگر ہندوستان کا یہ حال تھا کہ وسطِ ہند میں ایک زبان بولی جاتی تھی جسے "شورسینی" کہتے تھے سنسکرت میں متھرا کے آس پاس کے ملک کو "شورسین" کہتے ہیں۔ اسی پر اس بولی کا نام رکھ لیا گیا۔ دورِ دوم کی آخری ہیئت وہ ہے جسے "مخرب" کہہ کر بدنام کیا ہے۔ یہی مخرب بولیاں زمانۂ حال کی بولیوں کی امہات الالسنہ ہیں۔ پنجابی اور مغربی ہندی دونوں مخرب "شورسینی" سے نکلی ہیں۔ ہندوستانی مغربی ہندی کی وہ شاخ ہے جو بالائی دوآبہ اور میرٹھ کے آس پاس کے علاقہ میں بولی جاتی ہے۔ شہر دہلی اس قطعۂ ملک کی جنوبی سرحد کے قریب ہی ہے

یہاں یہ زبان روزمرہ تھی۔

اس خاکۂ تاریخ لسانی سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ

(۱) رگوید سے پہلے کی زبانوں کا حال قطعی نہیں معلوم۔

(۲) رگوید کی زبان بھی پنجاب اور ممالک متحدہ کی زبانوں کو صحیح صحیح پیش کرنے سے قاصر ہے۔

(۳) ہندوستانی زبانوں کی تاریخ سنہ ۵۰۰ قبل مسیح سے شروع ہوئی اور روزبروز ترقی کرتی رہی۔

(۴) آریہ وقتاً فوقتاً آکر اس ملک میں آباد ہوئے۔ دوگروہوں کی آمد کے درمیان اتنا وقفہ تھا کہ ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھتا تھا۔

(۵) پنجابی اور اردو (کھڑی بولی یا ہندوستانی) مغرب شورسینی سے نکلی۔

چونکہ دور دوم کی مغرب شورسینی سے پنجابی اور مغربی ہندی دونوں نکلی ہیں، اس لئے جب مسلمان پنجاب پر قابض ہوکر وہاں آباد ہوئے تو پنجابی میں اُن کے لفظ اور محاورے داخل ہوگئے ہوں گے۔ یعنی عاریت کے دونوں منظر، لفظیات میں اضافہ اور لفظوں کو ترک کرکے اُن کی جگہ فارسی لفظوں کا استعمال، ظہور پذیر ہوئے ہونگے لیکن یہ ناممکن ہے کہ اس واقعہ نے پنجابی کے قواعد یا لفظوں پر کوئی اثر ڈالا ہو۔ ہمیں اس وقت کی پنجابی کی کوئی کتاب نہیں معلوم۔ بودھوں اور جینیوں کی مذہبی کتابیں پالی وغیرہ میں ہیں، اور ان کی زبان پنجاب و ممالک متحدہ کی پراکرتوں سے تعلق نہیں رکھتی۔ کھمان راسو، بیسلدیو راسو اور پرتھی راج راسو وغیرہ میں عربی و فارسی کے لفظ ملتے ہیں۔ مگر ان کی قدامت معرضِ بحث میں ہے۔ پرتھی راج راسو کو تو ہندی کے بعض عالم بارھویں صدی عیسوی کی تصنیف ہی نہیں مانتے، اُن کے نزدیک اس کا زمانِ تصنیف سولھویں صدی عیسوی ہے۔ لیکن اگر بغرض اتمام حجت اس کو تسلیم بھی کرلیا جائے کہ وہ بارھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی تو بھی وہ کتاب ہے جس کی زبان میں سب سے پہلے فارسی اور اُس کے ذریعہ عربی وغیرہ کے لفظ شب تار میں انجم درخشاں کا منظر دکھاتے ہیں۔ لیکن کیا منطق کی بلند سے بلند پرواز بھی کسی کو اس کے تسلیم کرنے پر مائل کرسکتی ہے کہ اس کی زبان اُردو ہے۔ اسی طرح سور، تلسی اور کبیر وغیرہ کے مخلوقاتِ فکر بھی اس بارہ میں مدد نہیں کرتے۔ ان مصنفوں نے اپنی زبان و بیان کو بدیسی اثرات سے بچایا ہے۔ اس لئے جو چند لفظ اِن کے کلام میں نظر آتے ہیں وہ اس قسم کی عاریت کا نتیجہ ہیں جس سے خزانۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے۔ علمائے ادبیات سور اور تلسی کی تصنیفات کو مشرقی و مغربی ہندی کے شاہکار کہتے ہیں۔ اس لئے یہ استدلال خلاف قیاس نہیں کہ عاریت

عہ کبیر اور تلسی وغیرہ کے دوہرے عالم میں زبان زد ہیں مگر وہ فقط اتنی سند کے لئے کافی ہیں کہ اس عہد میں فارسی الفاظ کا دخل ہندوؤں کی زبانوں پر بھی ہوگیا تھا۔ انھیں اس نظم سے علاقہ نہیں جو فارسی سے آکر اُردو کے لباس میں ظاہر ہوئی اور ملکی ملک کو بے دخل کرکے گوشے میں بٹھا دیا۔ (ادبیات صفحہ ۲ مطبوعہ رفاہ عام اسٹیم پریس، لاہور ۱۹۱۳ء)

جب تک کسی زبان کی کایا نہ پلٹ دے، اس کے اُصول قواعد نہ بدل دے، اُس کے جزوِ غالب پر قابض نہ ہو جائے اُس وقت تک یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ اس کے امتزاج سے ایک نئی چیز پیدا ہو گئی۔ سطورِ بالا میں فارسی کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس سے بھی زیادہ عاریت کی بے بسی کا تماشا دیکھنا ہو تو تاریخ لسانِ انگریزی کا مطالعہ کرنا چاہئے اس کا خزانۂ الفاظ کہے گا ؎

نہ کیوں ہوں لاکھ مستانہ ادا میں میرے خانے میں گدائے میکدہ ہوں ہر طرح کی ہے پیالے میں

اور یہ بھی بتلائے گا کہ کیلٹک (Keltic) پر جب تک اینگلو سیکسن (Anglo-Saxon) غالب نہیں آئی، انگریزی پیدا نہیں ہوئی۔ اور مختلف زبانوں سے الفاظ لینے کے باوجود انگریزی، انگریزی ہی رہی اور آج تک ہے۔ اس کی اور اُردو کی تاریخ میں بھی بہت کچھ مماثلت ہے۔

مسلمانوں نے قریب قریب پونے دو سو برس تک پنجاب پر حکومت کر کے دہلی کا رخ کیا۔ لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ ان کے قبضۂ پنجاب کے زمانہ میں پنجابی نے جس سے وہ زبان مراد ہے جو مغرب شورسینی کی ایک شاخ تھی، اپنی لفظیات میں اضافہ کیا ہو گا اور کچھ لفظ ترک کر کے اُن کی جگہ عربی فارسی کے لفظ بولنے شروع کر دیئے ہونگے۔ لیکن کسی تصنیف کے دست یاب نہ ہونے سے حدودِ عاریت کا معین کرنا خیالی پلاؤ پکانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ قیاس اس سے زیادہ کی جرأت سے مانع ہے۔ اس لئے جب دارالسلطنت لاہور سے دہلی پہنچا تو اُس کے ساتھ آنے والے جو کچھ لائے ہونگے وہ مغرب شورسینی کی شاخ پنجابی ہو گی جس میں عربی فارسی کے لفظ ملے ہوئے ہونگے۔ دہلی پہونچ کر پنجابی کے وہ عناصر جو قدرِ مشترک کا درجہ رکھتے تھے اپنی انفرادیت کھو بیٹھے ہوں گے اور مغربی ہندی کی اس شاخ میں جو دہلی اور اُس کے نواح میں رائج تھی (ہندوستانی یا کھڑی بولی) اس کی لفظیات میں اضافہ کی یہ صورت ہوئی ہو گی کہ نوواردوں کے مستعمل الفاظ فارسی کے علاوہ پنجابی کے وہ لفظ جو مغربی ہندی کا جزو نہ تھے اس میں داخل ہو گئے ہونگے، ادبیاتِ اُردو کے ایک مورخ کا مقولہ ہے:-

"نارمنز کے آنے سے انگریزی پر جو اثر پڑا گو اُس کے بیان میں مبالغہ کو دخل ہے، لیکن وہ اثر اس اثر سے ضرور زیادہ تھا جو پنجابی اور ہندی پر مسلم افواج کے آنے سے پڑا۔ سوا اس کے کہ ان دونوں زبانوں نے چند لفظ لے لئے اور کسی قسم کا اثر برائے نام ہی تھا۔ عملاً دونوں میں کوئی تغیر ظہور پذیر نہیں ہوا۔ ضمیریں، فعل، عدد، اور قواعد نہیں بدلے۔ خاص تبدیلی لفظیات میں ہوئی۔"

ایک خیال ہے کہ اُردو پر پنجابی نے اثر کیا۔ اگر اس سے یہ مراد ہے کہ بوقتِ تبدیلیٔ مستقر حکومت پنجاب سے آنے والے کچھ لفظ اپنے ساتھ لائے جن سے مغربی ہندی کی شاخ ہندوستانی کی لفظیات میں اضافہ ہوا تو تسلیم ہے لیکن اگر مقصود یہ ہے کہ اس نے کسی اصولِ زبان کو بدلا تو اس کے اعتراف میں تأمل ہے۔ تائیدِ دعویٰ میں یہ

مثالیں پیش کی گئی ہیں:-

ہندوی	قدیم ہند آریائی	ہندوی	قدیم ہند آریائی
کام	کَرَم	لاکھ	لکشں
سچ	سَتیہ	کل	کَلیہ

"کام" اور "لاکھ" میں جو اصول کارفرما ہے اُس کا پتا زبانِ وید کی پراکرتوں میں چلتا ہے۔ بیجُرم۔ بھیل۔ یمبَ" وغیرہ" چام۔ بھیل۔ نیم" کی صورت میں ملتے ہیں۔ "سچ" اور "کل" دوسرے اُصولوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اِن لفظوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی لفظ کا کوئی حرف حذف نہیں کیا جاتا بلکہ بدل دیا جاتا ہے تو نقصان کی تلافی کی وہ صورت نہیں ہوتی جو اس وقت ہوتی ہے جب کہ نعم البدل مہیا نہیں کیا جاتا۔ وید کے زمانہ کی پراکرتوں سے قطع نظر اگر دورِ دوم کی پراکرتوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مرکب حروفِ صحیح جب بدلے ہیں تو ان سے پہلے کے مقصور حرفِ علت کو ممدود نہیں کیا گیا۔ وہاں بھی سنسکرت کی "ت ی" "چ" سے بدلی ہے "ل ی" میں سے بھی پُرانی پراکرتوں میں کبھی "ل" اور کبھی "ی" حذف کردی جاتی تھی۔ اشوک کے کتبات اس کے شاہد ہیں۔ یہ باتیں اس گمان کی طرف رہنمائی کرتی ہیں کہ اس قسم کے اُصول ہندوستان کی اکثر پراکرتوں میں کارفرما تھے۔ انھیں پنجاب سے کوئی خصوصیت نہ تھی، اور ممالک متحدہ کی بولیوں یعنی مغربی ہندی اور اس کی شاخوں میں ان کا موجود ہونا بعید از قیاس نہیں۔

سو۔ سوا سو برس تک اس زبان نے دہلی میں پرورش پاکر دکن کا رخ کیا اور مقامی الفاظ سے مل کر دکنی اُردو بن بیٹھی۔ اب اس نے دہلی اور دکن دونوں میں ترقی کرنی شروع کی۔ دکن کی یہ خصوصیت ہے کہ اُس نے اس سے تصنیف و ترجمہ کا کام لے کر اسے ادبی رفعت بخش دی۔ اب طبعًا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلمانوں کے پنجاب میں داخل ہونے سے لیکر دکن میں پہونچنے تک یعنی تین سواتین سو برس میں پنجاب یا دہلی نے کوئی شاعر یا نثار پیدا نہیں کیا۔ نفی میں اس کا جواب خلاف فطرت ہے، اثبات میں جواب دیں تو اثباتِ دعویٰ کے شواہد کہاں، لیکن جواب اثبات ہی میں دینا پڑیگا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سنسکرت کے دور دورہ نے باوجودیکہ عام زبانیں پراکرت تھیں لوگوں کو عرصہ تک مادری زبان کی طرف توجہ نہ کرنے دی اور ان کی دماغی قوتیں تمام تر سنسکرت کی تربیت و پرورش میں صرف ہوئیں اس زمانہ غلبۂ سنسکرت میں بھی پراکرتوں کے ناظم و نثار ماننے پڑیں گے اور یہ بھی فرض کرنا پڑے گا کہ ناقدری اور کم ہمتی نے ان کی نظم و نثر کو منصۂ شہود پر آنے سے مانع ہوکر انھیں سپرد فنا کردیا۔ جب کسی ملک پر غیر ملکی ادب کی عظمت اپنا سکہ جمالیتی ہے تو اس کا مذاقِ ادبی بگڑ جانے سے اہل قلم کے دلوں میں ایک اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے جسے فقدانِ جرأت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے اُن مخلوقاتِ فکر کو مادری زبان میں پیش کرتے ہوئے جھجکتے ہیں جو انھیں بہت ہی عزیز

ہوتے ہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ کس مپرسی کہیں انھیں تھپک کر آغوشِ فنا میں نہ سلادے۔ کسی زمانہ میں لاطینی و فرانسیسی وغیرہ انگریزی پر چھائی ہوئی تھیں۔ چاسر کی کوششوں نے ان کی تباہی کا سنگ بنیاد رکھا۔ لیکن دو صدی بعد تک یہ کیفیت تھی کہ بیکن اس اندیشہ سے اپنے خیالات لاطینی میں قلم بند کرنا چاہتا تھا کہ اس کی اپنی زبان انگریزی اس امانت کا بار نہ اٹھا سکے گی اور وہ وسطِ فنا میں ہلاک ہو جائیں گے۔ اُردو کا ابتدائی زمانہ انگریزی اور پراکرتوں کے ان دوروں سے بہت ہی ملتا جلتا ہے۔ شوقِ شہرت اور خوفِ ناقدری نے یا تو ناظموں اور نثاروں کو اس طرف توجہ ہی نہ کرنے دی یا انھوں نے کبھی جرأت سے کام لیا تو عربی فارسی زدہ پبلک کی بدمذاقی نے ان کے مولوداتِ فکر کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

وہی مورخ تاریخ ادب اُردو جس کا ذکر آچکا ہے کہتا ہے کہ دکن میں پرچم فتوحاتِ اسلامی لہرائے تو وہاں کے تیلگو۔ کناڑی بولنے والے باشندوں میں سے زیر سایۂ اسلام آنے والوں میں جو زبان پیدا ہوئی وہ اُردو تھی۔ اگر اس رائے کو صحیح مان لیا جائے تو وہاں وہی صورت ظہور پذیر ہوئی ہوگی جو ہندوستان پر تسلط برطانیہ سے ان ہندیوں میں ہویدا ہوئی جو حلقہ بگوشِ عیسائیت ہوئے۔ اکثر ہندی عیسائی اُردو چھوڑ کر انگریزی بولنے لگے۔ اس سے انگریزی میں کسی ہندوستانی زبان کے لفظ داخل نہ ہو سکے۔ کیونکہ ان کی تعلیم و تربیت نے انگلستان کو چشمۂ فیض بنایا۔ اور دیگر امور کی طرح زبان کے بارہ میں بھی ان کی آنکھیں ادھر ہی لگی ہوئی ہیں۔ دکنی نو مسلموں نے بھی تامل تیلگو چھوڑ کر دہلی کو "قبلۂ مقصد نگاہِ نیاز" بنایا ہوگا۔ لیکن کوئی جادو ایسا نہیں ہو سکتا جس نے چشم زدن میں ان کی مادری زبان کو ان کے حافظے سے محو کر کے اس کی جگہ اس میں اُردو رکھ دی ہو۔ اور وہ مسلمانوں کے پہونچتے ہی اور اسلام قبول کرتے ہی فوراً اُردو بولنے لگے ہوں۔ انھوں نے رفتہ رفتہ اُردو سیکھی ہوگی۔ اس کے علاوہ انگریزی ایک غیر ملکی زبان ہے اور دراوڑی بولیاں لاکھ پراکرتوں سے تعلق نہ رکھتی ہوں آخر بولی تو اسی سرزمین پر جاتی تھیں۔ اس لئے ان نو مسلموں نے دہلی کی زبان میں ایک خاصی تعداد اپنے لفظوں کی داخل کر دی ہوگی اور اس کے تسلیم کرنے سے مفر نہیں۔ کہ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی جو پنجاب اور دہلی میں آچکی تھی صرف فرق اتنا تھا کہ پنجاب اور دہلی میں مقامی زبانوں کی لفظیات میں اضافہ ہوا تھا۔ دکن میں یہ اضافہ دہلوی زبان میں ہوا۔ یا یوں کہئے کہ دکن پہونچکر اُردو نے کچھ دکنی لفظ اپنے خزانۂ الفاظ میں اور داخل کر لئے یعنی اُردو اس وقت کھڑی بولی پنجابی اور دکنی کے الفاظ کا ایک معجون مرکب تھی مگر ابھی تک اس کے قواعد کے بدلنے کا کوئی سبب پیدا نہیں۔ اسی واقعہ سے یہ بھی قیاس کر لینا چاہیئے کہ اُردو دیگر اقطاع ہند میں پہونچی تو وہاں اس نے کس قسم کے اثر قبول کئے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز دکن سے دہلی آئے گھر لوٹے تو طرۂ اُردو کو زیب دستار کئے ہوئے۔ ان کی معراج العاشقین کا گہرا مطالعہ اس نظر سے کرنا چاہیئے کہ لفظیات [illegible] اداکا کیا عالم ہے۔ وہ جوانی میں دہلی آئے اور بوڑھے ہو کر واپس ہوئے۔ ان کی زبان

اس وقت کی دہلوی زبان کا نمونہ ہے لیکن یہ اُمید کرنا کہ اس پر فارسی کے گہرے نقش مرتسم ہونگے خلاف توقع ہے۔ اس اصول کی بنا پر جو عام طور سے اختیار کیا گیا ہے، اُردو کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے اس لئے اس طریق استدلال ہی کو ترک کر دینا بہتر ہے۔ اس کی ہستی اور ہی دلائل سے ثابت کرنی چاہیئے جو اس کو بلا شبہ شک ثابت کریں کہ زبان پر ایک بیرونی اثر پڑا جس نے بالکل نہیں تو بہت کچھ اس کی کایا پلٹ دی۔

اس سے پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ ہندی کے شاعر اس زبان سے اپنے خیالات کی اشاعت کا کام لیتے رہے ہیں۔ ان کی تراوش کلک کو اُردو کا خطاب دینے سے یہ امر مانع ہے کہ انھوں نے عروض، خیال اور طرز ادائے خیال، ہر چیز کو ملکی اور دیسی رکھا اور استفادہ بھی سنسکرت ہی سے کیا جن نمونوں کی انھوں نے نقل کی اور جن سے اپنے ادب کو ترقی دی وہ ایک دانستہ کوشش تھی حدود ملکی میں رہ کر بلند پروازی کی۔ لیکن دکن میں دہلوی زبان کے پہونچنے کے بعد مسلم مصنفین ایک نئی دنیا میں نکل گئے۔ انھوں نے یک قلم ہندی عروض کو خیرباد کہدیا اور خیال اور طرز ادائے خیال کو فارسی کے قالب میں ڈھالنا شروع کیا۔ درحقیقت یہی وہ منزل ہے جہاں سے ہندی ادب میں ایک نئی چیز داخل ہوئی اور اسی کو اُردو کی ابتدا یا پیدائش کہہ سکتے ہیں۔ بعض شاعر ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے عروض ہندی سے بھی کام لیا ہے، لیکن گو ان کا کلام اس وقت پیش نظر نہیں مگر یہ یقین کرنا بھی شاید حقیقت سے چشم پوشی نہیں کہ انھوں نے خیال اور طرز ادائے خیال میں ان شاعروں کا تتبع کیا جو ہندی کے شاعر مانے جاتے ہیں

انقلاب سب سے پہلے دنیائے نظم میں آیا، اس لئے اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اُردو میں نثر سے پہلے نظم عرصۂ وجود میں آئی اور یہی صحیح بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ نثر بالکل مفقود تھی۔ نظم سے پہلے نثر کا کسی نہ کسی صورت میں ہونا ناگزیر ہے۔ علما اُن صورتوں میں بھی نظم پر نثر کے تقدّم کے قائل ہیں کہ جن میں نظم موجود اور نثر معدوم ہے، مثلاً رگوید کے منتر نظم میں ہیں اور وہ نثر فنا ہو چکی جس سے وہ قالب نظم میں ڈھالے گئے ہیں۔ لیکن اس سے وہ یہ استدلال نہیں کرتے کہ لوگ آپس میں گفتگو کیا کرتے تھے گویا شعر فی البدیہہ کہتے تھے بلکہ صاف صاف کہتے ہیں کہ زمان تصنیف رگوید میں ایک پراکرت یا نثری روزمرہ تھا جس کی منظوم صورت کے مظہر رگوید کے منتر ہیں۔ اس لئے اس مقولہ کے معنی کہ اُردو میں نثر سے پہلے نظم پیدا ہوئی صرف یہ ہیں کہ دیسی سامان سے بدیسی طرز میں کام لینے کی ابتدا نظم سے ہوئی۔ پہلے نظم میں عروض ہندی پر عروض عربی کو ترجیح دی گئی اور خیال اور طرز ادائے خیال بھی سب سے پہلے یہیں بدلے۔ نثر اُردو نے بعد میں فارسی کی تقلید کی اور اس کا طرز ادائے خیال بعد میں اختیار کیا۔

یوں تو شاید دکن ہی میں فارسی نے اُردو کو دبانا شروع کر دیا ہوگا لیکن ارکان اربعہ اُردو یعنی مظہر، میر، سودا اور درد کی کوششیں اس قدر نمایاں ہیں کہ ان کے سب معترف ہیں۔ پروفیسر محمد حسین صاحب آزاد فرماتے ہیں

"خانِ آرزو وہی شخص ہیں جن کے دامنِ تربیت سے ایسے شایستہ فرزند پرورش پاکر اُٹھے جو زبانِ اُردو کے مصلح دینے والے کہلائے" اور جس شاعری کی بنیاد ذوجگت اور ذو معنی لفظوں پر تھی اُسے کھینچ کر فارسی کی طرز اور ادائے مطالب پر لے آئے۔" قائمؔ اسی دَور کے شاعر ہیں تعلّی کی لیتے اور کہتے ہیں :-

قائمؔ قائمؔ میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ ۔۔۔ اِک بات لچرسی بہ زبانِ دکنی تھی

اُردو دکن میں مِس خام تھی دہلی میں واپس آکر کُندن ہوگئی۔ افسوس کہ پنجاب نے اس کی تخلیق میں جو حصّہ لیا وہ ہمارے دائرۂ علم سے خارج ہے۔ کاش اس وقت کی کوئی تصنیف کسی تاریک گوشے سے نکل کر شک و اشتباہ سے مکدّر مطلع کو صاف کر دیتی! شیخ فریدالدین شکر گنج سے جو چند شعر منسوب کئے جاتے ہیں۔ بعض محققین کو ان کی صحت میں کلام ہے۔ اس کے بعد پنجاب سترھویں صدی میں منظرِ عام پر آتا۔ اور شیخ عثمان، شیخ جنید، ولی رام، اور مولانا عبدی کو پیش کرتا ہے مگر اس سے کہیں پہلے دکن میں بہت سے شاعر پیدا ہو چکے تھے اور پنجاب پر بیرونی اثرات کا پڑنا ناممکن نہیں۔ تاریخی تحقیقات کے لئے دار السلطنت کے بدلنے سے پہلے کے کلام کی ضرورت ہے اور وہ نایاب ہے۔

یہاں جو نظریہ پیش کیا گیا ہے وہ محض گرامر (قواعد زبان) پر مبنی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی زبان کی گرامر وہ صحیفہ ہے جس میں اُس زبان کے رسم و رواج اور طور و طریق مرقوم ہوتے ہیں جو اس میں رفتہ رفتہ پیدا ہوئے ہیں۔ اور جب تک اس میں یہ اپنی جگہ پر قائم ہیں صرف چند لفظوں کا داخلہ اسے بدلا نہیں کرتا۔ زبانوں کی تاریخ کا گہرا مطالعہ اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ سطور بالا میں انگریزی کا حوالہ بطور مثال دیا ہی جا چکا ہے۔

ایک رُجحان پیدا ہو گیا ہے جو اُن اسباب کا مخالف ہے جنھوں نے اُردو کو جنم دیا۔ یہ شعرائے اُردو کا دامن پکڑ کر انھیں ہندی زبان و بیان کی طرف کھینچ رہا ہے۔ اگر اسے کامیابی ہوئی تو حق بہ حقدار رسید کا مصداق ہوگا، لیکن زمانے نے اُردو اور ہندی کے درمیان جو سدِ سکندری حائل کر دی ہے وہ شاید نہ ڈھائی جا سکے کیونکہ عصبیت فریقین کو اُن سرچشموں کی طرف لئے جا رہی ہے جن میں بُعد المشرقین ہے۔ یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہو گا۔

رباعیاں

افسانۂ غم ہے زندگانی میری ۔۔۔ ہے معنیِ بیکسی کہانی میری
پروانہ بھی نزدیک نہ آیا افسوس ۔۔۔ مفلس کا چراغ تھی جوانی میری

چھائی ہے سرِ چرخ گھٹا اے ساقی ۔۔۔ ایسے میں کرم اپنا دکھا اے ساقی
بیگانۂ افکارِ جہاں جو کردے ۔۔۔ وہ بادۂ سرجوش پلا اے ساقی ([illegible])

ایک رُباعی

بنامیر خدا

ہر آہ کی لو زمزمہ باری نکلی
ہر آنچ کی رو بادِ بہاری نکلی
آنکھوں سے گزر چکی جب اشکوں کی سپاہ
ہونٹوں پہ تبسم کی سواری نکلی

جوش

تاریخ ماضی کا سنہرا ورق

(از ستار جمال ۔ بھوپال)

پردہ داری میکند بر قصرِ قیصر عنکبوت
بوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

لکشمی بائی مہارانی جھانسی سے کون واقف نہیں، قوم پرست ہندوستان کا ہر بچہ جانتا ہے حریت و آزادی کی دیوی، روحِ عسکریت کی عدیم النظیر ملکہ۔ فوجی تاریخ ہند کا روشن ماہتاب۔ یہ وہی بہادر عورت ہے جس نے برطانیہ عظمیٰ کی عظیم الشان فوجی قوت کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا تھا اور جس نے سامراج استبداد کے پرخچے اڑا دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ یہ وہی برگزیدہ مہارانی جھانسی ہے۔ جس نے قربانگاہِ آزادی پر نہ صرف اپنی فرمانروائی کو بھینٹ چڑھا دیا بلکہ اپنی روح کو بھی نذر کر دیا۔ اور جس پر تاریخ ہند ہمیشہ فخر کرے گی۔ یہی ہندوستان کی پُر عظمت دیوی ہے، جس نے مٹھی بھر نوجوانوں کے ساتھ برطانوی عسکری طاقت کو تہ وبالا کر دیا تھا۔ ہم ناظرین کرام کو اُس کے دَور میں لئے چلتے ہیں اور ایک ایسا واقعہ پیش کرنا چاہتے ہیں جو پُر تنظیم لکشمی بائی کی سپاہی شناسی کی نادر مثال ہے۔

مہارانی بہ نفس نفیس قواعد میں شریک ہوا کرتی تھیں اور اکثر اوقات خود پریڈ لیا کرتی تھیں۔ ایک دن خود پریڈ سے فارغ ہو کر پریڈ ملاحظہ فرما رہی تھیں کہ میر بخشی فوج حشمت اللہ عزیز جو بلند و بالا۔ قوی ہیکل پُر رعب چہرہ۔ سرخ و سفید رنگ کا انسان تھا، حاضر ہوا فوجی انداز سے سلام کیا۔

مہارانی۔ کہیئے میر بخشی صاحب

میر بخشی۔ سرکار، ایک سپاہی ملاحظۂ حضور میں پیش کرنا چاہتا ہوں،

مہارانی، حاضر کرو۔

میر بخشی نے فوجی سلام کیا اور واپس گیا، چند منٹ بعد واپسی پر ایک نوجوان ساتھ تھا عمر بمشکل بیس سال، قد اوسط درجہ کا۔ نازک اور چھریرا اپا بدن گویا کا متحرک مرقع۔ پتلے پتلے لب، چھوٹا دہانہ غزالیں آنکھیں۔ لانبی لانبی

پلکیں، پیوستہ کمان ابرو، فراخ پیشانی، خط سبز سے چہرہ اجنبی محسوس۔ شاندار قیمتی ملبوس۔ ہر حیثیت سے انتہائی جاذب نظر۔ حاضر شدہ نوجوان تھوڑی دیر کے لئے مہارانی کا مرکز نظر بن گیا۔ مہارانی نے پوری محبت اور شفقت کے ساتھ پوچھا۔ تمھاری قومیت کیا ہے اور نام۔ مہارانی کی فوج میں راجپوت اور پٹھان ہی ملازم ہوسکتے تھے اور سید افسر

حمید اللہ رشید: سید ہوں" ادب کے ساتھ جواب دیا۔

مہارانی۔ ابھی تم بالکل کم عمر ہو تمھارے کھیلنے کھانے کے دن ہیں

حمید اللہ رشید۔ سرکار سپاہی کا کھیل تلوار بازی، نیزہ بازی، چوگان بازی،

مہارانی۔ میر بخشی صاحب یہ کس خاندان کا نونہال ہے۔

میر بخشی۔ معنور عالیہ یہ میرا حقیقی چھوٹا بھائی ہے۔

مہارانی۔ جبھی یہ سپاہیانہ انداز ہیں۔ اچھا رشید ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم نے اپنے خاندانی فنون حرب سے کیا حاصل کیا ہے (اور حکم دیا) "ہمارا سبزہ گھوڑا لاؤ"

بائی جی کا سبزہ گھوڑا عجیب الصفات تھا، فوج کے اکثر شہسواروں کو اس گھوڑے کی سواری نے خاک چٹادی تھی، الف ہوتا تھا، دولتی مارتا تھا، کاٹتا تھا، بغیر ضرورت و بغیر اطلاع سوار کے لیٹ جاتا تھا۔ تعجب خیز امر یہ تھا کہ مہارانی کی سواری میں بالکل بے عیب۔ دو سائیس گھوڑے کو پکڑے ہوئے لائے خاص مضبوط رسیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ قفسی ودہانہ خار دار چڑھا ہوا تھا۔

مہارانی:۔ زین کس دو۔

حمید اللہ رشید۔ "سوار کے لئے ننگی پیٹھ اور زین دونوں برابر ہیں"

رشید خاردار دہانہ الگ کرتے ہوئے انتہائی سرعت کے ساتھ گھوڑے کی پیٹھ پر تھا۔ گھوڑا چند قدم تک الف حالت میں گیا، اس کے بعد لگام دباکر سرپٹ ہوگیا۔ حمید اللہ رشید نے بھی گھوڑے کی تیزی میں مزاحمت نہیں کی۔ جب تک بائی جی سے زیادہ دوری نہیں ہوئی۔ جب سوار کی مقررہ حدود سے گھوڑے نے آگے بڑھنا چاہا تو حمید اللہ رشید نے پوری طاقت کے ساتھ ہنٹر کی موٹھ سے گھوڑے کی تھوتھنی کی تواضع کی، تیسری ضرب پر لگام آزاد تھی۔ اور گھوڑا ابھی مطیع الامر۔ جب مہارانی صاحبہ کا تھوڑا فاصلہ رہ گیا، گھوڑا الف ہوکر لیٹنا ہی چاہتا تھا کہ سوار زمین پر کھڑا تھا اور گھوڑے کے پاؤں زمین پر ٹیکتے ہی سوار پشت اسپ پر۔ آناً فاناً یہ سب کچھ ہوچکا تھا۔ مہارانی صاحبہ اور تمام فوج کی زبان سے بے ساختہ آفریں و مرحبا کی صدائیں بلند ہوگئیں۔ مہارانی صاحبہ نے سوار کے اترتے ہی سوار کی پیٹھ ٹھونکی اور فرمایا "یہ میرا نیزہ ہے، ہزار قدم کے فاصلہ پر تمھاری فوج

مقتول سپاہی پڑا ہوا ہے، دشمن کا دباؤ بڑھ رہا ہے، ضرورت ہے شاندار سپاہی کی، تاکہ تم پشت دشمن پر
مد کرسکو۔ مگر اپنے مقتولین کی لاشیں نہ چھوڑو تاکہ دشمن کو تمہارے کشتوں کا پتہ چل سکے، اور تمہارے شہید
ئیوں کی بے حرمتی نہ ہو۔

حمید اللہ رشید نے تعمیلِ حکم میں نیزہ تھاما، گھوڑے کو سرپٹ چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر میں روئی کا بنا ہوا پتلا سپاہی کے سامنے تھا اور گھوڑا پوری سرعت کے ساتھ واپس آرہا تھا۔

مہارانی:۔ شاباش! دیکھو یہ میری تلوار ہے، کچھ کارآمد بھی ہے یا نہیں؟

رشید نے تلوار لیتے ہوئے ادب کے ساتھ تلوار پر بوسہ دیا اور شمشیر زنی کے وہ کمال جو صرف کہنہ مشق ستادوں کے لئے خاص تھے۔ دکھلائے، مثلاً لیموں وغیرہ کا کاٹنا حریر کا ہوائی چورنگ کرنا۔ وغیرہ

مہارانی:۔ تم نے کچھ بندوق کی طرف بھی توجہ کی شاید چلا لیتے ہوگے۔ اچھا دیکھیں تمہارا نشانہ کس نوبت پر ہے،

رشید: سرکار تاش کا پتہ لانے کا حکم دیا جائے، پنجا ہو تو مناسب ہے۔

مذکورہ پتہ منگوایا گیا۔ رشید نے پتہ اتنے فاصلہ پر رکھا کہ بُندکیاں دکھائی دیں۔ اور زمین سے چند ٹ اونچا اٹھا ہوا اور مسلسل پانچ فیر کئے، اس کے بعد پتہ لاکر بائی جی کی خدمت میں پیش کیا، برابر فاصلے سے پانچ راخ تھے پنجے نے دہلے کی صورت اختیار کرلی تھی۔ کمال مظاہرہ نشانہ بازی نے ہندوستان کی جلیل القدر تی کو بھی حیرت میں ڈال دیا۔

مہارانی: میر بخشی صاحب، رشید کی تعلیم کس نوبت پر ہے؟

میر بخشی:۔ حضور عالیہ۔ عربی۔ فارسی کی درسی کتابوں کی تکمیل کی ہے۔

مہارانی:۔ رشید یہ میرا نیزہ اور تلوار امانت ہے، اس کا احترام تم کو خون سے کرنا پڑے گا بولو۔ قدمِ ثبات لغزش تو نہ ہوگی؟

رشید: سرکار سپاہی تو موت سے کھیلا ہی کرتا ہے، پیدا ہی موت کے لئے ہوا ہے۔

مہارانی: اچھا کل دربار میں تم حاضر ہو۔

دوسرے دن دربار میں حمید اللہ رشید حاضر ہوتا ہے۔ خلعتِ فاخرہ عطا فرماتے ہوئے بائی جی فرماتی ہیں نے تم کو سرحدی قلعہ تانبھٹ کا قلعدار مقرر کیا۔ تم کم عمر ہو، عہدہ انتہائی اہم ہے۔ سرحدی قلعہ ہے۔ دیکھو اپنی اور خاندان کی عزت اور میرے انتخاب کا احترام ملحوظ رہے۔ واقعہ مذکورہ کو ایک سال چند ماہ گزر چکے ہیں۔ مد اللہ رشید کا برتاؤ عوام سے اور اپنے ماتحتوں سے انتہائی قابلِ تعریف ہے۔ اس کی بے غرض ہمدردی، مزاجی، وسعتِ اخلاق، ہر شخص کے لئے باعثِ تاثر، اس کا دسترخوان وسیع تھا۔ بسا اوقات اس کے

ماتحت افسر اس کے ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے۔ ایک دن دوپہر کے کھانے میں مشہور تلور لیے صوبیدار شیر افگن خاں اور رسالدار غلام محمد خاں شریک تھے۔ شیر افگن خاں نے پشتو میں کہا "ہمارے سردار کی نازک اور مخروطی انگلیاں خوبصورت زنانہ ہاتھ زمامِ قلعداری کے بجائے پیش کشِ ساغر کے لئے زیادہ موزوں ہے جمیل ساقی ہے۔"

غلام محمد خاں "۔ بارہا میں نے اپنے سردار کو کمرۂ خواب میں سوتے پایا، رنگین دوشالہ جسم پر لپٹا ہوا تھا منہ کھلا ہوا، خیال گزرا کہ ایک دوشیزۂ نوخاستہ ہے۔ فردوسی رعنائیوں میں ڈوبا ہوا۔ پیکرِ حیات۔ نسائی حسن وجمال کا ماہِ نو۔ واللہ قلعداری کے لئے بھی بجائے بہادری کے ملائک فریب حسن سببِ سفارش بنا۔"

رشید پشتو زبان سے پوری طرح واقف تھا، اس تمام گفتگو کو سنتے وقت، اس کے کمالِ ضبط کا ادنٰے مظاہرہ یہ تھا کہ چہرہ بالکل ساکن۔ مجال کیا کہ ایک عضلہ تک پھڑکا ہو۔ دوسرے دن صوبیدار میجر شام سنگھ اور قلعدار رشید دونوں گھوڑوں پر سوار کھلے میدان میں آبادی سے فاصلہ پر مندرجۂ ذیل گفتگو کر رہے تھے۔

قلعدار: ۔ تم ادمٹ راجپوت ہو تم کو تلوار کی عزت کی قسم تلوار نکالو۔ بالکل ایک حریف کی طرح مقابلہ کرو۔"

شام سنگھ: "آپ انتہائی شریف افسر ہیں۔ آپ کا برتاؤ میرے ساتھ برادرانہ رہا۔ فوجی آئین بھی میری تلوار کشی کی شدید مخالف۔ خوب یاد رکھیئے۔ بائی جی عسکری ضوابط کی خلاف ورزی کرنے والے کے خاندان کو بھی مشکل سے معاف کرتی ہیں۔

قلعدار: ۔ میں بھی تمہارا افسر ہوں، تمہارے لئے میرا حکم فوجی اصول سے قابلِ احترام ہونا چاہیئے۔ اس پر میری دوستانہ التجائیں کیا اتنی ناقابلِ لحاظ ہو سکتی ہیں۔ عزیز دوست دو گھنٹہ بعد رازِ مقابلہ زیرِ نقاب نہیں رہے گا۔"

شام سنگھ: "۔ راجپوتی تلوار دوستوں پر نہیں اٹھا کرتی، اور ساتھ ہی ہم قومی وقار کے لئے ہر قسم کی قربانی بخوشی قبول کر لیا کرتے ہیں۔ مقابلہ بہرحال مقابلہ ہے۔ یہ کہہ کر شام سنگھ نے تلوار کھینچ لی۔ ڈیڑھ گھنٹہ کے مقابلہ کے بعد تلوار شام سنگھ کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ قلعدار نے لپک کر شام سنگھ کو گلے سے لگاتے ہوئے پورا واقعہ شیر افگن خاں اور غلام محمد خاں کا جو کھانے کے وقت گذرا تھا بیان کر دیا۔ اور کہا کہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ میرا انتخاب غلط تو نہ ہوا ہے۔ دیکھو شام سنگھ میری موت یا تمہاری شکست اگر انتخاب مالک کو صحیح ثابت کر سکتی ہیں تو واقعہ ہونا چاہیے۔ یہ کہتے ہوئے شام سنگھ کو تلوار قلعدار نے خود پیش کی۔ تم بہادر ہو میری نذر قبول کرو۔ مجھے سچے دل سے معاف کرنا۔

شام سنگھ: "تمہارا حسین چہرہ، تمہارا نازک جسم، فولادی قوت کا مالک ہے۔ تمہارا کمالِ فنونِ حرب عہدہ قلعداری سے بلند۔"

قلعدار۔ اس گفتگو کو راز میں رکھنا۔ پھر دونوں قلعہ میں واپس آگئے۔

واقعہ مذکورہ کے تھوڑے دن بعد شیر افگن خاں، غلام محمد خاں، حمید الشد رشید بیٹھے ہوئے تھے، ایک گونڈ بھاگتا ہوا آیا اور اُس نے کہا، اس قلعہ کی پہاڑی میں قلعہ سے ایک میل فاصلہ پر شیرنی نے بچے دیلے ہیں، بچے دو چار دن کے ہیں، شیرنی اگر مار ڈالی جائے تو بچے زندہ ہاتھ آسکتے ہیں۔ شیر افگن خاں اور غلام محمد خاں اپنی بندوقیں لینے کے لئے لپکے، رشید نے چند سکنڈ غور کیا، پورے سکون کے ساتھ آہنی دستانے پہنے، پیش قبض جیب میں ڈال لیا۔ تھوڑی سی دیر کے بعد تینوں شیرنی کے کچھار کے قریب تھے۔ گونڈ جو آگے آگے تھا اُس نے تینوں افسروں کو رک کر کہا کہ یہ موڑ جہاں سے راستہ مڑتا ہے اور نرکل کے درختوں تک جا کر ختم ہوتا ہے بس وہیں شیرنی ہے مگر سردار شیرنی یونہی کڑی ہوتی ہے جب بچے پاس ہوتے ہیں تو بہت غضب ناک ہو جاتی ہے احتیاط کیجئے پاؤں کی چاپ نہ سنائی دے، میں آدمی بلا کر ہانکے کے لئے لاتا ہوں، وہ ہانکا کریں گے، شیرنی نکلے گی، آپ پارچہ پر سے مار لیجئے۔

قلعدار: (اَن سُنی کرتے ہوئے) دیکھو دوستو، تلوار و نیزہ سے تو بہت کثرت کے ساتھ شیر کا شکار کیا گیا ہے اور بندوق سے تو بلا کا آسان ہے۔ یہ پیش قبض ہے، اسی سے شیرنی کا شکار شاید کوئی نئی چیز ہو۔ ہر دو سرداروں نے متفق اللفظ ہو کر حیرت کے ساتھ کہا: "پیش قبض سے شیرنی کا شکار بالکل نئی بات ہے۔"

چند منٹ کے بعد قلعدار کی غائب ہوتی ہوئی صورت کو دونوں سردار سراپا استعجاب بنے ہوئے دیکھ رہے تھے اور گونڈ قلعہ کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ ابتداءً شیرنی کے غرانے کی، اور پاؤ گھنٹہ بعد ڈکرانے کی، اور پھر دھاڑنے کی آوازوں نے پورے جنگل کو یکسر لرزش بنا دیا تھا۔ ہر دو سرداروں نے پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے سے کہا۔ قلعدار کی موت بائی جی کے غصہ کے ہاتھوں ہم کو کب زندہ رہنے دیگی۔ کیا کرنا چاہیئے کچھ سمجھ میں نہیں آتا عقل کام نہیں کرتی۔ واقعہ نے حدودِ مذاق سے متجاوز ہو کر سنجیدگی کی صورت اختیار کر لی اور اب تو خطرناک حدود میں جا پہنچا۔ وہ ابھی یہ گفتگو کر ہی رہے تھے اور ابھی مشکل کا اُن کو کوئی حل دستیاب نہیں ہوا تھا کہ قلعہ کی جانب سے ایک شخص ہوا کے پروں پر سوار آتا ہوا دکھائی دیا۔ آنے والا اتنے نڈر اور دلیرانہ طریقہ سے پہاڑی راستہ پر اور آتا تیز گھوڑا بھگا رہا تھا کہ جیسے آندھی پوری رفتار سے بڑھ رہی ہو۔ آن کی آن میں گھوڑا مع سوار کے دونوں افسروں کے قریب تھا۔ گرج دار آواز سے سوار یہ کہتا ہوا کہ "اگر قلعدار مارا گیا تو تمھارے پیٹ میں تلوار گھسیڑ دونگا" نکلا چلا گیا۔ غار سے تھوڑے فاصلہ پر گھوڑا چھوڑ کر اندھا دھند غار کی طرف لپکا۔ دونوں سردار بھی ایک دفعہ چونکے۔ اضطراری طور پر کچھار کی طرف بھاگے۔ غار میں پہونچنے کے بعد عجیب منظر دیکھا، شیرنی کے اگلے دونوں پنجے مع ذرا سی گردن کا خاصہ حصہ کٹا ہوا، پیٹ کانی چاک۔ قلعدار کا بایاں گھٹنا شیرنی پر ٹکا ہوا، داہنے ہاتھ میں پیش قبض خون میں شرابور، شیرنی دم توڑ رہی تھی۔

شام سنگھ: خوش نصیب تھی وہ ماں جس نے آپ جیسا دلیر بیٹا جنا۔ اور دھن ہیں بائی جی جنھوں نے آپ جیسا افسر انتخاب کیا۔ آپ کافی زخمی ہو چکے ہیں۔ فوراً قلعہ تشریف لے چلئے تاکہ زخموں کی مرہم پٹی کی جائے۔"

قلعدار: سردار تمھارا گھوڑا کہاں ہے، دیکھو قلعہ کا چارج تمھارے سپرد ہے، میں جھانسی جارہا ہوں۔

شام سنگھ: فاصلہ کافی ہے اور آپ بہت زخمی ہیں"۔

قلعدار گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا شیرنی کے بچے آگے رکھ لئے، گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا، پہاڑ کی سخت زمین پر اس کے سُموں سے ایسی آواز پیدا ہو رہی تھی جیسے اولوں کے گرنے کی۔ چند منٹ میں قلعدار نظروں سے نہاں تھا صوبیدار بیچر شام سنگھ طنز و حقارت کے ساتھ "کہئے سردار صاحبان، قلعدار کے نازک ہاتھ قبضہ تلوار کے لئے زیادہ موزوں ہیں یا جام بلوریں پیش کرنے کے لئے، میرے اعتراف شکست میں بھی پندار پنہاں ہے۔ میں آپ کو بتلا دینا چاہتا ہوں کہ قلعدار کی شمشیر زنی نے مجھے نہتا کر دیا" یہ کہہ کر تحقیر کی نظریں ڈالتا ہوا ٹھاکر قلعہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

دن مذکورہ کی شب بھیگ چکی ہے، وقت کا دیوتا اپنی آہنی زبان سے بارہ بجا چکا ہے، سکوت کی فرمانروائی ہے ظلمت شب نے رخ کائنات پر نقاب سیاہ ڈال دیا ہے۔ قلعہ جھانسی سیاہ دیو کی طرح سر اُٹھائے ہوئے دیکھنے والوں کے دلوں پر اپنے بانیوں کی عظمت و ہیبت کا سکہ بٹھا رہا ہے۔ نسائی حسن و جمال کا نادر شہکار، فطرت کی تصنیف جمیل یعنی مہارانی جھانسی، شباب کی پُرکیف نیند میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ایسے پُرہیبت سکوت شب میں قلعہ کے پھاٹک پر ایک سوار پہونچتا ہے، چند منٹ بعد سوار کے لئے پھاٹک کھل جاتا ہے، سوار محل کے دروازہ پر آتا ہے۔ پہرہ دار بائی جی کے پاؤں پر جگانے کے لئے آہستہ سے ہاتھ رکھدیتی ہے۔ بائی جی نیم باز آنکھوں سے دیکھکر دریافت کرتی ہیں "جمنا خیریت ہے۔"

"سرکار قلعدار تاں بھٹ زخموں کے خون میں نہائے ہوئے حاضر ہیں، اگر حکم ہو تو قدمبوسی کیلئے پیش کیا جائے۔"

مہارانی افسردگی کے ساتھ "فوراً بلاؤ"۔

قلعدار حاضر ہوتا ہے، سر سے پاؤں تک زخمی، شیرنی کے بچے سامنے ڈال دیتا ہے۔" میں نے صحت انتخاب کا" دعویٰ پورا کرنے سے قبل بیہوش ہو جاتا ہے۔ لیکن رانی جی سہارا دیتی اور گرنے سے بچالیتی ہے۔ زخمہائے حسن معصوم مہارانی کی آنکھوں کو پُرنم کر دیتے ہیں۔ اطبا و جراح جمع ہو جاتے ہیں۔

مہارانی: "تمھارا علم و فن میری نظر میں حقیر ہو جائیگا، تمھارا کمال ذلیل، تم کو منصب، جاگیر و تنخواہ کے ذریعے جو رقوم دی گئیں وہ ضائع۔ اگر قلعدار کو تم تندرست نہ کر سکے۔ مجھے اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کے لئے کافی وجوہ ہونگے اور اس وقت مجھے کہنا پڑیگا، کاش کہ میں یہ رقم جنگی ضروریات پر خرچ کرتی۔"

پانچ ماہ کے بعد قلعدار کشمکش موت و حیات میں رہ کر تندرست ہو جاتا ہے۔ کورٹ آف انکوائری (خونی

تحقیقاتی کمیٹی منعقد ہوتا ہے۔ میر بخشی۔ کرنل کرتار سنگھ، میجر عبداللہ یوسف۔ قلعدار شام سنگھ کرسیوں پر بیٹھے ہیں سردار رشید حاضر ہے۔

صدر:۔ تم نے بغیر فوجی مرکز اعلیٰ کی منظوری کے مستقر چھوڑا۔

رشید:۔ جی۔ سردار شیر افگن خاں غلام محمد خاں حاضر کیے جائیں۔

صدر:۔ (پُر رعب آواز میں دونوں سرداروں سے) تم نے ہز ہائینس کے انتخاب کا جو کمانڈر انچیف بھی ہیں مذاق اُڑایا۔"

ہر دو سردار:۔ جی ہاں ہم سے یہ خطا سرزد ہوئی"۔

دوسرے دن کورٹ مارشل کا اجلاس ہے مہارانی صدر ہیں، سب سے پہلے رشید کی پیشی ہوتی ہے۔

صاحب صدر:۔ "بغیر فوجی مرکز اعلیٰ کی منظوری کے تم نے اپنی چھاؤنی چھوڑی، یہ تم پر الزام ہے"۔

رشید:۔ "جی میں اقبالِ جرم کرتا ہوں"۔

صدر:۔ "کیوں"؟

رشید:۔ "میں اپنی زندگی سے نا اُمید ہو گیا تھا لہٰذا میں اپنی مالکہ کے قدموں میں اپنی زندگی کے آخری لمحے گزارنا چاہتا تھا۔ تاکہ موت کے وقت سکونِ روح نصیب ہو۔ دیوی کے قدموں سے دُور پُجاری کی موت تلخ ہوتی ہے سپاہی کی حقیقی وفاداری ہی سچی پرستش ہے۔"

حمید اللہ رشید کے دو توں حقیقی بھائیوں کی رائے رشید کے مخالف تھی۔

قلعدار شام سنگھ:۔ محترم سردار حمید اللہ رشید حضور عالیہ کے تقرر کو صحیح ثابت کرنے کے لیے جس جرأت کے ساتھ موت کے مُنہ میں گھس گئے وہ فوجی تاریخ ہند کا قابلِ افتخار باب ہے۔ سردار نے موت کو لبیک کہہ کر مالک کی رائے کی صداقت ثابت کی۔ اس حصولِ ثبوت میں کتنے شدید زخم برداشت کئے سرکار یہ امر پیشِ نظر رہے کیسی خطرناک حالت میں اتنی طویل مسافت مالک کے قدموں میں جان دینے کے لئے طے کرنا دیانت وفاداری کا خود ایک ایسا مقدس کارنامہ ہے جو اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ مجھے یہ کہنے کے لئے معاف کیا جائے، اگر ایسے دلیر اور جانباز افسر کو خفیف سی سزا بھی دی گئی تو میری روایاتِ وفاداری میں لغزش پیدا ہو جائیگی۔ اس سے زیادہ بہتر ہو گا کہ سردار رشید کے حکم سزا سنانے سے قبل ہی ادب کے ساتھ میں اپنی تلوار پیش کر دوں"۔ (اس تقریر کے وقت سردار شام سنگھ کی قامتِ بلند سے بلند تر محسوس ہو رہی تھی، اُس کا تانبا جیسا رنگ، اُس کے چہرہ پر تلواروں کے زخم کے نشانات وجاہتِ عسکری اور شجاعتِ فوجی کا مستقل ثبوت، اس کا جری اور سپاہیانہ اندازِ بیان، اس کا بیباک خلوص، بلا کا پُر تاثیر، اسکی فراخ پیشانی سچائی کی بجلیوں کی تڑپ سے تابناک)

صاحبِ صدر: میرے بزرگ سردار میرا فیصلہ سنا اگر تم کو پسند آسکے تو پھر کوئی جھگڑا ہی باقی نہیں رہتا، ورنہ میں تمہارے ارادوں کا احترام کرونگی۔ (حمید اللہ رشید سے) تم قلعداری سے معزول کئے گئے، اور میری محافظتِ جان کے اعلیٰ افسر مقرر کئے گئے، اور تمہارا تمام وقت میری تحفظ جان کے لئے ہے۔ تم کو صرف یہ اعزاز دیا جاتا ہے کہ بلا اجازت ہر وقت میرے کمرے میں داخل ہوسکتے ہو۔ خواہ میں حالتِ خواب ہی میں کیوں نہ ہوں۔"

اُسی وقت مہارانی کے اشارے سے خلعتِ محافظ جان شاہی عطا کیا گیا۔ (فوج میں یہ عہدہ اُس زمانہ میں سب سے زیادہ جلیل القدر سمجھا جاتا تھا۔ انتہائی دلیر، کامل تجربہ کار ہستیاں اس عہدہ پر سرفراز کی جاتی تھیں جن کی خاندانی روایتِ وفاداری و بہادری مخصوص اہمیتوں کی مالک تسلیم کی جاتی تھی) اس کے بعد کورٹ مارشل کے اجلاس نے ہر دو معتوب سرداروں کو طلب کیا۔

صاحب صدر۔ (شیر افگن خاں کی طرف متوجہ ہوکر) شیر افگن خاں! تیرے موٹاپے نے پہلے سے زیادہ تیرے دماغ کو ناکارہ بنا دیا، تو اپنے تن و توش کی وجہ سے اپنے آپ کو بہادر سمجھنے لگا، تیری بہادری تیرا ذاتی جوہر نہیں، تیری بہادری میرے اقبال کا صدقہ ہے، اب تجھے اپنی بہادری پر اتنا گھمنڈ ہوگیا ہے اور تیری حماقتیں اتنی وسیع ہوگئی ہیں کہ تو میرے انتخاب پر نکتہ چینی کرنے لگا ہے۔"

شیر افگن خاں: "سب سے پہلے میں اپنی اس غلطی کو تسلیم کرتا ہوں اور حکم عالی ملنے پر کچھ اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

مہارانی: ۔میں تجھ کو آزادی دیتی ہوں۔

"سرکار! قیام فوج کی غایت و غرض آزادی ملک ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ جو سپاہی ملک و وطن کی آزادی کے احترام میں اپنی جان بھینٹ چڑھا دے۔ فوجی آئین اسکی آزادی کا کوئی احترام نہ کریں، اور وہ ہر قدم پر پابند ہو۔ حضورِ عالیہ کیا یہی تقاضائے انصاف ہے، مجھے اپنی بزدلی کا اعتراف کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں، میں نے جو کچھ اپنی فطرتی زبان میں حضورِ عالیہ کی عدم موجودگی میں کہا تھا وہ مجھے یہاں اور اس وقت کہنا چاہیئے تھا، یقیناً فوجی قوانین کا منشاء یہی ہے کہ مجھے سزا دی جائے۔ مگر سرکار یہ یاد رہے کہ میری موت یا علیحدگی ایک ایسا خلا پیدا کر دے گی جس کو دوسرا شمشیر زن پورا نہیں کرسکے گا۔ بلاشبہ جھانسی کی فوج میرا مثل نہ پیش کرسکے گی۔"

مہارانی: "اس کا جواب تجھ کو کل فوج کے سامنے دیا جائیگا۔"

صاحبِ صدر۔ غلام محمد خاں، تم اپنے جرم کی صفائی میں کیا کہنا چاہتے ہو؟"

غلام محمد خاں: ۔میں ایک ادنیٰ سپاہی تھا، مجھے شاہانہ فیاضیوں نے معزز و مکرم بنا دیا، میں ایسے جرم کا مرتکب ہوا ہوں جس کی تلافی موت ہی کرسکتی ہے، میری آخری جائے پناہ حضورِ عالیہ

اما کین کورٹ مارشل کی سفارش پر معافی دیگئی۔ دوسرے دن میدان میں پوری فوج صف آرا ہوئی شیر افگن خاں اپنے نامعلوم حریف' نامعلوم فیصلۂ قسمت سے متردد تھا، حمید اللہ رشید مہارانی کی خدمت میں حاضر ہوا۔

"سرکار شیر افگن خاں کو میرے انتخاب کی صحت پر شبہ ہے' اور وہ اپنی ذات کو اپنے خیال میں مجھ سے برتر سمجھتا ہے مقابلہ کی اجازت دیجائے تاکہ پوری فوج صحت و عدم صحتِ انتخاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔"

مہارانی:۔ "دیکھو، شیر افگن خاں دیو قامت تجربہ کار مشہور شمشیر زن ہے' تم ابھی بہت کم سن ہو۔"

رشید:۔ "حضور عالیہ اس کا فیصلہ مقابلہ اور قسمت کرے گی۔"

شیر افگن خاں کی تلوار رشید کی تلوار سے ایک فٹ سے بھی کچھ زیادہ لانبی تھی۔ رانی کی اجازت پر مقابلہ شروع ہوا۔ ابتداءً ایک گھنٹہ تک شیر افگن خان بجلی جیسی تیزی کے ساتھ حملہ کر رہا تھا۔ رشید سکون اور آہستگی کے ساتھ مدافعت پر قانع تھا، اس کے بعد رشید کی رفتار دفاع تیز ہو گئی۔ دو گھنٹہ بعد شیر افگن اُلجھ اُلجھ کر مقابلہ کر رہا تھا۔ سات خراش رشید کے اور اکیس چھوٹے چھوٹے زخم شیر افگن کے آچکے تھے۔ ہر موقع پر رشید کی آواز "سینہ کھلا ہوا ہے' پشت کی خبر لو، داہنا بازو، ارے بائیں پسلی سے بے خبر ہو گئے' دیکھنا شہ رگ پر چرکہ نہ لگے۔ قبضہ ذرا مضبوط، تلوار بھی' ہوشیار ہو۔" حریف تھک چکا تھا۔ رشید نے بلا کے بند باندھنا شروع کر دیئے' ہر بند پر دیکھنے والے کو گمان ہوتا تھا کہ اب تلوار ہاتھ سے نکلی۔ آخر شیر افگن خاں کے ہاتھ سے تلوار نکل ہی گئی۔ پورے لشکر سے ایک شور بلند ہوا۔ ہر سپاہی کی زبان سے واہ واہ نکل گئی۔

مہارانی نے آگے بڑھ کر کہا "شیر افگن خاں شاباش، تمہارا مقابلہ بے مثل تھا، رشید سرزمین ہند کا سب سے بڑا سورما سپوت ہے' اس کے خاندان نے برسہا برس صفدر جنگوں اور سالار جنگوں کا مقابلہ کیا ہے' اس کے جد امجد نے مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ نواب وزیر الممالک کی متفقہ فوجوں کو ناک چنے چبوا دیئے۔ ایسی ہستی سے آنا کامیاب مقابلہ تمہاری بہادری کو چار چاند لگاتا ہے۔ تم بے مثل سپاہی ہو، میں نے تمہارے دعوے کی صداقت کو انصاف پر مبنی سمجھتے ہوئے پوری فوج کے سامنے تسلیم کر لیا۔ تم آزاد ہو، تمہارے سپاہیانہ احترام کو اس مقابلہ نے چار چاند لگا دیئے ہیں، تمہاری شکست نہیں بلکہ فتح ہے۔"

برطانوی فوجیں جھانسی کے مٹھی بھر سپاہیوں سے دست و گریباں ہیں۔ شیر دل مہارانی کی شیر دل فوج نے برطانوی طاقت کے چھکے چھڑا دیئے۔ ہر قسم کے آلات حرب و ضرب کی کثرت اور ذرائع رسد رسانی کی وسعت کے باوجود بھی قلعہ جھانسی آزاد تھا اور دشمن کے حملے ناکام۔ آخر کو برطانوی حکمت عملی آڑے آئی مہارانی جھانسی کے بھائی راؤ صاحب نے حکومت جھانسی کی اُمید میں سرکار انگریز سے سازباز کر لی، اور سب سے اہم مورچہ برطانوی فوج کے سپرد کر دیا۔ گولے قلعے کے اندر گرنے لگے۔ مہارانی نے اپنے یکتا گولنداز سے (جس نے

نمودار نشانہ بازی سے سیکڑوں برطانوی توپوں کے پرخچے اُڑا دیے تھے۔) پوچھا: میر صاحب قلعہ میں گولہ گرنے کے اسباب کیا ہیں؟

"سرکار مورچہ فتح ٹیکری دشمنوں کے قبضہ میں جا چکا ہے۔ افسوس راؤ صاحب نے دشمنوں سے سازش کر لی۔ میرے گولے دشمنوں کی توپوں کو جتنا ناکارہ بنا سکتے تھے بنا چکے مگر قلعہ کا بچنا نا ممکن ہے۔"

مہارانی: "کیا بھائی بہن کے گھر کو تباہ کر سکتا ہے۔"

میر صاحب: "حکومت کا لالچ سب کچھ کرا سکتا ہے۔"

مہارانی: "میں آخر تک مقابلہ کرونگی۔"

سپہ سالار: "سرکار ضرورت ہے کہ حریف کو غافل رکھ کر قلعہ فوجی مصالح کے اعتبار سے خالی کر دیا جائے اور آگے بڑھ کر گوالیار کی امداد سے جم کر اعداء سے مقابلہ کیا جائے۔ یہ میرا معروضہ تجربہ اور جنگی حکمت عملی پر مبنی ہے اگر صرف جان کا دیدینا باعث شجاعت اور سبب فتح ہو سکتا تو میں سب سے پہلے اپنا سر پیش کرنے کے لئے تیار تھا مگر حضور عالیہ گوالیار کی طرف روانہ ہوں، اور اس بوڑھے نمک خوار کو موقع دیں کہ انگریزی فوجوں کو روکے رہے خدانخواستہ اگر دشمنان سے حضور کو چشم زخم پہنچا تو ہماری شکست یقینی ہے۔ اور اس بدنما داغ کو تاریخ جھانسی سے کوئی قربانی بھی نہیں دھو سکتی۔"

بڑے بڑے تجربہ کار جنرل اور اکابرین فوج کے مجبور کرنے سے مہارانی گوالیار کا رخ کرنے پر تیار ہو ئی۔

(اچانک) "میری دُوربین لاؤ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ مورچہ فتح ٹیکری واقعی دشمنوں کے قبضہ میں ہے۔"

دُوربین پیش کی گئی۔ مہارانی نے دُوربین لے کر فتح ٹیکری پر نظر ڈالی اور پُرسکون لہجہ میں فرمایا "میر صاحب کا خیال صحیح ہے۔ مگر ہمارے بزرگوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب تک میر شہید کی قبر پر گولہ نہیں گرے گا تخت جھانسی زوال سے محفوظ رہے گا۔" اس کے بعد مہارانی نے مزار پر نظر ڈالی، افسوس دشمن کے گولے میر شہید کے مزار کو بوسہ دے رہے تھے۔ چند منٹ کے بعد مہارانی نے فوجی مصالح کو ملحوظ رکھتے ہوئے قلعہ خالی کر دیا گوالیار تک پہونچتے ہوئے راستہ میں مہارانی کی قلیل فوج نے جو مقابلے کئے وہ ہندوستان کی تاریخ کے لئے قابل فخر ہیں۔

قلعہ گوالیار پر مہارانی کا قبضہ ہو چکا ہے، مہارانی کا ارادہ ہے کہ متھرا تک قبضہ کر کے پوری طاقت کے ساتھ برطانی فوجوں کا مقابلہ کیا جائے۔ مگر افسوس اس کی جاں نثار سپاہ، اُس کے آزمودہ کار جنرل اور عمدہ سپہ سالار اور تجربہ کار افسران فوج حق نمک ادا کر کے موت کی آغوش میں میٹھی نیند سو رہے تھے، نو آزمودہ وہ بھی مختصر سی سپاہ رانی کے ساتھ تھی، راستہ میں گنجیاں لگوا دی گئی تھیں تاکہ اگر موت سے دو چار ہونا پڑے تو دشمن

لاش پر بھی قادر نہ ہو سکے۔ برطانوی فوجیں چاروں طرف سے گھیرا ڈالے ہوئے تھیں، مگر دلیر رانی نے گھیرے میں سے اپنا راستہ طاقت کے ذریعہ بنا لیا تھا۔ افسوس متھرا کے راستہ میں اُسکی فوج کام آچکی تھی چند عورتیں ساتھ تھیں اور اُس کا آخری افسر اور محافظ جان حمید اللہ رشید۔ دشمن تین طرف سے گولیوں کی باڑھیں مار رہے تھے۔ آخر میں رانی نے گھوڑا روک کر اپنے محافظ جان سے کہا "حمید اللہ رشید تمھارے پانچ بھائی جنگ میں کام آچکے ہیں، تمھارے خاندان کا ایک ایک بچہ جنگ کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ چکا ہے۔ ابھی مشکل سے تم نے زندگی کی پچیس بہاریں دیکھی ہیں، یہ جواہرات لو اور نکل جاؤ تم بہت کم عمر ہو، تمھارے مرنے کے دن نہیں، تمھاری موت کے ساتھ تمھارے تاریخی خاندان کا نام بھی ختم ہو جائے گا۔"

رشید: "سرکار میرا ایک بھائی تعلیم کے لئے باہر گیا ہوا ہے، اگر وہ بھی باقی نہ ہوتا اور جنگ میں کام آگیا ہوتا تو بھی میرے فرائض حضور عالیہ کے دلائل تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔"

مہارانی: "میرا حکم"

رشید: "سرکار کا حکم سپاہیانہ وقار اور حق نمک کے خلاف ہے عیش و کامرانی دولت و عزت سرکار کے قدموں نے عطا کی، اب اس وقت اِن قدموں کو چھوڑ دوں، آپ کے قدموں میں میری موت زندگی جاوید ہے۔"

چند گھنٹہ کے بعد حمید اللہ رشید کے متعدد گولیاں پیوست ہو چکی تھیں، اس نے گھوڑے سے گرتے ہوئے کہا "یہ نیزہ و تلوار، آقا آپ کی امانت ہے، اب میں اس کی حفاظت نہیں کر سکتا" اور شہید ہو گیا۔

رانی گھوڑے سے اُتری اور اپنے وفادار محافظ جان کی لاش گھوڑے پر سامنے رکھ لی، اپنے ساتھ والی عورتوں سے کہا، "دشمن خونی کتوں کی طرح خون کی بو سونگھتے ہوئے چاروں طرف سے گھیرا ڈالے ہوئے بڑھے چلے آرہے ہیں، مجھے زندگی کی کوئی اُمید باقی نہیں ہے، میری تمنا ہے کہ تم زندہ رہو دشمن بھی تم کو عورت سمجھکر نظرانداز کر دے گا لہذا جاؤ چلی جاؤ۔"

سہیلیاں: "سرکار ہمارے پاس کافی جواہرات ہیں، ہم لوگ اپنی زندگی پورے عیش کے ساتھ گزار سکتے ہیں، اگر وہ زندگی زندگی نہ ہوگی، بلکہ اس زندگی کو ذلیل ترین موت سے موسوم کرنا بالکل موزوں ہے حقیقی زندگی صرف حضور عالیہ کے ساتھ موت کو لبیک کہنا ہے۔"

اچانک متعدد گولیوں نے بائی جی کے جسم کو فگار کر دیا۔ لپک کر ایک سہیلی نے گنجی میں آگ لگا دی، بائی جی اس حالت میں کہ محافظ جان کی لاش ساتھ تھی گھوڑے کو ایڑ مارتی ہیں، وفادار گھوڑے، محافظ جان کی لاش اور خود بائی جی کو آگ کے شعلے اپنی آغوش میں لے لیتے ہیں اور اُنکی محبت کی اتباع میں اُنکی تمام سہیلیاں اس آتشیں گنجی کو اپنا حقیقی مکان بنا لیتی ہیں۔

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا   یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانہ کی خاک

کیا ہندوستان کے فرزندوں کے لئے یہ واقعہ درسِ عبرت رکھتا ہے۔

جذباتِ اثر

(از حضرت اثر لکھنوی)

جب سے تری مرضی مجھے معلوم ہوئی ہے — تقدیر بھی تدبیر کی محکوم ہوئی ہے
یارب یہ ہوا کیسی چلی باغِ جہاں میں — خود زیست بھی اک پیکرِ مسموم ہوئی ہے
خواہش ہے نہ کاہش ہے نہ حسرت نہ تمنّا — یہ کیا تری حالت دلِ مغموم ہوئی ہے
آسودگیِ غم میں تھی اک گونہ فراغت — سو وہ بھی اب اِس عہد میں معدوم ہوئی ہے
دھندلا سا کوئی نقش کہ مبہم سا اشارہ — روودادِ محبت کہیں مرقوم ہوئی ہے
ٹوٹا ہوا تارا ہوں کہ ٹپکا ہوا آنسو — یہ اپنی حقیقت مجھے معلوم ہوئی ہے
آہ اور اِس اُجڑی ہوئی دنیا کو بسا دے — اب یاد تری نکہتِ موہوم ہوئی ہے
پھولوں میں ہے، تاروں میں، نہ شبنم نہ سحر میں — وہ خوش نظری تجھ سے جو موسوم ہوئی ہے

اللہ ری بد آموزیِ آئینِ سیاست
افسانہ اثر فطرتِ معصوم ہوئی ہے!

"کونہ ..."

(از جرمن سے ترجمہ)

(از جناب محمد حسن صاحب)

(۱)

کوہ الپس کے دامن میں 'لوکارنو' کے قریب شمالی اطالیہ میں کبھی بڑا شاندار شاہی قلعہ واقع تھا، مگر اب تو سینٹ گوتھارڈ کے جنوبی علاقے تک صرف اس کے کھنڈر بکھرے ہوئے ہیں۔ اسی قلعے کے ایک وسیع و عریض کمرے سے کہانی شروع ہوتی ہے۔

ایک بوڑھی بھکارن بھیک مانگتے مانگتے اس قلعے کے بلیے چوڑے پھاٹک تک آئی، وہ سردی سے کانپ رہی تھی، سردی بڑی شدت کی پڑ رہی تھی۔ بیگم نے ازراہِ کرم اُسے قلعے کے اندر بلا لیا، اور اپنے کمرے میں پناہ دی۔ نواب صاحب شکار کو گئے ہوئے تھے۔

نواب شکار سے لوٹ کر اسی کمرے میں پہونچے۔ عام طور پر وہ اپنی بندوقیں وہیں رکھا کرتے تھے۔ مگر وہاں اُنھوں نے کیا دیکھا، ایک بوڑھی بھکارن۔ اُف کس قدر قابل نفریں چیز۔ اُنھوں نے ناک بھوں چڑھائی، جیسے اُنھیں اپنے کمرے میں مری ہوئی چوہیا پڑی مل گئی ہو۔ غیظ و غضب کی علامات اُن کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھیں، اُنھوں نے چلا کر کہا "او بوڑھی عورت! ہٹ جا یہاں سے، تنور کے پیچھے پڑ رہ!" بھکارن نے تعمیلِ حکم کی۔ وہ اُٹھی مگر چکنے فرش پر پھسل کر گری، ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اُسے سخت چوٹ آئی، مگر اُس نے انتہائی تکلیف کے عالم میں بھی کمرے کو طے کیا، وہ تنور کے پیچھے جا گری اور نواب کی آہٹ سے سرکتے ہوئے دہشت زدہ پردوں کی سرسراہٹ میں اُس کی کراہنے کی آواز گم ہو گئی۔

(۲)

چند سال بعد جنگ اور قحط سالی کی ناگہانی آفتوں نے نواب پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی تمام جائداد بیچ ڈالیں۔ ان کا قلعہ بہت اچھی جگہ واقع تھا، اس لئے شہر فلورنس کے ایک لکھ پتی نے اُسے لینا چاہا۔ نواب نے اسے اپنے پاس ٹھیرایا، اسی قلعہ میں۔ وہ دل میں خوش تھا کہ اب معاملہ جلد ہی طے ہو جائے گا۔ بیگم نے ایک کمرے میں عیش و آسایش کا سب سامان سجا دیا، اور اپنے نووارد مہمان کے آرام کا پورا پورا خیال رکھا۔ مہمان اسی کمرے میں ٹھیرایا گیا۔ وہ کمرے کی آرائش کو دیکھکر بہت خوش ہوا۔ رات ہوئی اور

لکھ پتی نے گھوڑا بیچکر سونے کی ٹھانی۔

(۳)

آدھی رات بھیگے یہ نو وارد لکھ پتی مہمان اپنے کمرے میں سے نکلا اور تیزی سے بھاگتا ہوا نواب کے کمرے میں پہونچا۔ ڈر کے مارے اس کے بال کھڑے ہوئے تھے اور تھر تھر کانپ رہا تھا، منہ سے بات نہ نکلتی تھی، نواب اور بیگم دونوں اپنے مہمان کو اس ہیئت کذائی میں دیکھکر ڈر گئے۔ اس نے ہانپتے کانپتے ہوئے کہا "میزبانو! تمھارے کمرے پر کسی آسیب کا اثر ہے"

"اثر!" نواب نے کہا۔

"اثر!" بیگم نے پوچھا۔

"ہاں ہاں اثر، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی انسانی ہستی بھوسے کے ڈھیر پر سے لیٹے لیٹے اٹھی آہستہ آہستہ درد و کرب کے عالم میں کمرے کو اس سرے سے اس سرے تک پار کیا، تنور کے پیچھے جا گری اور وہیں درد و کرب سے کراہتی کراہتی خاموش ہوگئی۔"

نواب کا دل دھک دھک کرنے لگا، جانے کیوں، شاید اُسے بوڑھی بھکارن کا خیال آگیا۔ ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "یہ سب آپ کا وہم ہے۔ بقیہ رات میں آپ کے ساتھ اسی آسیب زدہ کمرے میں بسر کرنے کے لئے تیار ہوں، مگر مہمان نے انکار کر دیا اور کہا "نہیں نہیں مجھے کوئی دوسرا کمرہ دے دیجئے تاکہ میں رات آرام سے بسر کر سکوں۔" وہ دوسرے کمرے میں پہونچا دیا گیا۔

آفتاب کی پہلی کرن پھوٹتے ہی لکھ پتی مہمان نے بگی تیار کرنے کا حکم دیا، اور نواب سے رخصت ہوگیا۔ نواب منھ دیکھتا رہ گیا، دماغ میں ایک خیال آتا، ایک جاتا تھا۔

(۴)

اس خوفناک اور سنسنی خیز حادثے نے دوسرے خریداروں کو بھی بھڑکا دیا، خود قلعے کے نوکروں میں پُراسرار طریقے پر اس کمرے کے "حادثات ہم شبی" کے متعلق افواہیں اور عجیب و غریب افواہیں پھیلنے لگیں۔ آخرکار نواب نے خود ان افواہوں کی تحقیق کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

سورج ڈوب چکا تھا آسمان پر سرخی چھائی ہوئی تھی، نواب نے اپنا بستر اسی کمرے میں بچھانے کا حکم دیا۔ تحقیقات کی پہلی رات شروع ہوئی۔ گھنٹے نے بارہ بجائے۔ وہی خوفناک پُراسرار شور، کوئی بھوسے کے ڈھیر سے اُٹھا، بھوسے پر سے اُٹھنے کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی، کسی نے کمرہ پار کیا، اس سرے سے اُس سرے تک، تنور کے پیچھے کوئی جا گرا، آہوں اور درد انگیز چیخوں کا شور فضا میں گم ہوگیا، نواب کا چہرہ زرد پڑ گیا، اس کا دل بڑی

تیزی سے دھڑکنے لگا "آہ وہ بوڑھی بھکارن" .... وہ اسی خیال میں ڈوب گیا ۔

(۵)

صبح ہوئی، نواب تحقیقات کی پہلی رات گذار کر نیچے اُترا تو بیگم نے پوچھا "کیا دیکھا"

نواب کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوئے گھبراہٹ اور ہیبت اُس کے دل پر چھائی ہوئی تھی اُس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا کمرے کے کواڑ دہشت سے بند کئے، پریشان لہجے میں کہنے لگا "بیگم، افواہ صحیح ہے"

بیگم پر بھی ہیبت چھا گئی، اُس نے کہا "اس افواہ کو مت پھیلنے دو، اس سے پہلے ہمیں اس کی تحقیقات کرنی چاہیئے نا۔"

سورج ڈوبا، نواب بیگم اور اُن کا ایک وفادار کتا اس "مہمان خانہ" کی طرف چلے۔ نواب اب اس قلعے سے پیچھا چھڑانے کی ترکیب سوچ رہا تھا، بیگم اس واقعہ کو افواہ سمجھ کر تحقیق کرنا چاہتی تھی۔

گیارہ بجے دو مشعلیں روشن کی گئیں، بیگم نے اپنا شب خوابی کا لباس پہنا، نواب نے ایک خنجر اور ایک پستول الماری سے نکال کر اپنے پاس رکھ لیا اور دونوں اپنے اپنے بستروں میں بیٹھے، دل بہلانے کی باتیں کرتے رہے، کتا اپنا سر پنجوں میں دیئے خراٹے لیتا رہا۔

بارہ بجے۔ اُف وہی خوفناک شور ..... انسانی آنکھیں اُسے دیکھنے سے عاجز تھیں۔ کمرے کے ایک کونے سے کوئی اُٹھا، سرسراہٹ پیدا ہوئی، کتا جاگ اُٹھا، اُس نے اپنے کان پھڑپھڑائے، اور غراتا ہوا تنور کی طرف چلدیا۔ نواب نے خنجر بے نیام کیا اور زور سے پکار اُٹھا "کون ہے" کوئی جواب نہ ملا۔

بیگم اور نواب نے اپنے بستروں کو تہ کرنے کا حکم دیا، سامان ٹھیک کیا جانے لگا۔ اُنھوں نے شہر میں رہنے کا تہیہ کر لیا۔ وہ اسی وقت قلعہ چھوڑنے والے تھے مگر.....

قلعے سے شعلے بلند ہو رہے تھے، نواب نے نا اُمیدی کی مدد سے اپنے خوف پر قابو پا لیا، مگر اب وہ زیست سے بیزار ہو چکے تھے، زندگی اجیرن ہو گئی تھی، اُنھوں نے ہاتھ میں ایک مشعل لی، اور تمام چوبی دروازوں کو آگ لگا دی، بیگم نے نوکروں کو نواب کی جان بچانے کے لئے اندر بھیجا مگر وہ نہایت مکروہ طریقے سے داعیِ اجل کو لبیک کہہ چکا تھا۔

اور اُس کے نوکروں نے اُس کی ہڈیوں کی راکھ لاکر ایک کونے میں ڈھیر کر دی۔ اُسی کونے میں جہاں اُس نے بوڑھی بھکارن کو ہٹ جانے کا حکم دیا تھا۔

تشطیر

(بر غزل حضرت اقبال)

(از حضرت محمود اسرائیلی)

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
اسکی سوزش ہی سے حریت کی ہوتی ہے نمو
کوندتی ہے دیدۂ پرخوں میں برقِ انتقام
تھرتھراتا ہے جہانِ چارسو و رنگ و بو

پاک ہوتا ہے ظن و تخمیں سے انساں کا ضمیر
دیدۂ بیدار ہو جاتی ہے گرم جستجو
ہر قدم پر منزلِ مقصود آتی ہے نظر
کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو

وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
جن کے تاروں ہی میں پھنس جاتا ہے منطق کا گلو
فلسفہ ابتک کا جن کی موشگافی کا اسیر
عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تارِ رفو

ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش
دیو استبداد ہے گر زخودی جس کا عدو
پھر مٹا دیتا ہے دنیا سے نظامِ کائنات
حاکمیت کا بتِ سنگیں دل و آئینہ رو

بحث ومباحثہ

سیماب صاحب کا طریقِ اصلاح

(از حضرت شوکت اعظمی)

سخن گوئی ہندوستان میں جس قدر سستی ہے، اُس کا اندازہ یوں آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں کے ہر ابجد خواں کو شاعر ہونے کا دعویٰ ہے۔ آزاد ممالک میں سخن گوئی کا کیا معیار ہے؟ ہم کو اس سے بحث نہیں لیکن ہاں ہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ شعر و شاعری کا جو گہرا تعلق انسان کی زندگی سے ہے، اُس کا احساس صرف ایک آزاد منش طبیعت ہی کو ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عیش پرستی ہمارے لئے طرۂ امتیاز رہی، جس کی آغوش میں ہماری شاعری پروان چڑھی، غلامانہ ذہنیت نے ہمارے احساسات کو مردہ کر دیا، پھر بھلا ہم شاعری کا صحیح مفہوم کیونکر سمجھ سکتے تھے؛ باوجود اس کساد بازاری کے جو اُردو شعرا کی ہے ہم صرف مخصوص شعرا کے مخصوص اشعار ہی کو اُردو شاعری کا سرمایہ کہہ سکتے ہیں، لیکن وہ تعداد میں اس قدر کم ہیں کہ ان کا ہونا نہ ہونا سب برابر ہے۔

خیر یہ تو پیش لفظ تھا سخن گوئی کے بارے میں، جس کو ہمارا نوجوان طبقہ نہایت تیزی سے اپنانے کی کوشش کر رہا ہے، اور ترقی کی اس رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں اُردو شاعری کا جسدِ بے جان سانسیں لینے لگے گا۔

ایک فطری شاعر کے یہاں جذبات کی فراوانی ہوتی ہے اور اُس کے احساسات لفظی جامہ پہننے سے عاری نہیں ہوتے، لیکن باوجود اس کے وہ فنی اعتبار سے کمزور رہتے ہیں۔ اس کی ناتجربہ کاری شعر کو اس قدر مؤثر نہیں ہونے دیتی جتنا کہ اُسے ہونا چاہیئے۔ اس کا دلکش خیال اثر اندازی میں ایک تجربہ کار شاعر سے نہیں بڑھ سکتا۔ ایک تجربہ کار شاعر جانتا ہے کہ اس کا ہر جذبہ اور ہر خیال سامع پر اثر نہیں ڈال سکتا، دوسرے اُسے کامل مہارت ہونے کی وجہ سے اس کا شعر اتنا اچھا معلوم ہونے لگتا ہے جتنا اُسے خیال کے لحاظ سے تو ہونا چاہیئے بولنے کی قوت ہر شخص میں ہوتی ہے، لیکن ایک مقرّر اس میں مہارت حاصل کرتا ہے اور یہ صرف تقریر کا فن ہوتا ہے جو دوسرے کو اس کی بات سُننے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ اسی طرح ایک ناتجربہ کار شاعر کو بھی فن حاصل کرنا چاہیئے، اور فن بغیر سیکھے نہیں آسکتا۔ اُستاد کی ضرورت اسی لئے محسوس ہوتی ہے۔ استاد کے لئے صرف کہنہ مشقی یا تجربہ ہی شرط نہیں بلکہ اسے سخن فہم اور فطری شاعر بھی ہونا چاہیئے۔ ایک تجربہ کار سخن گو سخن فہم اور ماہرِ جذبات شاعر میں اصلاح دینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اپنے شاگرد کے کلام پر اصلاح دینے سے

پہلے اس کے جذبات اور احساسات سمجھنے کے لئے اس کی فطرت کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیئے ورنہ اُستاد کی یہ بے پروائی شاگرد کی فطری لیاقت کو بھی ملیامیٹ کر دے گی اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس میں جس عنصر کی ترقی ہوگی وہ تصنع ہوگا۔ رفتہ رفتہ اس کی اپنے جذبات سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو جائے گی۔ لیکن ہمارے شعرا ان پابندیوں سے گریز کرتے ہیں کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ ایسا کرنے کے بعد وہ شاگردوں کی ایک کثیر جماعت کو نہ سنبھال سکیں گے۔ جس سے سوائے مالی نقصان کے ان کو کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اپنی جیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ ان کے شاگردوں کی فہرست زیادہ سے زیادہ لمبی ہو۔

یوں تو اُستادی کا دم بھرنے والے شعرا کی تعداد کافی سے کہیں زیادہ ہے۔ لیکن جناب سیاب اکبرآبادی ان میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، سب سے الگ ڈھائی اینٹ کی مسجد بنائے آگرہ میں گوشہ نشین ہیں۔ آگرہ اسکول کا پروپیگنڈہ آپ کا نصب العین ہے۔ آپ کے اصلاح دینے کے چند اُصول ہیں اور شاگرد بننے کے لئے کچھ شرطیں ہیں۔ آپ کا طریق اصلاح بھی سب سے جدا گانہ ہے۔ آپ کا شاگرد بننے کے لئے کن شرائط کو پورا کرنا چاہیئے یہ بتانے کے لئے ہم اس وقت بالکل تیار نہیں ہیں اور نہ ہمارے اس مضمون سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ البتہ آپ کے طریق اصلاح کے بارے میں ہم کو ضرور کچھ کہنا ہے کیونکہ اس کا تعلق ہمارے ادب سے ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم آپ کے طریق اصلاح پر کچھ روشنی ڈالیں، آپ کے اصلاح دینے کے چند اُصولوں کا ذکر کر دینا زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ آپ کی اصلاح سمجھنے میں دھوکے کا امکان کم رہے۔

۱۔ آپ ایک شعر میں دو مختلف الزمانہ افعال لانا جرم سمجھتے ہیں، حالانکہ کلیہ نظم کرتے وقت شاعر ایسا کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔

۲۔ لفظی تکرار سے آپ کو سخت نفرت ہے، خواہ کسی موقع پر تکرار ہی شعر کی جان کیوں نہ ہو۔

۳۔ "ا۔ و۔ ی" کا دبنا یا گرنا آپ کی شرع میں گناہ عظیم ہے، حالانکہ شعرائے متقدمین، متوسطین، متاخرین اور عصرِ حاضر کے یہاں اس کی مثالیں بکثرت ملیں گی۔

۴۔ زوائد کو ناقابلِ عفو تقصیر سمجھتے ہیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ آپ کے کلام میں خود اس کی مثالیں کافی سے زیادہ مل جائیں۔

۵۔ آپ فارسی اور عربی ترکیبوں کے بہت شائق ہیں، خواہ ان میں ثقل کا عیب ہو یا اکثر بے معنی ہوں۔

۶۔ آپ غزل میں ہر مضمون کی کیفیت کو جائز سمجھتے ہیں اور فلسفیانہ طرزِ ادا بہت مرغوب ہے، چاہے اس سلسلے میں شعر کے دونوں مصرعے بے ربط ہو جائیں۔

۷۔ اگر کسی شعر میں شعریت نہ بھی ہو تب بھی وہ آپ کی زبان میں شعر ہی کہلائے گا۔

اصلاح: خود اپنے حال پر اب تو مجھے افسوس ہوتا ہے
الٰہی کیا یہ میرے دل کی حالت ہوتی جاتی ہے

عرض خاکسار:- معلوم نہیں شفیق صاحب کو کس رو میں اصلاح دی گئی ہے "ہوتی" کی "ی" دب رہی ہے اور پوری غزل میں سیماب صاحب کے اُصول کے مطابق یہ عیب موجود ہے۔ پھر آخر ردیف کیوں نہ بدلی گئی۔ اس شعر میں جزوی تقابل ردیفین پر بھی توجہ نہ فرمائی، اور نہ یہ خیال کیا گیا کہ پہلے مصرع میں "حال" مذکر ہے اور دوسرے میں "حالت" مؤنث۔

بہر حال سیماب کی اصلاحوں میں وہ شان نظر نہ آئی جو ایک کہنہ مشق اُستاد کے یہاں ہونا چاہیئے اور نہ سیماب صاحب نے اصلاح دیتے وقت ان عیوب کا خیال رکھا جس کے لئے دوسرے اساتذہ پر تبرّا بازی کی گئی ہے۔

واردات

(از جناب مائل نقوی صدر انجمن ترقی اردو بھوپال)

محبت میں بھی گزری کس مزے کی زندگی اپنی
عجب عالم رہا اُن کا عجب حالت رہی اپنی

سحر اپنی ہے، شام اپنی، دل اپنا، زندگی اپنی
جو تم اپنے ہوئے محفل یہ ساری ہو گئی اپنی

صبا سے حالِ دل کیوں بیخودی میں کہہ دیا میں نے
چمن میں ہو گئی ہے رازداں ہر اک کلی اپنی

کوئی اُس سے حیاتِ جاوداں کے کچھ مزے پوچھے
لٹا دی ہو ترے قدموں پہ جس نے زندگی اپنی

حقیقت میں یہ سب اُن کی عنایت کے کرشمے ہیں
نہ یہ ذوقِ نظر اپنا، نہ یہ دیوانگی اپنی

نہ وہ جوشِ تکلم ہے نہ وہ ذوقِ تماشا ہے
تری محفل میں کوئی چیز شاید رہ گئی اپنی

دل و جان و جگر کیفیتِ غم میری سب سمجھے
بھری محفل اُن کی محفل میں کہی جس نے کہی اپنی

وہی کچھ کامیاب مقصدِ الفت ہوا جس نے
سُستی ہر ایک کی راہِ طلب میں اور کی اپنی

مری بربادیٔ کامل پہ تیرا مُسکرا دینا
جو مل جائے لٹا دوں پھر متاعِ زندگی اپنی

معاذ اللہ یہ مجبوریاں راہِ محبت کی
نہ صبحِ زندگی اپنی نہ شامِ بیکسی اپنی

مری غیرت ہے منتِ قاصد نہیں مائل
زبانی اپنی ہے جو کچھ بھی ہے دل کی لگی اپنی

لیلےٰ

(برسات کی ایک نشیلی رات میں)

(از حضرت سالک کانپوری)

(۱)
اندھیری رات، یہ ٹھنڈی ہوا، یہ گرم وجود
نصیب میں ہیں فقط کروٹیں! اے معبود

فضائے صحن میں، بارش نے چھیڑ رکھا ہے
جگر گداز ترنم، جنوں نواز سرود

دیارِ روح میں، ہنگامہ ہائے حشر و فساد
جوارِ شوق میں تخئیل کا ہبوط و صعود

کبھی کبھی کوئی بجلی چمک سی جاتی ہے
تمام منظرِ آفاق — بس سیاہ و کبود

کوئی خیال مرے دل کو گدگداتا ہے
نہ توڑ دے، یہ جوانی شرافتوں کی حدود

غضب ہے یہ حرمِ آہنیں، یہ صنفِ لطیف
ستم ہے ہمتِ مرداں! انسانیت یہ قیود

(۲)
میں خاندان کی عزت گنوا نہیں سکتی
مرے حبیب! کہ تجھ تک میں آ نہیں سکتی

یہ بندش اور یہ پابندیاں ہیں کچھ ایسی
انھیں مٹا نہیں سکتی، اٹھا نہیں سکتی

تمھارا نام، تمھاری وفا، تمھارا خلوص
اگرچہ دل میں ہیں، پر لب پہ لا نہیں سکتی

وہ نغمہ ہائے محبت، جو روح گاتی ہے
میں زیرِ لب بھی انھیں گنگنا نہیں سکتی

تم اک حقیقتِ عریاں ہو میری خلوت میں
مگر مجاز کی چلمن، اٹھا نہیں سکتی

میں آتشِ غمِ پنہاں میں جل تو سکتی ہوں
مگر چراغِ محبت جلا نہیں سکتی

(۳)
میں چاہتی ہوں بس اک رات، اک اندھیری رات
سجھائی دے سکے جس رات میں نہ ہاتھ کو ہات

وہ رات جس میں تخیل بھی دل کا کر نہ سکوں
وہ رات جس میں اٹھائے حیات، پردۂ ذات

سپرد کردوں تمھیں، بڑھ کے یہ امانتِ حسن
یہ لب، یہ چشم، یہ رخسار، یہ جبین، یہ ہات

وفا کے پھول، تمنا کا باغ، دل کی بہار
فسونِ چشم، جمالِ لطیف احساسات

گلے میں ڈال کے بانہیں، میں منتقل کردوں
یہ خواہشوں کا سمندر، یہ محشرِ جذبات

خدائے عشق کے آگے شکست کر ڈالوں
خیال و شوق کے جتنے ہوں دل میں لات و منات

شبِ سیاہ! اب آنا اگر مرے گھر میں
تو میرا چاند بھی لانا چھپا کے چادر میں

رفتارِ زمانہ

گذشتہ دو ماہ کی جنگ کا اہم ترین کارنامہ سُرخ فوجوں کی زبردست کامیابی ہے۔ روسی فوجیں اپنے ہر محاذ پر بڑی سُرعت سے بڑھتی چلی جا رہی ہیں، اور جرمن فوجوں کو کہیں ٹھہرنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ لینن گراڈ کے محاذ پر جنوب مغربی یوکرین میں روسیوں کی بے پناہ یلغاروں کے سامنے جرمن فوجیں پسپا ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اکثر لوگ [کہتے] ہیں کہ جن علاقوں کو جرمنی نے اس قدر خون بہا کر حاصل کیا تھا انھیں اب اس قدر آسانی کے ساتھ کیوں خالی [کیا] جا رہا ہے۔ اس کا جواب مسٹر چرچل نے اپنی ایک تقریر میں اس طرح دیا تھا کہ اگر ہٹلر اپنے نقصانات کو کم کرنا اور [مغر]بی یورپ میں کُھلنے والے محاذ کے لئے اپنی مرکزی فوج کو مضبوط بنانا چاہتا ہے تو اُسے روس میں پیچھے ہٹ کر محاذ [کی لمبائی] کو کم کرنا پڑیگا۔ چنانچہ جرمن پسپائی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ روس میں جرمن فوجیں [ہر] علاقہ چھوڑتی اور پسپا ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ مگر اسی سلسلہ میں ہم کو روسی فوجوں کے شاندار کارنامے نظر انداز نہ کرنا [چا]ہئیے۔ اگر بہادر روسیوں کا جرمنوں پر دباؤ نہ پڑتا تو وہ علاقے چھوڑ کر پسپا ہونے پر کیوں مجبور ہوتے۔ روس کی لڑائیوں [میں] جرمنوں نے شدید نقصانات جان و مال برداشت کئے ہیں بیشمار جرمن سپاہی ہلاک، زخمی اور قید ہو چکے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں۔ اگرچہ اس وقت خرابیِ موسم کی وجہ سے لینن گراڈ کے محاذ کی لڑائی سرد پڑ گئی ہے۔ لیکن جنوبی روس کی لڑائیاں پوری ہلاکت آفرینیوں کے ساتھ جاری ہیں۔ روسی فوجوں نے دریائے نیپیر کے دہانہ کے بہت سے شہروں اور [قصبو]ں پر قبضہ کر لیا ہے۔ ان کی یلغاریں دریائے نیسٹر کی طرف جا رہی ہیں جرمنوں کا ارادہ تھا کہ دریائے برگ پر مضبوط [مور]چے قائم کریں لیکن روسیوں نے جرمنوں کی تمام کوششیں خاک میں ملا دی ہیں۔ انھوں نے اوڈیسہ لواڈ ریلوے لائن [اور] مارنوپل اور پروسکورات کے درمیان بہت بڑا شگاف ڈال دیا ہے جس کی وجہ سے اب جرمنوں کو مجبور ہو کر دریائے [پرتھ] کی طرف ملک رومانیہ میں بھاگنا پڑ رہا ہے۔ روسیوں کی تازہ فتوحات بہت بڑے امکانات کی حامل ہیں۔ یعنی اگر روسیوں [کی فتو]حات کی رفتار یونہی رہی تو بہت جلد پہلے رومانیہ پھر ہنگری اور بلغاریہ جرمنوں کا ساتھ چھوڑ کر جداگانہ صلح کرنے [پر مجبور] ہو جائیں گے، اور اگر نہ ہوسکے تو انھیں بہت بھاری سزا بھگتنی پڑے گی۔ چنانچہ اس خطرہ کو محسوس کر کے جرمنی نے [ہنگری] پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس وقت دریائے نیپیر کے جنوبی خم میں جرمنی کی تقریباً ڈھائی لاکھ فوج ایک بہت بڑے [گھیر]ے کے اندر گھر گئی ہے، جسے بچا کر صاف نکال لے جانا مشکل معلوم ہو رہا ہے۔

لینن گراڈ کے شمالی محاذ پر جو روسی فوجیں آگے بڑھ رہی تھیں بڑا نارووا اور پسکاف ہیں، دریائے ڈوینا کے [کنارے] ریلوے پر بیسٹ کی وادیوں کے قریب ہیں اور پولینڈ کی پُرانی سرحد کے پار سا نتائی ورگہ تو میں لیکن پیچ دلیں

سے اس محاذ کی خبریں آنا بند ہیں۔ غالباً روسی فوجیں دم لیکر اپنی حالت درست کر رہی ہیں۔ امید ہے کہ اس محاذ کا جمود بہت جلد ختم ہو جائیگا، اور اسی کے ساتھ یہ امکان بھی ہے کہ جونہی برطانیہ و امریکہ کی فوجوں نے مغربی یورپ میں کسی جگہ فوجیں اتاریں فوراً ہی روسی فوجوں کی پیش قدمی برق رفتاری کے ساتھ ہونے لگے گی۔ جرمنی تین طرف سے گھر جائیگا۔

اطالیہ | اٹلی کی لڑائی تقریباً دو مہینے سے سست ہے۔ کیسینو، آنزیو اور کاسینو کے محاذات پر فریقین کی فوجیں جہاں پہلے تھیں وہیں اب بھی ہیں۔ جرمن مارشل کیسلرنگ نے ہزار کوششیں کیں، تابڑ توڑ جوابی حملے کئے، لیکن ہر مرتبہ نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا، اور وہ اتحادی فوجوں کو ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹا سکا۔ بایں ہمہ جرمنی کی طاقت اٹلی میں ابھی کچھ کم نہیں ہے۔ اس وقت اٹھارہ ڈویژن جرمن فوج نبرد آزما ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اٹلی کے محاذ پر دشمن آسانی سے شکست نہیں کھائیگا۔ آجکل کاسینو کے محاذ پر نہایت گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے، جسے پہلے اتحادیوں نے اپنے ہوائی جہازوں سے لگاتار بمباری کر کے پوری طرح تباہ کر دیا، بعد ازاں پانچویں فوج نے شہر پر ہلہ بول دیا۔ اب تازہ خبر یہ ہے کہ جرمن نہایت سختی سے مزاحمت کر رہے ہیں، ایک ایک انچ زمین پر لڑائی ہو رہی ہے۔ اتحادی فوجوں نے کاسینو کے دو تہائی حصہ پر قبضہ کر لیا ہے، مگر ایک تہائی حصہ ہنوز دشمن کے قبضہ میں ہے۔ اس محاذ کی تازہ اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ کاسینو کا ریلوے اسٹیشن اتحادیوں کے قبضہ میں آگیا ہے اور شہر کاسینو اور خانقاہ والی پہاڑی کے درمیان اتحادیوں نے مزید پیش قدمی کی ہے۔ ہندوستانی فوجیں شہر کاسینو کے مغرب میں دو پہاڑیوں پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔ جہاں لڑائی متذبذب حالت میں ہے۔ کبھی دشمن کچھ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور کبھی اتحادی۔ ساحل سمندر پر جہاں اتحادی فوجیں اتری ہیں وہاں دشمن آمدیو سے پانچ میل جانب مغرب حملہ کرنے والا تھا مگر اتحادیوں نے یہ حملہ رد کر دیا۔

ہوائی حملے | امریکن اور برطانوی ہوائی جہاز مغربی جرمنی اور جرمنی کے مقبوضہ یورپ پر شدید حملے کر رہے ہیں، اور یہ حملے رات اور دن دونوں میں کئے جاتے ہیں۔ اور اب ان حملوں میں ڈیڑھ دو ہزار ہوائی جہاز حصہ لیتے ہیں۔ جس سے اتحادیوں کی بڑھتی ہوئی ہوائی قوت کا پتہ چلتا ہے۔ اتحادی ہوائی بیڑہ کی بمباری سے برلن، میونخ، اسٹٹگارٹ، ہیمبرگ اور دوسرے صنعتی شہروں اور لڑائی کے کارخانوں کو سخت نقصان پہونچا ہے۔ اس تباہ کاری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ امریکن و برطانوی ہوائی جہاز ہر گھنٹہ دو سو مرتبہ چھاپے مارتے ہیں، ہر ۲۴ گھنٹہ میں تیس ہزار ٹن یا ۱۲۵۰ ٹن فی گھنٹہ بم گرا رہے ہیں۔ دشمن نے بھی جوابی حملے کر کے لندن میں آگ لگانے کی کوشش کی اور فاسفورس کے بم بڑی تعداد میں برسائے جس سے لندن کے ایک فیشن ایبل علاقہ میں آگ لگ گئی تھی، مگر اس ہوائی نبرد آزمائی میں اتحادیوں کا پلہ بھاری ہے۔

برہما | برہما کا محاذ جنگ شمالی برہما سے لیکر اراکان تک سات سو میل تک پھیلا ہوا ہے۔ سنگلاخ پہاڑیاں، ناہموار ندیوں، نالوں، دریاؤں کی کثرت، ریلوے لائنوں اور سڑکوں کا فقدان، وسائل و ذرائع نقل و حمل کی دشواریاں،

نا قابل عبور گنجان جنگلات اس طویل محاذ کی خصوصیات میں داخل ہیں۔ یہ کل محاذ چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) وادی ہکانگ کانگ، (۲) شمالی چھندوین کی وادی، (۳) چین کی پہاڑیاں اور (۴) اراکان۔ پہلے تین محاذ آسام و برہما اور چوتھا محاذ بنگال و برہما کی سرحد پر واقع ہے۔ اراکان کا محاذ بھی تین حصوں میں تقسیم ہے۔ (۱) کالاوان۔ (۲) پانزین، اور (۳) ماوبی، مانگڈا بوتھیڈانگ۔ کچھ عرصہ سے ان محاذوں پر جمود چھایا ہوا تھا لیکن پچھلے دنوں سے سرگرمیاں بڑھ گئی ہیں۔ وادی ہکانگ کانگ میں شہر لیڈو فتح کر کے برہما کے راستہ چینیوں کو مدد پہونچانا ہے، اور اراکان کے محاذ کا مقصد اکیاب پر قبضہ کرنا ہے۔ یہ درمیانی دو محاذات انھیں دونوں کی شاخیں ہیں جن کی نوعیت کبھی جارحانہ ہو جاتی ہے اور کبھی مدافعانہ۔

پچھلے دنوں اراکان کے محاذ پر جاپانیوں نے پیش قدمی کرنی چاہی تھی جس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ۵ویں انڈین ڈویژن فوجوں کے تعلقات منقطع کر کے ان کو گھیر لیا جائے۔ لیکن دشمن اپنے اس مقصد میں ناکام رہا اور اسے انگریزی فوج کے مقابلے میں خشکی پر پہلی شکست کا منہ دیکھنا پڑا جس کا جواب اب جاپانیوں نے یہ دیا ہے کہ درمیانی علاقوں میں اپنا زبردست فوجی اجتماع کر کے دریائے چھندوین کو کئی جگہ سے عبور کر لیا، اور اپنی فوجیں برہما کی سرحد پار کر کے ہندوستان میں داخل کر دیں۔ جو اب ریاست منی پور واقع آسام کے حدود میں ٹڈیم سے تقریباً چھ میل جانب شمال انگریزی فوجوں سے مقابلہ کر رہی ہیں۔ جاپانیوں کی اس جنگی چال کو کونسل آف اسٹیٹ میں ہز اکسلنسی کمانڈر انچیف نے بھی تسلیم کر لیا ہے، اور فرمایا ہے کہ دشمن نے بڑی طاقت والے تاراج دستے بھیج دیے ہیں۔ جن کا مقصد حسب معمول یہ ہے کہ ہمارے ذرائع نقل و حمل کو منقطع کر کے ہماری بڑھی ہوئی فوجوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیں۔ بہرحال خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انگریزی فوجیں دشمن کا زبردست مقابلہ کر رہی ہیں، اور اسے ضرور مار کر پیچھے ہٹا دیا جائیگا۔

بحر الکاہل | بحر الکاہل میں زیادہ تر ہوائی اور بحری معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں جن میں دشمن کے مقبوضہ جزیروں، اہم مقامات اور اڈوں پر حملے کر کے بمباری کی گئی۔ دشمن کے بعض چھوٹے چھوٹے جزیروں میں اتحادی فوجیں بھی اتریں۔ تازہ خبر یہ ہے کہ امریکن فوجیں جزیرہ امیراؤ میں اتر گئی ہیں۔

روس و فنلینڈ | فنلینڈ ایک چھوٹا سا اور کمزور ملک ہے جو لڑتے لڑتے گھبرا گیا ہے اسلئے وہ چاہتا ہے کہ روس کے ساتھ فوراً صلح کر کے جنگ سے کنارہ کش ہو جائے۔ چنانچہ جب بعض فنی لیڈروں نے روس سے صلح کرنے کیلئے سلسلہ جنبانی کی تو حکومت روس نے اپنے سفیر متعینہ سویڈن کی معرفت التوار جنگ کیلئے یہ شرطیں پیش کیں۔ (۱) لڑنا فوراً بند کر دیا جائیگا (۲) روس و فنلینڈ کے درمیان سرحد وہی رہیگی جو ۱۹۴۰ء کے صلحنامہ میں طے ہوئی تھی (۳) فریقین ایکدوسرے کے اسیران جنگ کو فوراً رہا کر دینگے (۴) فنلینڈ میں جو جرمن فوجیں ہیں انھیں غیر مسلح کر کے نظر بند کر دیا جائیگا (۵) تاوان جنگ اور فوج منتشر کرنیکا معاملہ گفت و شنید کیلئے اپنا وفد ماسکو بھیجیگا۔ اسکے بعد ان شرطوں میں کچھ ترمیم بھی کیگئی لیکن فنلینڈ نے یہ گوارا نہیں کیا کہ گفت و شنید جرمنی

سے پہلے ہی ان شرائط کو منظور کر لے۔ وہ گفت و شنید کے ذریعے شرائط صلح طے کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا روس کی علاوہ مندرجہ بالا قید کو مان لینا اپنی قومی خودداری کے خلاف سمجھتے ہوئے فنلینڈ نے روس کی پیش کردہ شرطیں ماننے سے انکار کر دیا۔

رومانیہ و ہنگری | چونکہ اب روسی فوجیں سرحد رومانیہ کے قریب پہونچ گئی ہیں، اور جرمن فوجوں کی نقل و حرکت اور رسد رسانی کے راستے صرف وہی باقی رہ گئے ہیں جو رومانیہ و ہنگری سے گزرتے ہیں، اور اس بات کا اندیشہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ شاید رومانیہ و ہنگری روس سے دو کر جداگانہ صلح کر لیں اور جرمنی تن تنہا رہ جائے اس لئے جرمنی نے تمام ہنگری و رومانیہ پر اپنا تسلط قائم کر کے اہم مواقع پر اپنی فوجیں تعینات کر دی ہیں۔ ہنگری میں پرانی حکومت الٹ کر نئی حکومت قائم ہو گئی ہے جو ہر بات میں جرمنی کی حامی ہے۔ اسی سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ چونکہ رومانیہ و ہنگری کے درمیان کوہستان کارپیتھین کے بارہ میں جھگڑا چلا آ رہا ہے اور اس امر کا امکان پیدا ہو گیا تھا کہ رومانیہ اور ہنگری کی فوجوں میں تصادم پیدا ہو جائے اس لئے جرمنوں نے خود کو بیچ میں ڈال کر کوہستان مذکور کے تمام اہم درّوں میں اپنی فوجیں تعینات کر دی ہیں، اور اب رومانوی و ہنگروی فوجوں کی ٹکر کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

ٹرکی و برطانیہ | پچھلے دنوں برطانوی فوجی افسروں کے ایک وفد نے ٹرکی جا کر ترک جنرل اسٹاف سے گفت و شنید شروع کی تھی جس کا سلسلہ پانچ ہفتہ تک جاری رہا تھا۔ وفد نے ٹرکی سے مطالبہ کیا کہ "(۱) اتحادیوں کی طرف سے جنگ میں شریک ہو جائے۔ یا (۲) اپنے ہوائی اڈے اتحادیوں کو دیدے۔ لیکن ترکوں نے یہ مطالبات منظور کرنے سے انکار کر دیا، اور دلیل یہ پیش کی کہ اطنہ میں پریسیڈنٹ انونو اور مسٹر چرچل کی جو کانفرنس ہوئی تھی، اس میں جس قدر اسلحہ جدید اور سامان جنگ دینے کا برطانیہ نے وعدہ کیا تھا، چار سال میں اسکا صرف چار فیصدی دیا گیا ہے اس لئے پہلے برطانیہ وہ تمام اسلحہ و سامان جنگ ٹرکی کو دیدے تاکہ ٹرکی پوری طرح سے مسلح ہو کر جنگ میں شریک ہو جائے۔ لیکن برطانیہ ٹرکی کو فوراً جنگ میں شامل کرنا چاہتا ہے اس طرح گفت و شنید کا سلسلہ ختم ہو گیا اور برطانوی وفد واپس چلا گیا۔ اب برطانیہ نے ٹرکی کو سامان دینا بالکل ہی بند کر دیا ہے۔ دونوں طاقتوں میں کسی قدر بدمزگی ضرور پیدا ہو گئی ہے لیکن دوستانہ تعلقات بظاہر بدستور قائم ہیں۔ آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

مسٹر چرچل کی تقریر | مسٹر چرچل نے اپنی جو تازہ تقریر براڈکاسٹ کی ہے اسمیں انھوں نے چند باتیں خاص بتائی ہیں۔ ایک تو جاپان سے لڑنے کیلئے ہندوستان کے سمندر میں بہت بڑا برطانوی بیڑا آ گیا ہے جسکا مستقر سیلون میں ہے، دوسری یہ کہ بحرالکاہل میں جاپان کے خلاف جنگ زیادہ زور پکڑ جائیگی۔ مسٹر چرچل نے کہا کہ اسمیں کوئی شک نہیں کہ آخر میں جیت ہماری ہی ہوگی۔ اٹلی میں بھی فتح ہماری ہی ہوگی جہاں لڑنے کیلئے ہمنے ۲۰ ڈویژن فوج مخصوص کر دی ہے اور جہاں ہمنے ۲۵ ڈویژن جرمن فوج پھنسا رکھی ہے۔ جرمنی کی مسلسل شکستوں کی وجہ سے رومانیہ، ہنگری، بلغاریہ اور فنلینڈ میں گھبراہٹ پھیل رہی ہے۔ جرمنی کی آمد و رفت کی مشکلوں سے بھی ہمیں نجات ملتی ہے۔ ہمارے پاس اسوقت اتنی ہوائی فوج ہے کہ اتنی ایک سال پہلے نہیں تھی امریکہ کی ہوائی طاقت ہم سے بھی زیادہ ہے۔ روس کی لڑائی کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر چرچل نے کہا کہ ایکسال کے اندر روسیوں نے جرمنوں کو اسٹالین گراڈ سے لیکر دریائے منیسٹر تک یعنی نو سو میل پیچھے ڈھکیل دیا ہے جس سے جرمنوں کے حوصلے پست ہو گئے ہیں۔ بحرالکاہل میں ہم نے امریکہ کی اور ہندوستان میں امریکہ نے ہماری لیڈری تسلیم کر لی ہے۔

ہندوستان | ہندوستان کی سیاسیات میں کوئی خاص بات قابل ذکر رونما نہیں ہوئی ہے۔ ہز اکسلنسی لارڈ ویول نے چند ماہ خاموش رہکر مرکزی اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے مشترکہ اجلاس میں تقریر کی ہے۔ اس نے ہندوستان کی تمام سیاسی پارٹیوں کو مایوس کر دیا ہے۔ انھوں نے نظربند کانگریسی لیڈروں کو رہا کرنے سے انکار کر دیا ہے تاوقتیکہ وہ ۸۔ اگست ۱۹۴۲ کا رزولیوشن واپس نہ لیں اور حکومت سے تعاون کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ دوسری طرف وائسرائے نے مسلم لیگ کو یہ کہکر ناخوش کر دیا ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان کی کوئی تقسیم نہیں ہو سکتی ہے۔ اسکا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مرکزی اسمبلی میں کانگریس پارٹی، مسلم لیگ پارٹی اور نیشنلسٹ پارٹی تینوں حکومت کے خلاف متحد و متفق ہو گئی ہیں اور انھوں نے حکومت کو نو مرتبہ شکست دی ہے اور فنانس بل کو نامنظور کر دیا ہے۔ حکومت ہند کا سالانہ بجٹ ہولناک خسارہ کا حامل ہے۔ جنگ کی وجہ سے ۹۴ کروڑ روپیہ سے زیادہ خسارہ

آمدِ بہار



جاڑوں کا خون بہار کے موسم میں کمزور ہو جاتا ہے اور جمع شدہ مادّے ابل پڑتے ہیں۔ اس لیئے ضرور ہے کہ اس موسم کے آتے ہی خون کی صفائی سائنٹی فک ذریعہ سے کردی جائے۔



اس مقصد کے لئے ہمدرد نے صافی ایجاد کی ہے
قیمت دس خوراکیں دس آنے۔
تفصیلات کے لئے رسالہ ہمدرد بہار مفت لیکر پڑھیے۔

ہمدرد دواخانہ۔ لال کنواں، دہلی۔

فصلِ گل



یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ بہار کو فصل گل کہتے ہیں۔ لیکن کیا آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ کیا کیا گل کھلاتی ہے۔ آئیے ذرا اسکی گل کاریاں بھی دیکھ لیجئے۔ یہ موسم ۱۵ فروری سے ۱۵ اپریل تک رہتا ہے اور اپنے ساتھ خسرہ، چیچک، پھنسیاں، پھوڑے، داد اور خارش ... خون کا بگاڑ، حلق کا درد، نکسیر ... ہوتی ہے۔ اگر آپ ان کاموں سے بچ سکیں تو بہار کے پھولوں کا لطف آتا ہے۔ گویا بہار فصل گل ہی نہیں بلکہ فصل خار بھی ہے ... ورنہ بہار کا موسم گزر بھی جائیگا اور کانٹوں ہی میں الجھے رہ جائینگے۔ یہ موسم جتنا پر لطف ہے اتنا ہی خطرناک بھی ہے۔ اپنے آپ کو اور سب گھر والوں کو تندرست رکھنے کے لیے آج ہی سے صافی کا استعمال شروع کر دیجئے۔
صافی بہار کی سب بیماریوں کا شافی علاج ہے۔
قیمت فی شیشی (۱۰ خوراکیں) ... آنے۔

دواخانہ سے رسالہ ہمدرد بہار مفت طلب فرمایئے

ہمدرد دواخانہ لال کنواں دہلی

(مطبوعہ) ... جیّد برقی پریس دہلی ...

زمانہ

جلد ۸۲ — اپریل ۱۹۴۴ء — نمبر ۴

اُردو شاعری اور گُل و بُلبل

(از سید اختر علی تلہری)

ایک زمانہ سے وہ لوگ جن کی بیشتر ادبی کائنات مغربی ادب کی خوشہ چینی ہے اُردو کی شاعری کو گل و بلبل کی شاعری کہہ کر اُس کا مضحکہ اُڑاتے ہیں، اُن کے خیال میں اُردو شاعری کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ "ایرانی گلاب" کی خوشبو سونگھتی اور "ایرانی عندلیب" کے زمزمے سنتی ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اردو میں اس طنز کرنے والوں میں وہ ادیب بھی شریک ہیں جو خوش نصیبی یا بدنصیبی سے اس غریب "مرغ چمن" کے ساتھ تخلص کی وابستگی رکھتے ہیں۔ "مغرب زدگی" کی یہ ایک لطیف مثال اور "احساس کمتری" کا یہ ایک دلچسپ کرشمہ ہے۔ موجودہ اس دَور میں جو بین الاقوامی تعلقات کے نشو و نما کا دَور ہے، اُن ادبی رشتوں کو منقطع کرنے کا مشورہ کیونکر دیا جا سکتا ہے جو ہمسایہ ملکوں کے ساتھ صدیوں سے قائم ہیں۔ دنیا کا نصب العین جب تک بہت ہی محدود قسم کی وطنیت و قومیت کے تصورات کے الجھاووں میں اُلجھا ہوا تھا تو اُس وقت تک تمام بیرونی و غیر ملکی چیزوں سے علیحدگی کے نظریہ کی تاویل نکل بھی سکتی تھی لیکن آج تو یہ صورتِ حال ہی نہیں ہے۔ وطنیت و قومیت کے محدود تصورات کو سماجی مفکرین نے اپنے افکار کی دنیا سے بالکل الگ کر دیا ہے۔ اب ان ادبی رشتوں کو منقطع کرنے کا مشورہ کیسا؟

یہ تو اور بھی بوالعجبی ہوگی کہ مغربی شاعری کے صورت و مادہ سے باوجودیکہ ہم اُن سے مانوس بھی نہیں ہیں رشتہ جوڑا جائے لیکن اُس ادب سے جو ہماری ادبی و شعری روایتوں کے لئے سرچشمہ کی حیثیت رکھتا ہو

رشتہ توڑ دیا جائے۔ اس سے غالباً انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر زبان کا ادب و شعر حالات و روایات کے مخصوص سانچوں میں ڈھلتے ڈھلتے ایک خاص شکل پیدا کر لیتا ہے۔ اس کی تشبیہوں اور استعاروں کی نوعیت اس کے عنوان ادا اور اسلوب بیان کا ایک خاص مزاج بن جاتا ہے۔ اس زبان کے ادب و شعر کے ارتقا کے لئے اس مزاج کی مراعات نہایت ضروری ہوتی ہے، اسی مزاج کا محرم بن کر اس زبان کے شعری ذخیرہ میں اضافہ کیا جا سکتا ہے، اور اس سے نہ صرف کامیاب طور پر انبساط و انقباض کے جذبات ابھارے جا سکتے ہیں بلکہ ان سے ظاہر ہونے والی نواؤں کو ضرورت کے مطابق "تلخ تر" بنا کر "ذوق نغمہ" پیدا کیا جا سکتا اور "محمل کی گرانی" دور کی جا سکتی ہے سچ پوچھیے تو شعر میں "ترقی پسندی" اسی کا نام ہے۔ کسی زبان کے ادبی مزاج کی محرمیت، ضرورت کے مطابق نغمہ میں ذوق کی آفرینش، محمل کی گرانی کا دور کرنا، یہی وہ باتیں ہیں جو اصل ترقی پسندی کی ضامن ہیں۔ ان میں سے اگر کوئی بات بھی نظر انداز ہو گئی تو پھر شعر میں ترقی پسندی کا جوہر پیدا نہیں ہو سکتا۔ شعری دنیا میں آج کل جو سکے ترقی پسندی کے نام پر چلائے جا رہے ہیں ان کے کھوٹے ہونے کی اصلی وجہ انھیں امور میں سے کسی نہ کسی امر کی عدم مراعات ہے۔

اردو جس طریقہ سے پیدا ہوئی اور جن راستوں سے اس نے نشو و نما حاصل کی اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا اس کے مزاج میں گل و بلبل، برق و چمن، آشیان و قفس کی سی چیزیں عناصر کی حیثیت سے داخل رہیں۔ گل و بلبل ایک حد تک ایرانی چیزیں سہی، مگر جہاں اردو نے ایران کی بہت سی چیزوں کو قبول کیا گل و بلبل کو بھی اپنے ادبی چمن میں جگہ دی۔ ان چیزوں کا اردو شعر و ادب کے چمن میں بار پا جانا کچھ بیجا بھی نہیں ہوا۔ ان سے اردو کے بولوں کی حلاوتوں اور اس کے معنی کی نہ صرف رنگینیوں میں بلکہ وسعتوں میں بھی کچھ اضافہ ہی ہوا کیونکہ ان لفظوں کے ساتھ جو اصل میں علامات (Symbols) کی حیثیت رکھتی ہیں مختلف مفاہیم کی ایک دنیا وابستہ ہو گئی اور یہ جتنے گھستے پستے گئے ان کا رنگ نکھرتا گیا، اور ہمیں محسوس ہوتا گیا کہ ان علامات میں اس کی پوری صلاحیت ہے کہ یہ ہمارے تاریخی و اقتصادی و تمدنی حالات کے تغیر کے ساتھ فکر و نظر کی نئی پیدا ہونے والی دنیا کا ساتھ دے سکیں۔ "گل و بلبل" ایران کا سرمایہ سہی، مگر اپنے ایرانی اسلاف کی بدولت اور ایرانی تہذیب و ایرانی شعر و ادب سے تعلق کی بدولت ورثتاً ایران کا یہ رنگین سرمایہ ہم تک منتقل ہوا، اور ہم نے اسے اپنا لیا اور اس طرح اپنا لیا کہ وہ ہمارے ادب و شعر کی ذات کا جزو بن گیا۔ گل و بلبل، آشیان و قفس وغیرہ کے بطون میں ایمائی و اشاراتی وسعتوں کی جو صلاحیتیں پنہاں تھیں انھیں ہم نے وقت و حالات کے تقاضوں کے دباؤ سے اچھی طرح ابھار دیا اور اب وہ ہمارے علاماتی و اشاراتی خزانہ کے ایسے خوشاب و پرضیا لعل و جواہر ہیں جنھیں علیحدہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔

اُردو شاعری کے گل و بلبل، آشیان و قفس وغیرہ پر جو نقاد معترض ہیں وہ اُردو ادب کا مزاج پہچانیں اور اُن الفاظ کی علاماتی وسعت و اشاراتی اہمیت کو پیشِ نظر رکھیں، غالب کا یہ شعر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے:-

مطلب ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام　　　بنتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

انھیں حقیقۃً اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر اُردو کی وادی میں "جیحون سیحون" کیوں نہیں بہے، اور اُس کے زمین و آسمان پر گل و بُلبُل اپنے متعلقات کے ساتھ کیوں اس قدر چھا گئے۔

اصل یہ ہے کہ جب اُردو کا کالبد ایرانی و ہندستانی عناصر سے طیار ہو رہا تھا اور وہ باقاعدہ ایک ادب کی مزاجی صورت اختیار کر رہا تھا تو جو چیزیں اُس کے دائرۂ مزاج میں ٹھیک ٹھیک سما گئیں وہ تو رہ گئیں خواہ وہ کسی خاندان اور ملک کی ہوئیں لیکن جو اُس کے "مزاجی حدود" میں قاعدہ سے نہ آسکیں خواہ وہ ہندوستانی ہی ہوئیں خارج ہو گئیں۔ "جیحون سیحون" کے بدلے "گنگ و جمن" اُردو زمین کی آبیاری کے لئے مل گئے۔ لیکن "گل و بلبل" کا بدل "کالی کوئلیا" اور "پاپی پپیہے" میں پورے طور سے نہ مل سکا۔ یہ نہیں کہ ان سے کام نہ لیا گیا ہو، اُردو کا مزاج پہچاننے والے خوش سلیقہ ادیبوں نے ان سے بھی موقع موقع پر کام لیا اور ضرورت و موقع کی مناسبت سے کام لینا بھی چاہیئے، لیکن ان کے ساتھ جو روایتیں وابستہ ہو گئی تھیں اُنھیں چاروں طرف پھیلانے کے باوجود بھی ان میں یہ صلاحیت نہیں پیدا ہو سکی کہ وہ اپنے علاماتی و اشاراتی دامنوں میں مختلف اُبھرتے ہوئے مفاہیم و مطالب و نظریات سمیٹ سکیں۔ ان کی علاماتی و اشاراتی دنیا بہت ہی محدود ہے لیکن گل و بلبل کے اشاراتی و علاماتی دامن اپنے متعلقات و مرادفات کی کثرت کی وجہ سے مطالب و مفاہیم کی پوری کائنات سمیٹنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان علامات و اشارات کے واسطے سے زندگی کے اکثر رُخوں کی تفسیر و تنقید خوبصورتی کے ساتھ کی گئی ہے اور آئندہ اور زیادہ ہو سکے گی، لیکن اس کے لئے ضرورت ہے کہ ان "ایمائی لفظوں" سے کام لینے والا ذوقِ سلیم رکھتا ہو، حقیقتوں کے مشاہدہ و مطالعہ کی صلاحیت کا مالک ہو، اُس کے ہاتھوں میں پہونچکر یہ اشاراتی و علاماتی لفظ معنی کی نئی دنیا کی تخلیق کرتے اور ذوق کے لئے کہیں سے بار نہیں ہوتے ہیں، لیکن وہ افراد جو ان اشارات و علامات میں حقیقتوں کی بیان کرنے والی زبان پیدا نہیں کر سکتے ہیں، اُن کے یہاں یہ ایمائی لفظ جہاں تک ترجمانی حقائق کا تعلق ہے گونگے بن جاتے ہیں اور ذوق کے لئے مستقل تکلیف کا سامان ہو جاتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے ایک مشہور شاعر کا شعر ہے:-

چہچکی ہے کس اندازسے کس کرب و بلا سے ۔ دل ٹوٹ گیا نالۂ بلبل کی صدا سے

"چہچکی" اور "کرب و بلا" کے بدنما استعمال سے قطع نظر کرتے ہوئے بلبل کا ایمائی لفظ اس شعر میں ایک "نشست پر" کی حیثیت سے زیادہ آگے نہیں بڑھ سکا۔ اس کی منقار سے یہاں کوئی حقیقت پرور زمزمہ پیدا نہیں ہو سکا۔ بلبل و گل سے حقیقت نما لفظوں کے ساتھ یہ بچوں کا کھیل ہے۔ اس قسم کے حقیر بضاعت شعر پر قیاس کر کے اردو کے گل و بلبل پر اعتراض کرنا تقتضائے انصاف نہیں ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ پرانی شراب نئی بوتلوں میں بھرنے کے خلاف بالغ النظر کامل الفن ذوقِ سلیم کے مالک شاعر انھیں الفاظ کی "پرانی بوتلوں" میں نئے افکار و خیالات کی تیز و تند شراب بھر سکتے ہیں، اور اس سلیقہ سے بھر سکتے ہیں کہ اس کا رنگ و بو و ذائقہ سب دیکھا ہوا سونگھا ہوا چکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

ذیل کی مثالوں سے اندازہ ہو گا کہ با کمال شاعران ایمائی لفظوں کے واسطہ سے زندگی کی اہم حقیقتوں کی ترجمانی کس کامیابی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔

میر تقی میر فرماتے ہیں:۔

کیا جانیں وہ مرغانِ گرفتارِ قفس کو ۔ جن تک کہ بصد ناز نسیم سحر آوے

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے ۔ جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

میر کے اِن مذکورۂ بالا شعروں میں انھیں ایمائی لفظوں سے کام لیا گیا ہے، اور ان میں وہ بنیادی حقیقتیں ادا کی گئی ہیں جنھیں مختلف جہتوں پر پھیلا کر ہمارے نام نہاد ترقی پسند ادیب کوس لمن الملک" بجا رہے ہیں۔

امارت و ثروت کی گود میں پلے ہوئے سرمایہ دار غریبوں کے دکھ درد کے حالات جان ہی نہیں سکتے انھیں اس کا احساس ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ بیچارے زندگی کی منزلیں کن دکھوں سے طے کرتے ہیں؟ اس خیال کو پس منظر میں رکھ کر میر کے یہ شعر پڑھئے۔ "پتا پتا بوٹا بوٹا۔ الخ" ؎ کیا جانیں وہ مرغانِ گرفتار قفس الخ اور ان لفظوں کی ایمائی حیثیت کی وسعتوں کا اندازہ کیجئے۔

تڑپ کے خرمنِ گل پر کبھی گرا اے بجلی ۔ جلانا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا

اس شعر میں بھی یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ غریبوں کے ساز و سامان پر نظر ڈالنا بے فائدہ ہے مغرور ثروت اور تمکینِ امارت کے خرمنوں کا پھونکنا البتہ دنیا کی بہبود کے لئے ضروری ہے۔

بیخود موہانی مرحوم کا ایک شعر ہے:۔

اک یوں چمن میں مہکے اِک یوں قفس میں تڑپے ۔ تو بھی خدائے گل ہے کیوں اے خدائے بلبل

دنیا میں ہر جگہ یہی تماشا دکھائی دیتا ہے کہ ایک تکلیفوں اور مصیبتوں کے شکنجہ میں کسا ہوا
رہا ہے اور دوسرا عیش و آرام کی نرم آغوشوں میں لیٹا ہوا مسکرا رہا ہے۔ دنیا میں اب تک جو نظام
ج رہے ہیں وہ دولت و ثروت کی تقسیم کے ناقص اصولوں کی وجہ سے انسانی دنیا میں اسی تکلیف دہ
ق کا سامان ہوتے رہے ہیں۔ اور چونکہ یہ نظام عرصہ سے رائج ہیں اس لئے بعض وقت یہ خیال پیدا
ہے کہ یہ فطری ہیں، قدرت ہی نے انھیں ہمارے سروں پر عائد کر دیا ہے۔ سرمایہ داروں نے جود دولت
ت کو اپنا حصہ سمجھتے ہیں اس سے فائدہ اُٹھا کر ان نظامات کو مذہبی تقدس کا حامل بنایا اور اپنا مطلب
ل کرنا چاہا۔ فہم سلیم رکھنے والا انسان جب اس صورتِ حال کی طرف نظر کرتا ہے تو اُس کے دل میں خواہ مخواہ
ل پیدا ہوتا ہے کہ خدا جو انتہائی عادل ہے ان تفرقوں کو کیونکر روا رکھ سکتا ہے؟ اُس کی سچی مذہبیت
ا اقتصادی عدم مساوات کی تخلیق کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہوئے ہچکچاتی ہے اور وہ تشکیکی لہجہ میں
ختیار پوچھ اُٹھتا ہے:۔

اِک یوں چمن میں مہکے، اِک یوں قفس میں تڑپے تو ہی خدائے گل ہے کیوں اے خدائے بلبل

اس شعر میں گل و بلبل کی ایمائی حیثیت نے جو حکیمانہ وسعت اور فلسفیانہ پختگی پیدا کر لی ہے وہ اپنی جگہ پر
ت ہی لطیف اور اہم ہے اور اُسے مد نظر رکھتے ہوئے ایسے ایمائی الفاظ کے وسیع معنوں کے
انات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ انھیں امکانات کی مزید توضیح کے لئے ذیل میں اُردو کے بعض وہ اشعار
ہ کئے جاتے ہیں جن میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تفسیر و تنقید ان ایمائی الفاظ کی وساطت سے
میاب طریقہ پر کی گئی ہے:۔

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو مرا ہونا بُرا کیا ہے نواسنجانِ گلشن کو
ہے کس قدر ہلاک فریبِ وفائے گل بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہائے گل
کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی آشیاں اپنا ہوا برباد کیا؟
ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں
کنجِ قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر فصلِ بہار باغ میں دھومیں مچا گئی
جوشِ گل چاکِ قفس سے دمبدم دیکھا کئے سب نے یاں لوٹیں بہاریں اور ہم دیکھا کئے
کھلی ہے خانۂ صیاد میں ہماری آنکھ قفس کو جانتے ہیں آشیاں نہیں معلوم
قفس میں بھی ہے اسیرو تمھیں وہی سودا لگائے فصلِ بہاری کی آس بیٹھے ہو
ہمیشہ تنکے ہی چنتا رہا وہ بلبل ہوں ابھی بنا ابھی برباد آشیانہ ہوا

امیر — صیاد ادھر خلاف، اُدھر باغباں امیر ۔۔۔ ہم بارِ خاطرِ قفس و آشیاں رہے

حسرت موہانی — نہ پہونچے گی کبھی کیا گوشۂ گل تک ۔۔۔ قفس سے اُڑ کے فریادِ عنادل

فانی بدایونی — اس کے سوا نہیں خبرِ آشیاں مجھے ۔۔۔ ہم تھے اسیرِ دام تو بجلی چمن میں تھی

اقبال — نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی ۔۔۔ نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

یاس لکھنوی — امیدوارِ رہائی قفس بدوش چلے ۔۔۔ جہاں اشارۂ توفیق غائبانہ ملا

شاد عظیم آبادی —
مرغانِ چمن سے پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آنا ہے اگر تو آجاؤ ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

عزیز لکھنوی — قفس کیا، دام کیا، رنجِ اسیری کیا ۔۔۔ چمن پر مٹ گیا جو ہر طرح آزاد ہوتا ہے

آرزو لکھنوی — تھا ادھورا ہی نشیمن کہ گرفتار ہوئے ۔۔۔ یادِ گلشن ہی نہیں حسرتِ تسخیر بھی ہے

مانی جائسی — قفس کیا چیز ہے صیاد ڈر اس وقتِ نازک سے ۔۔۔ کہ رنجِ قید بڑھ کر ہمتِ پرواز بن جائے

احسن لکھنوی — بھری بہار کے دن تھے خیال آ ہی گیا ۔۔۔ اُجڑ نہ جاتا تو پھولوں میں آشیاں ہوتا

مثال کے طور پر یہاں چند شعر پیش کر دیئے گئے ہیں، لیکن اگر اُردو دواوین کا مطالعہ کیا جائے تو ان ایمائی لفظوں کی اشارتی وسعتوں کا بڑا ذخیرہ مہیا ہو سکتا ہے۔

شاید کہا جائے کہ آخر تمثیل و مجاز کے پردوں میں چھپا کر مفہوم پیش کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ ایسی آڑ کیوں ڈھونڈھی جائے جو حقیقت سے الگ ہو۔ بیان مقاصد کے لئے اُن اسلوبوں کے اختیار کرنے کی کونسی ہے جو "ہرب و فرار" کی حیثیت رکھتے ہیں؟ جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کیوں نہ کہا جائے، گل و بلبل کا واسطہ کیوں اختیار کیا جائے۔ مگر اعتراض کی یہ شکل گل و بلبل ہی کے ساتھ مخصوص نہیں رہتی بلکہ اسکی زد میں دنیا کے تمام مجازی استعمالات آجاتے ہیں اور اس طرح یہ اپنی لپیٹ میں دنیا کی تمام زبانوں کو لے لیتا ہے۔ یہاں اس سے تفصیلی بحث کا موقع نہیں ہے صرف اجمالاً اتنا گذارش کر دینا ہے کہ انسانی فطرت میں یہ ہرب و فرار نا ہے، بہت سی صورتوں میں مقتضائے حال یہی ہوتا ہے کہ جو کچھ کہنا ہے پردہ پردہ میں کہا جائے، اُن مقامات میں اسی مجاز سے کلام میں لطف پیدا ہوتا ہے، اور انھیں کنایہ کی باتوں سے اُسمیں حسن آتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ صاف صاف باتوں کا بھی ایک موقع ہوتا ہے مگر اسکا بھی ایک محل ہے، ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مقامے دارد۔ بہت سے موقعوں پر "الکنایۃ ابلغ من التصریح" اب بھی اتنا ہی سچ ہے جتنا پیشتر تھا۔ کنایہ میں جو بات کہی جاتی ہے وہ ذرا توجہ سے سمجھ میں آتی ہے اور جو چیز توجہ سے سمجھ میں آتی ہے وہ اچھی طرح دلنشین ہوتی ہے اور اس سے اکثر نفس انسانی زیادہ محظوظ بھی ہوتا ہے۔ پروپیگنڈا کی شاعری اپنے کاروباری نقطۂ نظر سے کنایہ و مجاز کی کم متحمل ہوتی ہے مگر اعلیٰ ادب و شعر کیلئے یہ چیزیں اہم عنصر ہیں۔ انھیں نظرانداز کر کے کوئی شعری کارنامہ لطافتوں کا مالک نہیں ہو سکتا۔

ہندی خاتون

(از مولانا محمد حسین محوی صدیقی لکھنوی)

طن کی آبرو ہے زینتِ بزمِ وفا تو ہے
خلوص و صدق کی دیوی ہے تصویرِ رضا تو ہے

حسن مروت آشکارا سارے عالم پر
وفا کی شان، گھر کی جان ہے کانِ حیا تو ہے

ری الفت دلِ مجروح کو سرمایۂ راحت
ہجومِ یاس میں بیمارِ غمگیں کی دوا تو ہے

گاہِ لطف فرما تیری دارو نیم جانوں کو
مریضِ سوختہ قسمت کو پیغامِ شفا تو ہے

ری فطرت میں وہ شفقت جو قوت دے ضعیفوں کو
بڑھا دے ہمتیں جو وہ نوائے بے نوا تو ہے

مداقت تیری اک دولت محبت تیری اک نعمت
حقیقت یہ کہ قدرت کی عطائے بے بہا تو ہے

بق تو نے دیا ہر مرد کو خُلق و مروت کا
ستم دشمن ہے تو غم خوار پامالِ جفا تو ہے

ترا معصوم چہرہ رازدارِ پاک دامانی
شریف انسان کے دل کا کمالِ مدعا تو ہے

ری غیرت سبق آموز چشمِ شوخ و خودسر کو
نگاہوں سے ادب آموز اربابِ دغا تو ہے

ل ہر مرد کو پیغامِ ہمت تیری غمخواری
کہ راحت بخش ہر وابستۂ کرب و بلا تو ہے

ری شیریں کلامی جانِ تازہ بخشنے والی
رفیقِ بے ریا تو ہمدمِ درد آشنا تو ہے

شیوہ محبت تیری خو لطف و رضا جوئی
بساطِ زندگی پر مہرۂ مہر و وفا تو ہے

ریشاں خاطروں کی جان تیرا شیوۂ تسکیں
سکونِ قلبِ غمگیں راحتِ مبتلا تو ہے

ری معصوم فطرت مائلِ پاکیزگی یکسر
مذاقِ معصیت سے بے خبر ناآشنا تو ہے

ری طینت فریب و مکر سے بالکل ہی بیگانہ
ترا دل پاک باطن صاف یعنی بے ریا تو ہے

بحرِ زندگی سر موجِ طوفانِ بلا جس کی
یہاں ہر کشتیِ طوفاں زدہ کی ناخدا تو ہے

تیری سادگی قربان جس پر زینتیں لاکھوں
شرافت کا نمونہ، پیکرِ صدق و صفا تو ہے

تو رسے پیدا جوشِ رحم و غمِ دلداری
جہاں کے غمکدے میں مظہرِ فضلِ خدا تو ہے

مصائب میں سہارا دینے والی نامرادوں کو
حوادث کے تھپیڑوں میں دلوں کا آسرا تو ہے

سے کہتے ہیں نیکی اس پہ حاصل دسترس تجھ کو
بدی ہے نام جس کا اس تجھ تک نارسا تو ہے

ہم کہاں فرشتے تیرے حسنِ پاک داماں کی
کریں سجدہ ترے دامن پہ ایسی پارسا تو ہے

افسوس! اس فطرت سے دور اب ہوتی جاتی ہے
مگر یہ اصول جوہر اپنے سب تو کھوتی جاتی ہے

شہر آشوب

(سروش عسکری طباطبائی)

حسن کی زلف گرہ گیر نظر آتی ہے   عشق کے خواب کی تعبیر نظر آتی ہے
سرمگیں چشم کی تحریر نظر آتی ہے   درِ میخانہ کی زنجیر نظر آتی ہے

یہ کھلے بال یہ ڈھلکا ہوا آنچل ہے ہے   یہ جوانی کے سن و سال کی ہلچل ہے ہے
چشمِ میگوں میں یہ پھیلا ہوا کاجل ہے ہے   مست کے ہاتھ میں شمشیر نظر آتی ہے

تیری فرقت میں مجھے سرو و سمن ڈستے ہیں   جلوۂ صبح سرِ دشت و چمن ڈستے ہیں
گیسوئے شام لبِ گنگ و جمن ڈستے ہیں   بے ترے موجِ ہوا تیر نظر آتی ہے

چاندنی رات کے خاموش ترنم کی قسم   گلِ مہتاب کے نمناک تبسم کی قسم
جھلملاتے ہوئے گلدستۂ انجم کی قسم   کہکشاں میں تری تصویر نظر آتی ہے

کششِ برق جو ہے تیرے اثر میں ظالم   ہے وہی بات مرے دردِ جگر میں ظالم
یاد رکھ جو ہے ترے تیرِ نظر میں ظالم   آہ میں بھی وہی تاثیر نظر آتی ہے

دیکھ کیا دردِ محبت کی خوش انجامی ہے   دونوں عالم میں مرا نام تم ناکامی ہے
شہرتِ حسن کا باعث مری بدنامی ہے   اُف وہ رسوائی کہ توقیر نظر آتی ہے

میر انیس کی نفسیاتی غلطیاں

(از سید مظفر برنی صاحب متعلم، ایم۔ اے)

اُردو شاعری میں میر انیس اسی مرتبہ کے مالک ہیں جو انگریزی ادب میں شیکسپیر کو حاصل ہے جس نے انسانی فطرت کے اساسی نکات اور نفسیات بشری کے مخفی رموز بے نقاب کئے، بقول اقبالؒ ؎

حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا　　راز داں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

ہماری شاعری کا تمام تر سرمایہ انسانی احساسات و جذبات کی ترجمانی ہے۔ لیکن اس لحاظ سے مرثیہ تمام اصنافِ سخن پر بھاری ہے۔ غزل ایک محدود و مخصوص طبقہ کے جذبات کی آئینہ دار ہے، مثنوی میں کہیں کہیں انسانی فطرت اُجاگر کی جاتی ہے لیکن قصہ کی جاذبیت اور افسانویت پر کردار نگاری قربان کردی جاتی ہے، مزید براں ایک طلسمی دنیا میں مافوق الفطرت ہستیاں پیش کرنے کے بعد فطرت نگاری کی ذمہ داری کسی قدر کم ہو جاتی ہے۔ بلکہ شاعر کو بے اعتدالی کے لئے ایک وسیع میدان ہاتھ آجاتا ہے۔ وہ ایک طور پر آزاد ہوتا ہے کہ ناممکن ہی نا ممکن بلکہ متضاد باتیں بھی افراد کے کیرکٹر میں پیش کرسکے۔ گل بکاؤلی کے کیرکٹر کا تانا بانا ایسے ہی سیمیائی تاروں سے بُنا گیا ہے۔ قصیدہ سراسر طلسمِ الفاظ ہے، اس میں جذبات و احساسات کو دخل ہی نہیں، پُر شکوہ الفاظ، شاندار تراکیب، سنگلاخ زمینیں، صنائع و بدائع اقلیدس کی اشکال کی طرح حقیقی شاعری سے کوسوں دور ہیں۔ مرثیہ اور خصوصاً میر انیس کے مراثی، گوناگوں جذبات اور بوقلموں احساسات کی اچھوتی تصویروں کے مرقع ہیں۔ میر انیس انسانی فطرت کے زبردست نباض ہیں، یہی وجہ ہے کہ میں انھیں اُردو کا شیکسپیر کہتا ہوں۔

مولانا شبلی پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے میر انیس کو قعرِ گمنامی سے نکالا اور مرزا دبیر سے موازنہ کی روشنی میں ان کی شاعری کی مابہ الامتیاز خصوصیات پیش کیں۔ اس کے بعد جوہرِ انیس " "شاہکارِ انیس" "حیاتِ انیس" اور مختلف جرائد و رسائل میں بے شمار مضامین شائع ہوتے رہے لیکن میر انیس کی خامیوں پر بہت کم حضرات نے قلم اٹھایا ہے۔ عبد الغفور نساخ نے ایک مختصر سے رسالہ میں میر انیس کی فنی و لسانی غلطیاں جمع کی تھیں جن کا حوالہ اور بعض کے جوابات مولانا شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر میں دیئے ہیں۔ بعد ازاں مولانائے موصوف کی اس گراں قدر لیکن یک طرفہ (ایک نقاد کا قول ہے کہ شبلی نے انیس کے معائب کو بھی محاسن گردانا ہے،) تصنیف کے جواب میں چودھری نظیر الحسن صاحب فوق رضوی نے "المیزان" لکھی اور مولانا شبلی کے ہدفِ تنقیص مرزا دبیر کو اپنا ہیرو قرار دیا۔ اس میں ضمناً میر صاحب کی لغزشوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ لیکن میر صاحب کی نفسیاتی

غلطیوں پر کسی صاحب قلم نے توجہ نہ کی۔ اس لحاظ سے مضمون زیرِ نظر ایک نیا نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ ممکن ہے میری اس عبارت سے بعض حضرات کے جذبۂ عقیدت کو ٹھیس لگے لیکن میں ادب میں صحیح اور بے لاگ تنقید کو عقیدت مندی اور باطل پرستی پر ترجیح دیتا ہوں۔

میں شیکسپیر کو بھی خدائے نفسیات نہیں مانتا، اس کے ہاں بھی نفسیاتی خامیاں ہیں، لیکن ان کی پردہ پوشی اسٹیج کی پابندیوں اور مسودات کی عدم صحت سے ہو جاتی ہے۔ نفسِ مضمون شروع کرنے سے پہلے چند معتقدات اور مسلمات بیان کرنے ضروری ہیں، جن کی وجہ سے مختلف بدعنوانیاں پیدا ہوئیں۔ اول مرثیہ نگاری کا مقصد اولین بَین وُبکا اور رقت کی ترغیب دینا تھا، میر صاحب اپنے شاہکاروں کی اصل قدردانی اشکباری اور آہ و زاری کو خیال کرتے ہیں:۔

ہر چشم سے اشکوں کی روانی ہو جائے — مقبول مری مرثیہ خوانی ہو جائے
نفل جاری سے ہوں وہ آنسو جاری — ساون کی گھٹا شرم سے پانی ہو جائے

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "صف ماتم" مستقل طور سے بچھ گئی" "سینہ کوبی" "اشک ریزی" "گریباں دری" "سر پہ خاک ڈالنا" وغیرہ عاداتِ ثانیہ بن گئیں، بات بات پر اور جا بجا "بچشم تر" "رو کر کہا" وغیرہ غیر ضروری اور غیر فطری جملوں کا استعمال ہونے لگا۔ بعض دفعہ یہ باتیں واقعیت اور ممکنات کی حدود سے بھی نکل جاتی ہیں۔ مثلاً حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے سلسلہ میں اہلِ بیت کے شور و شیون کا نقشہ کھینچتے اور لکھتے ہیں:۔

اور تھیں پسِ جنازۂ آقائے خوش سیر — ازواج و خادماتِ محل سب برہنہ سر

جنازہ کے ساتھ ساتھ "ازواج" کا برہنہ سر چلنا تصور میں بھی آ سکتا ہے؟ علاوہ ازیں غم و الم کے اس غیر مخلصانہ اظہار اور شور و شین کے اس مصنوعی طریقہ کو افرادِ مرثیہ کے اس اعلیٰ و ارفع کردار سے دُور کی بھی نسبت نہیں ہو سکتی جس کی پوری پوری جھلک میر صاحب کے ہر مرثیہ میں نظر آتی ہے۔ اسی طرح ایک جگہ زعفر جن کی زبان سے ادا کرایا ہے ؎

پوشاک سیہ لا کے مجھے جلد پنھاؤ — سب ہائے حسینا کہو اور خاک اُڑاؤ

ظاہر ہے کہ اصلی غم کی حالت میں پوشاک کی نوعیت کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ یہ سب باتیں مصنوعی اداکار کے گُر ہوں تو ہوں فطری کیفیت کا نقشہ ہرگز نہیں۔ لیکن ایسی تمام غلطیاں مقصدِ مرثیہ نگاری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جائز قرار دی گئی ہیں۔

دوم۔ شاعر اپنے عندیہ کے مطابق حضرت امام حسین اور ان کے رفقاء کو عالم الغیب اور مافوق البشر اوصاف سے متصف خیال کرتا ہے۔ لیکن کبھی انھیں انسان اور محض انسان کے پیکر میں جلوہ گر دیکھتا ہے

کہیں افراد مرثیہ عام دنیاوی انسانوں سے صد درجہ بلند و بالا نظر آتے ہیں اور کہیں گوشت پوست کے انسان، بہ لحاظ عادات و اطوار، افعال و خیالات، انسان معلوم ہوتے ہیں۔ اس دورنگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقی اور گہری نفسیات نگاری کے نقوش مدھم پڑ گئے۔ میر صاحب کا جذبۂ باطل پرستی اور غلبۂ عقیدت بڑی حد تک اُن کے فن میں مانع ثابت ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ تقریباً ہر جگہ فریقین مخالف کے جذبات و خیالات کی عکاسی اُس بے باکانہ صداقت اور فن کارانہ واقعیت سے نہ کر سکے جو نفسیات نگاری کا پہلا اور ناگزیر تقاضا تھا۔ صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ ایک مرثیہ میں میدانِ جنگ میں حضرت عون و محمد کی آمد پر لشکرِ باطل کی جذبات نگاری یوں فرمائی ہے

ہنس کے یہ نوج نے تب سعد کے بیٹے سے کہا کس طرف دھیان ہے؟ دونوں کو تو سمجھا ہے کیا؟
کہیں روباہوں نے شیروں کو بھی ہے قید کیا کبھی لشکر میں علی قید ہوئے بھی ہیں؟ بتا!

یہ بنی فاطمہ ہیں، لڑتے ہیں مر جاتے ہیں
پسرِ شیرِ الٰہی کہیں ہاتھ آتے ہیں

صاف بات ہے کہ اگر دشمن کے دل میں وہ احساس پیدا ہو جائے جو یہاں دکھایا گیا ہے تو پھر جنگ کی خونخواری اور لعینوں کی سفاکی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔ یہاں عقیدے نے میر صاحب کو صداقت شعاری سے باز رکھا۔ میر صاحب دُنیا کے اُن عظیم ادبا و شعرا میں سے نہ تھے جو فن کو عقیدے پر فوقیت دیتے ہیں۔ شاعر یا ادیب کے لئے نازک مرحلہ ہوتا ہے جب وہ دو فریقوں کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے لیکن اسکی ہمدردیاں ان میں سے ایک فریق سے وابستہ ہوتی ہیں۔ اس صورت میں دوسرے فریق کے جذبات اور نفسیات کو ایک صد درجہ غیر جانبدارانہ اور بے لاگ صداقت و واقعیت سے پیش کرنا فن کاری کا حقیقی کمال ہے۔ نفسیات نگار کو عقائد و عواطف و امیال کی عینک اُتار دینا چاہیئے۔

سوم۔ مرثیہ خواں اور سامعینِ مجالس کربلا کے واقعات اور حالات سے بخوبی واقف تھے۔ بعض دفعہ میر صاحب افرادِ مرثیہ کو بھی آنے والے واقعات سے باخبر فرض کر لیتے ہیں۔ اس کی توجیہ یوں کی جا سکتی ہے کہ یہ انسانی جبلّت کا ایک کرشمہ ہے کہ انسان کو آنے والے واقعات کا علم پہلے سے ہو جاتا ہے۔ انگریزی کی مثل ہے

"Coming events cast their shadows before."

اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ حضرات صاحبِ باطن اور مافوق البشر ہستیاں تھے۔ لہذا مستقبل کا علم ہو جانا بعید از قیاس بھی نہیں۔ چونکہ یہ پہلو بھی عام انسانی فطرت (Normal Human Psychology) کے دائرے سے باہر ہے، لہذا میں نے اسے بھی مستثنیات میں سے قرار دیا ہے۔

یہ چند ایسی مجبوریاں تھیں جن کی وجہ سے بہت سی غلطیاں سرزد ہوئیں، لہذا میں نے مندرجہ بالا تقسیم

کی تمام خامیوں کو نظرانداز کر دیا ہے، اور صرف ان کو پیش کرتا ہوں جن کے لئے کوئی صورت جواز ممکن نہیں۔

نفسیاتی غلطی کی تشریح کر دینا ضروری ہے۔ پہلی قسم کی نفسیاتی غلطی تو وہ ہوگی جہاں بنیادی نفسیاتی اصولوں یا انسانی فطرت کے اساسی پہلوؤں سے انحراف ہو۔ کوئی ذہین شاعر جس کے خلاقانہ جوہر کی مدد نفسیاتِ انسانی کی تنگ و تار وادیوں میں یہ نکلے اس قسم کی غلطی نہیں کر سکتا۔ نفسیاتی غلطی کی دوسری قسم وہ ہے جہاں جذبات و احساسات یا اعمال و افعال اقتضائے حال کے خلاف ہوں، یہ جذبات و احساسات یا اعمال و افعال اصولاً تو فطرت انسانی کی بیخ کنی نہیں کرتے، البتہ حالات اور موقع و محل کے لحاظ سے غیر فطری نظر آتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی انگریز عورت کے شوہر کی وفات پر اُس کے جذباتِ غم و الم کی عکاسی یوں کی جائے کہ اُس نے اپنی چوڑیاں توڑ ڈالیں، بال کھول ڈالے، سفید لباس پہن لیا، وغیرہ وغیرہ، تو کس قدر غیر فطری معلوم ہوگا، لیکن یہی سب کچھ اگر ہندوستانی عورت سے متعلق ہو تو ہمیں مصنف کی فطرت نگاری اور صداقت شعاری کی داد دینا پڑتی ہے۔ میر صاحب کی تمام نفسیاتی غلطیاں اسی قسم کی ہیں۔

اب میر انیس کی چند نفسیاتی غلطیاں پیش کرتا ہوں، ایک مرثیہ ع

"جب حضرتِ زینب کے پسر مر گئے دونوں"

سے شروع ہوتا ہے، اس میں حضرت قاسم کی شہادت کے بعد گھر کی بیبیوں پر غم و اندوہ کے اثرات کی نقاشی کرتے ہیں، نازک وقت وہ ہے جب زوجۂ قاسم (جو ایک شب کی بیاہی تھیں) کی جذبات نگاری کرتے ہیں:

زانو پہ جھکا جاتا تھا سر شرم کے مارے | سینے سے نکل جاتے تھے آہوں کے شرارے
وہ کہتی تھی اب ناک سے نتھ کوئی اُتارے | رو رو کے سکینہ سے یہ کرتی تھی اشارے
اس ناشس کے جوڑے کو کوئی آگ لگا دو
سادے جو ہوں کپڑے وہ مجھے لاکے پنھا دو

کھولو اسے، کنگنے سے بس اب ہاتھ اُٹھایا | کیوں ہائے یہ کنگنا مجھے اماں نے پنھایا؟
بیٹی کو رنڈاپے کی مصیبت میں پھنسایا | کیا ان کا بگاڑا جو دُلہن مجھ کو بنایا؟
مر جانے کی رخصت کے طلبگار ہیں مجھ سے
سونپا تھا جنھیں وہ بھی تو بیزار ہیں مجھ سے

یہاں چودھری نظیر الحسن صاحب فوق رضوی مصنف "المیزان" کا اعتراض ہے کہ اگر مولانا شبلی مرزا دبیر کے اس بین پر، جو انھوں نے حضرت علی اکبر کی شہادت پر بادشاہ حلب کی بیٹی سے "دولھا" کہہ کر کرایا ہے جفا

اُٹھتے ہیں، تو میر انیس اس سے بھی زیادہ غیر فطری اور حیا سوز الفاظ زوجۂ قاسم کی زبان سے ادا کراتے ہیں، لیکن نقاد موصوف سے فرو گذاشت ہو گئی، میر صاحب نے ایک خوبصورت اور جامع تمہید کے بعد یہ مضمون ادا کیا ہے اور اسی تمہید سے کسی قدر محفوظ ہیں کہ انھوں نے کہیں یہ نہ کہا کہ یہ الفاظ یا جملے اُن کی زبان سے ادا ہوئے بلکہ کہتے ہیں ع

"رو رو کے سکینہ سے یہ کرتی تھی اشارے"

لفظ "اشارے" نے میر صاحب کی اس فاش غلطی کا پردہ رکھ لیا۔ مانا کہ ایک مشرقی نئی نویلی دُلہن سے اس قسم کے حیا سوز (مشرقی ماحول و تمدن کے نقطۂ نظر سے) جملے نہ کہلائے جائیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ میر صاحب جس تحت الشعوری نفسیاتی رَو کی عکاسی کرنا چاہتے ہیں وہ غیر فطری ہے۔ اول تو اس ماحول میں اس قسم کے جذبات پیدا ہونے ناممکن ہیں، دوسرے ماحول سے قطع نظر انسانی فطرت کے بھی خلاف ہیں۔ ایک ایسے زبردست سانحہ کے بعد ایک نوعروس کے دل میں اس قسم کے جذبات و خیالات نہیں پیدا ہو سکتے کہ

"کیا ان کا بگاڑا جو دُلھن مجھ کو بنایا"

"بیٹی کو رنڈاپے کی مصیبت میں پھنسایا"

بیٹی پر خاص زور دیا ہے۔

ایک مرثیہ (ع آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی) میں حضرت عباس کی شہادت کے بعد میر صاحب نے اپنے مخصوص طرز میں ہر فرد کے تاثرات و جذبات پر روشنی ڈالی ہے۔ حضرت زوجۂ عباس "علم کے نیچے" کھڑے ہو کر حضرت زینب حضرت امام حسین وغیرہ سب کے سامنے کہتی ہیں ؎

ہائے کہ تھا یہ آج کی شب تک ہمارا پیار ۔۔۔ اُٹھ اُٹھ کے دیکھتے تھے مرے منھ کو بار بار

میں کہتی تھی کہ سو رہو اک آن میں نثار ۔۔۔ کہتے تھے رو کے اب یہی صحبت ہے یادگار

فرصت میں وصل کی سحر و شام پھر کہاں

سونا تو حشر تک ہے یہ آرام پھر کہاں

فرائیڈ[1] کا مشہور عالم نظریۂ جنسیت ایک لمحہ کے لئے سرنگوں ہو جاتا، لیکن میر صاحب کے تقدس مآب سحر کار قلم کو کہاں قرار تھا، مشرقی تمدن اور صنفِ لطیف کے حیا و حجاب کا تصور کیجئے اس کے بعد موقعہ کی اہم آرزی اور مخاطب ہستیوں کی بزرگی اور قرابت داری کو ذہن میں لائیے اور پھر ان کے بالمقابل میر صاحب کی پیش کردہ تصویر رکھیئے۔ اگر ہم مرثیہ گو کو کردار نگاری کے اہم فرض سے بے نیاز بھی فرض کر لیں تب بھی علم کے نیچے حضرت

---

[1] Psyoks analysis. of Freud

ذوجۂ عباس کی زبان سے یہ الفاظ نہیں سُن سکتے بلکہ فطرت بھی کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی ہے۔

ایک مرثیہ میں حضرت عباس کو عَلَم ملنے کا ذکر کرتے ہیں :-

ناگاہ آکے بالی سکینہ نے یہ کہا — کیسا ہے یہ ہجوم؟ کدھر ہیں مرے چچا؟
عہدہ عَلَم کا اُن کو مبارک کرے خدا — لوگو! مجھے بلائیں تو لینے دو اک ذرا!
شوکت خدا بڑھائے مرے عمّو جان کی
مَیں بھی تو دیکھوں شان علی کے نشان کی

عباس مُسکرا کے پکارے کہ آؤ! آؤ! — عمّو نثار، پیاس سے کیا حال ہے بتاؤ
بولی لپٹ کے وہ کہ مری مشک لیتے جاؤ — اب تو عَلَم ملا تمھیں، پانی مجھے پلاؤ
تحفہ کوئی نہ دیجے نہ انعام دیجئے
قربان جاؤں، پانی کا اِک جام دیجئے

قاعدہ ہے کہ خوشی کے وقت بچوں کو ان کی تکلیف یاد نہیں دلاتے، مرہم لینے جاتے ہیں تو سوزشِ زخم کا ذکر نہیں کرتے، حضرت عباس بچوں کے نفسیات کے قطعاً برعکس عمل کرتے ہیں۔ ہاں جب حضرت سکینہ خود بیتاب ہو کر کہتیں ع "اب تو عَلَم ملا تمھیں، پانی ہمیں پلاؤ"۔ اُس وقت حضرت عباس کا اظہار ہمدردی و محبت لازمی اور فطری تھا۔

ایک مرثیہ میں حضرت زینب حضرت علی اکبر سے جبکہ وہ میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت لینے آتے ہیں کہتی ہیں ؎

مادر سے رضا جنگ کی لینے کو نہ آئے — بیٹوں کا بھی پُرسا ہمیں دینے کو نہ آئے

گھر کا گھر تباہ ہو جانے اور خصوصاً اپنے جگر گوشوں کی قیامت خیز شہادت کے بعد ایک پھوپھی کو یہ کہاں ہوش رہتا ہے کہ وہ اپنے بھتیجے سے اور اُس بھتیجے سے جسے خود پالا پوسا ہو طنزاً اور شکایت بھرے لہجہ میں گفتگو کرے ع "بیٹوں کا بھی پُرسا ہمیں دینے کو نہ آئے" میں کس قدر تکلف تصنع اور غیریت پائی جاتی ہے، اور یہ حقیقی محبت اور سچی فطرت نگاری سے کس قدر دور ہے، بعض جگہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب نفسیاتِ نگاری سے جی چُراتے ہیں، اور بہ لطائف الحیل اس خطرناک مرحلہ سے گذر جانا چاہتے ہیں۔ ایک مرثیہ (ع جب بادبانِ کشتیِ شاہِ اُمم گرا) میں لشکرِ باطل حضرت امام حسین سے یوں خطاب کرتا ہے ؎

دشوار ہے اگر غمِ فرزندِ نوجواں — مرنے کو آپ آئیے! اے قبلۂ زماں!

مشتاق تیر ہیں تبر و خنجر و سناں　جاں اپنی دیجئے جو ہے پیاری پسر کی جاں
اصغر سے کچھ غرض ہے نہ اکبر سے کام ہے
ہم کو تو آپ کے سرِ انور سے کام ہے

حضرت نے مسکرا کے نظر کی سوئے پسر　نعلینِ عرش جاہ پہ جھکایا پسر نے سر
فرمایا کیا ارادہ ہے اے غیرتِ قمر!　کی عرض اذن دیجئے یا شاہِ بحر و بر!
عباس کے فراق نے مارا غلام کو
بس اب نہیں ہے صبر کا یارا غلام کو

شہ نے کہا خوشی ہے بہر حال خاکسار　تم سے جو سَو پسر ہوں تو اس راہ میں نثار

نہ صرف یہ کہ یہاں حضرت امام حسین کا کیرکٹر گرا جا رہا ہے، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب ان جذبات کو بیان کرتے کرتے اُکتا گئے ہیں، اور اب واقعات پر صرف ایک سرسری نظر ڈال کر پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں تاکہ حضرت علی اکبر کی شہادت جلد از جلد سامعین کو اشکباری کے نیک کام میں مصروف کر دے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ بعض و فرمیانہ محبت اور فرزندانہ سعادت کا وہ نقشہ کھینچا ہے کہ داد سے مستغنی ہے۔

میر صاحب اکثر ربطِ کلام کا خیال نہیں رکھتے۔ ایک مرثیہ میں حضرت امام حسین کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

اس وقت شہِ دیں نے سُنی زاریِ خواہر　جس وقت کہ تھا حلقِ مبارک تہِ خنجر
فرمایا اشارے سے کہ اے شمرِ ستمگر　زینب نکل آئی ہے ٹھہر جا ذرا دم بھر
آخر تو سفر ہوتا ہے اس دارِ محن سے
دو باتیں تو کر لینے دے بھائی کو بہن سے

چنانچہ منھ پھیر لیا شمر نے خنجر کو ہٹا کے　دی شاہ نے زینب کو صدا اشک بہا کے

اور اس کے بعد ؎

دوڑی یہ صدا سُن کے یداللہ کی جائی　چلائی کہ دیدار تو میں دیکھ لوں بھائی
پر ہائے بہن بھائی تلک آنے نہ پائی　یاں ہو گئی سید کے تن و سر میں جدائی
قاتل کو نہ گردن کو نہ شمشیر کو دیکھا
بیوہ بہن تو سناں پر سرِ شبیر کو دیکھا

لیکن میر صاحب یہ بھول گئے کہ حضرت امام حسین کے ارشاد کے بعد ع

منہ پھیر لیا شمر نے خنجر کو ہٹا کے

ایک مرثیہ (جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے) میں صبح کا وہ شاندار منظر پیش کیا ہے کہ صبحِ کشمیر بھی شرمائے ؎

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور | دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور | وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوانِ طیور
گلشن خجل تھے وادیِ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک | شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریِ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک | ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

اُسی روز دوپہر کو وہ منظر کتنا بدل جاتا ہے ؎

کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار | ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار
ہنستا تھا کوئی گل نہ مہکتا تھا سبزہ زار | کانٹا ہوئی تھی پھول کی ہر شاخ بار دار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

اگرچہ مقام وہی ہے جو صبح بہار کی جان معلوم ہوتا تھا، لیکن چند گھنٹے گذرنے کے بعد پومپائی (Pompeii) کا یا فتحپور سیکری کے تباہ شدہ کھنڈرات کا منظر بدنما پیش کرتا ہے۔

میر صاحب کے اکثر مراثی کے مقاماتِ گریز نہایت غیر فطری ہیں۔ ایک مرثیہ میں حضرت علی اصغر کی تصویر دکھانا مقصود ہے، حضرت امام حسین لعینوں سے حضرت اصغر کی پیاس کی شدت بیان کرتے ہیں، اُس کا جواب ملتا ہے ؎

بڑھ کر بنِ کاہل نے کہا اے شہِ والا | اکبر کو تو دیکھا اسے میں نے نہیں دیکھا
دکھلاؤ تو اصغر کا مجھے چاند سا چہرا | سنتا ہوں کہ ہم صورتِ حیدر ہے بچارا
حاصل ہوئی اکبر سے پیمبر کی زیارت
باقی ہے مگر حیدرِ صفدر کی زیارت

یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ کہ حضرت امام حسین کی معصومیت سادہ لوحی اور بھولا پن ثابت کر لیجئے تاہم یہ طریقہ کار غیر فطری ہے سب سے زیادہ دل کش مرحلہ حضرت امام حسین کی شہادت کا ہے یہاں عقیدہ، واقعہ نگاری سے دست و گریباں ہوتا ہے۔ میر صاحب حضرت امام حسین کو مبارزت کی پیچیدہ راہوں سے منزلِ شہادت تک لاتے ہیں اور تب کہیں ہاتفِ غیبی کی ندا "یہ وہ گردوں سے صدا" حضرت محمد صلعم یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی صدا آنے کے بعد حضرت امام حسین جنگ سے ہاتھ اُٹھاتے ہیں اور شمر لعین کو سر اُڑانے کا موقع دیتے ہیں، یہ طریقہ بہت ہی غیر فطری ہے۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ میر انیس کی ایک نمایاں خصوصیت حفظِ مراتب کا احساس ہے لیکن یہ بھی کچھ نہیں، حضرت امام حسین قریب ترین عزیزوں اور قرابت داروں میں اس قدر ممتاز نظر آتے ہیں کہ خاندانی یگانگت اور عزیز داری کے مدارج باقی ہی نہیں رہتے۔ حضرت عباس امام موصوف کے بھائی نہیں معلوم ہوتے بلکہ وہ خود اپنی زبان سے کہتے ہیں:۔ ع عباس بولے بھائی نہیں ہیں تو ہوں غلام

علاوہ ازیں حضرت زینب کے علاوہ حضرت کلثوم بھی آپ کی ہمشیر تھیں لیکن انھیں ہمیشہ پس پردہ رکھا۔ گو میر انیس کا مشاہدہ نہایت باریک اور گہرا تھا تاہم کہیں کہیں سمندِ فکر ایسا عناں گسیختہ نظر آتا ہے کہ واقعیت و اصلیت مشاہدات کے پیچھے رہ جاتی ہے، مثلاً ایک مرثیہ میں حضرت مسلم کے کم سِن صاحبزادوں کی بابت لکھتے ہیں:۔

ماتھوں سے آشکار نشانِ سجود تھے بے رحم کے طمانچوں سے عارض کبود تھے

ایسی کم سنی میں پیشانی پر سجدہ کا نشان نہ دیکھا نہ سنا۔

میر انیس کے حق میں حد درجہ بے انصافی ہوگی۔ اگر آخر میں یہ عرض نہ کر دوں کہ میری تنقید و تحقیق شاعر کے مخصوص معیار اور اصلی نصب العین سے ذرا لگا نہیں کھاتی۔ اس لئے کہ میر انیس نے کبھی نباضِ فطرت اور ماہر نفسیات ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ بلکہ ان کا بلند ترین نصب العین تو یہ تھا ؎

اے شمع قلم! روشنی طور دکھا دے اے لوح! تجلی رخِ حور دکھا دے
اے بحرِ طبیعت! گہرِ نور دکھا دے اے شاہدِ معنی! رخِ مستور دکھا دے

بزمِ غمِ شبیر میں وہ جلوہ گری ہو
خورشید جہاں تاب چراغِ سحری ہو

مانی کو بھی حیرت ہو وہ نقشا نظر آئے بہتا ہوا اک نور کا دریا نظر آئے
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آئے سب بزم کو حیدر کا سراپا نظر آئے

مہتاب تو کیا ہے، رخِ خورشید بھی فق ہو
ہر بند پہ تصویر تجلی کا ورق ہو

آئینۂ حیات

(از پروفیسر حامد اللہ افسر میرٹھی)

جنکو ہر حالت میں خوش اور شاداں پاتا ہوں میں
اُن کے گلشن میں بہارِ بے خزاں پاتا ہوں میں

اللہ اللہ موجزن ہے کس قدر بحرِ حیات
دل میں ہر قطرہ کے رقصاں اک جہاں پاتا ہوں میں

کچھ تو بتلا کیا مآلِ علم و حکمت ہے یہی
زنگ آلودہ تری دانائیاں پاتا ہوں میں

کیا ترقی پر لگائیں گی وہ ملک و قوم کو
گھر کی جانب سے جو بے پروائیاں پاتا ہوں میں

جن کو آجاتا ہے اس دنیا میں خوش رہنے کا فن
شاخ پر طوبیٰ کی اُن کا آشیاں پاتا ہوں میں

جو نئی قدروں کے دلدادہ ہیں اُنکے دل میں بھی
نقش ہائے رہروانِ باستاں پاتا ہوں میں

وہم ماضی کو بدلتے ہیں جو وہمِ حال سے
جاگزیں اُن کی بہاروں میں خزاں پاتا ہوں میں

بھیجتے ہیں لعنتیں جو اہلِ زر پر خود اُنھیں
اہلِ زر کے در پہ خم مثلِ کماں پاتا ہوں میں

وعظ کہتے ہیں محبت کے مودّت کے جو روز
گھر میں خود اپنے اُنھیں چنگیز خاں پاتا ہوں میں

دیکھتا ہوں کوچہ ہائے معصیت میں گھومتے
بر سرِ منبر جنھیں رطب اللساں پاتا ہوں میں

ہیں وہ خود آگاہ بھی دنیا میں حق آگاہ بھی
جن کو ہر حالت میں ہر دم شادماں پاتا ہوں میں

صبح کی منزل کا تاروں سے پتہ کیا پوچھنا
ظلمتِ شب کارواں در کارواں پاتا ہوں میں

چاند کے اُس پار سورج سے اُدھر تاروں سے دور
رقص کرتے روز و شب لاکھوں جہاں پاتا ہوں میں

کس قدر افسانہ خوانی کو ہے اے افسر فروغ
آج کل ہر میز پر "پرچھائیاں"[1] پاتا ہوں میں

---

[1] افسانوں کی ایک کتاب کا نام ہے

ناخواندگی

(از ڈاکٹر ایم۔ حفیظ۔ سید۔ پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ)

ایشیائی ممالک میں اعلیٰ تعلیم کا وجود ضرور تھا مگر اس کی وسعت ایک خاص طبقہ تک محدود تھی برخلاف اس کے یورپین ممالک میں تعلیم عام اور خاص دونوں ہی طبقوں میں رائج تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان مغربی ممالک میں جمہوریت اور ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ اشتراکیت اور اشتمالیت کا نیا دور شروع ہو گیا ان سب اداروں کی کامیابی اور ترقی کا راز صرف ایک لفظ تعلیم میں مضمر تھا۔ سب سے پہلے تعلیم کو عام کرنے کا سہرا مشنریوں کے سر باندھا گیا۔ انھوں نے حتی الوسع تعلیم کو پھیلانے میں بیحد کوشش کی۔ اس کے بعد ہر ملک کی گورنمنٹ نے اس طرف خاص توجہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً ہر مغربی ملک میں کم سے کم سترہ اسی فی صدی پڑھے لکھے لوگ پیدا ہو گئے۔ بعض میں کم بعض میں زیادہ۔ بعض ایسے ممالک بھی ہیں جہاں ۹۰ یا ۹۵ فیصدی لوگ پڑھے لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کے تسلط سے پہلے حسب دستور مشنریوں نے تعلیم کا اجرا شروع کیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ نے ہمارے ملک میں ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کے لئے ہر قسم کے مدرسے اور ادارے قائم کئے۔ لیکن برطانیہ کی دو سو برس کی سلطنت کے باوجود بھی ہمارے ملک میں سات یا آٹھ فیصدی سے زیادہ پڑھے لکھے افراد نہ ملیں گے بعض بعض صوبوں میں اس سے بھی کم تعداد ملے گی۔

ہندوستان میں جس قدر سیاسی بیداری اور معاشری ترقی نظر آتی ہے یہ سب محض تعلیم کے پھیلاؤ کا نتیجہ ہے۔ یو۔پی کی پنج سالہ رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے صوبہ کی گورنمنٹ نے عام تعلیم کی اشاعت میں عوام کو حرف شناس بنانے ان میں نوشت و خواند کی قابلیت پیدا کرنے میں کافی دلچسپی لی ہے اور اس مسئلہ کی طرف پوری توجہ کی ہے۔ توسیع تعلیم کا ایک محکمہ ایجوکیشن سروس کے ایک اعلیٰ عہدہ دار کی نگرانی میں قائم کیا گیا ہے تقریباً دو ہزار مدرسے بالغوں کی تعلیم کے لئے کھولے گئے اور ڈیڑھ ہزار کتب خانے، اور تین ہزار چھ سو ریڈنگ روم (مطالعہ کے کمرے) اس پانچ سال کے عرصہ میں جاری کئے گئے۔ اب تک ساڑھے چھ لاکھ بالغوں کو حرف شناس بنایا گیا اور تین لاکھ سے زیادہ لوگوں کو اس قابل بنایا گیا کہ وہ اپنا نام لکھ سکیں ہمارے صوبہ کی گورنمنٹ ہر سال اس محکمے کے اخراجات کے لئے چھ لاکھ روپیہ سالانہ صرف کرتی ہے مگر یہ رقم ناکافی ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ گورنمنٹ کی کوششوں کے دوش بدوش پرائیویٹ ایجنسیاں

بھی اس کے پرچار میں مدد کرتی ہیں۔
جنگ کے زمانہ میں ہندوستانی فوج کے سپاہیوں کو تھوڑا لکھنا پڑھنا اس لئے سکھایا جاتا ہے کہ وہ جنگ کے قاعدے اور قانون کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور افسر بالادست کی ہدایات پر عمل کر سکیں۔ اسی طرح صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لئے ایسے کاریگروں کی ضرورت محسوس ہوئی جو کچھ لکھ پڑھ سکتے ہوں کیونکہ بغیر حرف شناس ہوئے ان پڑھ کاریگر اپنے خاص فن اور حرفہ میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ زمانہ کی ضروریات کے مطابق گورنمنٹ کو بھی مجبوراً تعلیم عام کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس طرح ہمارے ملک کے سیاسی لیڈروں اور مصلحان قوم کو بھی یہ کمی شدید محسوس ہوئی، کیونکہ بغیر عام تعلیم کا اجرا کئے ہوئے سوراج یا سلطنت خود انتظامی کے حصول میں پوری کامیابی نہیں ہو سکتی۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ چند سال قبل جب کونسل کے انتخاب در پیش تھے تو جاہلوں کو یہ کہہ کر ووٹ دیتے تھے کہ ہم لوگ گاندھی جی کو ممبر بنانے جاتے ہیں۔ ان کو یہ بھی نہ معلوم تھا کہ وہ کس کو ووٹ دے کر ممبر بنانا چاہتے ہیں۔ ایسی جہالت کی حالت میں نہ گورنمنٹ اپنی اسکیموں کو کامیاب بنا سکتی ہے اور نہ سیاسی آزادی کے خواستگار اپنے منصوبوں میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کیا جائے اور کس طرح تعلیم یا تعلیم کی اشاعت کی جائے اور عوام الناس میں کس طرح لکھنے پڑھنے کا تھوڑا سا شوق پیدا کیا جائے۔ جہاں تک گورنمنٹ کا تعلق ہے ہم کو اس سے زیادہ توقع نہ رکھنی چاہیئے اس لئے کہ گورنمنٹ ملک کی آمدنی کا معتد بہ حصہ ملک کی حفاظت اور جنگی سامان کی تیاری میں صرف کرتی ہے۔ ابھی تک تو یہ ہوتا رہا ہے کہ آبکاری کی آمدنی تعلیم کے صیغہ پر صرف کی جاتی تھی اور بس۔ گورنمنٹ اور ملک دونوں کو اس کا پورا تجربہ ہو گیا کہ ان کے باہمی اداروں، محکموں اور اسکیموں کو ترقی دینے میں اس وقت تک کامیابی نہیں ہو سکتی جب تک تعلیم عام نہ کی جائے۔ اس کی مثالیں اوپر دی جا چکی ہیں۔

جن صوبوں میں توسیع تعلیم کا محکمہ کانگریس حکومت کے زمانہ میں قائم کر دیا گیا تھا اور جو اب تک بعض صوبوں میں قائم ہے اس کو اور زیادہ ترقی اور توسیع دینا چاہیئے بجائے چھ لاکھ سالانہ کے کم سے کم پچیس تیس لاکھ سالانہ اس پر صرف کرنا ضروری ہے۔ ملک کے عام بہی خواہوں اور ہمدردوں کا فرض ہے کہ وہ ہر امکانی کوشش کام میں لا کر عوام کو حرف شناس بنائیں، اور جہالت کے غار سے ان کو نکالیں۔ صباحی اور مسائی مدارس جاری کریں جو لوگ پنشن یافتہ ہیں یا کھاتے پیتے خوشحال ہیں، اور کافی وقت رکھتے ہیں انھیں چاہیئے کہ وہ اپنے وقت کا ایک حصہ اپنے بھائیوں کو پڑھانے لکھانے میں صرف کریں۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبا کو چاہیئے کہ بجائے لغو، لاطائل کاموں یا فضول مشاغل میں وقت ضائع کرنے کے وہ تھوڑا سا وقت اس قومی تحریک کو ترقی دینے میں صرف کیا کریں، جو لوگ وقت نہیں دے سکتے وہ روپیہ سے مدد کر سکتے ہیں

ہم لوگ ہر چیز میں تقریباً ملک کی تقلید کرتے ہیں، انگلستان کی خوبیوں، اخلاقی اور ترقی ضروریات کی پیروی نہیں کرتے
انگلستان میں خصوصاً جہاں ۹۰ یا ۹۵ فیصدی لوگ پڑھے لکھے ہوتے ہیں وہاں بھی تعلیم بالغان کے ادارہ کو ترقی دینے میں ہر امکانی کوشش سے کام لیا جاتا ہے۔ ہر دلعزیز حضرات بڑے بڑے اور جوان غریب اور امیر اپنا قومی فرض سمجھکر ہر گوشے اور قصبے میں بالغوں کی تعلیم کے لئے درسگاہیں جاری کرتے ہیں۔ نیز یہاں ان بالغوں کو جو محض ابتدائی تعلیم حاصل کرکے کاروبار میں مصروف ہوگئے اور جن کی ذہنی تربیت کا سلسلہ بند ہوگیا ہے، انھیں دو تین گھنٹے روزانہ صبح یا شام یکجا کرکے مختلف مفید مطلب مضامین پر لکچر دلوائے جاتے ہیں، اور ان میں مطالعہ اور فکر کا ذوق پیدا کیا جاتا ہے۔ ان کے لئے آسان زبان میں حفظان صحت، تاریخ، ادب وغیرہ مضامین پر کتابیں لکھوا کر پڑھنے کے لئے دی جاتی ہیں اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا تو خاص طور سے انتظام کیا جاتا ہے۔

جس طرح گورنمنٹ ملک کی حفاظت کے لئے جنگی اغراض پر ملک کی آمدنی کا معتدبہ حصہ صرف کرتی ہے اور اس کے لئے قرضہ لینے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ اسی طرح گورنمنٹ اور ملک کا فرض ہے کہ جہالت عامہ کا مقابلہ کرنے کے لئے اور اس کی بیخ کنی کے لئے قرض لیکر عام تعلیم کی اشاعت میں روپیہ صرف کرے۔ باضابطہ نظام مدارس کا تقرر کرے۔ اس طرح دس برس کے قلیل عرصہ میں کم سے کم پچاس فیصدی آبادی کا حصہ حرف شناس بنایا جاسکتا ہے۔

تعلیم بالغان کے سلسلہ میں سب سے بڑا مرحلہ جہلا اور بالخصوص دیہاتیوں میں پڑھنے کا شوق پیدا کرنا ہے اس کے لئے بہت سرگرم اور جوشیلے کارکنوں کی ضرورت ہے۔ دیہاتیوں کو ترغیب دینے کے لئے ہندوستان کے مختلف حصوں میں مختلف تدبیریں اختیار کی گئی ہیں۔ احاطۂ مدراس میں حکومت نے خبروں اور دوسرے دلچسپ امور کو گاؤں کی دیواروں پر لکھنا شروع کیا۔ اس طرح ناخواندہ لوگ دیکھ سکتے ہیں کہ خواندہ لوگوں کو ان پر کیا فوقیت حاصل ہے۔ بعض جگہوں پر دیہاتیوں میں مسابقت کرکے ان گاؤں کو جہاں خواندہ لوگوں کی تعداد زیادہ نکلتی ہے یا جہاں لوگ خواندگی سب سے پہلے حاصل کر لیتے ہیں تمغے دیئے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں لوگ کسی ایک گاؤں کے سرپرست بن جاتے ہیں اور اس کے معاملات میں ذاتی دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ لوگ گاؤں میں کتب خانے قائم کرتے ہیں اور اپنے ذاتی اثر اور جد و جہد سے دیہاتیوں میں تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض جگہوں پر حفظان صحت، کاشتکاری اور گاؤں والوں کی دلچسپی کے دوسرے مضامین پر اشتہارات تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اس طرح ناخواندہ لوگوں میں اپنی کمی کا احساس پیدا کیا جاتا ہے۔

کبھی کبھی کارکنان اخباروں اور کتابوں سے خبریں، دلچسپ مضامین اور کہانیاں پڑھکر سناتے ہیں لیکن وہ اس کو ادھورا چھوڑ دیتے ہیں اور بتا دیتے ہیں کہ ان کا بقیہ حصہ کہاں پڑھا جاسکتا ہے۔ پہیلیاں وغیرہ بھی کاغذوں پر لکھی جاتی ہیں۔ پہیلیاں بوجھی جاتی ہیں۔ اگر جواب جس کو دلچسپی ہو خود پڑھے تو سکھ

کوئی طریقہ جس سے خواندگی کے فوائد عملی طور پر دکھائے جا سکیں مفید ثابت ہوتا ہے۔
دیہاتیوں کو یہ بھی بتایا جا سکتا ہے کہ پڑھنے لکھنے سے وہ مہاجن کے رحم و کرم پر نہ رہیں گے بلکہ خود شرائط اور سیدوں کو پڑھ سکیں گے، وہ اپنے فرصت کے اوقات کو مفید طور پر صرف کر سکیں گے، امدنگی سے زیادہ مسرت حاصل کر سکیں گے، وہ اپنے زراعت کے طریقوں کو بہتر بنا سکیں گے، اور اپنی آمدنی کو بڑھا سکیں گے، وہ ایک اچھے شہری بن سکیں گے، اور دنیا کے حالات سے زیادہ واقف ہو سکیں گے، وہ اپنے ووٹ کو زیادہ دانشمندی سے کام میں لا سکیں گے اور اپنے خطوط خود لکھ پڑھ سکیں گے۔ لیکن ان امور کو دیہاتیوں کے ذہن پر مرتسم کرنے کے لئے صرف تقریروں سے کام نہ چلے گا۔ ان کو طرح طرح کے ڈراموں اور کھیلوں سے خواندگی کے فوائد سمجھائے جانے چاہئیں۔

بالغوں کو یہ محسوس نہ ہونا چاہئیے کہ وہ پھر سے اسکول میں داخل کئے جا رہے ہیں، یہ بات ان کو کبھی پسند نہ ہوگی۔ ان کو انفرادی طور پر تعلیم دینا ہمیشہ بہتر ہوگا۔ تجربہ بتاتا ہے کہ بالغوں کو جماعت میں شامل ہوکر تعلیم حاصل کرنا بھلا نہیں معلوم ہوتا۔

کارکنان کو چاہئیے کہ اپنے کام کی ابتدا گرم جوش اور ذہین لوگوں سے کریں۔ اگر ابتدائی بالغ طلبا کامیاب نہ رہے تو سارے گاؤں پر بُرا اثر پڑے گا۔ شروع میں کچھ تیز طبع لوگوں کو لکھا پڑھا کر گاؤں والوں کے لئے مثال قائم کرنی چاہئیے۔ کارکنوں کو شروع ہی سے اس امر پر زور دینا چاہئیے کہ جو کوئی پڑھنا لکھنا سیکھ لے وہ استاد بن جائے اور دوسروں کو بھی سکھائے۔ ڈاکٹر لمباخ (Lambach) کا مقولہ ہے کہ ہر شخص کسی ایک کو سکھائے، اس طرح سیکھنے والے کے سامنے ایک مقصد ہو جاتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ سکھانے والے کے ذہن میں سیکھا ہوا سبق ہمیشہ کے لئے قائم ہو جاتا ہے۔ اس طرح جب کوئی خواندہ مرد یا عورت تعلیم دینے کے کام میں لگا ہوا ہو تو اس میں زیادہ دخل نہ دینا چاہئیے اور اس کی ہمت افزائی کرنی چاہئیے۔ سبق کے بعد اس کو نرم الفاظ میں کچھ مشورے دینے چاہئیں، اور اس کو بتانا چاہئیے کہ وہ کتنا اچھا استاد ہے۔ اس طرح ان کو خواندگی پھیلانے کے کام میں ترغیب ہوگی اور ان کا حوصلہ بڑھے گا۔ مسٹر رابرٹن کہتے ہیں کہ بالغوں کے استادوں کو سب سے زیادہ اس کا خیال رکھنا چاہئیے کہ وہ بچوں کو نہیں بلکہ معمر اور بالغ لوگوں کو پڑھا رہے ہیں۔ ان کو اپنے مزاج پر قابو رکھنا چاہئیے اور بڑے صبر و ضبط و تحمل سے کام لینا چاہئیے۔ ڈانٹ ڈپٹ اور جبر سے ہرگز کام نہ لینا چاہئیے۔ توجہ اور دلچسپی کی کمی سے ہراساں نہ ہونا چاہئیے۔ جب تک کارکن اپنے فرض کو نہ پہچانے گا اور اس کے تقدس کو نہ محسوس کرے گا وہ یہ دشوار کام بخوبی انجام نہ دے سکے گا۔

ڈاکٹر لمباخ (Lambach) کہتے ہیں کہ ناخواندہ بالغوں میں احساس کمتری بہت شدید ہو

وہ اپنی لیاقتوں اور صلاحیتوں کی طرف سے بہت مایوس ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان سے دبنگائی کی بات کرنا، مذاق کی لینا یا طنز کرنا ان کو ہمیشہ کے لئے پست ہمت کردے گا۔ ان کے ساتھ برابری برتاؤ ہونا چاہیئے اور ہمدردی و ملائمت کے ساتھ ان کی غلطیوں کو درست کرنا چاہیئے۔

اگر یہ نکات پیش نظر رکھے جائیں گے تو بالغ بہ نسبت بچوں کے بہت جلد پڑھنا لکھنا سیکھ جائیں گے کیونکہ ایک طرف تو اُن کی صلاحیتیں پختہ ہوتی ہیں اور دوسری طرف اُن کو تجربہ زیادہ ہوتا ہے۔

آہ! ساحر

(از حضرت منوّر لکھنوی)

اور ستم بپا ہوا دہلی خستہ حال پر — بزمِ سخن سے اُٹھ گیا ساحرِ باکمال بھی
اسکی عجیب ذات تھی اُسکی عجیب بات تھی — عارفِ حق نگر بھی تھا شاعرِ خوش مقال بھی
کس سے بلند اب ہو روح کس کے سخن پہ وجد آئے — مثل زبانِ قال ہے گنگ زبانِ حال بھی
صدق و صفا سے کام تھا فقر و غنا سے دل غنی — پاس تھی کفرِ عشق* بھی دولتِ لازوال بھی
اور کسی کو ہو نہ ہو مجھکو مگر یقیں یہ ہے — عالمِ بیدل بھی تھا عالمِ بے مثال بھی
عالمِ شیب کم نہ تھا زور میں کچھ شباب سے — اس پر اثر نہ کر سکے نام کو سن و سال بھی
لختِ جگر کی موت بھی دل کو نہ پست کر سکی — توڑ سکا نہ حوصلہ بھائی کا انتقال بھی
اس کی نظر نے کر دیا حرفِ خوشی کو مسترد — اس کے لغت میں بن گیا حرفِ غلط ملال بھی
بند ہو اس کی آنکھ اور ہو نہ کسی کو اطلاع — شعبدۂ عجیب تھی خامشیِ مآل بھی

واں جو ہے دیدۂ یقیں، دیکھ منوّرِ حزیں
ساحرِ نکتہ رس کی موت وصل بھی ہو وصال بھی

* کفرِ عشق حضرت ساحر کا اُردو دیوان ہے۔

جلالیاتِ عشق

(از پروفیسر مدہوش، ایم اے)

عشق سے جاں فروش کو فرصتِ جسم و جاں کہاں
عشق تو پختہ کار ہے حسن کی خامیاں کہاں؟

عشق ستیزہ کار سے حسن کو کیوں لگاؤ ہو؟
ناز و نعم کی زندگی عشق سی سخت جاں کہاں؟

عیش و ہوس ہیں پست دل، سہل پسند زندگی
لائقِ دردِ دل نہیں درخورِ دردِ جاں کہاں؟

عشق کے لالہ زار میں حسن کی سختیاں نہیں
حسن کو چھو کے دیکھیے عشق کی نرمیاں کہاں؟

یہ نہیں ہیں مرگِ دل سوزِ درونِ عشق ہے
سازِ شکستِ دل ہے یہ میری فغاں فغاں کہاں؟

عشق کے کاروبار میں حسن جمود آشنا
آ کے مگر اسے ابھی فرصتِ دردِ جاں کہاں؟

ڈھونڈ چکے ملا نہیں ہم کو تو خال خال بھی
حسن میں حسن ہی نہیں عشق ہے بدگماں کہاں؟

عشق ہے شعلہ راکھ میں دب نہ سکے گا حسن کی
زندہ حرارتیں کہاں حسن کی سردیاں کہاں؟

چاند فروغِ محض پر نور نہیں وہ نار ہے
حسن کے رنگ روپ میں دھوپ ہے کہکشاں کہاں؟

دھوپ کو دیکھ دیکھ کر یہ نہ سمجھ ہے چاندنی
جو کہ مچل چکے ہیں پوچھ ان سے کہ ہے اماں کہاں؟

حسن کی پستیوں سے ہٹ عشق کی رفعتوں پہ آ
عشقِ جلال پیشہ کو لے گیا رائیگاں کہاں؟

عشق حریفِ عشق ہے عشق کو عشق سے ہے کام
اس کو تلاش ہو کہ ہے جلوۂ بیکراں کہاں؟

سازِ ازل

رندِ میخانۂ ساقیِ ازل ہیں ہم لوگ
پینے والے مئے سرجوشِ عمل ہیں ہم لوگ

لغزشیں کھائیں اگر مصلحِ عالم ہو جائیں
اور سنبھل جائیں تو اک نقشِ عمل ہیں ہم لوگ

ہاں بگڑ جائیں تو ہو محورِ عالم لرزاں
آئیں ثابت قدمی پر تو اٹل ہیں ہم لوگ

نغمۂ عشق سے تھرائے قضا اور قدر
زندہ گزرے سرِ افسانۂ اجل ہیں ہم لوگ

تیری وادی میں بھی آوازِ بقا گونج اٹھی
اے فنا! اخترستانِ ازل ہیں ہم لوگ

ہے جو ریحانِ جوانی کی فضا روحانی
اک مچل دل کی نئی بزمِ غزل ہیں ہم لوگ

نے لب و لہجہ میں جن کے ہے ابد کی مدہوش
پردۂ خاک میں وہ سازِ ازل ہیں ہم لوگ

ہندوستان کا بجٹ

(از مسٹر پرسیورتا نند ورما)

حکومت ہند کے پانچویں جنگی بجٹ نے ٹیکس دہندگان ہند کی پشت پر مزید بوجھ لاد دیا ہے۔ ہمر مالیات پبلک گائے کے سوکھے تھن دبا کر مزید دودھ دُوہنے میں کمال کے آدمی ہیں۔ فنانس بل کو مرکزی اسمبلی سے رد کئے جانے کے باوجود بھی قانونی شکل دیدی گئی ہے۔ کیونکہ اس مغل اعظم کے اختیارات کو کون روک سکتا ہے جو دہلی کی مسند سے داد حکومت دے رہا ہے۔

آئندہ کسی غریب آدمی کو ٹیکس دیئے بغیر چائے، قہوہ، چھالیہ اور تمباکو سے لطف اندوز ہونے کی اجازت نہ ہوگی کیونکہ ان چیزوں پر چار آنے فی سیر ٹیکس لگا دیا گیا ہے۔ ڈاک اور تار کی شرح میں بھی اضافہ ہوگا، رہا معاملہ ریل کے کرایہ کا، تو ریلوے بجٹ کی رو سے اس میں بھی اضافہ ہوگا[علہ]۔ بعض شرائط کے ماتحت کارپوریشن ٹیکس میں ایک آنہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ زندگی کا بیمہ کرنے والی کمپنیوں کو فی روپیہ ۶۳ پائی ٹیکس دینا پڑے گا۔ انکم ٹیکس بھی ماشاء اللہ روز افزوں ہے۔ دس ہزار سے لیکر پندرہ ہزار روپیہ تک کی آمدنیوں پر اب تک سنٹرل سرچارج ۲۳ پائی فی روپیہ تھا آئندہ سے ۲۶ پائی ہوگا، اور ۳۵ ہزار سے لیکر دو لاکھ روپیہ تک آمدنی پر دو پیسہ فی روپیہ سپر ٹیکس بڑھا دیا گیا ہے۔

بجٹ میں ۸۷ کروڑ ۲۱ لاکھ روپیہ کا خسارہ دکھایا گیا ہے نئے ٹیکسوں اور اضافہ ٹیکس سے جو آمدنی ہوگی اس کی برکت سے یہ خسارہ ۵۴ کروڑ ۱۷ لاکھ روپیہ رہ جائیگا بجٹ ۴۴-۱۹۴۵ء میں آمدنی کا تخمینہ دو ارب ۸۴ کروڑ ۹۷ لاکھ اور خرچ کا تخمینہ تین ارب ۶۳ کروڑ ۱۸ لاکھ روپیہ لگایا گیا ہے، بقیہ خسارہ کو قرض وغیرہ سے پورا کیا جائیگا مرکزی بجٹ میں یہ خسارہ نیا نہیں ہے بلکہ ہوتا چلا آرہا ہے۔ چنانچہ مسلسل خساروں کی تفصیل مندرجہ ذیل نقشہ سے ظاہر ہے:-

سال	خسارہ
۱۔ سنہ ۴۰-۱۹۴۱ء	چھ کروڑ ۵۲ لاکھ ۸۰ ہزار روپیہ
۲۔ سنہ ۴۱-۱۹۴۲ء	۱۷ کروڑ ۲۷ لاکھ ۳۲ ہزار روپیہ
۳۔ سنہ ۴۲-۱۹۴۳ء	۹۴ کروڑ ۴۴ لاکھ روپیہ
۴۔ سنہ ۴۳-۱۹۴۴ء	۹۰ کروڑ ۲۹ لاکھ روپیہ

اس حساب سے گویا گذشتہ چار سال میں حکومت ہند نے تین ارب چوہتر کروڑ روپیہ آمدنی سے زیادہ خرچ

علہ بعد کے اعلان سے معلوم ہوا ہے کہ ریل کے کرایہ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے۔

اور قطعی بات ہے کہ یہ جنگی خسارہ قرضہ جات سے پورا کرنا چاہئے۔

ٹیکسوں کی حد اب سوال یہ ہے کہ ٹیکس اپنی حد کو پہونچ گئے ہیں یا نہیں؟ سردار منگل سنگھ نے پچھلے دنوں مرکزی اسمبلی میں کہا تھا کہ یہ "جیب کترا" بجٹ ہے۔ کیا سردار صاحب کا یہ قول غلط ہے؟ جہاں تک کاروبار اور تجارت کا تعلق ہے محنت و جانفشانی کرنے والوں کے پاس زائد منافع میں سے صرف ۱۶ فیصدی رہیگا باقی سب گورنمنٹ کی جیب میں چلا جائیگا۔ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں انکم ٹیکس کی شرح فیصدی ۴۰ تھی جو سنہ ۴۳-۱۹۴۲ء میں ۶۱ ہو گئی۔ سنہ ۴۴-۱۹۴۳ء میں گورنمنٹ کو ایک ارب ۸۴ کروڑ روپیہ آمدنی ہوئی تھی جس میں ایک ارب دو کروڑ روپیہ انکم ٹیکس کا حصہ تھا۔ ایکسائز ٹیکس کی آمدنی سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۶ کروڑ ۵۲ لاکھ روپیہ تھی جو سنہ ۴۳-۱۹۴۲ء میں ۲۵ کروڑ ۲۴ لاکھ روپیہ ہو گئی

جنگ کے باعث ہم جو یہ قارون کا خزانہ لٹا رہے ہیں اُس کا باعث یقیناً جنگ ہے۔ سنہ ۴۵-۱۹۴۴ء کے بجٹ میں خرچ کا تخمینہ تین ارب ۶۳ کروڑ ۴۰ لاکھ روپیہ لگایا گیا ہے۔ اس میں سے دو ارب ۷۶ کروڑ ۶۱ لاکھ روپیہ ڈیفنس یعنی جنگ کھا جائے گی۔ اس پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اتحادیوں کے مصارف ڈیفنس کے مقابلہ میں ہمارا خرچ ڈیفنس کچھ بھی نہیں ہے۔ انگلینڈ اپنی قومی آمدنی کا صرف ۱۷ فیصدی حصہ ڈیفنس پر خرچ کیا کرتا تھا اب وہ ۷۰ فیصدی کر رہا ہے امریکہ اپنی قومی آمدنی میں سے ۶۲ فیصدی حصہ ڈیفنس پر خرچ کر رہا ہے۔ مگر ہندوستان اس مد میں اپنی قومی آمدنی کا صرف ۴ فیصدی حصہ خرچ کر رہا ہے۔

یہ جنگ یورپین بلکہ دول مغربی کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہے۔ ہمارا اسمیں کچھ ہاتھ نہیں ہے اور نہ اسکے خاتمہ میں ہمارا کوئی ہاتھ ہوگا۔ بایں ہمہ ہم اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا نہیں چاہتے۔ ہمیں دشمن سے لڑنا چاہیئے۔ ہمیں اپنا ملک بچانا چاہیئے لیکن اپنی قومی آمدنی میں سے ۴ فیصدی ڈیفنس پر خرچ کرنا ہمارے جیسے مفلس و نادار ملک کیلئے نہ صرف ضرورت سے زیادہ بلکہ پریشان کن ہے جتنی چادر ہوتی ہے اتنے ہی پاؤں پھیلائے جا سکتے ہیں یعنی جتنی آمدنی ہوگی اسی تناسب سے خرچ بھی ہو سکتا ہے۔ جو ملک اپنی قومی آمدنی کا ۶۳ فیصدی یا ۷۰ فیصدی ڈیفنس پر خرچ کر رہے ہیں وہ اپنی صنعتی و حرفتی پیداوار میں تین چار سو فیصدی اضافہ کر چکے ہیں۔ حتیٰ کہ کناڈا اور آسٹریلیا جیسے ملکوں کی انڈسٹریل برآورد بھی ڈھائی سو فیصدی کے لگ بھگ زیادہ ہو گئی ہے۔ دوسری طرف جہاں تک تجارت برآمد کا تعلق ہے ہندوستان کی انڈسٹریل برآورد ۲۰ سے ۴۰ تک بڑھی ہوگی، تو کیا ایسی حالت میں ہم مزید بار کے متحمل ہو سکتے ہیں کیا وہ لوگ جو ہمارے فائدہ کے لئے ہم پر حکومت کرنے کے دعویدار ہیں ہمت مردانہ کرکے ہمارا ۴ فیصدی بوجھ ہلکا نہیں کر سکتے؟ اگر نہیں کر سکتے تو پھر ہماری مصیبتوں کا خاتمہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہماری اندرونی یا داخلی اقتصادی حالت بالکل تہ و بالا ہو چکی ہے جسکا ایک زندہ دلسوز اور خطرناک ثبوت یہ ہے کہ بعض فاقہ کشی کے ہاتھوں بنگال میں ہمارے بیس لاکھ بھائی ہلاک ہو چکے ہیں اور دوسرے علاقوں میں جو فاقوں سے ہزارہا [illegible] ہوئے ہیں وہ اسپر مستزاد ہیں۔ کیا ہمارے ملک کی طرح [illegible] ایسے ملک کے جسے پیٹ بھر کھانا نصیب نہ ہو جیسے جنگ کا [illegible] خطرناک بات ہے۔

دیواریں

(از کشمیری لال ذاکر)

دس کینڈل پاور کا لیمپ مدھم سی روشنی دے رہا تھا۔ ایک پروانہ بار بار اُس سے آ ٹکراتا، لیکن کانچ کا وہ خول جس کے اندر تاروں کا ایک خاص اُصول کے تحت مختصر سا اُلجھاؤ چمک کر روشنی پیدا کر رہا تھا در اصل ایک دیوار تھی۔۔۔ ایک ایسی دیوار جو پتنگے کو جل کر راکھ ہو جانے سے روکتی تھی۔۔۔۔ نہ جانے کتنے ہی پروانے ہر روز ایسی اُجلی اور شفاف دیواروں کو عبور کرنے کی کوشش میں تھک کر ہار جاتے ہیں۔

"یہ آشا نزدیک ہو کر بھی کتنا دُور ہے!" تمیر نے پروانے کی اس رائیگاں سی جد و جہد کو دیکھتے ہوئے کہا اور شکستہ سی پرانی آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے اُس کی آنکھوں کے سامنے پچھلے تین سال کے تمام واقعات گھوم گئے۔ اُس کی زندگی ایک چٹیل میدان کی طرح تھی جس میں راستے کے پیچ و خم نہ تھے، ایک ہی ویران سی لکیر تھی جس پر وہ چلا جا رہا تھا، اور آخر وہ لکیر بھی مستقبل کے دھندلکے میں کھو جاتی تھی، جہاں موت کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں تیرتی دکھائی دیتی تھیں۔۔۔۔۔ وہ ایک ہی راستے پر چلتے چلتے تھک گیا تھا۔۔۔ اُسے چند لمحے سستانے کی ضرورت تھی، لیکن کہیں بھی اُمید کا سایہ نظر نہ آتا تھا۔۔۔۔ اور نا اُمیدی کی جھلسا دینے والی دھوپ میں ایک ہی جگہ ٹھہر کر چلنے سے سفر کا کچھ حصہ طے کر لینا بہتر ہے۔۔۔۔ وہ کہیں ٹھہر بھی نہ سکا۔۔۔ شاید اُسی پتلی سی ٹوٹی پھوٹی پگڈنڈی کی طرح وہ بھی اُفق کی پہنائیوں میں گم ہو جائے گا۔۔۔۔۔ "میری شادی میری زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔۔۔۔ شادی کا اہم مقصد افزائشِ نسل نہیں بلکہ ایک ساتھی ڈھونڈنا ہے۔۔۔۔ ہر ایک انسان تنہائی سے گھبراتا ہے، اُسے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو اُس کے خیالات و تصورات کو سمجھ سکے، جو اُس کے سُکھ دُکھ میں شریک ہو۔۔۔۔ اور سُکھ دُکھ صرف جسمانی ہی نہیں روحانی بھی تو ہوتے ہیں۔۔۔۔ جو ارتقا کی مختلف منزلیں طے کرنے میں روح کی مدد کرے۔۔۔ لیکن میری ازدواجی زندگی کے ناطے کس قدر نامکمل ہیں۔۔۔ کس قدر بد قسمت انسان ہوں میں۔۔۔۔ کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ شاید لطیف جذبات شیاما کے پاس پھٹکنا تک نہیں چاہتے۔۔۔۔ اُس نے مجھے سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔۔۔۔ شاید اُس کا خیال ہے کہ کسی کو بغیر اچھی طرح سمجھنے کے بھی اپنایا جا سکتا ہے۔۔۔ نہ جانے اور کتنی دیر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے گی۔۔۔ لیکن اگر کسی کو اپنانا ہی زندگی کا مقصد ہے۔۔۔ تب بھی تو وہ ناکامیاب ہے۔۔۔ تین سال دن رات میرے ساتھ رہ کر بھی وہ مجھے اصلی روپ میں نہیں دیکھ سکی۔

اُس کے لئے زندگی ایک دیوار ہے جس کے سائے میں آرام کرنا ہی سب سے بڑا کام ہے۔ ... اُسے دیوار کو
پھاند کر نئے مناظر دیکھنے کی خواہش نہیں ہے۔ ... وہ صرف سایہ چاہتی ہے۔ سائے کی ماہیت اور شکل سے اُسے
کوئی غرض نہیں ..... میں بھی تو سر پٹک پٹک کر تھک جانے والے پروانے کی طرح اپنے مقصد میں ناکامیاب
رہونگا۔ ...... تمبر نے ایک دفعہ پھر دس کینڈل پاور کے لیمپ کی طرف دیکھا اور اُسے یوں محسوس ہوا کہ شیاما
ایک ایسا لنگار ہے جس سے اُس کی زندگی کی کشتی ٹکرا کر ٹوٹ جائیگی ...... وہ کبھی بھی ساحل کے سکون
اور آرام سے آشنا نہ ہو سکے گا ...... اور ریوا صبح سویرے آسمان کی نیلی جھیل میں موتی کی طرح چمکتا ہوا
ایک تارہ جسے وہ کنارے پر کھڑا ہو کر صرف دیکھ سکتا ہے ..... حاصل نہیں کر سکتا۔

تمبر سیٹھ شکھ چین لال کے ہاں سو روپے ماہوار کا کلرک تھا ... لیکن سبھی اُسے منیجر صاحب ہی
کہتے تھے .... حوادث کے بہت سے تھپیڑے کھانے کے بعد وہ بندھے ہوئے پانی کے ایک پُر سکون
حصے میں پہونچ گیا تھا ...... کنارا تو اُس کی قسمت میں تھا ہی نہیں، اُسنے اِسی کو غنیمت جانا ....
اُسے صرف سیٹھ صاحب کے کاروباری معاملات میں ہی نہیں بلکہ خانگی معاملات میں بھی دخل دینے کی
پوری پوری اجازت تھی ..... اپنے لئے تو زندگی کی مسرت کے تمام دروازے اُس نے خود بند کر دیئے تھے
وہ شاید زندہ رہنے کے قابل ہی نہیں تھا .... اُس کی خوشی کا باعث صرف ایک چیز تھی ... دوسروں کی
زندگی کو زیادہ سے زیادہ آرام اور خوشی دینے کی کوشش ..... اُس کی نا اُمیدی اور بیچ سماج کے ارتقا
میں ذرہ بھر بھی رکاوٹ نہ تھے ..... اسی لئے سیٹھ صاحب اُس پر پورا پورا یقین رکھتے تھے۔ وہ بھی زیادہ
سے زیادہ وقت اور محنت کے استعمال سے اُن کا کام کرتا .... صبح بہت جلدی گھر سے نکل آتا اور شام کو
کافی اندھیرا ہو جانے پر واپس جاتا ..... اُس کے لئے گھر میں کوئی کشش نہیں تھی ..... کتنا مشکل ہے
بغیر کسی کشش کے زندگی گذارنا۔ یہ وہ سمجھ گیا تھا ..... شیاما اُس کے لئے ایک ایسی دیوار تھی جو اُسے
گھر کے آنگن میں جانے سے روکتی ...... کئی دفعہ اُس نے چاہا بھی کہ وہ اس دیوار کو پھاند کر گھر کے سکھ
اور چین سے آشنا ہو لیکن وہ ایسا نہ کر سکا ... کئی دفعہ اس نے چاہا کہ دیوار سے سر ٹکرا کر ختم ہو جائے ....

لیکن یہ بھی نہ ہو سکا

سیٹھ صاحب کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی ..... وہ اکثر سوچا کرتے کہ اتنی بڑی جائداد کا کیا ہو گا؟ زندگی
تو آخر کسی وقت بھی ساتھ چھوڑ سکتی ہے ..... اِس کا کیا بھروسا؟ اسی مقصد کے لئے اُنھوں نے تین شادیاں
کیں لیکن کوئی بھی عورت دو سال سے زیادہ زندہ نہ رہی ..... اُنھیں شادی کی تو خاص ضرورت نہ تھی ....
اپنے کاروبار سے ہی اُن کا اصلی بیاہ ہو گیا تھا ..... اُنھیں اسی کی خوشنودی کی ضرورت تھی اور وہ دن رات

اِسی کے نازاُٹھایا کرتے۔۔۔۔ اسی لئے شاید قدرت نے تین انسانی پیکروں کو اُن کے راستے میں مکانوں کا بننے سے روک دیا تھا۔۔۔۔ اب بھی وہ اگر شادی کرنے پر رضامند ہوگئے تھے تو اولاد کی خاطر۔۔۔۔ تیسرا کا زیادہ اصرار بھی کسی حد تک اس کا موجب تھا۔۔۔۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کا مالک دنیا میں کوئی نہ کوئی نام لیوا تو چھوڑ جائے۔۔۔ آخر اُن کی چوتھی شادی ہوگئی۔۔۔۔ چوتھی بار سیٹھ صاحب دُولہا بنے اور تصورات کے گھروندے بناتے ہوئے ریوا کو ساتھ لیکر ایک دفعہ پھر خوش ہو اُٹھے۔۔۔۔ ریوا کے گھر میں آتے ہی ایک خاص قسم کی آراستگی اور سلیقہ نظر آنے لگا جو عورت کی چار پانچ سال کی طویل غیر حاضری میں نابہم ہوگئے تھے۔۔۔ شاید بے جان چیزیں بھی عورت کے لمس کو ترستی ہیں۔۔۔۔ اُس سلیقہ اور آراستگی کو دیکھکر اُسے اپنا گھر یاد آجاتا۔۔۔۔ ایک سرائے جہاں وہ صرف شب بسری کے لئے جاتا تھا۔۔۔ سیٹھ صاحب کے گھر کا سارا انتظام اُسی کے سپرد تھا اس لئے اُسے ریوا کو بہت نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا۔۔۔۔ اُس کے مذاق، مشاغل اور خیالات پر یاس کی ایک ہلکی سی چھاپ تھی۔۔۔۔ وہ کیوں، یہ اُسے بھی معلوم نہ ہو سکا تھا۔۔۔ ریوا کو بھی تیسر میں کچھ مطابقت سی محسوس ہوئی۔

شادی سے پہلے ریوا سوچا کرتی شاید ازدواجی زندگی کی دلچسپیاں اور مصروفیتیں اُس کے دل سے ایک نامعلوم سا اضطراب دُور کردینے میں کامیاب ہوسکیں۔۔۔۔ شاید وہ اپنے درد پر امارت اور تکلفات کا پردہ ڈال کر اُسے کسی پر عیاں نہ ہونے دے۔۔۔ لیکن اب اُسے یہ صرف ایک خواب دکھائی دیتا تھا جو اُس نے ادھ جگے میں دیکھا تھا۔۔۔۔ وہ ایک سُراب تھا جس کے پیچھے وہ بھاگی تھی۔۔۔۔ وہ اب بھی پہلی سی ہی پیاسی تھی۔۔۔۔ پیاسے انسان کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔۔ اور پانی طوفان میں ملتا ہے صحرا کی دہکتی ہوئی ریت میں نہیں۔۔۔۔ کیا اُس کی زندگی پھر کسی طوفان سے آشنا ہوگی؟ ۔۔۔۔ اور بعض دفعہ اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک نوجوان انسان کی شکل گھوم جاتی، جس کے چہرے سے بھوک ٹپکتی تھی۔۔۔ بھوک سے پیدا شدہ لاپرواہی اور لاپرواہی میں سے جھلکتی ہوئی کرختگی اور سنجیدگی۔۔۔ ایک ایسا انسان جو کبھی اُبلتا ہوا لاوا تھا لیکن ماحول کی سرد اور تیز ہوانے اب جیسے ٹھوس اور مضبوط پتھر بنا دیا تھا، اور اُسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ بڑا سا پتھر ازدواجی زندگی کے اونچے کنگارے سے اُس کی زندگی کے دریا میں گرنے والا ہے۔۔۔۔ آخر تھکے ہوئے مسافر کو اپنی پیاس بجھانا تھی سفر کا اگلا حصہ طے کرنے کے لئے۔۔۔۔ اور ریوا کو اپنی ہنستا ہنستا زندگی ایک بڑے ویرانے کی طرح دکھائی دیتی جس میں دُور اُفق کے قریب ایک سیاہ سا دھبہ تھا۔۔۔ اُس نے کئی دفعہ چاہا کہ وہ دھبہ نزدیک آجائے۔۔۔۔ ایک کالی گھٹا بنے اور کھُل کر برسے، اُس بڑے سے ویرانے میں جل تھل ہوجائے۔۔۔ لیکن وہ دھبہ اپنی جگہ سے نہ ہل سکا۔۔۔ اور وہ سرد اور ٹھوس پتھر

شادی سے پہلے وہ ادب اور موسیقی کے دلدادہ تھے۔ لیکن شادی کے بعد پھر غافل ہو گئے۔۔۔ وہ کارخانے میں موسیقی کی دھنوں کی جھنکار میں ایک ایسے نغمے کی لطافت محسوس کرتے جو ان کی روح تک کو مسرور کر دیتا ۔۔۔ وہ چند لمحوں کے لئے اس مادی دنیا سے اوپر اٹھ جاتے۔ اور ایک ایسی جگہ پہنچ جاتے جہاں عورت اور مرد کے تعلقات اور ازدواجی زندگی کے بندھنوں کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔۔۔۔ وہ اپنی خامیوں کو تخیل کی مدد سے قابلِ رشک نعمتیں بنانے کی کوشش کرتے۔۔۔ ریوا کے لئے بھی ان کے پاس تیاگ، سادگی اور پتی ورتا دھرم کے پرچار کے سوا کچھ نہ ہوتا۔۔۔ ان کی بیوی کو محسوس ہوتا کہ وہ اپدیش نہیں بلکہ ایک محروم روح کی پکار ہے ۔۔۔ اس کا خون کھول اٹھتا اور وہ چاہتی کہ اس ٹھوس اور سرد پتھر کو خود ہی پانی میں دھکیل دے۔۔۔۔۔ اسے طوفان کی ضرورت تھی۔ شانتی کی نہیں۔۔۔۔ اس کی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے اپنے خاوند پر جم جاتیں اور وہ ایک مجرم کی طرح سر نیچے جھکا کر کمرے سے باہر نکل جاتا۔

ریوا نے چاہا کہ وہ سمیر کے حالات کو بدل دے۔ وہ حالات جو اسے کچلے ڈالتے تھے غربت اور خیالات کی تشنہ لبی۔۔۔ سمیر نے خود بھی تو کئی بار باتوں باتوں میں کہا تھا "مفلسی ایک ایسی دیوار ہے جو ارتقا کی راہ میں حائل ہے اور جسے پھاند سکنا ممکنات سے نہیں" وہ اس دیوار کو بالکل گرا دینا چاہتی تھی۔ تاکہ ارتقا کو پھیلنے کے لئے وسعتیں مل جائیں۔۔۔۔۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی ۔۔۔ سمیر اب دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔۔۔ ہر تیسرے دن اس کے ہاں قیمتی تحائف بھیجے جاتے تھے۔۔۔ مفلسی کی اونچی دیوار بہت حد تک شکستہ ہو چکی تھی۔۔۔۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی اونچے کنگارے سے ایک سرد اور ٹھوس پتھر ریوا کی زندگی کے دریا میں بھی گر گیا تھا۔۔۔۔۔ دریا کی سطح متلاطم ہو گئی تھی۔ اس میں بیسیوں چھوٹے چھوٹے بھنور ایک دوسرے سے گلے ملتے۔۔۔۔ سیکڑوں چھوٹی چھوٹی لہریں ایک بڑی سی لہر میں تبدیل ہو کر کنارے سے آ ٹکراتیں۔۔۔۔ دریا جو پہلے ساکن پانی کا ایک بڑا سا پھیلاؤ دکھائی دیتا تھا اب ایک متلاطم سمندر تھا۔۔۔ لیکن دریا کی خواہشیں پوری نہ ہو سکیں۔۔۔ وہ تو کناروں کو عبور کر کے ارد گرد کے ویران اور سنسان چٹیل میدان کو سیراب کرنا چاہتا تھا۔۔۔ وہ چٹیل میدان جس میں صرف ایک پگڈنڈی تھی۔۔۔ دور افق کے دھندلکے میں تحلیل ہوتی ہوئی سیاہ رنگ کی پتلی سی لکیر۔۔۔ دریا کے بھنور اور لہریں اس کے اپنے کناروں کو ہی کرید رہی تھیں۔۔۔ مگر یہ جنگ روزِ ازل سے چلی آتی ہے۔ آج تک دریا کناروں کی قید سے آزاد نہیں ہو سکا۔ اس کی ان تھک کوششیں اسے کنارہ کے بغیر زندہ رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔۔۔۔ تو کیا کناروں کی یہ اونچی اونچی دیواریں کبھی نہ گر سکیں گی؟

ریوا اپنے کمرے میں بیٹھی نہ جانے کس سوچ میں غرق تھی۔۔۔۔ سامنے کینڈل پاور کا لیمپ کمرے کو جگمگا رہا تھا۔۔۔ نہ جانے اتنی احتیاط کے باوجود بھی ایک پتنگا کس طرح وہاں پہنچ گیا تھا۔۔۔ وہ بار بار لیمپ کے

[illegible] میں زرد [illegible] لیمپ کی مدھم [illegible] روشنی کی تیز شعاعیں اُسے [illegible] ...اور ہر دفعہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہتا...... اچانک ریکھا کی آنکھیں اُس طرف اُٹھیں، دو موٹے موٹے آنسو اُس کے خوبصورت چکنے گالوں پر سرکنے لگے..... اُسے یوں محسوس ہوا کہ وہ بہت تیز روشنی والا ایک لیمپ ہے اور تمیر ایک کمزور سا پروانہ...... جو اس کی اپنی تیز روشنی ہی ایک ایسی دیوار ہے جسے تمیر پھاند نہ سکے گا...... "تم اتنے نزدیک ہو کر بھی کتنے دور ہو" ...... اور ریکھا نے اپنا پریشان اور تھکا ہوا سر میز پر رکھ دیا۔

غزل

(مسٹر پھول چند شعلہ اٹاوی)

تعمیرِ آشیاں کی تمنا رہی مجھے — جب تک فلک پہ ایک بھی بجلی ملی مجھے
دامن ہے چاک چاک گریباں ہے تار تار — کرنا ہو آج حسن کی پردہ دری مجھے
اے حسنِ بے نیاز بھی وحشت نواز ہے — پھولوں کی سادگی پہ ہنسی آگئی مجھے
تا حدِ چشمِ شوق نہیں ساحلِ سکوں — اے موجِ اضطراب کدھر لے چلی مجھے
صیاد ذکرِ برق و بہارِ چمن نہ چھیڑ — بس بس قفس کی زندگی راس آگئی مجھے
یہ کس نے چھیڑ دی شبِ فرقت کی داستاں — بیدار ہو سنبھالنا نیند آگئی مجھے
یا دیر و کعبہ قابلِ سجدہ نہیں رہے — یا آزما رہی ہے مری بندگی مجھے
کچھ عرش کی بلندیاں کچھ غم کی پستیاں — جھولا جھلا رہی ہے مری زندگی مجھے
ہوتا گیا میں راہِ محبت پہ گامزن — برقِ نگاہ شمع دکھاتی گئی مجھے

اے شعلہ تھی وہ عشق میں بیداریِ حیات
مرنے کی تھپکیاں جو سلاتی رہی مجھے

نگاہِ اوّلیں

(از جناب اظہار حسن خاں اظہار ملیح آبادی)

وہ تری پہلی نظر محشر بداماں ہائے ہائے
وہ مرے سینے میں ارمانوں کا طوفاں ہائے ہائے

وہ تری آنکھوں میں پیغامِ محبت کی نمی
وہ مری نظروں میں مر جانے کا ارماں ہائے ہائے

وہ مری ہر سانس میں دل کے دھڑکنے کی صدا
وہ ترے رخسار پہ زلفِ پریشاں ہائے ہائے

وہ ترے سینے میں ارمانوں کا رنگیں ارتعاش
وہ مرے دل میں خروشِ برقِ تاباں ہائے ہائے

وہ مرا ہلکا تبسم پرتوِ سوزِ دروں
وہ تری آواز شرحِ دردِ پنہاں ہائے ہائے

وہ ترے سینے میں موجِ آبِ تمکیں العیاث
وہ مرے سینے میں سیلِ یاس و حرماں ہائے ہائے

وہ ترے عارض پہ زلفوں کی اداسی حیف حیف
وہ مرے چہرے پہ عکسِ شامِ ہجراں ہائے ہائے

وہ ترے ماتھے کا ٹیکا خونفشاں بر جان و دل
وہ مرے اشکوں کی شمعیں زیرِ مژگاں ہائے ہائے

وہ مرے خاموش ہونٹوں پر اداسی موت کی
وہ ترے عارض میں موجِ آبِ حیواں ہائے ہائے

وہ تری ہر ناز کی بر چشمِ دوراں کا عتاب
وہ مری ہر آرزو سر در گریباں ہائے ہائے

پھر وہی اظہار کہہ دے اپنے خاص انداز میں
"وہ تری پہلی نظر محشر بداماں ہائے ہائے"

پھانس

(از جناب بہار کوٹی)

سخنے چند زغم ہائے نہانی بہ شنو

ایک مقابلہ کے امتحان میں شرکت کی غرض سے ملبسار جارہا تھا، فرنٹیر میل میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی بڑی دقت سے کھڑکی کے ذریعہ ایک چھوٹے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوگیا، قلی نے کھڑکی سے سامان ٹھونس دیا۔ حواس بجا ہونے اور سامان جمانے کے بعد کمپارٹمنٹ کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ مجھے ایک بڑی بی اور ایک

بہ سامانِ دو عالم گلستاں رنگ — زتابِ رخ چراغانِ لبِ گنگ

قسم کی محترمہ کی ہم سفری کا فخر حاصل ہے۔

میں فرطِ مسرت سے گنگنا اُٹھا:۔

مہ مصر است داغ از رشکِ مہتابے کہ من دارم

بڑی بی نماز میں مصروف ہوگئیں، میں نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ع

سجادہ گستری تو و من بسترافگنم

پر عمل کیا، اور برابر والی سیٹ پر متصرف ہوگیا۔ کسی نے مزاحمت نہ کی۔ محترمہ سالنامہ حجاب کے مطالعہ میں ہمہ تن غرق تھیں۔ لیکن ع — بہ شوخی کہ رخِ اختراں بہ گردانیم

بڑی بی نماز سے فارغ ہوئی ہی تھیں کہ محترمہ نے سالنامہ سے ایک غزل کے منتخب اشعار ترنم میں سنانے شروع کر دیئے۔ "دیکھئے کتنے پرمغز اشعار ہیں، بڑا بے پناہ کہنے والا ہے شعرائے جدید میں کوئی بھی اس کے مقابلہ پر نہیں لایا جاسکتا۔ آپ اس کی ہر غزل میں سوز آگینی اور تسلسل پائیں گی۔ سنیئے:۔

اے رہ نوردِ عشق ذرا دیکھ بھال کے — ظالم یہیں کہیں ہے قیامت چھپی ہوئی

دیکھے ہوئے کسی کو زمانہ ہوا مگر — اب تک ہر ایک پھانس سی دل میں چبھی ہوئی

تغزل اور ترنم میں ڈھل جانے کے بعد، ترنم وہ بھی کسی جانِ تغزل کے منہ سے ؎

بادِ مستانہ می جنبید و شبنم می چکید — غنچہ را در رخت خواب آلودہ دامان دیدہ ام

لہ True story کا ترجمہ شاید اس سے بہتر نہیں ہوسکتا میں "سچی کہانی" لکھنا پسند نہیں کرتا۔

تھیں "ہزار گونہ سخن در دہان و لب خاموش" بیٹھا رہا۔ انھیں کیا معلوم کہ جس خوش قسمت شاعر کی تعریف میں وہ زمین و آسمان کے قلابے ملا رہی ہیں، وہ ان کی برابر والی سیٹ پر بیٹھا ہوا انھیں ستائش مندانہ نگاہوں سے تک رہا ہے۔ میں خود نمائی کے جذبے سے مغلوب ہو گیا۔ سگریٹ کیس نکالنے کے بہانے سے اپنا ہینڈ بیگ اُٹھایا اور اُس کا وہ رُخ جس پر خوبصورت حرفوں میں "BAHAR" لکھا ہوا تھا اُن کی جانب کر دیا۔ انھوں نے ہینڈ بیگ کو اور پھر مجھے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بڑی بی کے کان میں کچھ کہا۔ بڑی بی بے ساختہ بول اُٹھیں "آپ کا اسم شریف؟"

"اوں، اوں، مَیں، مَیں۔ خاکسار کو بہار کہتے ہیں۔"

"ماشاء اللہ، ہم لوگ بڑے خوش نصیب ہیں کہ بہار جیسا ادیب و شاعر ہمارا رفیقِ سفر ہے۔"

مَیں خاموش رہا۔ اب تو شعر و شاعری پر معرکہ آرا بحث چھڑ گئی۔ شاید ہی کوئی بدقسمت شاعر بچا ہوگا جس پر صحیح یا غلط تنقید و تبصرہ نہ ہوا ہو۔ میں نے بھی جی کھول کر داد ہمہ دانی و ہمہ فہمی دی۔ کافی رات جا چکی تھی، حواس پر نیم شعوری کیفیت طاری تھی۔ تھوڑی دیر میں کمپارٹمنٹ میں سکوت تھا اور ہم لوگ اپنے اپنے بستر پر۔ مجھے نیند نہ آ رہی تھی۔ جلد جلد کروٹیں بدل رہا تھا اور کبھی کبھی غالبؔ کی ع "زہرہ را انند رد ائے نور عریاں دیدہ ام" والی غزل گنگنا اُٹھتا۔ گاڑی بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے مجھے لوریاں دے کر سلا دیا۔

کچی نیند میں مَیں نے شانے پر ایک نازک اور گرم گرم ہتھیلی کا لمس محسوس کیا۔ چونک پڑنے پر مجھے مترنم آواز میں بتایا گیا کہ ملسار کا اسٹیشن آ گیا۔ مَیں ہڑبڑا کر اتر پڑا اور اپنے حسین رفیقِ سفر کی مدد سے سامان اُتار لینے میں کامیاب ہو گیا۔ گاڑی چل دی۔ مَیں انھیں اور وہ مجھے گھورتے رہ گئے ..... میں ع "تہی سبد ز در گلستاں بہ گروانیم" گنگناتا ہوا قلی کو ڈھونڈھنے لگا۔

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند

اِمتحان میں کامیاب ہو گیا۔ ٹھیک ایک سال بعد گجرات کے ایک روڈ سائڈ اسٹیشن پر ٹکٹ کلکٹر کی حیثیت سے میرا تقرر ہو گیا۔ یہ جگہ آب و ہوا کے اعتبار سے تو اچھی تھی، مگر "زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم" "میتوں چھے" "اوڑ کیم چھے" سے بڑی وحشت ہوتی۔ ماحول کی ابتری اور بھی سوہانِ روح تھی۔ یہ معلوم کر کے کہ کوئی مسلمان ڈپٹی اسٹیشن ماسٹر تبدیل ہو کر آ رہے ہیں، بڑی طمانیت ہوئی۔ ایک روز شام کو وہ مع اہل و عیال اُتر پڑے کوئی کوارٹر خالی نہ تھا۔ اسٹیشن ماسٹر کی خواہش کے مطابق میں نے اپنے کوارٹر کا نصف حصہ ان کے تحت و تصرف

ں دے چکا۔ ڈپٹی صاحب بڑے سنجیدہ بزرگ تھے اور اُن کے گھر کا بچہ بچہ خوش اخلاق تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ور بے انتہا مسرت ہوئی کہ فرنٹیئر میل والی محترمہ بھی مکینوں میں سے ایک تھیں۔ وہ ڈپٹی صاحب کی بھانجی تھیں، ور اُن کے والدین کا سایۂ عاطفت صغر سنی ہی میں اُن کے سر سے اُٹھ چکا تھا۔ اب ڈپٹی صاحب کی کفالت ہی یں اُن کی تربیت و تعلیم ہو رہی تھی۔ وہ ادیب کا امتحان پاس کر چکی تھیں، اور اس سال ادیب عالم کے امتحان کی اری کر رہی تھیں۔ ڈپٹی صاحب کے ایما اور خود اُن کے اصرار سے میں نے انھیں پڑھانا شروع کر دیا ع

چناں شہریار و وزیرے چنیں

وہ بلا کی ذہین تھیں، اور خیال تھا کہ دو ماہ میں کورس ختم ہو جائیگا۔ مگر اُس پُرکیف صحبت کو ایک ماہ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ برہم ہو گئی۔ میں تخفیف میں آگیا اور ڈپٹی صاحب کی اَن تھک کوشش کے باوجود بھی مجھے وطن آنا پڑا

ع گر رفتہ ام ز کوئے تو آساں نہ رفتہ ام

ان سے دُور رہ کر میری کیا حالت تھی، اس کی صحیح ترجمانی شاید اس مصرع سے ہو سکے

برنگِ شعلہ می رقصم در آتش

روزِ روشن بہ وداعِ شبِ تار آمد و رفت

نو مہینے بعد ریلوے کا حکم ملا کہ اگر میں کسی دوسرے ڈسٹرکٹ میں جانا چاہوں تو ملازمت مل سکتی ہے ں نے جواب میں رضامندی کا اظہار کر دیا اور میرا تقرر احمد آباد اسٹیشن پر ہو گیا۔ ایک روز مجھے آنند جنکشن ن دن کے لئے ریلیونگ ڈیوٹی پر جانے کا حکم ملا۔ وہاں خلاف توقع زیادہ رکنا پڑا۔ اور چونکہ مختصر قیام کے لحاظ ے میں قلیل رقم لے کر گیا تھا۔ مجھے قلتِ زر کے باعث مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ نیا اسٹیشن ہونے کے باعث سی سے قرض طلب کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ہیڈ ٹکٹ کلکٹر کام کی زیادتی کے باعث اسٹیشن چھوڑنے کی جازت دینے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ ایک دن تو دو بجے تک کھانا میسر نہ آیا۔ اُوور برج گیٹ پر میری ڈیوٹی تھی، ں شکم پُری کے مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ کبھی سوچتا تھا ہوٹل والے سے اُدھار کھانا لے لوں، کبھی کہتا نہیں اس میں بکی ہو گی۔ کبھی کہتا ہیڈ ٹکٹ کلکٹر سے صورتِ حالات بیان کر دوں اور کچھ رقم قرض لے لوں۔ لیکن غیرت کسی یصلہ پر پہونچنے نہ دیتی تھی۔ اسی بے خیالی اور پُرخیالی کے عالم میں پاؤں کی چاپ سُنائی پڑی۔ میں نے حسب وت چونک کر جیسے کوئی گہری نیند سے چونک پڑے، کہا "ٹکٹ پلیز" آنے والوں میں سے ایک سے آنکھیں ہوئیں اور میں دم بخود رہ گیا۔ فرنٹیئر میل والی محترمہ اور اُن کے ساتھ ایک بے حد معمولی شکل و صورت اور ضع قطع کے معمّر بزرگ۔ محترمہ نے مزاج پرسی، شکوہ و شکایت کے ساتھ ایک سانس میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ بیوی

اور ایک بچے کی ماں بن چکی تھیں۔ اُن کی زندگی بے کیف تھی۔ وہ مجھے اب بھی یاد کرتی تھیں، دوران گفتگو میں انھوں نے ایک شعر بھی پڑھا جو غالباً یوں تھا۔

نہ بہ جستہ شرارہ نہ بجا ماندہ زباد　　　سوختم لیک ندانم بہ چہ عنوانم سوخت

انھوں نے اپنے مکان کی نشان دہی بھی کی، اور شام کو ملنے کا وعدہ لے کر اسٹیشن اور پھر مکان واپس چلی گئیں، اس تمام عرصہ میں اُن کے "سرتاج" (بیچارے بڑے شریف تھے) دُور کھڑے رہے۔

اب میں ایک دوسری فکر میں مبتلا ہوگیا، اُن کے بچّے بھی ہے، اس کے لئے کھلونے لے جانا چاہیئے کسی کے گھر خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ کم سے کم پانچ روپے تو ہوں۔ ہمت کر کے ہیڈ ٹکٹ کلکٹر سے قرض مانگوں گا۔ میں انھیں خیالات میں منہمک تھا کہ ہیڈ ٹکٹ کلکٹر صاحب آ گئے، اور قبل اس کے کہ میں کچھ کہتا انھوں نے پہلی ٹرین سے سابرمتی جنکشن ریلیونگ ڈیوٹی پر جانے کا حکم سُنا دیا۔ میں پہلی ٹرین سے روانہ ہوگیا، مگر سابرمتی کے لئے نہیں بلکہ وطن کے لئے (مستعفی ہوکر)۔

وہ پہلے بہ تواتر یاد آتی تھیں اور اب کبھی کبھی۔ البتہ یہ مصرع ہر وقت ورد زبان رہتا ہے۔

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم

جنونِ جستجو

(از حضرت بیتاب بریلوی، بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)

طلسم آرزو ہے اور میں ہوں　　　فریبِ رنگ و بو ہے اور میں ہوں
کنارِ آبِ جو ہے اور میں ہوں　　　ہوائے مشکبو ہے اور میں ہوں
کھنچا جاتا ہوں خود اپنی ہی جانب　　　جنونِ جستجو ہے اور میں ہوں
سنو تو دل سے باتیں ہو رہی ہیں　　　تمہاری گفتگو ہے اور میں ہوں
جوانی جیسے جھومی جا رہی ہے　　　صراحی ہے سبو ہے اور میں ہوں
سمٹ کر ایک دنیا آ گئی ہے　　　شریکِ بزم تو ہے اور میں ہوں
جگر کے داغ آئینہ ہوئے ہیں　　　گلستاں روبرو ہے اور میں ہوں
وہی بھولے بھلا سے اور دل ہے　　　وہی لاتقنطو ہے اور میں ہوں
یہ عالم ہے تو اے دستِ جنوں اب　　　نقابِ ماہرو ہے اور میں ہوں

مزاجِ حسن بدلا جا رہا ہے
وہی اگلی سی خو ہے اور میں ہوں

شوریدہ بیانی

(از جناب کشور واحدی)

دھوکا ہے خیالِ آزادی پیغامِ زبانی جب تک ہے
شیروں کا سرِ مغرور یہاں روباہِ کہن سے نیچا ہے
زندوں کا لباسِ تن بھی یہاں مُردوں کے کفن سے نیچا ہے
کہسارِ ہمالہ کا سر بھی توہینِ وطن سے نیچا ہے
اِک داغ ہے یہ تاریخِ ستم دنیا کی کہانی جب تک ہے

آزاد شہیدوں سے میں نے پھر خون کے رشتے جوڑے ہیں
میدانِ سنان و خنجر میں کچھ دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں
افسردہ رگوں میں غیرت کی احساس کے شعلے توڑے ہیں
ٹھنڈا نہیں ہوگا میرا لہو گنگا کی رَوانی جب تک ہے

یہ خون جو میرے تن میں ہے طوفانِ جہاں بن جائے گا
قوت کے پہاڑوں کے حق میں شعلوں کا مکاں بن جائے گا
آنکھوں میں اُتر آئے گا کبھی اور اشکِ رواں بن جائے گا
جم کر نہ رہے گا پلکوں پر اس خون میں پانی جب تک ہے

مینا جو قفس کی قید میں ہے اُڑنے کے لئے پَر تولے گی
جس عضو پہ نوکِ نشتر کو رکھدیں گے رگِ جاں کھولے گی
محظوظ ہو یا بیزار کوئی ہر زندہ حقیقت بولے گی
خاموش نہ ہوگی میری زباں شوریدہ بیانی جب تک ہے

تہذیب کی صہبا کی بوتل اِک دیدۂ نم رہ جائے گی
مذہب کی نوائے دلکش بھی اِک آہِ الم رہ جائے گی
عالم کی سیاست ٹکرا کر اِک جنگِ بہم رہ جائے گی
دنیا میں نہ ہوگا امن و سکوں مفلس کی جوانی جب تک ہے

الوداع[1]

(از منشی تلوک چند محروم بی۔ اے)

لیلاوتی! وہ شامِ جدائی پہونچ گئی — جو ناگزیر تھی، جسے آنا ضرور تھا
جو دل رہے ہیں تیری محبت میں شادماں — کچھ اُن کو غم کی چوٹ بھی کھانا ضرور تھا

باچشمِ اشکبار و دلِ بے قرار آج — خود اپنے گھر سے تجھکو جُدا کر رہے ہیں ہم
دل میں ترا مقام تھا آنکھوں میں جا تری — آنکھوں پہ اور دل پہ جفا کر رہے ہیں ہم

پابند جس رواج کی دُنیا ہے، ہم بھی ہیں — فطرت کے انتظام پہ چلنا ضرور ہے
آنکھوں سے دُور ہو کے بھی دلمیں رہیگی تو — ازبسکہ نُورِ آنکھوں کا، دل کا سُرور ہے

بیٹی! نہ ہو ملول کہ فرقت سے ناگزیر — یہ گھر اگر ترا ہے تو وہ گھر بھی ہے ترا
تسکینِ خاص ہے دلِ غم دیدہ کیلئے — یہ دل کشا نوید، یہ اُمید جاں فزا

جس گھر میں جا رہی ہے تو اس گھر کو چھوڑکر — راحت کدہ بنے گا وہ مسکن ترے لئے
مہر و وفا و صدق و صفا کا ہے گھر وہ گھر — بشگفتہ ہے وہ صورتِ گلشن ترے لئے

کہتے ہیں الوداع تجھے اس دعا کے ساتھ — ایشور کرے کہ گھر وہ نیا تجھکو راس ہو
ہو صحنِ خانہ دامنِ شفقت ترے لئے — تجھکو ہو اس کا پاس اُسے تیرا پاس ہو

اپنی یہی دعا ہے۔ نصیحت بھی ہے یہی — اُس گھر میں لکشمی کی طرح تو مقیم ہو
چھوٹے بڑے کے دلمیں سمائے تو اس طرح — موجِ صبا میں جس طرح گُل کی شمیم ہو

خدمت سے اور خوبیٔ لطفِ کلام سے — تسخیر تو دلوں کو کرے اور خوش رہے
ایثار پر عمل ہو ترا اے عزیزِ جاں — اپنا ہو یا ہو غیر بہر طور خوش رہے

ساس اور سسر کو اپنے سمجھ مادر و پدر — ہر وقت سر پہ سایہ رہے اُن کے پیار کا
اُن کی رضا کو اُن کی دعاؤں کو عمر بھر — دامن سمجھ تو رحمتِ پروردگار کا

چھوٹوں سے پیار اور بڑوں کا ادب رہے — اپنے پتی کی تو ہو "اَنُوگامِنی" سدا
ہو اپنی احتیاج کا اظہار کم سے کم — رغبت ہو تیاگ سے تجھے دل ہو غنی سدا

---

[1] بتقریب شادی دختر نیک اختر مسٹر منوہر لال صاحب کپور، طالب چکوالی۔

بحث و مُباحثہ

(از سری کرشن داس۔ انسپکٹر پولیس چمبہ)

ماہ جون ۱۹۴۳ء کے زمانہ میں حضرت محوی نے اپنی نظم بہ عنوان "نوائے دل" میں ستم کو کئی اشعار میں باندھا ہے۔ مثلاً شعر اول:۔ ستم اُن کا کرم نہ ہو جائے شعر دوم ختم شوقِ ستم نہ ہو جائے
شعر پنجم:۔ عزم ترکِ ستم نہ ہو جائے شعر دہم:۔ ستم دولت کم نہ ہو جائے

پہلے شعر میں ستم کو بہ کسرِ تائے اور دوسرے اور پانچویں اشعار میں ستم کو بفتح تائے استعمال کیا ہے اس سے بڑھ چڑھ کر اُنھوں نے دسویں شعر میں اس لفظ کو ایک غیر معروف اور نامانوس طور پر استعمال کر کے بحر میں حذف و سکون پیدا کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ میرا مدعا تقطیع سے بآسانی دل نشین ہو سکتا ہے۔ اس نظم کی بحر فاعلاتن مفاعلن فعلن ہے۔ اس مصرعہ کی تقطیع بطور ذیل ہے:۔

فاعلاتن	مفاعلن	فعلن
ف ا ع ل ا ت ن	م ف ا ع ل ن	ف ع ل ن
س × ت مے د و (س)	ت ک م ن ہ و	ج ا ئے

ظاہر ہے کہ رُکن اول کا حرف دوم ساقط ہے۔ یہی سقم تیسرے شعر کے دوسرے مصرعہ "سرِ تسلیم خم نہ ہو جائے" میں بھی موجود ہے، یعنی اس مصرعہ کا تیسرا حرف بھی ساقط ہے۔ حضرت داغ دہلوی نے ستم کو ہمیشہ بفتح تا ہی باندھا ہے مثلاً

۱۔ کیا لطفِ ستم یوں اُنھیں حاصل نہیں ہوتا ۲۔ ترے وعدے پہ ستمگر ابھی اور صبر کرتے

حضرت امیر مینائی نے بھی ستم کو بفتح تا ہی باندھا ہے۔ مثلاً:۔

(۱) مرے بس میں یا تو یارب وہ ستم شعار ہوتا (۲) ستم کرنے میں اُستاد آسماں کی بھی زمیں نکلی

قادر سخنانِ فارس نے بھی ستم کو بلا استثنا بہ فتح تا کے باندھا ہے۔ مثلاً

نبیں کز ظلم جبّارے کم آزارے ستم بیند ستم گر نیز روزے کشتۂ تیغِ ستم گردد سعدی
دستے کز پئے آزِ طمع تیغِ ستم آخت گر زانکہ بہ برّند بہ شمشیرِ ستم بہ امیری
در کارگہِ عدلِ تو از بس ہنر آموخت عدل تو بہ فرزندی بر داشت ستم را عرفی

سہ حرفی الفاظ کی سکون و تحریک سے متعلق امیر مینائی صاحب فرماتے ہیں کہ "الفاظ ثلاثہ میں ساکن کو متحرک کرنے کا قاعدہ عام نہیں ہے، بلکہ جس قدر اساتذہ نے تصرف کر لیا ہے اُسی قدر جائز ہے... میری[1] رائے میں صورت برعکس پر بھی یہی سند بالعکس عائد ہے۔

---

[1] اسی رسالہ کے صفحہ ۲۰۲ پر ادارۂ زمانہ نے جالب کے اشعار کی تنقید و تصریح میں غیر ضروری کاوش سے کام لیا ہے

ع دن میرے نقش و رنگ کا کیجئے گا آپ ۔ سے متعلق مرقوم ہے کہ لفظ "بن" آجکل متروک ہے مگر ین رمجی یہے ولیعنیرا وغیرہ الفاظ سے متعلق مولانا حالی فرماتے ہیں[1] "یہ الفاظ شاید لکھنؤ میں ترک ہو گئے ہوں یا ہو جائیں لیکن دہلی اور مضافات دہلی میں وہ کم و بیش برابر بولے جاتے ہیں.... اور وہ ہمیشہ بولے جائیں گے .... شعر میں اُن کی ضرورت ہمیشہ رہیگی"۔ شعر

پھر بھی بقدر دوست نہیں احترامِ دوست آنکھوں سے یوں تو سجدے کئے جارہا ہوں میں

کے دوسرے مصرعہ میں ادارہ کی رائے میں "سجدے" کی "ے" گر گئی ہے۔ مگر جہاں تک میرا مطالعہ شاہد ہے دورِ حاضرہ کے شعرائے باکمال نے اس کو روا رکھا ہے۔ مثلاً حضرت امیر مینائی صاحب فرماتے ہیں :-

دمِ رخصت اُن کا کہنا کہ یہ کاہے[2] کا رونا تمھیں مری قسموں[3] کا بھی نہیں اعتبار ہوتا
دل اُڑا لیتے ہیں[4] وہ کھول کے زلفوں کی لٹیں دیکھو دن پھرتے ہیں چوروں کے انھیں راتوں میں
تھے تیر کی خطا کیا مری حسرتوں نے روکا نہ لپٹتیں[5] یہ بلائیں تو وہ دل کے پار ہوتا
دکھلاکے سب کو دستِ حنائی وہ کہتے ہیں عاشق کا یہ لہو ہے، چھپایا نہ جائیگا
اُڑا لے جاتے ہیں عاشق کے دل کو سینہ زوری سے

مندرجۂ بالا اشعار میں "ے" اور "د" کے گرنے کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ شعر

وہ چشمِ ناز بھی مانوس شبنم ہوتی جاتی ہے ادھر بھی عشق کی تکمیل پیہم ہوتی جاتی ہے

پر اعتراض کیا ہے کہ تکمیل پیہم نہیں ہوتی صرف ایک مرتبہ ہوتی ہے۔ شاعر کا تخیل اور طرز ادا بھی اس تنقید سے مغائر و منافی نہیں ہیں۔ غالباً پیہم ناقد کے سد راہ ہوا ہے مراد یہ ہے کہ ادھر چشمِ ناز شبنم سے مانوس ہوتی جاتی ہے ادھر عشق مکمل ہوتا جاتا ہے، اُدھر تکمیلِ اُنس ہوتی جاتی ہے۔ ادھر تکمیل عشق ہوتی جاتی ہے۔ دونوں کے عمل اپنے اپنے نتیجہ کی طرف بتدریج رو براہ ہیں۔ ابھی نہ چشمِ ناز ہی مانوس ہوئی نہ عشق ہی مکمل ہوا۔

اِسی رسالہ کے صفحہ ۲۰۹ کی پانچویں سطر میں ادارہ نے ہندوستان کے متعلق .... اور.... مزید اختیارات کے متعلق .... استعمال کئے ہیں۔ مگر گیارھویں سطر میں .... سے متعلق ہے .... مرقوم ہے۔ یعنی ایک ہی صفحہ پر متعلق سے پہلے "سے" اور "کے" بلاتمیز استعمال کئے گئے ہیں۔ حضرت امیر مینائی "سے متعلق" لکھتے ہیں[6]۔ گو بعض فصحا مثلاً حالی، شبلی، حسرت موہانی نے متعلق سے پہلے "کے" استعمال کیا ہے مگر ایک ادبی رسالہ کے ایک ہی صفحہ پر دو مختلف الفاظ کا استعمال غیر پسندیدہ ہو سکتا ہے۔

میری رائے میں حضرت نحوی کا تم سے متعلق اختلافِ تلفظ خلافِ قاعدہ اور حضرت جالب کے اشعار پر زمانہ کے اعتراض بجا ہیں۔ میں مدت سے ادبِ اُردو کے مطالعہ سے محروم اور ادبی حلقوں کے فیض سے دور افتادہ ہوں اسلئے مجھ میں اس دقیق مسئلہ پر بحث کی استعداد و دستگاہ نہیں ہے۔ مگر چونکہ اُدبا کی نظر میں ہر ادبی مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے، اسلئے مناسب ہوگا کہ با اثر اہلِ الرائے کو اس بحث پر بحث کی دعوت دیجائے اور چونکہ زمانہ اُردو کی اصلاح و تہذیب کا علمبردار ہے یہ بحث بھی اسکے اغراض و مقاصد کی تحقیق و تنقید ہوگی

[illegible]

لطفِ سخن

(سید مقبول حسین احمد پوری)

زندگی اپنی مصیبت سے بھری — دل میں چبھتی ٹیس آنکھوں میں تری
ہوگئیں بیداریاں صید الم — خواب اِن آلام کی صورت گری
ندیاں بہتی ہیں خوں کی ہر طرف — شاخ تہذیب و تمدن ہے ہری
آہ یہ دنیا ہوئی نارِ خلیل — روح پر پڑتی ہے ضرب آذری
عہد زریں کا تصور ہے فریب — حکمرانی پہ ہے عہدِ بربری
اِک مجسّم دکھ ہوا اپنا وطن — خوں رلاتی ہے نگاہ سرسری
مر رہے ہیں نانِ جو کو گلبدن — سرخ رخساروں پہ اشکوں کی تری

اے مرے دل خامشی کا کیا گلہ
سامنے ہے تیری دھڑکن کا صلہ

(از جناب مختار علی صاحب عباسی مختار کوہ آبو)

بساطِ طور رہنِ برق سوزاں ہوتی جاتی ہے — نگاہ جلوہ جو سر در گریباں ہوتی جاتی ہے
یہ کیا یارب نگاہِ فتنہ ساماں ہوتی جاتی ہے — کہ دل تک آتے آتے تیر و پیکاں ہوتی جاتی ہے
خدا جانے کہ کیا انجام ہوگا زندگانی کا — محبت کفر ساماں جزو ایماں ہوتی جاتی ہے
معاذاللہ غصّہ میں کسی کے رخ کی تابانی — یہ سرخی بہرِ افسانے کا عنواں ہوتی جاتی ہے
دعا بیکار آہیں نارسا بے سود ہیں نالے — مری ہر ایک کوشش نذرِ حرماں ہوتی جاتی ہے
گری تھی انتہائے یاس میں جو دیدۂ تر سے — وہی اک بوند محشر خیز طوفاں ہوتی جاتی ہے
چھپانا اُن سے کیفیاتِ دل مختار کب ممکن — تمنائے دلی رخ سے نمایاں ہوتی جاتی ہے

(از حضرت منوّر لکھنوی)

تجھکو فرصت کبھی اے گردشِ دوراں کیوں ہو — خود جو دشمن ہو خدا اُس کا نگہباں کیوں ہو؟
میری ہر سانس ہے اِک شرطِ وفا کی تکمیل — عمر نے ساتھ دیا ہے تو گریزاں کیوں ہو؟

دل خود اپنے ہی لہو سے نہ دکھائے یہ بہار
رنگ و بو کے لئے ممنونِ گلستاں کیوں ہو؟

توڑنا عہدِ ازل کا مجھے منظور نہیں
ترکِ ارماں سے وہ شرمندۂ ارماں کیوں ہو

مرمٹے شوق سے پروانۂ جانباز مگر
وجہِ افسردگیِ شمعِ فروزاں کیوں ہو

جس کو اٹھنا ہو کسی روز وہ پردہ کیسا
جس کو پنہاں نہیں رہنا ہے وہ پنہاں کیوں ہو

رعب دنیا کا یہ چشمِ نگراں پر کیسا
آئینہ دیکھ کے آئینے کو حیراں کیوں ہو؟

کوئی تو عرضِ دعا کے لئے پنہاں رہ جائے
میری قسمت کا ہر اک حرف نمایاں کیوں ہو؟

ہر کوئی سختیِ دوراں کا سزاوار نہیں
ہر کوئی سختیِ دوراں سے پریشاں کیوں ہو؟

جب میں خود اپنی تباہی پہ تلا بیٹھا ہوں
پھر توقف تجھے اے گردشِ دوراں کیوں ہو

دلِ حسّاس پہ احساس کی تہمت تو بجا
غمِ دوراں بھی منوّر غمِ دوراں کیوں ہو

(از جناب نخشب جارچوی)

رازِ الفت کی جو دنیا کو خبر ہو جائے گی
زندگی دشوار سے دشوار تر ہو جائے گی

احتیاطِ شوق و ضبطِ آرزو کے باوجود
مجھ پہ جو گذرے گی اُن کو بھی خبر ہو جائے گی

آپ کے دامن سے وابستہ ہے میری زندگی
آپ جس عالم میں جائیں گے بسر ہو جائے گی

دل تبیر دیدِ جاناں پارۂ سیماب ہے
اک بلا ایسے میں تائیدِ نظر ہو جائے گی

شکوہ تو کرتا مگر نیچی نظر کا کیا جواب
آہ لب تک آتے آتے بے اثر ہو جائے گی

میں سمجھتا ہوں دلِ غم دیدۂ انجام کو
آپ کے ہنستے ہی میری آنکھ تر ہو جائے گی

کون میری سی کہے گا واقعہ یونہیں سہی
ساری دنیا وہ جدھر ہونگے اُدھر ہو جائے گی

یوں نگاہِ ناز کی جنبش کی کچھ قیمت نہیں
جب بھی دانستہ بچے گی کارگر ہو جائے گی

اب مری جانب نظر ہے جب میں دیکھونگا اُدھر
وہ نظر گھبرا کے صرفِ بام و در ہو جائے گی

دل کی بے تابی ترا رنگِ تغافل دیکھکر
کون کہتا تھا کہ اپنی بھی بسر ہو جائے گی

آپ نخشب اضطرابِ دل سے کیوں گھبرا گئے
رفتہ رفتہ یہ کڑی منزل بھی سر ہو جائے گی

تنقید کتب

اعمال نامہ

زیرِ نظر کتاب سر سید رضا علی کی خود نوشت سوانح حیات ہے جو ہمارے صوبہ کی معروف ہستی ہیں۔ نائٹ۔ ایم۔ ایل۔ اے، اور فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہونے کے علاوہ جنوبی افریقہ میں ہائی کمشنر آف انڈیا کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں۔ دوران جنگ میں جبکہ کاغذ کمیاب بلکہ نایاب ہوتا جا رہا ہے آپ نے کم و بیش پانچ سو صفحات کی یہ کتاب سپردِ قلم فرمائی ہے جو نہایت نفیس اور دبیز کاغذ پر چھپی ہے۔

یہ کتاب موصوف کی تصنیف کا پہلا حصہ ہے جو چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ غالباً بعد از جنگ شائع ہوگا اس حصہ میں لائق مصنف نے اپنے بچپن تعلیم و تربیت اور دوسرے مشاغل زندگی کا بالترتیب ذکر کیا ہے جس سے موصوف کے ذہنی و دماغی ارتقا کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے اور یہ پتہ چل سکتا ہے کہ کن واقعات نے آپ کو سیاست میں دلچسپی لینے کے لئے مجبور کر دیا۔ کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی کھل جاتا ہے کہ ارباب حکومت ہندو مسلمانوں کو لڑانے میں کن شاطرانہ چالوں سے کام لیتے رہے ہیں لیکن دونوں باوجود فہم و فراست کے آنکھیں کھولنا نہیں چاہتے اور اس طرح سے زنجیرِ غلامی کو روز بروز مستحکم بناتے چلے جا رہے ہیں۔ مثلاً سر انٹنی میکڈانلڈ نے صوبہ بہار کی عدالتوں میں اردو کے بجائے ہندی میں عرضی پرچیاں دینے کی اجازت مرحمت فرما کر جو تخم ریزی کی تھی اس کا ثمرہ اردو ہندی قضیہ کی صورت میں اہل ملک کے سامنے آج موجود ہے۔ تقریباً سو سالہ ملکی سیاسی حالات کے علاوہ علی گڑھ کالج کی کم و بیش پوری تاریخ اس کتاب میں درج ہے جس سے اس امر پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ ملک آنجہانی اور ان کے ساتھیوں کی روش کو چھوڑ کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد سر سید احمد خاں نے علی گڑھ میں کیوں قائم کی اور وہ اس علیحدگی پر کیوں بضد رہے؛ اور ان کے رفقائے کار اور جانشینوں نے علی گڑھ کالج اور مسلمانوں کی کیا خدمات انجام دیں۔

لائق مصنف کی ابتدائی زندگی کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ چونکہ ایک سنی المذہب دادا اور شیعہ ماں باپ کے سایہ میں پل کر جوان ہوئے ہیں؛ اس لئے قدرتاً شروع ہی سے آپ کو آزاد خیالی اور رواداری کا سبق ملتا رہا ہے۔

مصنف موصوف کو اردو زبان و ادب سے بغایت شغف اور دلچسپی ہے؛ جس کا اندازہ اس کتاب سے ہو سکتا ہے

چنانچہ کتاب کا ایک باب آپ نے محض اُردو شاعری اور ادب کے لئے وقف فرمایا ہے اور اُردو کی ادبی حیثیت اصلی میں روشن کی ہے۔ آخر میں اُردو کتابت کی اصلاح کے متعلق بھی چند تجاویز پیش کی ہیں جن سے آپ کو اتفاق ہو یا نہ ہو، کم از کم مصنف کی بلند نگہی اور نکتہ رسی کا ضرور اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

گیارھواں باب بھی خصوصیت سے پڑھنے کی چیز ہے جس کو لائق مصنف کے الفاظ میں گلستانِ سعدی کا باب پنجم سمجھنا چاہیے۔ اس باب میں موصوف نے "حسن و محبت کی جیتی جاگتی آٹھ تصویروں" کے عنوان سے اپنے چند نہایت سنجیدہ، ممتاز اور سربرآوردہ احباب کی داستانِ محبت کو بڑے دلکش انداز میں قلم بند فرمایا ہے۔ ان آٹھوں تصویروں کے دیکھنے کے بعد ہماری نگاہیں ایک ایسے نویں شخص کے لئے متجسس ہو جاتی ہیں جو اپنی داستانِ عشق اس انداز سے سناتا کہ عہد اکبری کے نو رتنوں کی طرح محبت کے یہ نورتن بھی لافانی ہو جاتے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس بے تکلف محفل میں احباب نے سر رضا علی موصوف سے اپنی داستانِ محبت سنانے کی استدعا نہیں کی لیکن آپ خود بھی اگر کسی "پردۂ دلآویز" میں لپٹے ہوئے بیٹھے ہوں تو کیا عجب ہے۔

دیکھنا حضرتِ واعظ تو نہیں ہیں اے دوست کوئی میٹھا نظر آتا ہے پسِ خم مجھ کو

بہر حال یہ سب داستانیں بیحد دلچسپ ہیں۔ چھٹی تصویر خصوصیت سے عمدہ اور سبق آموز ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ داستان گو اور اُن کی محبوبہ کس قدر مضبوط اور بلند کیرکٹر کے لوگ تھے، اور اُن کو اپنے جذبات پر کتنا قابو حاصل تھا۔

سر رضا علی کی اس تصنیف سے چند جدید انکشافات بھی ہوتے ہیں جن کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔ مثلاً یہ کہ غالبؔ شیعہ تھے لیکن مردہ بدست زندہ ہونے کی حیثیت سے جبراً اُن کی تجہیز و تکفین سُنّی طریقہ پر کی گئی۔ صاحب موصوف نے اپنے اس دعوے کی دلیل میں "تجلیات"[1] کے صفحہ ۱۹ کا حوالہ دیا ہے، اور لکھا ہے کہ غالبؔ کے زمانہ میں یہ مسئلہ بڑا اہم اور اختلاف مابین کا سبب بن گیا تھا کہ آیا خالقِ عالم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مثل پیدا کرنے پر قادر ہے یا نہیں۔ چنانچہ ایک گروہ کہتا تھا کہ خدا قادر ہے اور دوسرا کہتا تھا نہیں ہے۔ لیکن چونکہ غالبؔ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ خدا ان کا مثل نہیں پیدا کر سکتا۔ اس لئے اُنھوں نے ایک خط حضرت سلطان العلماء مولوی سیّد محمد صاحب کے نام جو ایک شیعہ مجتہد تھے اور لکھنؤ میں رہتے تھے بھیجا جس میں اپنے عقیدہ کا اظہار فرمایا اور ان سے اس بارہ میں استصواب کیا کہ اُن کی کیا رائے ہے۔

اول تو یہ بحث ہی قطعاً بیکار ہے کہ غالبؔ یا کسی اور دوسری مشہور نامور ہستی کا کیا مذہب تھا، کیونکہ کسی شخص کی عظمت کا سکہ ہمارے دل پر محض اس کی مذہبی یک رنگی کے باعث نہیں بیٹھتا بلکہ اُن کے ذاتی جوہر کی بنا پر ہم اس کی

[1] سوانح حیات مفتی محمد عباس صاحب مرحوم مؤلفہ جناب عزیز لکھنوی مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ۔

واجب الاحترام قرار دیتے ہیں۔ اس لئے غالب شیعہ کیا معنی کسی مذہب کے بھی پیرو ہوتے تب بھی اُن کی شاعری کا لوہا ہم کو ماننا پڑتا۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کیلئے اس بحث کو مناسب بھی سمجھ لیا جائے تو مولوی صاحب موصوف سے غالب کا ایک مسئلہ مختلف فیہ کے متعلق استصواب کرنے سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ اُن کا خود کا مذہب بھی شیعہ تھا۔ بقول لائق مصنف کے اگر اس مسئلہ نے اتنی عالمگیر حیثیت اختیار کر لی تھی تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ غالب جیسے معقول پسند دماغ اور ہر چیز کو عقل و درایت کی روشنی میں دیکھنے والے شخص نے اُن سنی المذہب مولویوں سے استصواب نہ کیا ہوگا جو دہلی کے اندر اور دہلی سے باہر رہتے تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ غالب نے خود بھی اس مسئلہ پر غور کیا ہوگا اور دوسرے مختلف فرقوں کے مولویوں سے بھی مشورہ کیا ہوگا۔ محض یہ بات مان لینا کہ خدا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ثانی پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، شیعہ یا سُنّی قرار پانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اصل میں غالب کا مذہب تو کھلا ہوا ہے۔ وہ خود کہتا ہے   رباعی

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری   کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صوفی!   شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری

یا پھر کہتا ہے کہ :-

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم   ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اس میں شبہ نہیں کہ غالب کو حضرت علیؓ سے بڑی عقیدت تھی اور وہ تفضیلیہ مذہب کے پیرو کہے جا سکتے تھے لیکن محض حضرت علی کا اُنس اُن کو شیعہ نہیں بنا سکتا کیونکہ حبِ علیؓ ایک علحدہ چیز ہے اور بغضِ معاویہ قطعاً دوسری۔ آج بھی بہت سے ایسے سُنّی حضرات ہیں جن کو خلفائے ثلاثہؓ کی محبت و عقیدت کے ساتھ ساتھ حضرت علی سے شیعوں جیسی محبت ہے۔ اس کے علاوہ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ سُنّی ماں باپ کے گھر پیدا ہوئے، سُنّی بیوی سے عقد کیا اور مرتے دم تک سُنّی طریقوں پر عمل کرتے رہے۔ ان حالات میں سر رضا علی کا یہ فرمانا کہ غالب شیعہ تھے اور اُن کی تکفین جبراً سُنّی انداز پر کی گئی عجیب و غریب بات معلوم ہوتی ہے۔

آخر میں یہ بات عرض کر دینی بھی بیجا نہ ہوگی کہ اس کتاب کے مطالعہ سے مصنف کا مدحیہ پہلو نکلتا ہے۔ کمزوریاں [illegible] بشریت ہیں اور اس کلیہ سے مصنف موصوف بھی مستثنیٰ قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ لیکن آپ کو کتاب میں کوئی مقام ایسا نہ ملے گا جہاں آپ لائق مصنف پر نکتہ چینی تو کجا اُنگلی اُٹھانے کی بھی جرأت کر سکیں۔ کاش موصوف یہ کتاب Confession of Rousseau یا مہاتما گاندھی کی خود نوشت سوانح عمری کے انداز پر لکھتے۔ خود نوشت سوانح حیات کے مصنف کو اپنی خامیوں کے اظہار میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرنا چاہیئے، کیونکہ ان خامیوں کے اظہار سے نہ صرف اس کی بیباکی، راست گفتاری اور اخلاقی جرأت کا پتہ چلتا ہے بلکہ اسکی صحیح عظمت بھی ہمارے دلوں پر اسی وقت قائم ہوتی ہے۔

مصنف کا طرزِ تحریر کافی شگفتہ اور سلیس ہے "حق تو یہ ہے" کی بار بار تکرار ناگوار گذرتی ہے جس کا استعمال اُن کو بے حد مرغوب معلوم ہوتا ہے۔ قیمت مبلغ آٹھ روپیہ ہے اور غالباً خود مصنف یا دہلی پرنٹنگ ورکس سے طلب کی جا سکتی ہے

(ح۔ ی۔ ع)

لالہ و گل

سید مجاہد حسین کاظمی کے نو مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جو انڈین پریس الہ آباد نے شائع کیا ہے۔ مصنف کا طرزِ تحریر دلچسپ اور پُر اثر ہے۔ حالانکہ کئی افسانے ایک ہی خیال کے ماتحت لکھے گئے ہیں اور ان میں ایک ہی طرح کے جذبات کار فرما ہیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ، جس کے دیکھتے ہوئے قیمت ۱۲ بہت مناسب ہے۔

منیجر انڈین پریس الہ آباد سے مل سکتی ہے۔

ہندوستان ہمارا

مسٹر سری رام شرما ایم۔ اے کی ۲۶ صفحات کی مختصر سی کتاب ہے جس میں ہندوستان پر تاریخی، جغرافیائی، معاشرتی اور سیاسی حیثیت سے سنجیدہ نظر ڈالی گئی ہے۔ کتاب کافی دلچسپ اور مفید معلومات سے پُر ہے۔

قیمت ۴ ہندوستانی پبلشرز دہلی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

۱۹۴۳ء کی معیاری غزلیں اور نظمیں

شعرائے اُردو کی اہم غزلیں اور ۲۹ نظمیں شامل ہیں جو پبلشرز کی رائے میں ۱۹۴۳ء کی معیاری غزلیں اور نظمیں ہیں۔ اس انتخاب میں کئی شعرا مثلاً ساغر و مجاز وغیرہ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ غزلوں و نظموں کا انتخاب بھی اس سے بہتر ہو سکتا تھا۔ مثلاً حضرت روش صدیقی کی جو نظم اس مجموعہ میں شامل کی گئی ہے اس سے کہیں بہتر نظمیں انہوں نے پار سال کہی ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہر شخص کا انتخاب اُس کے ذوق کے مطابق ہوتا ہے، تاہم بہترین طریقہ کار یہ ہے کہ انتخاب کلام خود شعرا پر چھوڑ دیا جائے اور وہ اپنا بہترین کلام خود منتخب کر دیا کریں۔ کتاب کی اشاعت میں کاغذ کی غیر معمولی کفایت روا رکھی گئی ہے۔ لکھائی چھپائی بہت معمولی ہے۔ تاہم یہ سلسلہ دلچسپ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ پبلشرز سال آئندہ اس سے بہتر اور زیادہ دیدہ زیب مجموعہ پیش کرنے میں کامیاب ہونگے۔ قیمت ایک روپیہ ۸، ہندوستانی پبلشرز دہلی سے مل سکتی ہے۔

پتھر سے ہیرا

ایک بے ماں باپ کے بچہ کی سرگذشت ہے جس نے اچھی تربیت کے زیر اثر ترقی کی اور رفتہ رفتہ ایک امیر تاجر ہو گیا۔ کتاب بچوں کے لئے مفید ہے قیمت دو روپیہ ۸ جو کتاب کے دیکھتے ہوئے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

نیا کتاب گھر اُردو بازار جامع مسجد دہلی سے خریدی جا سکتی ہے۔

باغی لڑکی

محترمہ شفیق بانو صاحبہ کے ۱۴ افسانوں کا مجموعہ ہے جو نیا کتاب گھر اردو بازار جامع مسجد دہلی نے
شائع کی ہے۔ افسانے معمولی ہیں، کہیں کہیں زبان کی خامیاں بھی ہیں لکھائی چھپائی و کاغذ نہایت معمولی قیمت ۱۲،

چاند سورج کی چوری

سراغرسانی کا ناول ہے۔ آجکل یورپ میں سراغرسانی کے ناول سائنٹفک معلومات کے زیر اثر لکھے جاتے ہیں
یہ ناول زیر نظر پرانے سراغرسانی کے افسانوں کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ شائقین نیا کتاب گھر دہلی سے طلب فرمائیں

پنکھڑیاں

یہ مسٹر محمد رحیم چمن کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ آجکل اردو میں افسانے بڑی کثرت سے لکھے جاتے ہیں
لیکن آج سے بیس سال بعد ان میں سے کتنے افسانے پڑھے جائیں گے اس کا جواب مستقبل ہی دیگا۔ اس مجموعہ
میں سب قسم کے افسانے ہیں۔ اچھے بھی ہیں اور معمولی بھی۔ لکھائی چھپائی معمولی ہے اور کتابت کی غلطیاں بکثرت ہیں
قیمت ۱۲، ملنے کا پتہ: نیا کتاب گھر۔ دہلی۔

ہندی کے مسلمان شعراء

۴۰ صفحات کی اس مختصر سی کتاب میں علاوہ پیش لفظ و دیباچہ کے ہندی شاعری کی خصوصیات پر
روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، اور مسلمان بادشاہوں کی قدردانی کا بھی مختصر تذکرہ کیا گیا ہے۔ پچیس ۲۵
شعرا کے مختصر حالات اور ان کے کلام کے نمونے بھی درج کئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس مختصر پیمانہ پر یہ کتاب لکھی گئی ہے
وہ اس موضوع کے لئے ناکافی ہے۔ کتاب زیر نظر میں ہندی کے کئی مسلمان شعرا کے نام درج ہونے سے رہ گئے ہیں مثلاً
حسن خاں جس کی بھگتی کی شاعری سور داس کی شاعری سے ٹکر لیتی ہے۔ کبیر صاحب کو مسلمان شاعر بتایا گیا ہے
حالانکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ہندو تھے۔ بایں ہمہ کتاب اس بنا پر قابل قدر ہے کہ چند ہی صفحات میں وہ پڑھنے
والے کو ہندی کے متعدد مسلمان شعراء سے روشناس کر دیتی ہے۔ کتاب عبد اللہ بٹ صاحب کی تصنیف ہے، لکھائی
چھپائی اچھی اور قیمت ۸ر مناسب ہے۔ کتاب مکتبۂ اردو لاہور سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

کٹھ پتلیاں

ایک ایکٹ کا مختصر ڈرامہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی قسمت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہے، سوچتا کچھ ہے اور
ہوتا کچھ ہے پھر بھی جیسے اعمال ویسا ہی نتیجہ۔ اس تمثیل میں پرانی اور نئی تہذیب کا موازنہ کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ آجکل
[illegible] سطحی زندگی کے مقابلہ میں پرانی تہذیب قابل ترجیح ہے [illegible]
[illegible] زندگی کے مختلف پہلوؤں پر فلسفیانہ [illegible] کی کوشش کی ہے قیمت [illegible]
[illegible] دہلی سے مل سکتی ہے۔

جدید سائینس نے خون کی خرابی کا علاج آسان کر دیا

جلاب کے بغیر جسم کو کندن بنا لیجئے



پہلے زمانہ میں بڑے بڑے جلابوں کے بغیر خون کی صفائی ناممکن تھی لیکن جدید سائینس نے اس مشکل علاج کو بھی آسان کر دیا۔ چنانچہ آجکل ہر شخص جلاب لینے کے بجائے صافی استعمال کرتا ہے۔ صافی بغیر جلاب کے جسم کو کندن بنا دیتی ہے اور ان تمام فاسد مادوں کو خارج کر دیتی ہے جو موسم بہار اور گرمی میں حدت پانے کے بعد ابل پڑتے ہیں اور بیشمار بیماریوں کا سبب بن جاتے ہیں۔ صافی زمانہ حاضر کی وہ حیرت انگیز ایجاد ہے جس کا چند روزہ استعمال جسم کی کایا پلٹ کر رکھ دیتا ہے۔ بگڑا ہوا خون بچوں کے خون کی طرح صاف ہو جاتا ہے پھوڑے پھنسیاں مہاسے داغ۔ دھبے اور پرانا قبض سب دور ہو جاتے ہیں۔ فساد خون کی تمام بیماریاں جاتی رہتی ہیں رنگ خوب نکھر آتا ہے صافی پاخانہ، پیشاب اور پسینہ کے ذریعہ سے غیر محسوس طریقہ پر فاسد مادوں کو جسم سے نکال کر پھینک دیتی ہے۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے لئے یکساں مفید ہے



قیمت فی شیشی (۱۰ خوراکیں۔ ۱۰ دس دن کیلئے) دس آنے۔

موسم بہار میں تن درست رہنے کے لئے رسالہ ہمدرد صحت دوا خانہ سے مفت لے کر پڑھیے۔

تار کا پتہ ہمدرد دہلی | ہمدرد دواخانہ دہلی

مقامی حضرات ہماری ایجنسی [illegible]

...و شاعروں پر فراق گورکھپوری کے چھ کالے...

...کی اور بیانیاتی تبصرہ کی نایاب مثال

تین سو صفحات مجلد ——— قیمت فی ...

...یہ کتاب ایک دریافت کی حیثیت رکھتا ہے اور اردو نثر کی قوت کا نمونہ ہے

ناشر ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس یونیورسٹی ...

زمانہ بک ایجنسی کانپور سے بھی طلب فرما سکتے ہیں

یادگارِ پریم چند

مشہور رسالہ زمانہ کا ...

جس میں منشی پریم چند کے ...

بہترین انشا پردازوں اور شاعروں ...

مضامین نثر اور ...

... کی زندگی ...

...

اولاد والو اگر اپنی اولاد کو خوش و خرم رکھنا ہے تو

بال سدھا

کا استعمال برابر جاری رکھئے کہ تندرست ...

... بچے بھی اس کے ...

...

چوتھا ایڈیشن

[illegible] دسمبر ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں حسب ذیل تبدیلیاں اور اضافے ہوئے

[illegible] ۱۸۵۷ء کے حالات مفصل لکھے گئے۔

ترقی اُردو کے قیام اور اُس کی ترقی کی تاریخ دی گئی۔

[illegible] دیوبند کے حالات کے سلسلے میں اس کے بانی مولانا محمد قاسم صاحب کے تعلیمی وصیت [illegible]

اضافہ کیا گیا ہے جسمیں مذہبی اداروں کو امراء سے مالی امداد حاصل کرنیکی ممانعت کی گئی ہے۔

[illegible] خاکساران کے حالات اور طریقہ کار میں نمایاں تبدیلی کی پوری کیفیت درج کی گئی ہے۔

[illegible] اداروں کے سالانہ جلسوں کے حالات مکمل کردیے گئے ہیں۔

[illegible] سٹیفورڈ کرپس کی تجاویز کے متعلق کانگریس اور مسلم لیگ کے رویہ کی کیفیت درج ہے۔

[illegible] انڈیا مومن کانفرنس اور آزاد مسلم کانفرنس دہلی کے حالات دیے گئے ہیں۔

[illegible] سیاسی حفاظت کے عنوان کے تحت صوبہ متحدہ میں ۳۵ سال کے بلووں کی تعداد [illegible] کی گئی ہے جن سے حیرت انگیز انکشاف ہوا۔

مسلمانوں کے موجودہ منصوبے کے تحت میں دکھایا گیا ہے کہ سیاسی حالات میں [illegible] کے ساتھ مسلمانوں کا مستقبل کن وجوہ کی بنا پر روشن ہے۔

مکتبہ جامعہ دہلی قرول باغ

[illegible] اور ایجنسیاں:- جامع مسجد دہلی - امین آباد لکھنؤ - پرنسس بلڈنگ بمبئی
پبلشرز یونائیٹڈ لاہور - سرحد بک ایجنسی - پشاور

[illegible] مطبع ... جامعہ ... پبلشر ... مکتبہ جامعہ دہلی

زمانہ

جلد ۸۲ — مئی ۱۹۴۴ء — نمبر ۵

بھاشا کا ایک گمنام شاعر

(از مولٰنا مائل نقوی صدر انجمن ترقی اُردو بھوپال)

مسلمان ہندوستان میں آٹھویں صدی عیسوی میں آئے، لیکن سندھ سے آگے نہ بڑھے۔ گیارھویں اور بارھویں صدی میں محمود غزنوی اور محمد غوری شمالی ہند میں داخل ہوئے، اُن کی آمد اگرچہ عارضی تھی لیکن تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ ان سلاطین نے ملک میں داخل ہوتے ہی یہاں کی زبانوں سے ہمدردانہ برتاؤ شروع کر دیا۔ محمود غزنوی نے پنجاب کو اپنی قلمرو میں شامل کر کے یہاں اپنا سکّہ جاری کیا اور اس پر وہ عربی عبارت جو سلطان کے تمام سکّوں پر مسکوک تھی حکماً ہندی رسم الخط میں کندہ کی گئی۔ محمد غوری کے زمانہ میں مسلمانوں کے کئی خاندان باہر سے آ کر ہندوستان میں آباد ہوئے، جنھوں نے دیسی بانوں کی طرف حکومت کی توجہ دیکھکر انھیں حاصل کرنے کی کوشش کی اور اتنی مہارت پیدا کی کہ نہ صرف ہندی میں بخوبی بات چیت کر سکتے تھے بلکہ اس زبان میں شعر بھی کہتے تھے۔ مسعود۔ قطب علی۔ اکرم۔ فیض اس عہد کے مشہور ہندی شاعر ہوئے ہیں۔

مسلمان فرمانرواؤں میں پہلے پہل "خاندان غلامان" نے دلّی کو پایۂ تخت بنا کر ہندوستان میں مستقل اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اُنھوں نے ابتدا ہی سے ہندی کی سرپرستی شروع کر دی۔ امیر خسرو (جن کا انتقال [illegible] میں ہوا) ان بادشاہوں کے درباری شاعر تھے۔ ان کے فارسی اشعار کی تعداد

تین لاکھ ہے اور اسی قدر تعداد اُن کے ہندی کلام کی بھی بتائی جاتی ہے۔ اِن شعرا کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ہندی کو محض وقتی ضرورت کی حد تک حاصل نہ کرتے تھے، بلکہ اسے اپنی مادری زبان کے برابر جگہ دیتے تھے۔ اس ضمن میں خسرو کی یہ غزل (جس کا ایک مصرع فارسی اور ایک ہندی میں ہے) بہت مشہور ہے:

زحالِ مسکیں مکن تغافل دُرائے نیناں بنائے بتیاں
چو تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

خسرو کے بعد مسلمان شعراء کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا جو ان کے نقشِ قدم پر چلکر ہندی میں دادِ سخن دیتا رہا، اور ان کے شیریں کلام سے ہندی زبان کے ادب میں بیش بہا اضافہ ہوا۔

شیر شاہ سوری کے عہد میں ملک محمد جائسی نے اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی، اب تک مسلمان شاعر ساون، بھجن، کبت وغیرہ کہتے تھے، مگر انھوں نے "پدماوت" کے نام سے ایک طویل قصہ نظم کرکے ایک مستقل کتاب پیش کی۔ اکبر کا عہدِ حکومت اس باب میں یادگار ہے کہ ہندوستان میں صدیوں تک ہندو مسلمانوں کے ایک ساتھ رہنے اور شگفتہ تعلقات کے باعث اس زمانہ سے ایک مشترکہ خوشگوار تہذیب کا آغاز ہوا، دونوں قوموں نے نہایت گرویدگی کے ساتھ ایک دوسرے کے ادب میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کی، مسلمان شعرا کی ایسی کثیر تعداد معرضِ وجود میں آئی جس نے ہندی اور صرف ہندی کو اپنے اظہارِ جذبات کا ذریعہ بنایا۔ ان کے تفصیلی ذکر کے لئے تو ایک دفتر چاہیئے۔ اس مضمون میں صرف ماضی قریب کے ایک گمنام مسلمان شاعر کا حال لکھا جاتا ہے جس نے بھاشا کی شاعری میں علمِ استادی بلند کیا تھا

اِن کا نام فضل احمد اور عرف جنگلی تھا۔ ۱۲۴۰ھ میں بڑا گاؤں تحصیل بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ فضل احمد نام اُن کا خود رکھا ہوا تھا، اس کا ایک سبب خاص تھا۔ ایک مرتبہ ان کے خاندان کے کچھ لوگ جن میں ان کی والدہ بھی تھیں کسی دُور کے قصبہ میں مہمان جا رہے تھے۔ راستہ میں مرادا نامی ایک گاؤں تھا، اس کے قریبی جنگل میں یہ قافلہ شب باشی کے لئے ٹھہرا ہوا تھا، یہیں ان کی ولادت واقع ہوئی۔ خاندان کے بزرگ مقام کی مناسبت سے انھیں "جنگلی" کہنے لگے، آگے چل کر یہی اُن کا عُرف ہوگیا۔ یہ بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوئے تھے، والدین کو حضرت مدار سے خاص عقیدت تھی، اس لئے ان کا نام مدار بخش رکھا گیا۔ جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو اس میں شرک کی بُو آئی، لہٰذا اسے بدل کر فضل احمد اختیار کیا۔

قدرت کا یہ عجیب اُصول ہے کہ جن ہستیوں کو آگے چلکر بڑا بنانا چاہتی ہے ابتدا سے اُن کے واقعاتِ زندگی کو ایک مخصوص نظام کے ماتحت ترتیب دیتی ہے۔ چنانچہ جنگلی شاہ دو سال کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اس کے دو ہی سال بعد ماں کی آغوشِ شفقت سے بھی محروم ہوگئے۔ چچا جی نے

ملے چھپکر

بڑی محبت سے پرورش کی۔ مدرسات میں جو تعلیم ممکن ہو سکتی تھی دی گئی۔ لیکن جہاں تک ان سے ہو سکا تعلیم دونوں سے بھاگتے ہی رہے، صحت بہت اچھی اور ہاتھ پاؤں مضبوط تھے، شرارت رگ و ریشہ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی جس شرارت میں شریک ہوتے تھے، اسمیں اپنے ساتھیوں سے منزلوں آگے نکل جاتے تھے۔ گاؤں کے لڑکوں کا سردار بننے کے لئے کسی بات کی کسر نہ تھی، لہٰذا اُن کی ایک ٹولی بنا کر خود اُس کے سرگروہ بنے قریب دجوار کے کھیت، باغ تالاب اُن کی تاخت و تاراج کا تختۂ مشق تھے۔ شادی ہو جانے کے بعد لڑکپن کی شرارتیں تو ختم ہوئیں مگر ورزش، کشتی گیری اور تیراکی کا شوق ہوا، دُور دُور جا کر کشتی مارتے تھے، بہادری کے زور سے سارے علاقہ پر اپنا سکہ جمائے ہوئے تھے۔

جنگلی صاحب اپنے وطن میں اپنی آزادانہ طبیعت اور زور آوری کے نشہ میں چور تھے کہ اُسی زمانہ میں دیوہ سے حاجی وارث علی شاہ صاحب کی بزرگی کا غلغلہ بلند ہوا "بڑے گاؤں" سے دیوہ پانچ کوس سے بھی کم ہے کچھ لوگ دیوہ جا کر حاجی صاحب کے مرید ہو آئے اور اُن سے اپنی پیر کی بزرگی کا حال بیان کیا جنگلی صاحب، حاجی صاحب کے ہم سن تھے، پھر جوانی کا جوش کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا، انھوں نے کشف و کرامات کے بیانات کو مذاق میں اُڑا دیا، اور جو لوگ ان کے سامنے حاجی صاحب کے طریقت کی تعریف و توصیف کرتے تو یہ ہر ایک کی مخالفت کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ انھیں حاجی صاحب سے ایک ضد سی ہو گئی اور یہ علانیہ انکے مخالف بن گئے۔

اِن واقعات کے کچھ عرصہ بعد حاجی صاحب بڑے گاؤں تشریف لے گئے۔ دورانِ گفتگو میں کسی نے جنگلی کا نام لیا، آپ نے فرمایا "بُلا لاؤ" آدمی بھاگے ہوئے اُن کے پاس آئے، مگر یہ بھی اپنی ضد کے پکے تھے کسی طرح چلنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ بلکہ جو لوگ بُلانے کے لئے آئے تھے اُن سے بحث شروع کر دی، آخر بمشکل تمام راضی ہوئے۔ اب حسنِ اتفاق ملاحظہ ہو کہ اِدھر سے یہ چلے اُدھر دیر ہو جانے کی وجہ سے حاجی صاحب ان سے ملنے کے لئے خود روانہ ہو گئے۔ وسطِ راہ میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ نگاہ ملتے ہی دل کا عالم ہی اور ہو گیا حاجی صاحب ان کا ہاتھ پکڑ کر علیحدہ لے گئے، فرمایا "جنگلی اب تم مرید ہو جاؤ" انکار کی مجال نہ تھی، بیعت کے لئے ہاتھ بڑھا دیا اور جنگلی سے جنگلی شاہ ہو گئے۔

ہونے کو تو مرید ہو گئے، لیکن دوسرے مریدوں کی طرح ان کے دل میں عقیدت کا کوئی خاص جذبہ نہ تھا۔ ایک مدت کے بعد حاجی صاحب پھر بڑے گاؤں تشریف لائے۔ دورانِ قیام میں ایک دفعہ رات کے وقت حاجی صاحب اُن کے زانو پر سر رکھ کر سو گئے۔ ایک حالت سے بیٹھے بیٹھے انھیں تکلیف محسوس ہونے لگی۔ خیال کیا کہ رات ابھی اتنی باقی ہے کروں تو کیا کروں، اس خیال کا آنا تھا کہ دفعۃً حاجی صاحب اُٹھ بیٹھے اور فرمایا "جنگلی! تم تھک گئے ہو جاؤ اب سو رہو" یہ بہت عذر کرتے رہے لیکن حاجی صاحب نے

مگر یہ وہیں بیٹھ گئے اور خیال کیا کہ اچھا! اب جو بات میں دل میں سوچتا ہوں اگر بغیر کہے حاجی صاحب نے اُسے بتا دیا تو بیشک مان جاؤں گا، دل ہی دل میں کہنے لگے کہ "مرید تو ہو گیا لیکن اس سے پیشتر جو کچھ میرے اعمال رہے ہیں اُن کا کیا حشر ہو گا۔" یہ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ حاجی صاحب پھر ہیدار ہوئے اور ارشاد فرمایا "خنگی! سُنا! آدمی جب مُرید ہوتا ہے تو ایسا ہو جاتا ہے جیسے ماں کے پیٹ سے ابھی پیدا ہوا ہے۔" مرشد نے یہ کلمات کچھ اس ادا سے کہے کہ اعتقاد اور عشق کا تیر اِن کے دل میں پیوست ہو گیا۔ رخصت ہوتے وقت حاجی صاحب نے فرمایا "خنگی! تم کچھ کہا کرو" اُنھوں نے عرض کی "سرکار میری لیاقت جو کچھ ہے آپ پر ظاہر ہے، کبھی اُستادوں کی صحبت نہیں اُٹھائی، شاعری سے کوئی سروکار نہیں رکھا کس طرح کہا کروں" اس پر حاجی صاحب نے کہا "خنگی! تم ضرور کہا کرو۔"

حاجی صاحب کے چلے جانے کے بعد محض یہ تعمیل ارشاد کچھ کہنے بیٹھے، مگر کچھ بھی نہ سوجھا۔ آخر ایک ٹھمری جو کبھی سُنی تھی اُس کا انترہ یاد آ گیا۔ اُسی وزن پر کچھ لفظ سوچے طبیعت پر زور دینا تھا کہ کشتِ زارِ فکر کو بارانِ مضامین نے سیراب کرنا شروع کیا۔ ایک ہی نشست میں کئی ٹھمریاں کہہ ڈالیں۔ اس کے بعد ذرا ہمت بڑھی اور اُردو میں کہنے کی کوشش کی، اس میں بھی اچھے اچھے شعر نکالے۔ ایک ابتدائی غزل کا مطلع ہے:۔

ہمارے گھر میں اپنا گھر بنائے جس کا جی چاہے ۔۔۔ جگہ پاکیزہ ہے بستر لگائے جس کا جی چاہے

پھر فارسی میں طبع آزمائی کرنا چاہی، مُقیماں زبانی یاد تھا، اُس کے شعروں پر جو مصرعے لگانا شروع کئے تو پوری کتاب تضمین کر ڈالی۔ اب جو طبیعت میں روانی پیدا ہوئی تو یہ حالت تھی کہ دفتر کے دفتر لکھے جاتے تھے مگر مضامین کی آمد کم نہ ہوتی تھی۔

ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو اس واقعہ سے حیرت ہو۔ لیکن تعجب کی کوئی بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قدرت بعض طبیعتوں میں کچھ وصف اس طرح ودیعت کر دیتی ہے کہ اُن پر عدم احساس کا گہرا پردہ پڑا رہتا ہے اور خود ان اوصاف کے حامل بھی اپنی خوابیدہ صلاحیت سے مطلق بے خبر ہوتا ہے۔ پھر کوئی اہم واقعہ یا غیر معمولی حادثہ اس پردہ کو ہٹا دیتا اور فطرت کا اصلی حُسن تجلّی بن کر چمکنے لگتا اور دیدۂ نظارگیاں کو خیرہ کر دیتا ہے۔ ایران میں حکیم سنائیؔ اور خواجہ حافظ شیرازی اور ہندوستان میں والمیک جی، کالی داس اور تلسی داس کے واقعاتِ زندگی اس حقیقت کے شاہد ہیں[1]

یہ سوال بہت دلچسپ ہے کہ خنگی شاہ نے بھاشا کو اپنے اظہارِ جذبات کا ذریعہ کیوں بنایا۔ درحقیقت قدرت نے ایشیا کی تمام زبانوں میں فارسی اور برج بھاشا کو شاعری اور صرف شاعری کے لئے وضع کیا ہے۔ ایران

---

[1] حضرت ریاض خیرآبادی نے اپنی شاعرانہ زندگی کے متعلق بھی اسی قسم کا ایک واقعہ [illegible] بیان فرمایا تھا (ا۔ ن)

کی بہار اور برج کا سبزہ زار دلوں میں وہ البیلا کیفیت پیدا کرنے میں ایک خاصیت رکھتے ہیں پیغمبر حسن مجازی کا مسکن ایران ہے تو ہندوستان کے فدائے عشق شباب کی جولان گاہ برج۔ تاثراتِ محبت کے اظہار کے لئے جو سوز و اثر اس زبان میں ہے وہ ہندوستان کی کسی دوسری زبان کو میسر نہیں، اس کا بول میٹھا ہے، باتیں کرنے میں منہ سے رس ٹپکتا ہے جنگلی شاہ کی مادری زبان بھاشا تھی، ان کے محبوب یعنی مرشد کی زبان بھی یہی تھی، عشق کے سوز و گداز کی تشریح اور محبوب سے راز و نیاز کے لئے اس سے بہتر کونسی زبان ہو سکتی تھی؟ لہٰذا انھوں نے دوسری زبانوں سے قطع نظر کرکے بھاشا کو اپنے جذبات کی ترجمانی کیلئے انتخاب کیا

ان کا کلام محبت کی شوریدگی سے لبریز ہے، معلوم ہوتا ہے کہ دل کے پیمانہ سے عشق کی شراب چھلک رہی ہے ان کے کلام کا دوسرا وصف "اثر" ہے جو نامعلوم طریقہ سے پڑھنے والے کے دل کو گرما دیتا ہے۔ بھاشا کے ادب کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ "اثر" اس زبان کی ممتاز خصوصیت ہے۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ بھاشا کا شاعر پیچیدہ تشبیہوں، دُور از کار استعاروں اور مبالغوں کے چکر میں کبھی نہیں پڑتا، وہ کسی منظر کو جس طرح دیکھتا یا سمجھتا ہے اُسی طرح اُس کی تصویر کھینچ دیتا ہے، سادگی اور حقیقت اپنے اندر ایک کشش رکھتی ہیں اس کے ساتھ جب عشق کا سوز بھی شامل ہو جاتا ہے، تو دلوں پر تاثیر کی بجلیاں گرتی ہیں۔ پھر عشق کی بھی قسمیں ہیں مجازی اور حقیقی۔ مجاز عارضی و فانی ہے اسی لئے اس کے اثرات بھی ناپائدار ہوتے ہیں، مگر حقیقت لافانی ہے تو اس کا اثر بہت گہرا اور ابدالآباد تک باقی رہتا ہے۔ فارسی زبان کے ہزاروں شاعر ہوئے اور سب ہی نے عشق و محبت کے ترانے گائے۔ مگر جو اثر شعرائے متصوفین کے کلام میں ہے آج تک تازہ ہے۔ جو آگ سعدی رومی۔ حافظ اور خسرو کے دلوں میں لگی تھی اور جس کے شعلے اشعار کی صورت بن کر نکلے تھے وہ صدیاں گزر جانے پر بھی آج دلوں میں سوز و گدا[redacted]یدا کر رہے ہیں۔ خود بھاشا میں صدہا شاعر ہوئے لیکن تلسی داس اور سور داس کا کلام جس تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے اس کا جواب ملنا غیر ممکن ہے۔

یہی حال جنگلی شاہ کے کلام کا ہے، انھوں نے اپنی ساری عمر پیر و مرشد کے عشق و عاشقی میں بسر کی، جو کچھ کہا حقیقی محبت کے دریا میں ڈوب کر کہا۔ محبت کے لئے کہا اور صاف صاف کہا، جوشِ محبت کے لحاظ سے ان کا کلام سور داس کے کلام سے ٹکر کھاتا ہے جو کرشن کنھیا کے بھگت تھے۔ ان بزرگوں کے کلام میں شاید بعض باتیں کسی قدر عُریاں معلوم ہوں لیکن ہندی شاعری کا مذاق اردو سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں تکلف اور تصنع کے بجائے تاثراتِ محبت کو سیدھے سادے اور معصومانہ انداز میں بیان کیا جاتا ہے، جو جذبات سینے میں موجزن ہوتے ہیں کلیجہ چیر کر محبوب کے سامنے رکھ دیئے جاتے ہیں عشق کی سرمستی عقل کی احتیاط پر غالب ہوتی ہے۔ بھاشا کا کلام اسی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیئے

بہر حال اب جنگلی شاہ کے کلام کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں:۔

ہولی | بھاشا کی شاعری میں ہولی سب سے زیادہ دلدوز چیز ہے، اول تو یہ موسم ہی کچھ اس طرح اثر انداز ہوتا ہے کہ درد مند دلوں میں محبت کی آگ سلگ اُٹھتی ہے۔ پھر اس فصل کے مشاغل اسے اور ہوا دیتے ہیں ہندی شعراء نے نظم کی اس صنف میں اپنے شاعرانہ کمال کے جوہر دکھائے ہیں۔ جنگلی شاہ تو سراپا محبت تھے، ان کے خیالات کا کیا کہنا، ذیل کی ہولی ملاحظہ ہو:۔

ڈگر (راہ) چلت مت چھیڑو پیا   کاہے پکڑت ہو ہمری کلائی
ہاٹ (راستہ) چلت بہیّاں پکڑت ہو   واہ انوکھی تمہری ڈھٹائی
لاج ناہیں نینن پیا تمھرے   تم ہو مست، ہم جات لجائی
تن لرجے مورو کانپے ہیا

پتیاں پڑوں گھونگھٹ مت کھولو،   بیچ ڈگر پر ہے کوؤ آئی
گھر مورے آؤ، گروا لگاؤ   جو کہیو پیا دیہوں دکھائی
چھ مکھ دیہوں جلائی دیا

ہٹ مت کرو، کہا مانو ہمارا   ہٹ کے کئے کچھ بن نہیں آئی
(ضد) دیکھ ہیں کہوں مہری نندیا   اپنے برن (بھائی) سے کرہیں بُرائی
تمھرے گُن مورو جائے جیا

جنگلی! پیا وارث البیلی   مورے گھر آ دیں چرائی چرائی
سگری رین موہے، گروا لگا دیں   بھور (صبح) پڑے ناہیں دیت دکھائی
آس نہ کہوں دیکھیوں رسیا

ٹھمری | ٹھمری کو ہندی ادب میں وہی رتبہ حاصل ہے جو اردو اور فارسی میں غزل کو ہے سرور و نشاط، حزن و ملال، وصال و فراق ہر قسم کے مضمون کی اس میں گنجائش ہے جنگلی شاہ کی پہلے ایک مستانہ ٹھمری لکھی جاتی ہے:۔

تورے نین سشیام متوارے دیکھ   موری انکھیاں جھک گئیں ری آج
مدھ ماتی (مست شراب) برکھا آوت   چھوؤں اُور گھٹا بن بن چھاوت
رس بوندنی بوندنی برساوت   مینھ دامنی (بجلی) دمک گرجن ری آج
میں مدھ ماتی سشیام کی   ہیرت ہوں دن رین

پگ لرجیں، تن کانپے — پڑت نہ کہوں چین
ہے چور جو بن موسوں رہو نہ جات — موری چھتیاں کسک گیئیں رتی لاج
(رنگ) جنگلی! پیا وارث پیارا — جیسے چند سورج جگ سے نیارا
مکلن مکلن بھیو اُجیارا — کاری رتیاں چمک گیئیں ری آج

شراب جمال سے سرشاری کے بعد عاشقانہ شوخی کا انداز یہ ہے:۔

توسے نیناں رسیلے، چنچلے چٹکیلے — سُن نکست پران
زلفیں مُکھ پر گریں بکھر بکھر — ناگن کے سمان
(مانند) جنگلی کہت گلے لگ جا ہمارے — پیا وارث مان

مندرجہ بالا کلام دیکھنے سے معلوم ہوا ہوگا کہ جنگلی شاہ مقطع میں اپنے نام کے ساتھ اپنے پیر و مرشد کا نام ضرور لاتے ہیں۔ یہ دستور بعض شعرائے متصوفین کے یہاں رہا ہے۔ یہ لوگ تنہا اپنا نام لانا بھی فراق معنوی کے مترادف سمجھتے ہیں۔ جس طرح دل میں ہر وقت معشوق کی لگن لگی رہتی ہے اسی طرح زبان پر بھی اُس کا نام جاری ہو جاتا ہے۔ مولانا روم اپنی مثنوی میں حسام الدین کو بار بار یاد کرتے ہیں۔ سور داس، کرشن کا نام لیتے ہیں، ہندوستان کے مشہور صوفی شاہ خادم اپنے اُردو اور ہندی کلام میں شاہ صفی کو پکارتے ہیں :۔

کہت ہے خادم اپنے صفی سوں
کہا مورا مان

محبت کی یہی لگن جنگلی شاہ سے پیا وارث کا وظیفہ پڑھواتی ہے

بھاگ :۔ یہ گانے کی وہ قسم ہے جو رات ڈھلے گائی جاتی ہے۔ وقت کی مناسبت سے اس کے مضمون ہوتے ہیں۔ جنگلی شاہ نے اسمیں خوب طبع آزمائی کی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بھاگ کہنے کا حق ادا کیا ہے رات خوب بھیگ گئی ہے۔ آنکھوں میں نیند بھری ہوئی ہے جمائیوں پر جمائیاں آ رہی ہیں۔ جاگنے کو جی نہیں چاہتا، سو رہنے کی درخواست کی جا رہی ہے

سونے دو جی نینن نیند بھری
ہمری نا ہیں انکھیاں، اوگرت ہیں — کون اُپائے کری
(تھکتی) (تدبیر)
سونے رہو تم توں رس ماتے — چھتین ہاتھ دھرے
سورن سو گئے تارن چھپ گئے — پپیہا بولت ہے چرچری

جنگل کے تیر سے ناہیں ٹمت ہیں　　　وارث کرو گھڑی

اودھا کہروا کہرا ناچ راجہ مہرا کی ایجاد ہے، جو نواب آصف الدولہ کے کہاروں کے جمعدار تھے۔ اس ناچ کی مناسبت سے شاعروں نے گیت بنائے۔ جنگلی شاہ نے بھی اس قسم کے بہت سے گیت لکھے ہیں، بطور نمونہ ایک گیت ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

کیسے بھاگے ہیں جھلک دکھلائے کے　　　ہیرا لیکے، جیسا ترسائے کے
جو میں جنتیوں پیا اَس کرہیں　　　رکھتیوں (دل) چرن ماں سیس نوائے کے
سپنے میں ڈار گلے بیچ بہیاں　　　بھاگ گئے ہو چھتیاں (جھکائے) لگائے کے
چونک پڑیوں (خواب)، پایوں نہ اُن کا،　　　ڈھونڈھ پھریوں گھبرائے کے
وارث بنا بیاکل بھیو جنگلی　　　کیسے راکھوں میں من سمجھائے کے

بھجن:۔ ہندی نظم کی یہ قسم (بے چین) بہت مقبول ہے۔ حمد و مناجات، بزرگانِ مذہب کی مدح، سب اسی نظم میں آتے ہیں۔ صاحبِ دل شعرائے بہتر سے بہتر بھجن لکھے ہیں اور اس لڑی میں رشد وہدایت کے موتی پروئے ہیں۔ جنگلی شاہ نے اس میدان میں بھی دادِ سخن دی ہے۔ موت کا وقت اور اعمال سے اپنی تہی مانگی کا حال کس موثر طریقہ سے لکھا ہے:۔

بالی عمر پیا مانگیں گنو نواں
دوار روکے بالم بیٹھے کیسے کو نکسوں انگنواں
جاؤ سکھی کہد یو بلم سے ناہیں موسے نکسے جو بنواں
لوگ کٹم سب بنتی کرت ہیں ایک نہ مانیں سجنواں
ماتا پتا جھنکارن رووبیں بلک رہے ہیں بر نواں
ناگن ریکھا ناگیان ہمارے، ناکو بھرے گہنواں
سیج سُودن کو جب سوامی ایہیں بنیئے نہ کوئی بہنواں
جنگلی پیا وارث کے چرن پر کاڈھ کے راکھوں پر نواں

کبت کبت کو ہندی شاعری میں قصیدہ کا بدل سمجھنا چاہیئے، قدیم راجہ مہاراجاؤں کے دربار میں شعراء نے ایک ایک کبت پر ایک ایک لاکھ روپیہ صلہ حاصل کیا ہے جنگلی شاہ نے اس زمین میں بھی طبع آزمائی کی ہے، مگر ان کے یہاں بادشاہوں رئیسوں کی تعریف کے بجائے حمد اور نعت اور وصف مرشد کے نمونے ہیں

نمونہ یہ ہے:۔

مقیمان ماں رسول جیسے، پاک دامن ماں بتول جیسے، میدان ماں منقل جیسے، بچھیا ماں بیرن کے میریں۔
ولین ماں بوتراب جیسے، پھولن میں گلاب جیسے، تارن ماں مہتاب جیسے تیسے یہ نورن کے نیر ہیں
سورن ماں شبیر جیسے، دھاتن ماں اکسیر جیسے، پیرن ماں دستگیر جیسے، تیسے یہ امرا کے امیر ہیں
پیارن ماں ایمان جیسے، کتابن میں قرآن جیسے، دیہن ماں پران جیسے، تیسے وارث جنگلی کے پیر ہیں

کنڈلی ہندی شاعری کی ایک قسم ہے جس میں چھ کڑیاں ہوتی ہیں۔ ان میں معنوی تسلسل کے علاوہ لفظی اعتبار سے بھی ایک کڑی کو دوسری کڑی کے ساتھ خاص مناسبت ہوتی ہے۔ ہندی میں بہاری کی کنڈلیاں بہت مشہور ہیں۔ جنگلی شاہ نے اس میدان میں بھی دادِ سخن دی ہے۔

جنگلی شاہ دوسرے شعراء کے برخلاف اپنے زمانہ کے فروعی اور تاریخی واقعات بھی نظم کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی بابت بہت کچھ لکھا ہے، اور ان سے بہت سے اہم واقعات کے جزئیات پر روشنی پڑتی ہے۔ ذیل میں ایک کنڈلی نقل کی جاتی ہے، یہ اس وقت لکھی گئی تھی جب غدر کے بعد ہندوستان پر انگریزی تسلط ہو رہا تھا اور مخبری اور دار و گیر کا بازار گرم تھا۔ اس نازک زمانہ میں احتیاط کی نصیحت کرتے ہیں:۔

راجہ جگ انگریز ہیں سو چلیو اسہیں ٹولے (جھکائے)
بائیں، وہنے دیکھیو، راکھو پگ ارتھائے
راکھو پگ ارتھائے، نہیں کہوں (قدم) ٹھوکر کھیتو (سمجھ بوجھ کا)
کالکھے جھوٹ موٹ بندھوا ہوئی جیتو
جنگلی سوچ بچار کے کرو جگ کے کاج
کاہو سے کڑے نہ بولیو کہ ہے گوری کے راج

ساون برسات ہندوستان کی بہار اور ساون اس موسم کی جان ہے۔ اس مہینے میں لڑکیاں سسرال سے میکے آتی ہیں اور یہ شوہر سے فراق کا زمانہ ہوتا ہے، اسی لئے ساون میں اشتیاقِ دیدار اور فراق کے مضامین زیادہ ہوتے ہیں۔ ذیل کا ساون انہیں خیالات کا آئینہ ہے:۔

رُت برکھا کی بہار	موہے نا سوہائے پیا وارث بن
مور کرت ہیں گُہار	بِس اندھیاری بدرا گرجیں
بیچ بیچ گادیں ملار	گاڑے ہنڈولا سکھیاں جھولیں

[illegible]

کاری گھٹا برسیں بجلی چمکے   پون چلت ہے بھبھار
تال تلیاں جل تھل ہوگئیں   ندیاں چھوڑت ہیں کرار
نت دن رہیں پیا سو بن سنگ   ترست جیارا ابھار
باٹ تکت وارت تمہری   جنگلی نیناں پسار

جاچر دھمار (زاد) ایک رقص مستانہ ہے۔ اس ناچ میں شریک ہونے والے چھوٹی چھوٹی لکڑیاں ہاتھ میں لیتے ہیں۔ ایک خاص اُصول اور ہم آہنگی کے ساتھ زمین پر پیر اور لکڑی پر لکڑی پڑتی ہے، کبھی اپنی ہی لکڑیوں کو بجاتے ہیں کبھی دوسروں کی لکڑی پر ضرب لگاتے ہیں۔ جب جوش پر آتے ہیں تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ دیکھنے والوں پر وجد کا عالم طاری ہوجاتا ہے۔ نقشبند درویشوں نے اس میں دھمار کی ایجاد کی۔ مجلسِ سماع ختم ہوجانے پر یہ لوگ دھمار کھیلتے تھے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ گرز کے لوہے سے سارے جسم کو زخمی اور لہولہان کرلیتے تھے۔ دھمار ختم ہونے پر اس سلسلہ کا سجادہ نشین یا مرشد طریقت اپنا ہاتھ اُن کے بدن سے مس کرتا تھا، معاً خون بند ہوکر زخم مندمل ہوجاتے تھے اور یہ لوگ بالکل بھلے چنگے ہوجاتے تھے لیکن اب جاچر کا رواج بہت کم ہوگیا ہے، اور دھمار کے عوض شعبدہ بازی ہوتی ہے۔ اس ناچ میں جو نظمیں گائی جاتی تھیں اُن میں تال کا خاص خیال رکھا جاتا تھا لکڑی کی ضرب اور پاؤں کی دھمک کا مدار اسی پر ہوتا تھا جنگلی شاہ نے اس پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔

دھن، دھن، وارث، بھاگ تمہارا   تم کارب دیلی (خدا) نے سنوارا
تم چت، بیت، سے بھیو بھگوان   تمہرے گھٹ (دل) بیٹھا کرتارا

جنگلی شاہ نے ایک طویل قصہ نظم کرنا شروع کیا تھا اس میں بحر اور طرز پدماوت کی اختیار کی تھی۔ اسی طرح حمد و نعت، مناجات، پیر و مرشد کی مدح اور اپنے حالات بیان کئے تھے۔ اس کے بعد قصہ کا آغاز ہوا تھا اس کتاب کا ایک قصہ محفوظ رہ گیا ہے۔ پہلے خدا کی وحدانیت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد خدا کی خلاقی کا ذکر کیا ہے، اور کائنات کی ایک ایک شئے گنوائی ہے۔ اس مضمون میں ملک محمد جائسی کے ساتھ چلکر تفصیل میں اُن سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ چند شعر یہ ہیں:-

پرگھٹ کین جگ سنسارا (دنیا)   پرگھٹ کین سمندر پہاڑا
پرگھٹ (ظاہر) کین سیپ اور موتی   پرگھٹ کین رتن (سمندر) بھر جوتی
پرگھٹ کین مرگا درگ (آنکھ) انجن   نین کے سندر (خوبصورت) بھروبی کنچن (سونا)
پرگھٹ کین روپ (ہرن) ادھکاری   پرگھٹ کین یہ پیو بھاری
پرگھٹ کین یہ دوؤ (حسن) نیناں   دیکھت روپ پرت ناہیں چیناں

حسن کی تخلیق کس طرح ہوئی، عشق، حسن پر کس طرح شیدا ہوا، ان میں کیا گفتگو ہوئی۔ ازل کے روز کائنات کی کیا حالت تھی۔ پھول کو شگفتگی اور کلی کو دل، گرفتگی کیوں ملی۔ پہلی شراب کس نے بنائی اور اس میں نشہ کی مستی کیوں کر آئی۔ آدم سے فرشتوں کا مکالمہ، غرض عجیب عجیب مضامین اور معرفت کے نکتے لکھے ہیں۔ طوالت کے خوف سے ان کی تفصیل نہیں لکھی جا سکتی۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ ضائع ہو چکا ہے اور بہت کم باقی رہ گیا ہے۔ اس قابل ہے کہ اسے طبع کرا کے منظر عام پر لایا جائے۔ اگر یہ صورت ہو گئی تو یہ ہندی ادب کی بہت بڑی خدمت ہوگی اور اس سے اس زبان کے ادب میں بیش بہا اضافہ ہوگا۔

احساسات

(از جناب اثر مرزا نازک الہ آبادی جوائنٹ سکریٹری ایوان الادب الہ آباد)

بہر تصویر ہے پہلو بہ پہلو جلوہ آرائی
ہے ترکِ زندگی عشق اب ترکِ جبیں سائی

نگاہوں سے تری وہ نعمتِ عشق آفریں پائی
کہ دردِ دل ہوا ابتک بے نیازِ چارہ فرمائی

نگاہِ ناز نے کس حسن سے لی آج انگڑائی
کہ دل کھلنے لگے باغِ تمنا میں بہار آئی

سحر تک مِل کے لوٹا تیرے اقرار و تغافل نے
جو نیند آئی تو ہوش آیا، جو ہوش آیا تو نیند آئی

تخیل کی حدوں سے بھی کچھ آگے ہیں تمنائیں
سمندِ عشق کا کیجئے لے سیا دل کی گہرائی

کیا ہے جذب جب سے کثرتِ انوارِ جاناں نے
ہجومِ دو جہاں کو میں سمجھ بیٹھا ہوں تنہائی

میں سمجھا پھر نظامِ آرزو بے سلسلہ ہوگا
کہ جب پہلوئے دل سے کامیابی کی صدا آئی

ہر اک کروٹ پہ ہر جنبش پہ ہوتا ہے گماں اُنکا
دو عالم مِل گئے یا کائناتِ دردِ دل پائی

ازل ہی سے مِلی ہے مجھکو نازک فطرتِ شاعر
کیا کرتا ہوں محسوسات پر میں خامہ فرسائی

غزل

(پروفیسر فراق گورکھپوری ایم اے)

تجھے بھلائیں تو نیند آتے آتے رہ جائے — کوئی ادھوری کہانی سی جیسے کہہ جائے
اُسی پہ آئینہ شاید ہو کچھ نزاکتِ وقت — تری نگاہ کی جو نرم چوٹ سہہ جائے
ترے قریب سراپا قصور آئے عشق — ترے حضور سے جائے تو بے گنہ جائے
نگاہِ ناز کے آثارِ انقلاب نہ پوچھ — کہیں یہ قصرِ زمان و مکاں نہ ڈھہ جائے
کہاں کہاں سے چمک جائے عشق کی تقدیر — کہاں کہاں نگہِ نرگسِ سیہ جائے
کھلے ہیں رمز و کنایاتِ زندگی اس طرح — تری نگاہ کی یاد آ کے جیسے رہ جائے
کبھی کبھی تو جتائے کرم نما کی ادا — کبھی کبھی تو ہماری بھی بات رہ جائے
تو دن کی طرح حسیں رات کی طرح پُر کیف — جہاں بھی جائے باندازِ مہر و مہ جائے
یہ سنتے ہی قدمِ کاروانِ عشق اُٹھے — کہیں بھی چین نہ پائے گا جس جگہ جائے
وہ رات! گوش بر آواز تھے جب انجم و ماہ — تری نگاہ کہانی سی جیسے کہہ جائے
وہ رنگِ رخ تھا اُٹھائی ہے جب نگاہ اُس نے — شراب جیسے چھلکتے چھلکتے رہ جائے

نگاہِ مست تری تھاہ کوئی پا نہ سکا
فراقؔ ہی کی نظر ہے جو تہ بہ تہ جائے

شیخ عراقی کا کلام

(از پروفیسر لیکھ دھیان اہوجہ صاحب ایم. اے ایم. او. ایل جالندھر)

فارسی ادب کی تاریخ میں ساتویں صدی عیسوی تصوف کی صدی ہے۔ اس دور میں فارسی شعرا میں تصوف میلان جس قدر پایا جاتا ہے بحیثیت مجموعی کسی اور دور میں دکھائی نہیں دیتا۔ ہم اس صدی کو صحیح معنوں میں صدیِ عرفان و اخلاق کہہ سکتے ہیں۔

ایران کے صوفی شعرا میں سلطان ابوسعید ابوالخیر (المتوفی ۴۴۰ھ) پہلے شاعر ہیں جنہوں نے فارسی شاعری کو تصوف سے روشناس کیا اور صوفیانہ مضامین کو رباعی کی صورت میں ادا کیا۔ ان کے بعد برگزیدہ صوفی شعرا میں سنائی۔ عطار۔ رومی اور عراقی ہیں۔

ایران میں شاعری کا آغاز قصیدہ سے ہوا۔ مدحیہ قصائد لکھنے کا شوق اور ضرورت ہی تھی جس نے فارسی شاعری کا سنگِ بنیاد رکھا۔ قصیدہ کی تشبیب کے عشقیہ اشعار کو الگ کر لیا تو غزل بن گئی۔ یہ تھا غزل کا آغاز۔ شعرالعجم کے الفاظ کے مطابق گویا قصیدہ کے درخت سے ایک قلم لے کر الگ لگا لیا۔

لیکن یہ صرف ابتدا تھی۔ فارسی غزل کی اصلی ترقی کی تاریخ تصوف کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ ابھی تک صرف تصویر کا خاکہ تیار ہوا تھا، اس میں مصور کے موقلم نے رنگ آمیزی نہ کی تھی، یا یوں کہیے کہ ایک گلشن تھا چاردیواری سے محفوظ، خوش وضع روشوں سے سجا ہوا، بہتے ہوئے پانی کے چشموں سے آراستہ، لیکن اس کی کیاریاں ابھی زمین اور خوشبودار پھولوں سے محروم تھیں۔ عشقِ حقیقی کے متوالے صوفی شعرا نے آکر باغبانی کی اور فارسی شعر کے چمنستان میں وہ گل بوٹے کھلائے جن کی خوشبو سے سارا عالم مہک اٹھا۔

اصلیت یہ ہے کہ صوفیائے کرام کا کلام صرف سرسری وارداتِ عشق پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ عارفوں کو عشقِ حقیقی میں پاکیزہ اور لطیف جذبات اور احساسات کا ذاتی تجربہ ہوتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ ان کے لطیف جذبات پاک اور نازک اشعار کی صورت میں صحیفۂ ادب کی زینت بنتے ہیں۔ ان کے آئینہ میں کسی اور کے چہرے پرتو اور اُن کے جام میں کسی اور میکدے کی شراب ہوتی ہے۔ ان کے مضامین سروشِ غیب کا عطیہ ہوتے ہیں۔ بقول عراقی:-

از آں خوش است ہمی نالہ ام بگوشِ جہاں کہ ہیچ دم نزنم تا توام نہ بنوازی

دیگر صوفیائے کلام کے ساتھ شیخ عراقی نے بھی فارسی غزل کے مرتبے میں رنگ آمیزی کرنے میں جو حصہ لیا ہے وہ اہم ہے اور قابل قدر۔

عراقی کی خصوصیات اُن کے کلام کی سادگی اور صفائی ہے، ایسی سادگی جو اُن کے کلام کو شیریں اور لطیف بنا دیتی ہے اور اُن کے بیان کو زیادہ دلنشین۔ اس کے ساتھ درد اور سوز و گداز کا پہلو بھی نمایاں ہے

کہتے ہیں ایک سادھو کسی بیابان کے گوشہ میں دھوپ میں بیٹھا تھا، سکندر اپنے جاہ وحشم کے ساتھ وہاں سے گذرا لیکن وہ سادھو وہاں سے نہ ہلا۔ سکندر نے اپنے جاہ وجلال سے اسے مرعوب کرنے کی ناکام کوشش کی، اور اُسے جلد ہی اس درویش کی شانِ بے نیازی کا قائل ہونا پڑا۔ چلتے وقت سکندر نے اس سے خوش ہو کر پوچھا "بتا کیا چاہتا ہے؟"۔ درویش بولا "ذرا آگے سے ہٹ جائیے، سورج کی دھوپ مجھ تک آنے دیجئے"۔ یہ دنیاوی جاہ اور مرتبہ بھی تو دیوار سکندری بن کر صوفی کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے، اور اس محبوبِ حقیقی کے پرتو کو عارف کے دل تک پہنچنے نہیں دیتا۔ ان تمام دنیاوی علائق کو جب تک توڑا نہیں جاتا تب تک انسان اس آفتاب کے نور سے محروم ہی رہتا ہے۔ عراقی کے ہاں بھی یہی خواہش ہے کہ یہ دیواریں ٹوٹ جائیں اور مہر عالم تاب براہ راست اس کے در و بام پر ضوپاشی کرے

کے خانۂ من خراب گردد   تا مہر بر آید از در و بام

یہی مرحلہ ہے جس کو طے کرنے کے لئے پہلے اپنے آپ سے گذرنا ہوتا ہے۔ عراقی:-

ذرہ بودیم آفتاب شدیم   از عراقی چو مہر بگسستیم

در سایہ مجو دلِ عراقی   کاں ذرہ بہ آفتاب پیوست

عارف اپنے معبودِ حقیقی کے عشق میں مستغرق ہو کر ایک ایسے عالم میں پہنچ جاتا ہے جہاں بقولِ غالب "اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے" اور یہی رتبہ ہے جو سلطان بایزید بسطامی اور منصور حلاج ایسے فنافی اللہ عارفوں کو نصیب ہوتا ہے، عراقی ایسے ہی عالم کا بیان کرتے ہیں:-

ترا چوں از تو بستانند نماند جملہ او ماند   تو آنگہ خواہ انا الحق گوی و خواہی گوی سبحانی

وصال کا حقیقی درجہ کیا ہے؟ طالب ہمہ تن مطلوب ہو جائے یہاں تک کہ محبت کی بندشیں بھی اُٹھ جائیں پھر وہ عالم محویت چھا جاتا ہے کہ بھری انجمن میں خلوت کے مزے ملتے ہیں اور خلوت میں انجمن ناز کے جلوے۔ محویت، جذب اور استغراق کی وہ کیفیت طاری ہوتی ہے کہ عذاب میں راحت ہوتی ہے اور شاید راحت میں عذاب، ہجر میں وصال کا سا کیف اور وصال میں ہجر کی دامنگیری۔ ایسے ہی حیرت کے مرحلے ہیں جن کو عراقی اپنے اشعار میں بیان کرتا ہے:-

گہے درد تو درماں مے نماید   گہے وصل تو ہجراں مے نماید

زندگی اور غم لازم و ملزوم ہیں۔ وقت کے بیکراں ساحل سے زندگی کی لہریں ٹکراتی ہیں اور ان کا عمل اور ردِ عمل شروع ہوتا ہے، اور انہی لہروں پر انسانی آرزوؤں کی کشتی ہچکولے کھاتی ہے، لہروں ہی لہروں کے سہارے شاید بغیر کسی ناخدا کے، چلی جاتی ہے۔ اور جنہوں نے اس بحرِ ہستی کے تلاطم اور تموج کو آزمایا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس سمندر میں آرام و راحت کی بادِ موافق کے مقابلے میں رنج و غم کے طوفان زیادہ اٹھتے ہیں۔ شیلے نے "سکائی لارک" کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے: "ہم آگے دیکھتے ہیں اور پیچھے، اور ایسی چیزوں کے لئے بیقرار رہتے ہیں جو ملتی نہیں۔ ہماری سچی سے سچی ہنسی بھی غم کا پہلو لئے ہوتی ہے۔ اور ہمارے شیریں سے شیریں نغمے وہ ہیں جو غم و اندوہ سے پُر ہوں۔"

فارسی شعرا شمع کی لَو کو خندہ سے تشبیہ دیتے ہیں، لیکن موم کی شمع ہنستی تو ہے کہیں اس کے ساتھ ساتھ آنسو بھی بہاتی ہے۔ عراقی اس حقیقت سے ایک نہایت لطیف نکتہ پیدا کر کے انسانی غم کی صداقت کو واضح کرتے ہیں

گرچہ خندم گاہ گاہی شمع وار   درمیانِ خندہ گریانم دریغ

یہ سب کائنات کہاں سے آئی اور کہاں جائے گی، چکبست کا مشہور شعر ہے:۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب   موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

آج سے چھ سات صدی پہلے فارسی کے اس صوفی شاعر نے اسی خیال کو الفاظ کا یوں جامہ پہنایا تھا کہ سب کائنات ایک ہی حقیقت سے پیدا ہوتی ہے، اور پھر اسی میں جدا اشکال مل جاتی ہیں۔

برہوا شد بخارے از دریا   باز چوں جمع گشت دریا شد

زندگی کیا ہے؟ ایک شروع نہ ہونے والا آغاز، اور ختم نہ ہونے والا انجام، اس کی گتھی نہ آج تک کسی سے سلجھی اور نہ ہی سلجھے گی۔ جب سے وقت کا چکر چلا ہے عقلِ انسانی بھی چکر میں ہے لیکن اس معمہ کو حل کرنے کی ہر سعی بھی ناکام ہی ثابت ہوئی ہے۔ ابو طالب کلیم نے اس دنیا کو ایک پرانی کتاب سے تشبیہ دی ہے جس کے دو طرف کے ورق پھٹ چکے ہوں

ما ز آغاز و ز انجام جہاں بے خبریم   اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتادست

اردو کے ایک شاعر نے بہت اچھا کہا ہے:۔

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی   نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

انسان ایک ہستی اور ہالی کے عالم میں اس بازارِ ہستی میں قدم رکھتا ہے، عقل و ہوش کے [illegible] میں سے گزرتا [illegible] ہستی [illegible] کے ساتھ رخصت ہو جاتا ہے [illegible] ہیں۔

نیست مرا ز خود خبر بیش ازیں کہ در جہاں　　　　مست و خراب آمدم مست و خراب می روم

بااین ہمہ انسان ایک خاص عظمت کا مالک ہے کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًا کی آیۂ کریمہ کے مد نظر اس عالم کی تخلیق انسان کے بغیر اپنے مدعا کی تکمیل سے قاصر ہے۔ یہ انسان ہی تو ہے جس پر اس کائنات کا مدار و مدار ہے، اور اسی کے لیے ہی تو سارا نظام ہستی قائم کیا گیا ہے۔ آپ اسے احساس خودداری کہیئے یا جذبۂ خودی، عراقی اس سے غافل نہیں ہیں۔

من ارچہ از تو مے آیم پدیدار　　　　تو نیز اندر جہاں از من پدیدی

جام گیتی نمائے او مائیم　　　　کہ بما ہر چہ بود پیدا شد

چوں بندِ طلسم ماکشادی　　　　بینی کہ توئی خود اسم اعظم

حضرت یوسف کا قصہ مشہور ہے، انھیں جمال بشری کی لاثانی تصویر مانا جاتا ہے، بھائیوں نے انھیں دھوکے سے ایک کنویں میں پھینک دیا، وہاں سے ایک قافلے والے لے گئے اور انھیں مصر کے بازار میں جا کر بیچ، یہاں پھر انھیں زندان میں رہنا پڑا۔ عراقی ایک نہایت لطیف تلمیح میں اس مشہور قصہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں شاعر کا دلِ تنگ مانا کہ محبوب حقیقی کی جلوہ گاہ بننے کے قابل نہیں لیکن کیا ہوا جمالِ یوسف بھی تو کبھی چاہ و زنداں کی زینت بن سکتا ہے، ایک عالم بے ساختگی میں کہا ہے:-

چہ بائے دُست دلِ تنگِ من دلے یوسف　　　　گہے فتد بہ چہے تیرہ گاہ بزندانے

سچی طاعت اور سچی دعا کیا ہے، بقول غالب:-

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

سچی اطاعت وہی ہے جس میں جنت کے مے و انگبیں کی لاگ نہ ہو اور دعا بھی وہی سچی ہے جو لبوں تک نہ آئے، وہی الفاظ پر نہ رکھتے ہوئے بھی طاقت پرواز رکھتے ہیں، جو جنبش زبان کی حاجت سے بے نیاز ہوں۔ جو دل کی گہرائیوں سے نکلیں اور سیدھے سمع حق تک پہنچیں۔ عراقی

آں دعا آنچناں نہاں گفتم　　　　کہ بجز سمع حق کسے نشنید

ایسی دعاؤں کے لئے ہی تو اجابت در حق سے استقبال کے لئے آیا کرتی ہے۔

کہاں سے؟

آئی مرے کانوں میں یہ آواز کہاں سے　　　　دیتا ہے سنائی یہ مجھے ساز کہاں سے؟

حیرت میں ہے احساس تو ادراک ہے خاموش　　　　اِس نغمۂ دلکش کا ہے آغاز کہاں سے؟

(جگن ناتھ آزاد بی اے)

ہمارا تعلیمی مسئلہ

(از مبشر علی صدیقی بدایونی، ایم۔اے۔ بی۔ٹی علیگ)

بنیادی طریقۂ تعلیم اس صوبہ میں اب محض ایک تعلیمی تجربہ نہیں رہا، بلکہ اس نے ایک نظریہ کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ پرانے ڈھرے پر پڑھانے والے مدرسین اب اس کی اہمیت کو سمجھ رہے ہیں، اور طلباء پہلے سے زیادہ سبق میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کے تخلیقی مادہ کے نکاس کا راستہ اب بہت زیادہ کشادہ ہوگیا ہے۔ ایک عام آدمی جو طریقۂ تعلیم سے واقفیت نہیں رکھتا، بنیادی تعلیم پر مندرجہ ذیل اعتراضات کرسکتا ہے:

(۱) طلباء لکھنے پڑھنے میں پہلے کے مقابلہ میں اب کمزور ہوگئے ہیں۔

(۲) مدرسین کا کام بہت ہلکا ہوگیا ہے۔

(۳) بنیادی طریقۂ تعلیم میں حرفہ (Craft) پر زیادہ زور دینے کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نظر نہیں آتا کہ طلباء تعلیم کے اختتام پر آسانی سے روزی کما سکیں۔

لیکن ان تینوں اعتراضوں کے جوابات بآسانی حسب ذیل دیئے جاسکتے ہیں:۔

(۱) طلباء پڑھنے لکھنے میں پہلے سے کمزور نہیں، بلکہ بہتر ہوگئے ہیں۔ اب وہ جو کچھ پڑھتے ہیں اس پر غور و فکر کرتے ہیں اور اپنے تجربے کی کسوٹی پر اسکو پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تعلیم اب پہلے سے زیادہ جاندار ہوگئی ہے۔

(۲) مدرس کا کام ہلکا نہیں بلکہ بھاری ہوگیا ہے۔ اب وہ کتابیں نہیں پڑھاتا بلکہ بچوں کو پڑھاتا ہے۔ اُن کی نفسیاتی کیفیات کو ہر قدم پر مقدم سمجھتا ہے، وہ ان کے لئے معلومات کا ذخیرہ نہیں فراہم کرتا بلکہ اُن کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اُبھارتا ہے، اور اس کی ساری کوشش بچے کو ایک اچھا شہری بنانے پر صرف ہوتی ہے۔

(۳) حرفہ پر اس لئے زیادہ زور نہیں دیا جاتا کہ طالب علم بطور پیشہ کے اُسے اختیار کرے بلکہ ایسا کرنے میں عملی کام کا موقعہ دستیاب ہوتا ہے۔ جب بچہ وقتی کے ٹکڑے کاٹتا، مختلف قسم کے رنگ بھرتا، مٹی کے برتن بناتا، ڈزائن تیار کرتا، سوت کاتتا اور بنتا، اور باغ کی کیاری میں پانی دیتا ہے تو حساب، جغرافیہ اور آرٹ کی معلومات وہ کسی کتاب یا مدرس سے فراہم نہیں کرتا بلکہ خود اپنے عمل سے حاصل کرتا ہے تو کام بھی عمل کل کا تجربہ ہو جائیگا۔ اور بچہ اگلے دن کا سبق زیادہ یقین و جوش کے ساتھ تیار کریگا۔

ہی عمل ہے جو انسانی زندگی کو جاندار بنائے رکھتا ہے، اور ہر مشکل کام کو آسان کر دیتا ہے۔

ضرورت ہے کہ بنیادی طریقۂ تعلیم کو پرائمری جماعتوں سے آگے جلد بڑھایا جائے۔ اور پرائمری جماعتوں کے مدرّس کو طریقۂ تعلیم کی جتنی اچھی تربیت ہو سکے دی جائے، اس کے نقطۂ نظر کو وسیع کیا جائے اور ملازمت کے لئے سہولتیں بہم پہونچائی جائیں تاکہ وہ خوش اسلوبی سے کام انجام دے سکے۔ اور ہندوستان میں ابتدائی تعلیم کی خاطرخواہ ترقی ہو سکے۔ اگر ہم نے اس بنیاد کو چٹان کی طرح مضبوط کر دیا تو پھر آندھی کا تیز سے تیز جھونکا عمارت کے بالائی حصوں کو نہ گرا سکے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں کالج کے پروفیسروں کی نہیں بلکہ پرائمری درجات کے مدرّس کی فوری اصلاح کی ضرورت ہے۔

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس اس سال جبلپور میں ہونے والی ہے جس میں اہم تعلیمی مسائل پر پُر مغز تقریریں ہونگی، اور تعلیمی مشکلات کا حل سوچا جائیگا۔ مسٹر سارجنٹ کی اسکیم پر بھی غور و خوض ہوگا سارجنٹ اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کروڑوں روپیہ کی ضرورت ہے، اور جب روپیہ کا مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے تو اس اسکیم کے نفاذ پر شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں۔ کیا ہر اچھی اسکیم اس لئے مسترد کر دی جانا چاہیئے کہ اس کے لئے روپیہ کی فراہمی میں دشواری ہوگی۔ کیا ہندوستان جیسے بڑے ملک میں اتنا روپیہ تعلیم پر خرچ کرنا مناسب نہیں۔ اگر سارجنٹ اسکیم اس قابل ہے کہ اس کا تجربہ کیا جائے تو مناسب ٹیکس کے ذریعہ روپیہ وصول کیا جا سکتا ہے۔ مسٹر سارجنٹ کا خیال بالکل ٹھیک ہے کہ ہندوستان میں جبریہ ابتدائی تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ ہمارے ملک میں تعلیم یافتہ اشخاص کی تعداد اب بھی دس گیارہ فیصدی سے زائد نہیں۔ ہماری آبادی کا بڑا حصہ دیہات میں رہتا ہے۔ اگر ہمیں دیہاتوں کو ایک پُر فضا مقام بنانا ہے، اُن میں زندگی کی لہر دوڑانا ہے، وہاں کے باشندوں کی اخلاقی قدریں وسیع کرنا ہیں، اُن کی اخلاقی و معاشرتی حالت درست کرنا ہے تو ہمارا اولین فرض ہے کہ دیہات میں ابتدائی لازمی تعلیم کو جلد از جلد رائج کر دیں۔ آبادی کا دیہاتی حصہ جس قدر جلد جہالت کے قعرِ مذلت سے نکلے گا اُسی قدر ملک کی ترقی کی راہیں کشادہ ہو جائیں گی۔ شہروں میں بھی ہمیں لازمی ابتدائی تعلیم کا ماحول کے مطابق انتظام کرنا پڑے گا۔ سارجنٹ اسکیم میں معلمین کی جو تنخواہیں مقرر کی گئی ہیں اُن کو کم از کم رقم (Minimum) سمجھا جائے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں معلم کی تنخواہ بہت قلیل ہے۔ پھر سماج کے مطالبات ملاحظہ ہوں، معلم صاف ستھرا لباس زیب تن کرے اس کے رہنے کا مکان بھی نمونہ ہو۔ وہ ایک فارغ البال آدمی کی طرح سماجی جلسوں میں شرکت کرے اور ہر وقت اپنی ہر ایک چیز کو معیاری بنا کر طلبا کے سامنے پیش کرے۔ لیکن تنخواہ کے اعتبار سے سماج نے جو جگہ ایک معلم کے لئے مقرر کی ہے وہ پٹواری سے کچھ اوپر اور کلرک سے بہت نیچے ہے۔ معلم بھی

سماج کا ایک فرد ہے، اُس کی بھی کچھ ضروریات ہیں، وہ بھی آدمی ہے، اُسے بھی سوسائٹی میں ایک باوقار زندگی بسر کرنا ہے، اس لئے اُس کو بھی روپیہ کی ضرورت ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اگر ہندوستانی سماج اُسے معقول معاوضہ نہ دیگا تو یا تو وہ خود ختم ہو جائیگا یا سماج کو بے شمار اُلجھنوں میں مبتلا کر دیگا فی الواقع ہندوستانی معلمین کے (خصوصاً وہ جو ابتدائی تعلیم کا کام انجام دیتے ہیں) معاوضہ میں بڑے اضافہ کی ضرورت ہے۔

سارجنٹ اسکیم کوئی نئی اسکیم نہیں ہے، اس سے قبل بھی ہندوستانی ماہرینِ تعلیم ان ہی باتوں کا اعادہ کر چکے ہیں۔ روپیہ اور تربیت یافتہ معلمین کی کمی کوئی ایسی چیز نہیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا لازمی ہو کہ اسکیم ناقابلِ عمل ہے۔ ایک مشترکہ زبان کی ضرورت، طریقۂ تعلیم میں تبدیلیاں اور مخلوط تعلیم وغیرہ اس اسکیم کے ضمن میں ایسی باتیں ہیں جن پر ہمارے ماہرینِ تعلیم غور کر سکتے ہیں، اور موقع و محل کے اعتبار سے اس میں حسبِ ضرورت تبدیلیاں بھی کر سکتے ہیں۔

یہاں پر ایک اچھے معلم کے نصب العین کے متعلق کچھ کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ اس موضوع پر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی ایک تقریر بعنوان "اچھا اُستاد" کتابی صورت میں دہلی سے شائع ہوئی ہے جس کے مطالعہ سے ہر معلم بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔ معلم کا جو نصب العین اس تقریر میں پیش کیا گیا ہے اور جس معیار پر اُسے پرکھا گیا ہے ہندوستان میں بہت کم معلم اس پر پورے اتریں گے۔ دراصل ہمارے یہاں معلمین کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو کلرک کی جگہ کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ فاضل مقرر ایک اصلی اُستاد اور ایک نقلی اُستاد کا فرق اس طرح ظاہر کرتا ہے "دوسرے آدمیوں کی زندگیوں میں ان خوبیوں کا خواہاں ہونا جن کا یہ آپ سیوک ہے، اوروں کو کچھ بنانے کا شوق اور اس کے لئے خود کچھ بننے یا ہونے کی ضرورت، یہ اچھے اُستاد کے ذہن کی بناوٹ کا تانا بانا ہے۔ بازار میں اس سے ملتا جلتا نقلی مال بھی بہت ملتا ہے، مگر اس سے دھوکا نہ کھانا چاہئے۔ ایسے اُستاد بھی ہوتے ہیں جن کی طبیعت دوسرے آدمیوں کی طرف ذرا نہیں جھکتی، اُنھیں کسی خاص خوبی سے بھی کوئی دلی لگاؤ نہیں ہوتا اُنھیں بس اپنا پیٹ پالنا ہوتا ہے۔ دوسروں کو کچھ ہنر سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، یہ دکان لگا دیتے ہیں، لوگ دام دیتے ہیں یہ ہنر بیچتے ہیں مثلاً بیچ کر نہ کمایا زراعت کی ڈوکتہ میں لکھکر کما لیا۔ آخر ہمارے ملک میں اچھے اُستاد اس زمانہ میں کمیاب بلکہ نایاب کیوں ہیں۔ عہد قدیم و متوسط کو جانے دیجئے، دورِ جدید کا ذکر ہے۔ کیا اس پیشہ میں کچھ ایسی خامیاں ہیں جو ہمارے اُستادوں کا دل توڑ دیتی ہیں۔ کیا وہ اشخاص جو اچھا اُستاد بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس پیشہ میں قدم نہیں رکھتے۔ کیا معاوضہ محنت کے برابر

ان کو نہیں ملتا۔ کیا سماج میں ان کی کچھ عزت نہیں؟ ان سوالات کے جواب اچھی طرح ظاہر کرتے ہیں کہ
اِس مُلک میں اچھے اُستادوں کی کیوں کمی ہے۔ تقریر کے آخر میں اچھے استاد کی بابت ڈاکٹر صاحب نے
کیا خوب کہا ہے "اچھے اُستاد میں اہلِ قوت اور حکمرانوں کی سیرت کا ایک ذرہ بھی نہیں ہوتا۔ اس میں اور
ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حکمراں جبر کرتے ہیں، یہ صبر کرتا ہے، وہ مجبور کرکے ایک راہ پر چلاتے ہیں
یہ آزاد چھوڑ کر ساتھ لیتا ہے۔ ایک کے وسائل ہیں تشدد اور زبردستی، دوسرے کے محبت اور خدمت، ایک کا
لمنا ڈر سے مانا جاتا ہے، دوسرے کا شوق سے، ایک حکم دیتا ہے، دوسرا مشورہ وہ غلام بناتا ہے اور یہ ساتھی
ان خوبیوں کے علاوہ اور بھی بہت سی صفتیں اچھے اُستاد میں پائی جاتی ہیں۔ اچھا مدرس ہونے کے لئے یہ
اچھا مقرر بھی ہوتا ہے، اور ایسی ہی بہت سی چھوٹی چھوٹی خوبیاں اور رکھتا ہے۔ مگر اس کا امتیاز یہی ہے کہ
اسکی زندگی کی جڑیں محبت کے سرچشمے سے سیراب ہوتی ہیں، اس لئے یہ وہاں اُمید رکھتا ہے جہاں دوسرے
دل چھوڑ دیتے ہیں، وہاں تازہ دم رہتا ہے جہاں دوسرے تھک جاتے ہیں۔ اُسے وہاں روشنی دکھائی دیتی ہے
جہاں دوسرے اندھیرے کی شکایت کرتے ہیں...... اور بچے کی طرف سے جب ساری دنیا مایوس ہو جاتی ہے
تو بس دو آدمی ہیں جن کے سینہ میں اُمید باقی رہتی ہے۔ ایک اُسکی ماں اور دوسرا اچھا اُستاد۔" اقتباس کافی
طویل ہو گیا ہے لیکن در اصل یہ تقریر اس قابل ہے کہ اس کے اقتباسات کی جانب ہر خاص و عام کی توجہ
مبذول کرائی جائے۔

غزل

آج ادھر بھی شورشِ غم ہے — چہرہ بھی فق ہے آنکھ بھی نم ہے
فطرتِ ہستی رنج و الم ہے — دل بھی پریشاں آنکھ بھی نم ہے
جب سے شعاعِ مہر پڑی ہے — قطرۂ شبنم مائلِ رَم ہے
صاف ہے ظاہر شورشِ دل سے — اُن کی توجہ عشق پہ کم ہے
کیوں ہے پریشاں بارِ الم سے — دم ہے تو غم ہے غم ہے تو دم ہے
ہاتھ دھڑکتے دل پہ نہ رکھنا — اس میں نہاں ہنگامۂ غم ہے
اللہ اللہ حسن تمہارا — سامنے جیسے ایک ارم ہے
حسن بھی جس کو دیکھ کے روئے — وہ مرا آنسو حاصلِ غم ہے
حالتِ جالب پوچھتے کیا ہو — اس کا چہرہ شرحِ الم ہے

غزل[1]

(حضرت وحشی کانپوری)

لبِ مینا سے گر کچھ ریزشِ اسرار ہو جائے
غریقِ موجِ مے ہر سبحہ و زنار ہو جائے

وہ دورِ ساغرِ رندانہ پھر یک بار ہو جائے
کہ جسمیں ڈوب کر تقویٰ تجلی بار ہو جائے

محبت کو محبت کا اگر پندار ہو جائے
تو تکمیلِ محبت اور بھی دشوار ہو جائے

اگر دل پر جلائے عشقِ حیرت کار ہو جائے
اسی آئینہ سے پیدا جمالِ یار ہو جائے

مری تردامنی دیکھی نہیں تو نے ابھی واعظ
اگر دامن جھٹک دوں بارشِ انوار ہو جائے

وہی پھر جامِ رنگیں دے کہ جسکے فیض سے ساقی
خرد بیکار ہو جائے جنوں ہشیار ہو جائے

قیامت ڈھا رہا ہے اسقدر مجبوریوں پر بھی
نہ جانے کیا کرے انساں اگر مختار ہو جائے

تھپیڑے کھا رہی ہے زندگی موجِ حوادث کے
یہ کشتی ڈوب ہی جائے تو بیڑا پار ہو جائے

بزیرِ تیغِ نمرودی وہ شانِ عشق پیدا کر
کہ ہر آتشکدہ تیرے لئے گلزار ہو جائے

وہی ہوتا ہے محرم اس حریمِ ناز کا وحشی
کہ جس کی ہر ادا عکسِ ادائے یار ہو جائے

---

[1] بتقریب آل انڈیا مشاعرہ جے پور

کوڑیلے کے پھول

(از گوبند پرشاد مہسوی ایم۔ اے۔ بی۔ جج سلون (ضلع رائے بریلی)

دیکھنے والے ذرا دیکھ عجب ہے منظر — زینت افروز ہیں یہ پھول بھی مثل زیور
رات کے وقت اگر چاند ہوا جلوہ گر — زینت کے ذرے چمک اٹھتے ہیں تارے ہو کر
ہو بہو ویسے ہی یہ پھول نظر آتے ہیں
صبح کے نور میں جب دیکھنے ہم جاتے ہیں

حسن ان میں ہے کہ دنیا میں نہیں اسکا جواب — شرم سے منہ کو چھپاتے ہیں کنول اور گلاب
نہ تو افلاک کے اوپر نہ سر چشمۂ آب — خاک کو کرتے ہیں یہ رونقِ فرش کمخواب
بیچ میں ان کے کبھی خود کو جو میں پاتا ہوں
شاہزادوں سے بھی کچھ شان میں بڑھ جاتا ہوں

میرے نزدیک ہیں یہ جام شرابِ گلفام — اپنے ساقی نے دیا ہے ہمیں الفت کا پیام
اپنے مستوں کیلئے پیش کئے ہیں کچھ جام — تاکہ مدہوش رہیں صبح سے لیکر تا شام
اسی ویرانہ میں میخانہ ہے پیمانہ ہے
اور ساقی ازل کا، یہ جلو خانہ ہے

اُن کی ہستی کو مٹاتی ہے وہی بادِ خزاں — چمنِ دہر رہا کرتا ہے جس سے نالاں
جورِ گلچیں سے یہ کرتے نہیں فریاد و فغاں — خاکساری کے سوا کچھ نہیں ان کا ارماں
پھول کہنے کے لئے ان کو میں تیار نہیں
پھول بھی پھول نہیں، ساتھ اگر خار نہیں

یہ سنا ہے کئی امراض میں اکسیر ہیں یہ — دلِ بیکس کسی ہمدرد کی تدبیر ہیں یہ
دہر میں الفتِ خاموش کی تفسیر ہیں یہ — یعنی جذباتِ محبت کی تصاویر ہیں یہ
دیکھ بیدرد انھیں اس طرح پامال نہ کر
میرے دل کا جو ہے ان کا بھی وہی حال نہ کر

آہ دنیا کو یہ اب تک نہیں معلوم ہوا — کہ ہر اک ذرہ کو قدرت نے ہی اک دل بخشا
میں جو ان پھولوں سے کرتا ہوں مصیبت کا گلا — تو مرے کان میں آتی ہے سسکنے کی صدا
حسرت و یاس سے سب تکتے ہیں صورت میری
سوچتا ہوں کہ بہت خوب ہے قسمت میری

ملہ انکو سنسکرت میں سنکھ پشپی، شنکھ ہلی اور ہندی میں سنکھولی کہتے ہیں۔

پارس اور لوہا

(از روشن پٹیالوی، بی۔ اے)

لالی اگرچہ ایک برہمن کی لڑکی تھی مگر خدا نے اس بت کو گھڑتے وقت نہایت فیاضی سے کام لیا تھا ہاں! اگر خدا سے غلطی ہو سکتی ہے تو یہ ہوئی کہ بجائے اعلیٰ گھرانے کے پنچ کے گھر پیدا کیا۔ سونا لوہار کی بھٹی میں پڑا، گنگا جل نالی کے پانی میں مل گیا۔

لالی کا حُسن ایسا دلآویز تھا کہ جو بھی اُسے ایک نظر دیکھ لیتا صانعِ قدرت پر نثار ہونے کے لئے تیار ہو جاتا عمر کے لحاظ سے لالی ابھی بچپن کی خوشگوار کیاری سے پوری طرح سے نہیں نکلی تھی مگر باغِ جوانی کی روشوں پر قدم جا پڑا تھا۔ وہ کسی کو دیکھتی تو اُس کی چنچل اور شوخ آنکھیں شرم کے مارے نیچے جھک جاتی تھیں۔ نظریں پلکوں میں جا چھپتی تھیں۔ بچپن کے الھڑ پنے سے وہ اسی لاپرواہی سے گلیوں میں دوڑنا چاہتی تھی مگر چلتے چلتے کمر میں ہلکی سی لچک پیدا ہو جاتی، اور وہ اپنی چال بھول کر ٹھٹھک جاتی تھی۔ وہ بچپن کے زمانہ کی طرح قہقہہ مار کر ہنسنا چاہتی، مگر ہنسی لب کے باہر نکلنے کی بجائے زیرِ لب تبسم بن کر اسے شرمائے دیتی تھی۔ لالی حیران تھی کہ یا خدا یہ کیا عالم ہے، اتنی تبدیلی کیوں؟ میرے انداز میرے بس میں کیوں نہیں، مجھے لوگ للچائی ہوئی نظروں سے گھورتے ہیں گھورا کریں، میری بلا سے، مگر میرے رخساروں پر حیا کی سُرخی دوڑ کر میری آنکھیں کیوں نیچی ہو جاتی ہیں دوپٹہ بار بار کیوں سرک جاتا ہے اور سنبھالے بھی نہیں سنبھلتا؟ غرضیکہ حُسن و شباب کا ایک بے پناہ طوفان تھا جو بے ساختہ اُمڈا چلا آتا تھا، اور لالی بیچاری بے خبر تھی کہ وہ دن دور نہیں جب وہ اسی طوفان میں بے اختیار غرق ہو جائیگی۔

(۲)

لالی کا پھول سا چہرہ کملایا ہوا نظر آتا تھا۔ گہرے فکر کے آثار اُس کے بُشرے سے نمایاں تھے ہاتھ میں جھاڑو تھی مگر دل بے قرار۔ تحصیل کا احاطہ بہت بڑا تھا اور کوڑا کرکٹ بھی بہت پڑا تھا، آج تحصیلدار صاحب کے چند دوست آنے تھے، اس لئے تمام کمروں کو خاص احتیاط سے صاف کر کے تمام کوڑا کرکٹ باہر احاطہ میں پھینک دیا گیا تھا۔ خشک سوکھے پتے، تیلیں، ٹکڑے ٹوٹے پڑے تھے۔ لالی کو تمام احاطہ صاف کرنا تھا، اور وہ بھی تحصیلدار صاحب کے آنے سے پہلے؛ تحصیلدار صاحب دن نکلنے سے پہلے ہی سیر کے لئے جاتے اور

تقریباً دو گھنٹے بعد لوٹا کرتے تھے، یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا، لالی اس سے بخوبی واقف تھی، روزانہ تو وہ اس کام کو کھیل سمجھتی تھی مگر آج نہ معلوم کیوں اسے یہ پہاڑ معلوم دے رہا تھا۔ ہاتھ میں جھاڑو لئے شہتوت کے گرے ہوئے پکے خوشے کھانے لگی۔ آج اس کا دل اسے نہ معلوم کیوں کام کرنے سے روک رہا تھا۔ تحصیلدار صاحب کے آنے کا خیال آتے ہی وہ جھٹ اٹھ کر جھاڑو دینے لگی۔ مگر ہاتھ پھر رک گیا اور وہ ہائے رام کہہ کر انار کے درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ دو چار پھول اس کے سرخ رخساروں پر تصدق ہونے کے لئے گر پڑے۔ لالی کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی۔ اس کے خیالات کا سلسلہ اس معمولی سے واقعہ سے بالکل منتشر ہو گیا تھا، اس نے اوپر نظر اٹھا کر دیکھا تو گلہری دکھائی دی جو پھول کتر کتر کر نیچے گرا رہی تھی، اسے کوستے ہوئے وہ پھر اپنے کام میں مشغول ہوئی، مگر اتنے میں ہی بوٹوں کی آہٹ سنائی دی۔ ہاتھ کی روانی بڑھ گئی، دوپٹہ جو سر کے نیچے کندھوں پر پڑا تھا گھونگھٹ کی شکل میں چہرے پر چھا گیا، نظریں زمین میں گڑ گئیں، تحصیلدار صاحب سیر کر کے واپس آ گئے، انھوں نے کوارٹر میں داخل ہونے سے پہلے لالی کو اچٹتی ہوئی نگاہ سے دیکھا، پھر انار کے پھولے ہوئے درخت پر نظر پڑی، ایک دبی آہ بھری اور اندر چلے گئے۔

اور لالی! اس کے دل کی کون جانے۔ نہ معلوم کیوں اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، بدن میں رعشہ سا محسوس ہوا، ماتھے پر پسینہ آ گیا، ہاتھ پھر رک سا گیا اور تحصیلدار صاحب کے جانے کے بعد جب کمرے کے کواڑ زور سے بند ہوئے تو اس نے گھونگھٹ اوپر اٹھایا، حسرت بھری نگاہوں سے بند دروازے کو دیکھا، یہ تھا جواب ان حسرتوں کا.... اُن آرزوؤں کا،.... اُن موہوم تمناؤں کا، جو تحصیلدار صاحب کے دل سے وابستہ تھیں، ہونٹ دانتوں تلے دبائے، ماتھے پر سے پسینہ صاف کیا، کپڑوں کو ٹھیک کیا اور طبیعت پر جبر کر کے وہ پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

(۳)

بابو گنگا پرشاد ایک ہونہار، ہمدرد اور ایماندار تحصیلدار تھے، لوگ ان کے حسن سلوک کے مداح تھے، کسی پر سختی کرنا تو جانتے ہی نہ تھے، غصہ نام کو نہ تھا، ہنس مکھ دیکھنے میں نہایت قبول صورت، علم موسیقی کے دلدادہ، فن شاعری و ادب لطیف کے پجاری، گاتے تو سامعین کو بُت بنا دیتے تھے۔ گلے میں بلا کا سوز تھا۔ لیکن اپنے بے تکلف دوستوں ہی کے سامنے کھلتے تھے ورنہ بظاہر بڑے شرمیلے تھے۔

گو طبیعت بہت نرم تھی مگر اپنے فرائض کی انجام دہی میں کسی کا لحاظ نہ کرتے تھے۔ ڈسپلن اور نظم و نسق کو قائم رکھنے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے بھی گریز نہ کرتے۔ اگر کسی مقدمہ میں کسی معمولی شخص کے مقابلے میں ان کا کوئی نزدیکی رشتہ دار بھی فریق ہوتا تو خلاف قانون کبھی اس کی مدد نہ کرتے۔ بلکہ ہمیشہ انصاف کا خیال رکھتے

تاکہ کسی کو انگشت نمائی کا موقع ہی نہ ملے۔

ماتحتوں پر بہت مہربان تھے، معمولی فروگذاشتوں کا تو کیا، اگر کسی سے بڑا قصور بھی ہو جاتا تو اس کے ساتھ اتنی ہی سختی کرتے کہ اس کے تبادلہ کی سفارش افسران بالا سے کر دیتے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ سخت گیر افسر ہی نظم و نسق قائم رکھ سکتا ہے، مگر انھوں نے اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ نرم دل افسر بھی اپنے فرائض بڑی خوبی سے انجام دے سکتا ہے۔

بابو گنگا پرشاد آزاد خیال ضرور تھے مگر یہ نہیں کہ ان کا کوئی اصول زندگی ہی نہ ہو، انھوں نے مطالعہ اور تجربہ سے چند قوانین وضع کیے تھے، اور ان ہی پر بڑی سختی سے کاربند تھے۔

اس کے برعکس ان کے والد پنڈت ہیرالال گو ذات پات توڑک سبھا اور دیگر سوشل سوسائیٹیوں کے سرگرم ممبر تھے، مگر اول درجہ کے کٹر پنتھی تھے۔ بات بات میں آنچ کی لیتے تھے۔ پنڈت ہیرالال کی تقریر میں جادو تھا اور قلم میں طاقت۔ اچھوت ادھار اُن کی زندگی کا اہم ترین مشغلہ تھا۔ پولیٹیکل سرگرمیوں کے دنوں میں اُن کی قربانیوں کی وجہ سے ان کے کارہائے نمایاں ایک درخشاں آفتاب بن کر چمک اُٹھے تھے۔ اور اُنھیں ایک یا دو مرتبہ جیل جانے کا بھی فخر حاصل ہو چکا تھا، کھدر تو گویا اُن کی جان تھی، گھر کی تو خبر نہیں مگر جب کبھی باہر نکلتے تو سر سے پاؤں تک ہاتھ کے کتے ہوئے کھدر میں ملبوس نظر آتے تھے۔

ذات پات توڑک سبھا کی ہفتہ وار میٹنگ میں پنڈت جی ضرور شامل ہوتے، لوگ اُن کے لیکچروں کو خاص دلچسپی سے سنتے تھے۔ تالیوں سے کمرہ گونج اٹھتا تھا۔ ایشور پرارتھنا کے بعد جب پنڈت جی اپنی پُر اثر تقریر شروع کرتے تو حاضرین بُت بن جاتے تھے۔ دو تین گھنٹے تک بولتے رہنا ان کے لئے معمولی بات تھی۔ آخر میں وہ بھگت تلسی داس کی یہ مشہور چوپائی ضرور پڑھتے سے

ذات پات نہ پوچھے کوئے ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے

سب طرف سے ہیرالعل جی کی جے کے نعرے بلند ہوتے۔ لوگ ہار پہناتے..... اتنے ہار کہ وہ پھولوں کے بوجھ کے نیچے گویا دب جاتے۔

(۴)

لالی کا باپ شیرو بے روزگار تھا، لالی جوان ہوتی جا رہی تھی، اور شیرو جوان بیٹی کی فکر میں ضعیف! تحصیلدار صاحب کے پاس اُس نے اپنا دکھڑا رو دیا۔ گنگا پرشاد جی نرم دل تو تھے ہی، جھٹ اُسے اور لالی کو ملازم کروا دیا، غریب کو دال روٹی کا سہارا مل گیا۔ شیرو کو باہر کا کام سپرد ہوا اور لالی تحصیلدار صاحب کے گھر کا کام کرنے لگی۔ محکمہ حفظان صحت اُن کے ماتحت تھا۔ تنخواہ اسی فنڈ سے دی جانے لگی۔ کوارٹر صاف کرنا

احاطہ کی صفائی، مویشیوں کی دیکھ بھال وغیرہ بھی لالی ہی کے سپرد ہو گئی، اور تحصیلدار صاحب اس سے سرکاری تنخواہ کے علاوہ اپنی جیب سے بھی دو چار روپے کا سلوک کر دیتے تھے۔ لالی کو اس گھر کا کام اتنا پسند آیا کہ وہ سارا دن ان کے کام میں ہی لگی رہتی۔ تحصیلدار صاحب بھی اگرچہ اس کی محنت مزدوری سے خوش تھے مگر حسن و نزاکت کی بے قدری اور سستا پن دیکھکر انھیں رحم آجاتا تھا۔ کبھی کبھی سوچا کرتے تھے کہ کیا خدا نے یہ نرم و نازک بازو اسی کام کے لئے بنائے ہیں، کیا یہ تیلی لچکدار کمر اسی لئے ہے کہ جھاڑو دیتے وقت گھنٹوں خمیدہ رہے۔ کیا یہ کالی کالی لمبی زلفیں اسی لئے ہیں کہ گرد و غبار اڑ اڑ کر ان میں پڑے۔ کیا یہ ننھے ننھے خوبصورت پاؤں برہنہ رہنے کے قابل ہیں۔ مگر وہ کیا کر سکتے تھے، قانونِ قدرت کس کے بس میں ہے؟ وہ جتنا اس کی حالت پر غور کرتے اتنا ہی اُس کی بھری جوانی اور اس سخت محنت و مشقت پر انھیں ترس آجاتا تھا۔ لیکن تیرو اُن کی مہربانیوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگا تھا، کام ٹھیک سے نہ کرتا، اور افسر صفائی جس کے ماتحت وہ کام کرتا تھا اُس سے اُلجھ پڑتا تھا۔ ایک دن تیرو نے تحصیلدار صاحب کی پشت پناہی کے خیال سے جو کچھ منھ میں آیا، افسر صفائی کو کڑوی کسیلی سنا دیں۔ افسر صفائی ایک باغیرت خاندانی آدمی تھا، وہ تیرو کی زیادتیوں کو روز دیکھتا تھا، مگر تحصیلدار صاحب کے تیور دیکھکر خاموش رہ جاتا تھا، مگر اُس روز وہ بھی برداشت نہ کر سکا۔ تحصیلدار صاحب سیر سے واپس آئے ہی تھے کہ یہ فریاد لے کر گیا۔ تحصیلدار صاحب کئی دنوں سے تیرو کی شکایت سنتے آرہے تھے، مگر ایک جادو تھا جس نے اُن کی زبان اور دل کو کیل رکھا تھا۔ تیرو کو بُرا بھلا کہنا چاہتے تھے مگر نہیں کہہ سکتے تھے۔ اُس دن اُس کی شکایت سن کر بہت غصہ آیا۔ اُسے بلوا کر سخت و سُست بھی کہا مگر یہ نہیں ہو سکا کہ اُسے اپنے محکمے سے تبدیل کر دیں اگر کوئی اور افسر ہوتا تو اُس دن اُس کی خیر نہ تھی۔ مگر اُنھوں نے افسر صفائی سے صرف اتنا کہکر صفائی کروا دی کہ اس دفعہ آپ اسے معاف کر دیں، آئندہ کبھی گستاخی نہ کرے گا، کیا کروں بیچارہ غریب ہے، جوان لڑکی گھر میں بیٹھی ہے، جس کی شادی اُسے کرنی ہے، زبان کا کڑوا ضرور ہے مگر دل کا میلا نہیں۔ آپ جیسے مہربانوں کے آسرے ہی گذر اوقات کر رہا ہے، اگر ملازمت سے برطرف کر دیا تو پیٹ کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔ آخر معاملہ رفع دفع ہوا، حسن کی فتح ہوئی۔

(۵)

لالی اور گنگا پرشاد کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت نے بُری طرح گھر کر لیا تھا۔ لالی کا یہ عالم تھا کہ رات دن تحصیلدار صاحب کے گھر پڑی رہتی تھی۔ گنگا پرشاد چاہتے تھے کہ وہ اندر کا کام کرے بال بچوں کو بھی کھلایا کرے مگر اپنے والد سے ڈر جاتے تھے۔ چاہے وہ کتنی ہی خوبصورت تھی مگر تھی تو ایک ہریجن

کی لڑکی۔ پھر اُسے یہ حق کیسے حاصل ہو سکتا تھا کہ وہ ایک برہمن کے گھر جیا دے سکے۔

تحصیلدار صاحب ابھی کنوارے تھے، اُن کی بڑی بہن بال بچوں کے ساتھ اُن کے ہاں رہتی تھی اس وجہ سے اُن کا گھر بھرا پُرا رہتا تھا۔ مگر جو راحت و مسرت اُنھیں حاصل ہونی چاہیئے تھی وہ نہ ملتی تھی۔ اُن کا اُٹھتا ہوا شباب اندر ہی اندر انگڑائیاں لے رہا تھا۔ وہ محبت کی تشنگی کو مٹانا چاہتے تھے جو روز افزوں ترقی پر تھی، جوانی کا نشہ دن بدن اُن کے دماغ پر گویا چھا رہا تھا اور عقل و ہوش کی قیود سے اُن کو آزاد بنا رہا تھا۔ پہلے پہل وہ شادی کے سخت مخالف تھے، مگر اب انھیں محسوس ہونے لگا تھا کہ دنیا میں رہتے ہوئے اس کے بغیر چارہ ہی نہیں۔ وہ یہ سمجھ گئے کہ دنیا میں مرد کا بہترین ساتھی عورت ہے۔ اس کے بغیر انسان اپنی زندگی کو پُر مسرت نہیں بنا سکتا۔

لالی شہر کا تمام کام بالکل چھوڑ چکی تھی، اس کے لئے باپ کی جھڑکیاں بھی سہنی پڑتی تھیں، روٹی بھی اب تحصیلدار صاحب کے گھر ہی کھاتی تھی۔ شیرو اگر ادھر کہیں سے لاتا تو یہ چھوتی تک نہ تھی، کہتی کہ تحصیلدار صاحب کے گھر کی بھاجی اچھی بنتی ہے۔ تحصیلدار صاحب بھی اس کا خاص خیال رکھتے تھے خفیہ طور پر مٹھائیاں اور پھل دیتے ہی رہتے تھے لیکن اپنی ہمشیرہ کو بھی جب وہ لالی کو روٹی دینے لگتی، خاص طور پر سفارش کرتے کہ بیچاری غریب ہے سبزی بھاجی اچار اور میٹھا بھی تو دے دیا کرو، اسے اور کہاں سے ملے گا۔ وہ بھی اپنے بھائی کا کہا نہ ٹالتی، اور اُسے خاندان کا ہی ایک فرد سمجھ کر جیسا کھانا بنتا ویسا ہی دیتی

لالی اب صفائی پسند ہو گئی تھی، صاف ستھرے کپڑے پہنکر تحصیلدار صاحب کے گھر آتی، چار پیسہ والی صابن کی ٹکیہ منگوالی تھی، تِلوں کا خالص تیل بھی ایک ٹوٹے ہوئے آبخورے میں باپ سے چھپا کر رکھنے لگی تھی کہیں سے ایک ٹوٹے ہوئے آئینہ کا ٹکڑا اور بانس کی چھوٹی سی کنگھی بھی لے آئی تھی، بال دونوں وقت سنوارنے لگی تھی، چوٹی کس کر باندھتی تھی، مست آنکھوں میں سیاہ کاجل کے ڈورے بھی کھینچتی تھی رنگین گردن کا لہنگا بھی بنوا لیا تھا۔ گنگا پرشاد بھی بیحد خوش تھے کہ لالی کا مذاق دن بدن سدھرتا جاتا ہے صاف رہنے سے اُسکا جوبن اور زیادہ نکھر گیا جس طرح بارش کے بعد باغ میں پھول پتے زیادہ جاذب نظر ہو جاتے ہیں، گنگا پرشاد نے لالی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اب اُس کی ضروریات کے مطابق اُس کی امداد بھی کرنے لگے تھے سے خوشبودار آنولے کا بڑھیا تیل، پاؤڈر، کریم، اسنو، ایک عمدہ سا شیشہ منگا دیا۔ اس سب سامان کو لالی نے تحصیل کے ہی ایک کمرے کے کونے میں چھپا کر رکھ دیا، تاکہ اس کو دیکھ کر اُس کا باپ یا تحصیلدار صاحب کے رشتہ دار شک نہ کرنے لگیں۔ تحصیلدار صاحب نے چپکے چپکے اُسے دو اچھے کپڑے بھی بنوا دیئے۔ اب کیا تھا اُونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ، لالی اُن سے پہلے ہی محبت کرتی تھی اِس

خاطرداری و نازبرداری نے اُس کے دل کو اور بھی موہ لیا۔
تحصیلدار صاحب کام کرتے کرتے بلدہا تحصیل سے اُٹھکر گھر آجایا کرتے۔ کبھی کوئی مثل بھول جاتے کبھی ٹائی کی گانٹھ اور پتلون کی شکن درست کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ ادھر لالی بھی اُن کی منتظر رہتی جیسے ہی بوٹوں کی آہٹ سُنائی دیتی، اُس کا کلیجہ ہاتھ بھر کا ہوجاتا، ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم نمایاں ہوتا، ایک جھجکتی ہوئی نظر اُوپر اُٹھتی اور دونوں کی نگاہیں چار ہوجاتیں اور پھر شرما کر جُھک جاتیں۔ یہ محبت کا جادو تھا۔

(۶)

مہینہ کے شروع ہوتے ہی تحصیلدار صاحب تحصیل کے بڑے کمرے میں بیٹھے ہوئے اپنے سامنے ملازمین کو تنخواہ دلوا رہے تھے۔ لالی باہر برآمدے میں سمٹی سمٹائی کھڑی تھی، نہ معلوم اُس کی باری کیوں نہیں آتی تھی، اُسنے کوارٹروں اور احاطے میں جھاڑو دینے کے علاوہ اور بھی کئی کام کئے تھے۔ آخر تحصیلدار صاحب نے یکے بعد دیگرے تمام ملازمین کو تنخواہیں دلوادیں، اب صرف لالی باقی رہ گئی۔ تحصیلدار صاحب نے منشی کو رخصت کیا اور رجسٹر کو بند کرکے میز پر رکھ دیا، قلم قلمدان کے سپرد کردی، دل دھڑکنے لگا، ادھر لالی جھینپتی لجاتی بغیر کچھ کہے واپس جانے لگی، تو تحصیلدار صاحب سے نہ رہا گیا، انھوں نے نہایت نرم لہجہ میں پکارا "لالی!"

"جی" کے سوا اور کوئی لفظ لالی کی زبان سے نہ نکلا۔ بیچاری ٹھٹھک گئی

"کیا تو تنخواہ نہ لے گی" تحصیلدار صاحب نے پوچھا

"میں تو کب کی کھڑی ہوں" لالی نے دبی زبان سے جواب دیا۔

"تو اندر کیوں نہیں آتی؟" تحصیلدار صاحب کے ان الفاظ میں لالی کے لئے حکم کی سی شان موجود تھی، لجاتی، شرماتی ٹھٹھکتی دروازے پر جاکر کھڑی ہوگئی۔

"تو کیا رجسٹر پر بغیر انگوٹھا لگائے ہی تنخواہ لینا چاہتی ہے۔" تحصیلدار صاحب نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا

لالی دوپٹہ سنبھالتی اور بدن چُراتے ہوئے میز کے پاس جاکر کھڑی ہوگئی۔

تحصیلدار صاحب نے ایک دبی ہوئی آہ کے ساتھ کہا "لالی تم نے مجھ پر بڑا بھاری ظلم کیا ہے"

لالی خاموش تھی، بولنا چاہتی تھی مگر کوئی اندر سے دل مسوس رہا تھا، آنکھوں سے اس چٹکی کا جواب دینا چاہتی تھی مگر نگوڑی شرم بھی پیچھا چھوڑے۔

تحصیلدار صاحب نے پھر کہا "لالی!"

"جی" کے سوا پھر بھی کوئی لفظ لالی کی زبان سے نہ نکلا۔

"آخر تیرا کیا ارادہ ہے؟" تحصیلدار صاحب نے پوچھا

"جی! میں تو آپ کی تابعدار ہوں" اُسنے کانپتی آواز میں جواب دیا۔
"مگر میں تجھے اپنے دل کی ملکہ اور گھر کی رانی بنانا چاہتا ہوں"
"جی! میں تو ایک جھاڑو لگانے والی ہوں"
"لالی! میں مدت سے چاہتا تھا کہ دل کھول کر تجھ سے دو باتیں کروں، اور اپنی محبت کا فیصلہ کروالوں آج موقعہ ملا۔ بول تجھے مجھ سے محبت ہے یا نہیں؟"
لالی اور بھی سمٹ گئی۔ دوپٹہ بار بار سر سے سرکنے لگا، آنکھیں زمین میں گڑ گئیں، گویا یہ وہاں سے اس سوال کا جواب ڈھونڈھنا چاہتی تھی۔ دل میں ہلچل پیدا ہو گئی، مگر لب نہ ہل سکے۔ آنکھیں اوپر کو اٹھکر اعتراف محبت کرنا چاہتی تھیں مگر شرم دامن نہ چھوڑتی تھی۔
تحصیلدار صاحب نے کچھ دیر خاموش رہ کر پوچھا "جواب کیوں نہیں دیتی پیاری"
"جی" کے سوا پھر بھی دوسرا لفظ اُس کی زبان سے نہ نکلا۔
"اُف! یہاں جی پڑ رہتی ہے اور تو جی کے سوا اور کچھ بولنا ہی نہیں جانتی۔ گویا" لیکن میں آج اس کا فیصلہ کروا ہی لوں گا۔" کیا تجھے مجھ سے محبت ہے؟
لالی نے آخری فقرہ نہیں سُنا، ناک پر مکھی آ بیٹھی تھی، یہ اُسے ہٹانے میں مشغول تھی، حسب معمول اُس کی زبان سے وہی لفظ نکلا "جی!"
اس پر تحصیلدار صاحب نے لالی کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر وہ چھلاوے کی طرح دامن بچا کر دروازے کے باہر ہو گئی
تحصیلدار صاحب نے نہایت بے قراری سے پکارا "لالی!"
"جی!" اسکے لالی کی آنکھیں اوپر اُٹھیں، اُنھوں نے دیکھا کہ ان آنکھوں میں اقرار محبت کا دفتر پنہاں ہے
انھوں نے پوچھا "لالی جب ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہے تو پھر تو مجھ سے دُور کیوں بھاگتی ہے"
اب لالی کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی، گویا غنچہ چٹخا "حضور! آپ پارس ہیں اور ہم لوہا۔"
تحصیلدار صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "مگر لوہا تو پارس سے چھو کر سونا بن جاتا ہے لالی!"
"مگر لوہا پارس سے چھو کر پارس نہیں ہوتا۔" لالی نے نیچی نظریں کر کے کہا۔ "اور میں سونا بننا نہیں چاہتی، سونا بن کر دوسرے کے گلے کا ہار کیوں بنوں، ہاں اگر لوہا پارس سے چھو کر پارس بن سکے تو دوسری بات ہے"
تحصیلدار صاحب حیران رہ گئے، وہ تعلیم یافتہ تھے اور ادب کے دلدادہ۔ ایک گنوار اَن پڑھ لڑکی سے اس قسم کے جواب کی توقع نہ تھی۔ لاجواب سے ہوکر بولے "لالی تم حسین اور پاک ہو۔"
"مگر میرے حُسن اور آپ کے عشق کے درمیان اس جھاڑو کی دیوار کھڑی ہے" لالی نے جھاڑو کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں تجھ سے محبت کرتا ہوں" تحصیلدار صاحب نے قلم سے بلاٹنگ پیپر پر کچھ لکھتے ہوئے کہا

"او حضور مجھے بھی تو پرماتما نے دل دیا ہے" لالی نے دلیری سے جواب دیا۔

"تو پھر کس بات کا ڈر ہے؟"

"مگر جب تک آپ کو کوئی حق حاصل نہیں ہوتا، اُس وقت تک میں آپ کے پاس نہیں آ سکتی۔

"تو کیا شادی!" تحصیلدار صاحب نے کانپتے ہوئے کہا۔

لالی نے نڈر ہو کر جواب دیا..... جی.....ای..... "

"یہ تو غیر ممکن ہے" تحصیلدار صاحب نے للچائی ہوئی نظروں سے لالی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو یہ بھی غیر ممکن ہے کہ آپ میرا ہاتھ تک بھی پکڑ سکیں۔"

"بڑے بڑے گھرانوں میں عشق و محبت کے ایسے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں، اور ایک چاہنے والا اپنی چہیتی کے ساتھ بغیر سماج کے نام نہاد بندھن میں پڑے ہوئے میاں بیوی کی زندگی بسر کرتا ہے" اُنھوں نے کہا۔

"حضور! بڑے گھرانوں کی بڑی باتیں، ہم ان کی کیا برابری کر سکتے ہیں، سونے میں تانبا کھپ جاتا ہے، مگر لوہے میں اگر ذرا سا بھی عیب ہو تو بیکار ہو جاتا ہے" لالی نے بے ساختہ جواب دیا۔

تحصیلدار صاحب نے پوچھا "اسکا کیا مطلب؟"

"حضور! بڑے گھرانوں کے عیبوں کو دولت چھپا دیتی ہے، مگر ہم غریبوں کی دولت تو ہماری عزت ہی ہے۔"

تحصیلدار صاحب نے پوچھا "تو کیا الکا ہے؟"

"حضور! مجبوری" لالی نے جواب دیا۔

"تو کیا تجھے مجھ سے محبت نہیں؟"

"یہ میری آنکھوں سے پوچھیے" لالی مسکراتی ہوئی بولی۔

تحصیلدار صاحب نے دیکھا سچ مچ آنکھیں عشق و محبت کے جذبات سے لبریز تھیں۔

"تو بغیر شادی تو میری نہیں ہو سکتی؟"

"میں تو حضور کی کب کی ہو چکی ہوں۔ مگر بغیر دو شرطوں کے آپ مجھے چھو نہیں سکتے۔"

"وہ دو شرطیں کیا ہیں؟" تحصیلدار صاحب نے تکیے کا سہارا پا کر پوچھا۔

"یا تو پارس وہ جو کو پارس کر لے ... یا
"یا پارس لوہے سے چھو کر لوہا بن جائے" لالی نے کہا اور بغیر تنخواہ لئے سمجھیے کر چلی گئی اور ماتھا
میں حجاؤ دینے لگی۔

(۷)

شہر میں جات پات توڑک سبھا کا جلسہ تھا۔ ایک ہریجن کی شدھی ہونے والی تھی۔ شدھی کی رسم ادا کرنے اور اُپدیش دینے کے لئے پنڈت ہیرالال صاحب کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ پنڈال بھرا ہوا تھا۔ شدھی کی رسم شروع ہوئی اور پنڈت ہیرالال جی نے خوب سرگرمی دکھائی۔ شدھ ہونے والے بھائی کے ہاتھوں سے لڈو تقسیم کروائے۔ اور اس کے بعد پنڈت جی لیکچر دینے اُٹھے۔ اُنھوں نے سب سے پہلے شدھ ہونے والے بھائی کا ہندو دھرم کی طرف سے خیر مقدم کیا، پھر حاضرین کو مخاطب کر کے کہنے لگے: "دوستو! آپ کی نجات اسی میں ہے کہ ذات پات کے نام نہاد بندھنوں کو توڑ ڈالیں۔ آپ کی نجات سے بھارت ماتا کی نجات ہے، بھارت ماتا آپ پر ہی اُمید باندھے بیٹھی ہے۔ آپ شاید اس شدھی کو پسندیدگی کی نظروں سے نہ دیکھیں گے۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہریجنوں کو پرماتما نے پیدا نہیں کیا، کیا اُن کے لئے کوئی اور دُنیا بنائی گئی ہے کیا آپ گن کرم کے قائل نہیں۔ گنگا ماتا یہ نہیں دیکھتی کہ اس میں اشنان کرنے والا کون ہے، وہ سب کو ایک سماں پوتر اور شانت کرتی ہے، سورج اور چاند یہ نہیں دیکھتے کہ یہ ہریجنوں کی جھونپڑی ہے اس پر روشنی اور دھوپ نہ ڈالیں۔ بلکہ اپنی فیاضی سے وہاں بھی روشنی اور گرمی پہونچاتے ہیں جیسے کہ ایک برہمن کے گھر میں یہ بھی ہمارے بھائی ہیں۔ ایک ہی پتا کے پُتر ہیں، ان کی سیوا کا احسان ہماری قوم پر اتنا ہے جس کے بوجھ سے ہم دبے جا رہے ہیں۔ آؤ ہم سب ملکر ایشور سے پرارتھنا کریں کہ ہے پربھو ہمیں شکتی دو کہ ہم اس کام کو بیدھڑک اور بےخوف ہو کر کئے جائیں۔ ایک زبان ہو کر بولو

ذات پات نہ پوچھے کوئے   ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے

لوگوں نے اُونچے سروں میں اس چوپائی کو دُہرایا۔ ہندو دھرم کی جے پر پنڈت جی کا زبردست لیکچر ختم ہوا سب پنڈت جی کی تعریف کرنے لگے اور کہنے لگے کہ اگر ایسے ہی دو چار ودوان اور ہمارے دیش میں ہو جائیں تو بھارت ورش کا بیڑا پار ہو جائے۔

گنگا پرشاد بھی خاص طور پر مدعو کئے گئے تھے۔ وہ شروع سے آخر تک جلسہ کی کارروائی دیکھتے رہے اپنی زندگی میں آج پہلی دفعہ وہ اس قسم کے جلسے میں آئے تھے۔ اپنے والد محترم کی تقریروں کی دھاک تو بہت سُنی تھی اپنے کانوں سے سُننے کا موقع آج ہی ملا۔

(۸)

باپ بیٹا کھانا کھا رہے تھے، گنگا پرشاد نے پوچھا، "کیا ذات پات کا بندھن کچھ بھی نہیں؟"

پنڈت جی نے جواب دیا، "گن کرم سبھاؤ پر دھان ہیں۔"

"تو کیا ایک بھنگی بھی شدھ ہو کر سماج میں وہی درجہ حاصل کر سکتا ہے جو ایک اونچے کل کے برہمن کو حاصل ہے؟" گنگا پرشاد نے سوال کیا۔

پنڈت جی نے عالمانہ طریق پر جواب دیا، "آخر گن کرم سبھاؤ ہی تو پربل ہیں، ذات پات تو محض ڈھونگ ہے۔"

"تو کیا اگر برہمن ایک بیر بجن لڑکی سے شادی کرنا چاہے تو دھرم کے انوسار اس کی شادی جائز ہوگی؟"

پنڈت جی اب ذرا چکرائے، بولے "ہاں جائز تو ہوگی اور شاستر کی پرمان آگیا بھی ہے، مگر دیش اور کال کا وچار بھی لازم ہوگا۔"

گنگا پرشاد: "پتا جی! آپ جیسے وسیع النظر انسان کے لئے دیش اور کال کا وچار اس وقت ہونا چاہئے جبکہ کوئی بات شاستر مریادا کے خلاف ہو۔ جب شاستر ایک بات کی آگیا دیتا ہے اور بھارت ماتا بھی آپ سے قربانی مانگتی ہے، تو کیوں نہ سب سے پہلے اپنے کو ہی فرض کی دیوی پر قربان کر کے زمانہ کے لئے ایک آدرش قائم کر دیں؟"

پنڈت جی کچھ نہ سمجھ سکے کہ گنگا پرشاد کا آخر مطلب کیا ہے، پوچھا: "ذرا اور تشریح کرو، تمہارا اصلی مقصد کیا ہے؟"

گنگا پرشاد نے کہا "فرض کیجئے کہ آپ کا کوئی دوست ہے اور اس کا لڑکا کسی بیر بجن لڑکی سے محبت کرتا ہے اور لڑکی بھی اسے دل سے پیار کرتی ہے، دونوں کا پریم سچا ہے، اور وہ تو چاہتے ہیں کہ دنیوی نظروں سے دو قالب ایک جان کے رشتہ میں منسلک ہو جائیں، اب اس کے لئے دو ہی راستے ہونگے، یا تو بیر بجن لڑکی شدھ ہو جائیگی یا اس کا لڑکا خود ہندو جاتی کو چھوڑ کر بیر بجن بن جائیگا۔ ہندو دھرم کی رو سے تو بیر بجن بھی ہندو ہی ہیں، دھرم ایک لامحدود شے ہے۔ اب آپ بتلایئے آپ اپنے دوست کو کیا صلاح دیں گے، ہندو جاتی کی رکھشا کریں گے یا اس کا پتن؟"

پنڈت جی بولے: "انسان دوستی، انسانی ہمدردی اور ریفارمر کی حیثیت سے تو میں یہی صلاح دونگا کہ جس طرح بھی ہو ہندو جاتی کی رکھشا کی جائے اور بیر بجن لڑکی کو شدھ کر کے جاتی میں ملا لیا جائے۔"

گنگا پرشاد کا چہرہ کھل اٹھا۔ "تو پتا جی! آج آپ نوشی دوا دیں کہ جات پات توڑک سبھا میں ایک بیر بجن لڑکی شدھ ہوگی اور اس کا بیاہ ایک برہمن لڑکے سے کیا جائیگا۔"

پنڈت جی: "میں نہیں سمجھا تم کیا کہہ رہے ہو، صاف صاف کہو۔"

گنگا پرشاد: "صاف صاف سنیئے، میں للّی کو دل سے چاہتا ہوں اور للّی بھی مجھ سے پریم کرتی ہے چہ وہ ایک ہریجن لڑکی ہے، مگر عصمت کی دیوی اور حسن کی پُتلی ہے، تاوقتیکہ اُس کا بیاہ میرے ساتھ نہ دیا جائے وہ ہاتھ لگائے جانے تک کی روادار نہیں۔"

پنڈت جی پر گویا بجلی گر گئی، پیر تلے کی زمین کھسکتی ہوئی معلوم ہوئی، کچھ دیر تک تو سکتہ کا عالم طاری رہا ۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں، تیوروں پر بل پڑ گئے اور کڑک کر بولے: "گنگا..... یہاں تک..... کل مریادا کو ۔ل نشٹ کرنے کا وچار ہے، اسی لئے کہتے ہیں کہ زیادہ تعلیم بھی اکثر نوجوانوں کو خراب ہی کرتی ہے، میں نے ۔اہ مخواہ تمہیں پڑھا کر یہ آفت مول لی۔"

گنگا پرشاد: "پتا جی! گُن کرم اور سُبھاؤ کو مدِ نظر رکھیئے، اب زبان سے نہ پھریئے۔"

پنڈت جی نے پھر گرج کر کہا: "چولھے میں جائیں گُن کرم اور بھاڑ میں جائے شدھی اندولن۔"

گنگا پرشاد نے طنزاً پوچھا "تو کیا آپ کی گرما گرم تقریریں اور تحریکیں صرف اَوروں کے لئے ہیں؟ ۔د عمل کرنے کے لئے نہیں؟"

پنڈت جی: "مجھ کو بھی پڑھانے لگا ہے!"

"تو پتا جی! معاف فرمائیں، مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ دنیا کو دھوکا دے رہے ہیں، یہ بھارت ۔ن کا اُدّھار نہیں بلکہ گراوٹ ہے، بادل جتنا گرجتا ہے اگر اتنا ہی برسے تو دنیا سبز ہی سبز نظر آئے، آپ ۔ک ہیں جو چاہے کریں۔ مگر میں صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کسی حالت میں بھی اس شدھی اور شادی ۔ی اجازت نہیں دے سکتے؟"

پنڈت جی نے آنکھیں دکھاتے ہوئے جواب دیا: "نہیں ہرگز نہیں! اگر تم بیوقوف ہو تو میں تمہارے ۔ساتھ بے سمجھی کی بات نہیں کر سکتا۔"

گنگا پرشاد: "بہتر، میں اگرچہ اپنے آپ کو لیڈر یا ریفارمر نہیں مانتا، نہ ہی سبھاؤں میں جاکر تقریریں کرتا سُنتا ہوں، مگر اپنے دھرم کو ضرور پہچانتا ہوں، میرا دھرم کہتا ہے کہ والدین کا حکم بجا لانا ہی فرزند ۔فرض اولین ہے، اس لئے میں آپ کا حکم بسر و چشم بجا لانے کو تیار ہوں، مگر ساتھ ہی اتنی گذارش ضرور ۔بجا کہ آپ اس بہروپ کو چھوڑ دیں، اس میں آپ کی بھی بھلائی ہے اور قوم و ملک کا بھی فائدہ ہے ۔س کام کو آپ خود نہیں کر سکتے اُس کی دوسروں سے اُمید رکھنی سخت غلطی ہے۔ ایک ریفارمر یا لیڈر ۔رض ہے کہ وہ جو کچھ کہے اُس پر عمل کر کے دُنیا کے لئے ایک قابلِ تقلید نمونہ بن کر دکھائے۔ اگر تقریر اور

عمل میں کوئی تعلق نہ ہو تو ایسی تقریریں بالکل بے اثر ہیں، ان کا کوئی اثر سامعین پر نہیں ہو سکتا۔"
پنڈت جی: "چل چل آیا ہے کل کا چھوکرا نصیحت کرنے، جا اپنا کام کر۔"
گنگا پرشاد جی خاموش ہو کر چلے گئے اور پنڈت جی اگلے ہفتہ کا لیکچر تیار کرنے میں مصروف ہوگئے سب سے اوپر اُنھوں نے یہی چوپائی لکھی ؎

ذات پات نہ پوچھے کوئے ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے

(۹)

لاّلی کی شادی ٹھیک ہوگئی، پاس ہی پڑوس کے گاؤں میں ایک ہریجن اس گلِ نوبہار کے لئے چُنا گیا وہ تقریباً چالیس سال کا تھا اور میونسپلٹی میں بارہ روپے ماہوار پر نوکر تھا، دس بارہ گھر ججمانوں کے بھی تھے، اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی، گھر کا مکان بھی تھا، کچھ زمین بھی تھی اور ایک بھینس بھی!

شیرو اور اُس کے رشتہ دار اس رشتہ سے بہت خوش تھے، اس سے زیادہ لاّلی کو اور کیا مل سکتا تھا۔ اچھا گھر اچھا بَر، اور بَر کیا بھی خوش قسمت تھا کہ اُسے ایک ہوشیار دُلھن مل رہی تھی، بچارے کو حُسن اور بھری جوانی کی تو کیا قدر تھی، وہ تو اس بات پر خوش تھا کہ لاّلی کے آتے ہی اُس کی آمدنی میں اضافہ ہو جائیگا۔ دس ججمان اور بن جائیں گے، ججمانوں کے تمام گھروں کو میاں بیوی آدھا آدھا بانٹ لیں گے، علاوہ اس کے شہر میں صفائی کے دفتر میں بھی لاّلی کا نام لکھوا دیا جائیگا، وہاں سے بھی کچھ آمدنی ہو جائیگی۔ ہر انسان ہر شے کو خودغرضی کی عینک سے دیکھتا ہے۔ شادی میں محض چار دن رہ گئے تھے، دونوں طرف تیاریاں ہو رہی تھیں، مہمان آنے شروع ہو گئے تھے، شام کے وقت برگد کے درخت کے نیچے شراب کا دَور چلتا، ڈھولک بجتی تھی، گانا بجانا بھی ہوتا تھا، شیرو خوش تھا کہ ایک بوجھ سر سے ہٹ جائیگا۔ اگر سچ پوچھئے تو شادی کے تمام اخراجات تحصیلدار صاحب نے اُٹھائے تھے۔ شیرو کو یکمشت تین سو روپے قرض دیدیئے تھے، کپڑے وغیرہ بھی اُنھوں نے بنوائے تھے اس کے لئے لاّلی کے ماتا پتا حد سے زیادہ خوش تھے اور تحصیلدار صاحب کے شکرگذار۔

مگر لاّلی کے چہرے سے خوشی کے آثار مفقود تھے، وہ ایک ایسی کلی تھی جو کِھلنے سے پہلے ہی مرجھائی جا رہی تھی، سکھیوں کا چھیڑنا اُسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، تحصیلدار صاحب کے بھیجے ہوئے کپڑے کفن سے بدتر معلوم ہوتے تھے، وہ رات دن اکیلی پڑی پڑی نہ معلوم کیا سوچتی تھی، اُس کے لب بند رہتے لیکن دل اندر ہی اندر کراہتا تھا۔ آنکھیں خشک تھیں مگر جگر روتا تھا، اب وہ تھی یا اس کی بیکسی

(۱۰)

آج پھیرے کی رات تھی، یہ کامرانی کی رات ہوتی ہے جب حُسن کا خیر مقدم کرنے والا ملتا ہے، اور تمام اُمیدیں

ایک مرکز پر اکٹھی ہو جاتی ہیں
مگر لالی کی طبیعت آج شام سے زیادہ بگڑی ہوئی تھی، دو چار قے بھی آئی تھیں اور اسی وقت سے وہ نڈھال سی پڑی تھی۔ ماتا پتا اور دوسرے رشتہ داروں کو بڑی تشویش ہو رہی تھی۔ برات تحصیل کے برآمدے میں اتر چکی تھی، براتی کچھ تھکے ماندے سے تھے، دیسی شراب کی بوتلیں کھل رہی تھیں۔ تحصیلدار صاحب کا حکم تھا کہ یہ جس طرح چاہیں تحصیل کے برآمدے میں رہیں کوئی مخل نہ ہو۔ تحصیلدار صاحب سرشام ہی سے اپنے ایک دوست کے ہاں دعوت کھانے کا بہانہ کر کے تحصیل کے کوارٹروں سے چلے گئے۔ وہ علم موسیقی کے دلدادہ تھے اپنے ایک دوست کے ہاں غم غلط کرنے کے لئے پہونچے، وہاں ہارمونیم موجود تھا، وہ اچھا بجا سکتے تھے بے تکلف سوسائٹی بھی تھی، تحصیلدار صاحب اپنے دل کے امڈے ہوئے جذبات کو دبانے کے لئے یہاں آئے تھے، ظاہرا بہت خوش نظر آتے تھے، بات بات پر لطیفے سناتے تھے، مگر جوں جوں وقت گذرتا تھا اُن کا دل بیٹھا جاتا تھا، کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد تحصیلدار صاحب نے باجہ چھیڑا اور گانا شروع کیا، بہاگ، پیلو اور پہاڑی پر زیادہ زور تھا، ہزار چاہا کہ پروا، دیس یا ہنڈول شروع کریں مگر ہر دا کے سُر پیلو میں بدل گئے۔ دیس کے سور ٹھیں اور ہنڈول کے للت ہیں۔ آخر چند احباب نے غزلوں کی فرمائش کی۔ دو چار غزلوں کے بعد تحصیلدار صاحب نے کہا لیجئے صاحبان ایک نئی غزل سنئے اور شاعر کے جذبات کی داد دیجئے۔ رعایت۔ استعارہ۔ خیالات۔ بندش ملاحظہ کے قابل ہیں۔ ہارمونیم کے سُر چھیڑے۔ بہاگ کی مست الاپ کے بعد ایک غزل شروع کی سابھی غزل ختم نہ ہونے پائی تھی کہ باہر سے آواز آئی۔ تحصیلدار صاحب! ..... یہ آواز شیرو کی تھی

تحصیلدار صاحب گھبرائے ہوئے باہر آئے۔ دیکھا شیرو حیران پریشان ننگے پاؤں، ننگے سر باہر کھڑا ہے۔ انھوں نے تعجب سے پوچھا: "خیر تو ہے؟"

"حضور چلئے! لالی کوئی دم کی مہمان ہے، میری عزت خاک میں مل گئی، وہ مرنے سے پہلے آپ کے درشن کرنا چاہتی ہے، اُس نے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ اگر اس بات کی خبر ہمیں پہلے ہوتی تو یہ دن کیوں دیکھنا نصیب ہوتا۔

تحصیلدار صاحب اس منحوس خبر سے گھبرا گئے، پاؤں تلے کی زمین نکل گئی، کاٹو تو لہو نہیں بدن میں دوستوں سے سرکاری کام کا بہانہ کر کے شیرو کے ساتھ ہو گئے۔

(۱۱)

لالی ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر ایک چھوٹی مگر صاف کوٹھری میں پڑی تھی۔ تحصیلدار صاحب کا بھیجا ہوا گورنمنٹ کا سوٹ سامنے لٹک رہا تھا آپ وہی کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ ایک طرف مٹی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا

سہاگ کے جوڑے کا کفن سرہانے رکھا ہوا تھا۔ لالی اب وہ لالی نہیں تھی، اُبھرے ہوئے رخسار نہ معلوم کیوں پچک گئے تھے۔ آنکھیں نہ معلوم کیوں بے رونق ہو گئی تھیں۔ صرف پلکیں اس بات کی شہادت دیتی تھیں کہ ان کے نیچے کبھی دو مست آنکھیں تھیں، رنگ بالکل زرد تھا، دروازے کی طرف ٹکٹکی بندھی ہوئی تھی، سانس تیزی سے چل رہا تھا۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور ادھر لالی کی نیم مُردہ آنکھیں کھل گئیں۔ تحصیلدار صاحب نے دیکھا کہ جن آنکھوں میں کبھی عشق و محبت کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا، اُن میں اب بلا کی حسرت اور نا اُمیدی بھری تھی، لالی کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم آیا، اُس نے بڑی مشکل سے اپنا دوپٹہ سنبھالا، نیم مردہ آنکھیں پھر بند ہو گئیں

تحصیلدار صاحب نے سرہانے جا کر پکارا: "لالی!"

ہلکی سی "جی" کی پیاری آواز نکلی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"پیاری! تمہاری یہ حالت؟" تحصیلدار صاحب نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"حضور! غریب کی محبت بھی غریب ہوتی ہے، جس طرح میں بیکس و لاچار ہوں، اُسی طرح میری محبت بھی بیکس و لاچار ہے۔"

تحصیلدار صاحب نے دوڑ کر لالی کا ہاتھ تھام لیا، اور اُس کا سر زانو پر رکھ کر رومال سے اُس کے رخساروں پر ڈھلکتے ہوئے آنسو پونچھنے لگے۔

لالی میں اگر طاقت ہوتی تو اب بھی تحصیلدار صاحب کو ایسا نہ کرنے دیتی مگر اس وقت مجبور تھی۔ حیا اور عصمت پر آنے والی موت کی کمزوری غالب تھی۔

تحصیلدار صاحب نے لالی کی پیشانی کے بال ہٹاتے ہوئے کہا: "لالی.... اور بیتابی سے لالی کے خشک رخساروں کو گویا چومنے کے لئے جھکے مگر لالی کے رخساروں تک تحصیلدار صاحب کے ہونٹ پہونچنے بھی نہیں پائے تھے کہ لالی کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ تحصیلدار صاحب نے چھیڑ کی غرض سے کہا: "لالی دیکھو چراغ تلے اندھیرا!"

مگر لالی کی وہ پیاری آواز "جی!" سُننے میں نہ آئی، تحصیلدار صاحب نے دیکھا، حسن کا دریا اُتر چکا تھا، ادھ کھلی کلی مرجھا چکی تھی، شباب کا سایہ ڈھل چکا تھا۔ تحصیلدار صاحب نے ایک چیخ ماری اور اُسی کے سینے پر سر رکھ کر بیہوش ہو گئے۔ شیرو وغیرہ جو تحصیلدار صاحب کے اندر داخل ہونے پر کوٹھڑی سے باہر آ گئے تھے چیخ کی آواز سُن کر اندر آئے۔ دیکھا تحصیلدار صاحب بھی ٹھنڈے ہو چکے ہیں، آہ! آج لوہے نے پارس کو چھو کر سونا بنا لیا۔ مگر لالی نے چراغ تلے اندھیرا نہ ہونے دیا۔ جیتے جی تحصیلدار صاحب کو

ہاتھ نہ لگانے دیا۔

دونوں کا جنازہ ایک ہی وقت میں نکلا۔ مرنے کے بعد ہی سچے پریمیوں کی حسرت نکلا کرتی ہے۔ دونوں ایک ہی شمشان بھومی میں جلائے گئے۔ جسے سماج نے روکا تھا اُسے محبت نے پورا کر دیا۔ دونوں چتائیں جل رہی تھیں، شعلے ایک دوسرے سے لپٹے جا رہے تھے۔ تحصیلدار صاحب کی چتا سے گویا آواز آئی "لالی!" اُس نے کہا "جی!" پریم کی جیت ہوئی اور سماج کی ہار۔

پنڈت ہیرا لال اکلوتے اور ہونہار بیٹے کا صدمہ برداشت نہ کر سکے، مہینوں روتے رہے، آخر آنکھوں کی بینائی کھو بیٹھے۔ اگر انھیں اس نتیجہ کا علم ہوتا تو وہ گنگا پرشاد کو اس شادی سے نہ روکتے۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا، اور اُس نے نشانے پر بیٹھ کر دو معصوم روحوں کی پاکیزہ زندگیوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ پنڈت جی کے خیالات میں گنگا پرشاد اور لالی کی قربانی سے زبردست انقلاب آ چکا تھا، اب وہ قول و فعل کی یکسانیت کی حقیقی اہمیت محسوس کرنے لگے تھے۔ پنڈت جی کا لیکچر اب بھی سبھا میں بدستور ہوتا تھا، مگر اب اس میں خاص درد و اثر ہوتا تھا جو پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا، جات پات توڑک سبھا کے بہت سے ممبر بڑھ گئے جنھوں نے اپنی قابل تقلید زندگیوں سے قوم کی حالت بدل کر رکھدی۔

مگر پنڈت ہیرا لال کے لئے اکلوتے بیٹے کا غم آخر مہلک ثابت ہوا، وہ اندر ہی اندر گھل گھل کر کمزور ہو گئے اور چند ماہ بیمار رہ کر راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ گنگا پرشاد، لالی اور پنڈت ہیرا لال کی سمادھیاں جات پات توڑک سبھا کی طرف سے پختہ بنوا دی گئیں، جن پر جلی حروف میں یہ چوپائی کندہ تھی ؎

ذات پات نہ پوچھے کوئے ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے

عمل کی عظمت

(ایک سنسکرت اشلوک کا مفہوم)

(از حضرت منور لکھنوی)

قسمت کے ڈر سے کچھ بھی نہ کرنا ادنیٰ ترین ہے اسفل ترین ہے
کچھ کام کرنا، پھر چھوڑ دینا ہے کچھ غنیمت پھر بھی نہیں ہے
ہر حال میں تو محوِ عمل رہ یہ بات اعلیٰ تر بالیقیں ہے

غزل

از جناب سید اختر علی آختر تلہری (شاہجہانپور)

ہر نفس تجھکو ہے اندیشۂ انجام ابھی
عقل پختہ سہی سودا ہے ترا خام ابھی

کیفِ امروز کا محرم ہو تو ناداں کیونکر
تو نے بدلے ہی نہیں ہیں سحر و شام ابھی

مصحفِ دہر کے اِک لفظ کی تفسیر نہ کی
زندگی تیری ہے بے معنی و ناکام ابھی

یوں شب و روز نہ تو دہر کا شکوہ کرتا
تو نے فطرت کا سُنا ہی نہیں پیغام ابھی

عشق کے بادۂ رنگیں میں ذرا اس کو ڈبو
دیکھ سادہ ہے ترا جامۂ احرام ابھی

قافلہ والے کہیں سے ہیں کہیں جا پہونچے
بدنصیبی سے ہے تو مائلِ آرام ابھی

محفلِ عیش میں باتوں کے بنانے والے
امتحاں کا ترے آنے کو ہے ہنگام ابھی

سطوتِ غم سے پھر چھا گئے آفاق پہ وہ
جن کو تو کہتا تھا خورشیدِ لبِ بام ابھی

اپنی بے بال و پری کا تو مداوا کر لے
پھڑ پھڑاتا ہے عبث مرغِ تہِ دام ابھی

گلشنِ حسنِ حقیقی میں کہاں تیرا گذر
تو ہے مفتونِ حسینانِ گل اندام ابھی

حوصلوں میں ترے رفعت ہو کہاں سے پیدا
شوق ہے خام تو ہے ذوق ترا عام ابھی

طورِ عرفانِ حقیقت پہ تو پہونچے کیونکر
کعبۂ دل میں بھرے ہیں ترے اصنام ابھی

ساقیِ بزم کے بدلے ہوئے تیور پہ نہ جا
شوقِ صادق ہو تو ملتا ہے تجھے جام ابھی

تو ہوا اور شانہ کشِ زلفِ حقیقت اختر
تجھ سے چھوٹا نہیں سر رشتۂ اوہام ابھی

یادِ ماضی

(از بادا کرشن گوپال مغموم، بی۔ اے)

گذشتہ دورِ محبت کی یاد آتی ہے
یہ یاد آتی ہے جب مجکو خوں رُلاتی ہے

نظر سے چھُپ گئے افسوس! صبح و شامِ عشق
کہاں ہے حُسن کی مَے سے بھرا وہ جامِ عشق؟

وہ دورِ عیش وہ دورِ نشاط، کیا کہنا!
سرورِ لُطفِ مئے اختلاط، کیا کہنا!

کھُلا ہوا وہ چمن زارِ اک مرادوں کا
وہ اک مرقعِ رنگیں حسین خوابوں کا

وہ مسکراتے ہوئے گل، وہ دل فزا کلیاں
حریمِ نازِ محبت کی خوش ادا کلیاں

ہر ایک گل سے وہ اُٹھتی ہوئی وفا کی بُو
سوادِ صحنِ چمن میں گلِ حنا کی بُو

وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کا جھوم کر چلنا
وہ آسماں پہ گھٹاؤں کا جھوم کر چلنا

وہ سبز پتے درختوں کے گنگناتے ہوئے
خوشی کے جوش میں وہ تالیاں بجاتے ہوئے

وہ بُلبلوں کے ترانے، وہ کوئلوں کی کُوک
وہ قمریوں کی صدائیں، وہ سارسونکی ہُوک

سیاہ ابر میں بگلوں کی دل فریب قطار
نظر نواز وہ خوش رنگ وادیِ کہسار

وہ زیرِ سایۂ اشجار مرغزاروں میں
سفید گائیں وہ چمکیلے سبزہ زاروں میں

وہ گرد و پیش ہری جھاڑیوں کا خوش منظر
وہ آبِ صاف کے جھرنے، وہ خوشنما پتھر

وہ بن میں چوکڑی بھرتے ہوئے ہرن ہر سُو
وہ لمبی دُوب، وہ کھلے ہوئے یاسمن ہر سُو

وہ بن کے مور، وہ موروں کا رقصِ جاں پرور
وہ اَبر، اَبر میں بجلی کا دلکشا منظر

وہ جھیل، جھیل کے پانی میں آسماں کا عکس
وہ نیلے پانی میں گلہائے زعفراں کا عکس

کچھ ایسا وقت تھا، ایسا ہی کچھ سماں تھا وہ
زمین ایسی تھی، ایسا ہی آسماں تھا وہ

مگر کچھ ایسا طبیعت میں انقلاب ہے اب — یہ دل جو خوش تھا کبھی وقفِ اضطراب ہے اب
سکوں نہ دن کو میسّر، نہ رات کو تسکیں — عجب کشاکشِ غم میں ہے اپنی جانِ حزیں
نگاہ میں نہیں جچتے مناظرِ قدرت — پسند دل کو نہیں اب مظاہرِ قدرت
نظر کے سامنے اِک بوستانِ ویراں ہے — پڑا ہے خاک پہ ہر پھول، بُو پریشاں ہے
کچھ ایسی بدلی ہے صورت خزاں نے گلشن کی — زمینِ صحنِ چمن اب زمیں ہے گلخن کی
ہوائے فصلِ خزاں نے چمن کو لوٹ لیا — غریب پھولوں کے رنگیں وطن کو لوٹ لیا
بچارے نازوں پلے پھول خاک بسر ہیں — بچارے خاک میں نالہ کشِ مقدر ہیں
روش روش پہ پڑے ہیں پامال زرد رُو پتّے — رُلاتے ہیں نگہِ یاس کو لہُو پتّے
چمن چمن تھا کبھی، تیرہ خاکداں ہے اب — یہ اپنے ماضیِ رنگیں کی داستاں ہے اب
نہ طائرانِ چمن زاد کے ترانے ہیں — نہ الفتِ گُل و بلبل کے اب فسانے ہیں
سیاہ ابر جو گردوں پہ گھر کے آتا ہے — تو پہروں آنکھوں کو میری لہو رُلاتا ہے
نظر جو آتی ہے بگلوں کی وہ سفید قطار — غمِ فراق میں روتا ہوں میں بحالِ نزار
وہ مرغزار، شکیبِ دلِ حزیں تھے جو — وہ لالہ زار، ہمیشہ سے دلنشیں تھے جو
نگاہ دیکھ کے اُن کو اُداس ہوتی ہے — بہ یمنِ سوزِ نہاں، وقفِ یاس ہوتی ہے
وہ جھیل دیکھ کے وحشت سی دل کو ہوتی ہے — لرزتی جان ہے ہیبت سی دل کو ہوتی ہے

وہ دَورِ ماضی جو پھر سے مجھے میسّر ہو
تو دل پہ میرے نہ یوں حسرتوں کا خنجر ہو

قطعہ

روتا مجھے چھوڑ جانے والے — کیا تجھ سے کہوں کہ حال کیا ہے
آنکھیں ہیں کہ آشیانِ ویراں — طائر جس میں سے اُڑ گیا ہے

رفتار زمانہ

جنگ کا زیادہ زور اس وقت روس اور ہندوستان کی مشرقی سرحد پر ہے۔ یکم جنوری ۱۹۴۴ء سے اب تک روسیوں نے دشمنوں سے اپنے تمام اہم علاقے خالی کرا لیے ہیں۔ انھوں نے دشمنوں کو دریائے نیپر کے کنارے سے دریائے نسٹر تک دھکیلا اور پھر نسٹر سے دریائے پروتھ اور سیرتھ تک بھگا دیا۔ اور اس طرح وہ مغرب کی طرف برابر بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک روسی فوج تارنوپول سے لاڈی کی طرف پولینڈ میں بڑھ رہی ہے۔ دوسری روسی فوج نے اسکالا کے میدان میں جرمن فوجوں کو گھیر لیا ہے۔ تیسری روسی فوج جنوب کی طرف دریائے پروتھ کو پار کرکے رومانیہ میں داخل ہو گئی ہے، جس نے جاسی کا اہم مقام فتح کرکے دامن کوہستان کارپیتھین کی طرف بڑھنا شروع کر دیا ہے۔ چوتھی روسی فوج نے تیراسپول کے جنوب دریائے نسٹر کو پار کرکے بسارابیہ کے دارالحکومت کشی نف کا گھیرا ڈال لیا ہے۔ پانچویں روسی فوج نے بندرگاہ اوڈیسا اور اوویڈیوپول پر قبضہ کرکے بحیرۂ اسود کے کنارے رومانیہ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا ہے۔ کوہستان کارپیتھین کی طرف روسی فوجوں کی یلغاروں کو جرمن جنرل مارشل مانسٹین روک رہا ہے جس کو پچھلے دنوں تازہ دم کمک بھی پہونچ گئی ہے۔ اس کے علاوہ مانسٹین کے عقب میں جرمنوں کا سلسلۂ مواصلات بھی پوری طرح قائم و مضبوط ہے۔ اوڈیسہ سے آگے بڑھنے والی روسی فوجوں کی مزاحمت جرمن جنرل فان کلیسٹ کر رہا ہے اس نے رومانوی بندرگاہ گیلاٹز کے سامنے مورچہ بندی کی ہے تاکہ رومانیہ کی حفاظت کی جائے۔ اگر روسی فوجیں ان جرمن مورچوں کو بھی توڑنے میں کامیاب ہو گئیں تو پھر رومانیہ کا دارالحکومت بخارسٹ اور پلوئشتی کے تیل کے چشمے خطرہ میں پڑ جائیں گے جن کی حفاظت کے لیے جرمن ایڑی چوٹی تک کا زور لگا دیں گے۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز اور شاندار فتوحات روسی فوجوں کو جن کی کمان جنرل تولبوخین اور یریمینکو کے ہاتھ میں ہے جزیرہ نمائے کریمیا کے اندر حاصل ہوئی ہیں۔ کریمیا میں روسی فوجوں نے صرف چار دن کی معرکہ آرائی میں ۳۷ ہزار جرمن و رومانوی سپاہی قید کر لیے ہیں۔ اور ۱۱ اپریل سے ۱۴ اپریل تک روسی فوجیں کرچ، یوپاتوریہ، سمفروپول، فیوڈوسیا، یلٹا اور بلیک لادہ پر قابض ہو گئی ہیں۔ اس کے بعد جرمنوں کے سخت مقابلہ کے باوجود روسیوں نے کریمیا کی بندرگاہ سیواستوپول پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہ مقام بہت مضبوط اور قلعہ بند تھا۔ اس مشہور بندرگاہ کے ہاتھ میں آ جانے سے روسیوں کے لیے بلقان کا راستہ صاف ہو گیا ہے۔ اور بحر اسود میں جرمنوں کا [illegible] ہو گیا ہے [illegible]

اس محاذ پر فریقین اپنے اپنے لشکروں کی درستی، کمک کی فراہمی اور آئندہ معرکوں کی تیاری میں مصروف ہیں یہ عارضی سکون آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اس محاذ پر فریقین میں زور کی ٹکر ہوگی۔ جرمن جنرل تین طرف سے روسی حملوں کا اندیشہ کر رہے ہیں۔ (۱) ریگا کو مستقر قرار دیکر روسی فوجیں بحر بالٹک کے کنارے کنارے استھونیہ، لیٹویہ۔ اور لتھوانیہ پر فوج کشی کریں گی۔ (۲) دوسری پیش قدمی منسک اور وارسا کی طرف ہوگی۔ (۳) تیسری یلغار میں روسی لشکر مختلف سمتوں سے نقل و حرکت کر کے رومانیہ و کارپیتھین کے دروں میں گھس کر ہنگری پر حملہ آور ہوں گے۔ اس ہونے والی جنگ کے نتائج پر جرمنی کی قسمت کا فیصلہ منحصر ہے۔

اٹلی کے محاذ پر کوئی اہم تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ گو کہ اٹلی میں اتحادیوں کی فوج کشی کو ۸ مہینے ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک اٹلی کا صرف ایک تہائی حصہ اتحادیوں کے قبضہ میں آسکا ہے۔ مہینوں سے کاسینو اور آنزیو کے مورچوں پر جرمن اور اتحادی فوجیں بالمقابل پڑی ہوئی ہیں، دونوں طرف سے پوری پوری کوششیں جاری ہیں۔ پانچویں اور آٹھویں لشکر نے اب پیش قدمی شروع کی ہے اور دو تین میل آگے بڑھ گئی ہیں، یہ حملہ جرمنو کی گسٹو لائن کی پوری لمبائی پر کیا جا رہا ہے۔ کاسینو اور لیری کے درمیان آٹھویں لشکر نے دریائے ریپڈو کو عبور کر لیا ہے، اور جرمن فوجوں کو گسٹو لائن کی بیرونی صف بندی سے نکال دیا ہے، لیکن جرمن بہت سخت مقابلہ کر رہے ہیں اور اپنے مورچے مستحکم کر رہے ہیں۔

جرمنی پر ہوائی حملوں کا سلسلہ جاری ہے جن میں ہزار دو ہزار کی تعداد میں ہوائی جہاز حصہ لیتے ہیں۔ ان حملوں میں جرمنی کے ان کارخانوں کو جو جنگی سامان تیار کرنے میں مصروف ہیں شدید نقصان پہونچایا جاتا ہے۔ خیال ہے کہ جنگ شروع ہونے سے اب تک اتحادیوں نے جرمنی اور اٹلی کے چھبیس ہزار ہوائی جہاز تباہ کئے ہیں۔

اتحادیوں نے فنلینڈ، رومانیہ، ہنگری، اور بلغاریہ کو الٹیمیٹم دیدیا ہے کہ وہ جرمنی کا ساتھ چھوڑ دیں ورنہ اگر وہ اپنی موجودہ پالیسی پر قائم رہیں گے تو اُن کے حق میں اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں دوسرا محاذ جلد ہی کھلنے والا ہے، فوجیں اور ساز و سامان جمع ہو چکا ہے، جرمنی اور جرمن مقبوضہ یورپ پر دن رات بمباری کی جا رہی ہے۔ جرمن بھی اس سے بے خبر نہیں ہیں فیلڈ مارشل رومل نے یورپ کے مغربی ساحل کی مورچہ بندی مکمل کر لی ہے۔ ہالینڈ کا کچھ حصہ زیر آب کر دیا گیا ہے، حال کی ایک خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر چرچل نے فیلڈ مارشل اسمٹس وغیرہ کی ہمراہی میں برطانوی طیاروں اور فوجوں کا معائنہ کیا۔ اس معائنہ میں ایک خفیہ ہتھیار کا بھی مظاہرہ کیا گیا جو رومل کی مورچہ بندیوں کے توڑنے میں کام میں لایا جائیگا۔ فیلڈ مارشل اسمٹس کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ حملہ کا وقت بالکل قریب آگیا ہے۔

مسٹر ڈی ویلیرا نے گورنمنٹ کے شکست ہو جانے پر آئرلینڈ میں دوبارہ عام انتخابات کئے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ انتخابات ۳۰ مئی ۱۹۴۴ء کو ہوں گے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ مسٹر ڈی ویلیرا کو ان جدید انتخابات میں اکثریت حاصل ہو جائیگی۔

سرحد برما و ہندوستان

ہندوستانی نقطۂ نظر سے اُن لڑائیوں کو جو برما اور ہندوستان کی سرحد پر ہو رہی ہیں زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ پچھلے دنوں اس محاذ پر جس کے صورت حالات کسی قدر مشکل اور غیر ہو گئی تھی لیکن اب حالت اچھی ہے۔

پچھلے دنوں جاپانیوں کے ہراول دستے جنگلوں اور پہاڑیوں میں چھپتے چھپاتے امپھال کے میدان کے شمالی و شمالی مشرقی حصوں میں کسی قدر بڑھ آئے تھے، اور دشمن کا ایک دستہ سلچر کی سڑک پر بہت آگے بڑھ آیا تھا یہ سڑک منی پور روڈ سے بشن پور کے مقام پر کٹ کر چلی ہے جو امپھال سے ۲۰ میل جنوب مغرب واقع ہے۔ شمال میں جاپانی فوجوں سے کوہیما کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا، جس کا اتحادی فوجیں بڑی بہادری سے دفاع کر رہی ہیں۔ لیکن اس کے بعد صورت حالات میں خوشگوار تبدیلی ہوتی چلی گئی۔ دشمن کو نہ صرف میدان امپھال سے نکال دیا گیا ہے بلکہ اتحادیوں نے جارحانہ پوزیشن اختیار کر لی ہے۔ جو جاپانی دستہ بشن پور سلچر روڈ پر بڑھ گیا تھا اُس کا مقابلہ کر کے بھگا دیا گیا۔ اور اُس کے بیشتر سپاہی مار ڈالے گئے۔ کوہیما کو دشمن نے گھیر لیا تھا لیکن اب اتحادیوں نے دیماپور سے پہونچکر دشمن کا باؤ دور کر دیا ہے۔ اور کوہیما کے ارد گرد جاپانیوں کا صفایا کیا جا رہا ہے۔ دیماپور کوہیما کے درمیان دشمن نے سڑک پر جو رکاوٹیں پیدا کر دی تھیں وہ بھی دور کر دی گئی ہیں۔ تدام ٹاہو ٹیلیل روڈ پر لڑائیاں ہوئیں ان کا نتیجہ مذبذب رہا۔ اور بجز اس کے کہ دشمن کو شدید نقصان پہونچا، کوئی اہم تبدیلی نہیں ہوئی۔ اب چونکہ برسات بہت جلد شروع ہونے والی ہے جو دنیا کے اس حصہ میں سب سے زیادہ ہوتی ہے اس لئے دشمن آسام کی طرف زیادہ پیش قدمی نہیں کر سکے گا۔

شمالی برما میں وادی موگانگ اور میرا یوم شکا کانا علاقہ پر اتحادیوں کا دباؤ مستقل طور پر بڑھتا جا رہا ہے۔ وادی موگانگ میں شاہ دزپ سے ۲۰ میل جنوب مغرب مقام پو تسین میں ایک سخت لڑائی ہوئی تھی جس میں دشمن کو مار بھگایا گیا اور اب وہ بہت سی لاشیں اور سامان میدان میں چھوڑ کر بھاگا۔ جنرل اسٹلول کی فوجیں نانانگ کے جنوب میں دریائے تانائی ہیلان کے جنوبی کنارے پر ایک میل آگے بڑھ گئی ہیں۔

وسطی برما میں میجر جنرل ونگیٹ آنجہانی کی فوجیں جو ہوائی جہازوں سے اتاری گئی تھیں تنگ کر رہی ہیں اور دشمن کی ان فوجوں کے عقب میں جو شکا کانا میں ہیں سلسلہ مواصلات تباہ کر رہی ہیں۔ شکا کانا اور اندا کے درمیان جو ریل ہے اُس پر انھوں نے باؤ ڈال رکھا ہے۔ دشمن نے ان بہادر سپاہیوں کو تباہ کرنے کے لئے دو حملے کئے تھے

جو قائم رہے تھے۔ اب دشمن نے تیسرا حملہ شروع کیا ہے جو بہت بڑا اور سخت ہے۔ پھر بھی ابھی اتحادی سپاہیوں کا کچھ نہیں بگڑا ہے اور کاشا کے شمال مغرب میں دشمن کی رسد رسانی کا جو راستہ ہے اُسے اُنھوں نے کاٹ دیا ہے۔

اراکان کے محاذ پر دشمن کچھ پیش قدمی کرتا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اتحادیوں نے مقام بٹیا ڈونگ جو سرحد چاٹگام سے تقریباً ۱۶ میل ہے بغیر مزاحمت کے خالی کر دیا ہے اور اب تازہ ترین اطلاع یہ آئی ہے کہ بوتھیڈانگ بھی خالی کر دیا گیا ہے۔ برما میں ہوائی حملے حسب معمول جاری ہیں۔

بحرالکاہل کے محاذ جنگ کی بھی تقریباً وہی حالت ہے جو یورپین محاذ کی ہے۔ جزیرہ تیمور سے بسمارک جزائر کرولائن تک اتحادی ہوائی جہازوں کے حملوں کا سلسلہ جاری رہا اور اتحادی فوجوں نے نیو گنی میں پیش قدمی کی، اور ہالینڈیا تک پہونچ گئیں جہاں اُنھوں نے یوگاوچم پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ جزائر مارشل میں چند اور چھوٹے چھوٹے جزیروں پر قبضہ کر لیا ہے۔ اگرچہ مشکلات کو دیکھتے ہوئے اتحادی فوجوں کے یہ کارنامے کافی ٹھوس ہیں، لیکن سب سے بڑا کارنامہ وہ ہوگا جب رابول اور ترک پر اتحادیوں کا قبضہ ہو جائیگا۔ جزائر کیوسائل پر بھی اتحادی ہوائی جہازوں نے کئی مرتبہ تاخت کی ہے لیکن بحیثیت مجموعی اس محاذ پر بھی کوئی اہم ترقی نہیں ہوئی ہے۔

۶ مئی ۱۹۴۴ء کو صبح ۸ بجے مہاتما گاندھی کو اُن کی خرابیٔ صحت کی بنا پر رہا کر دیا گیا ہے۔ اس وقت گاندھی جی کو نصلی بخار ہو گیا تھا جس کے بعد اُن کے خون کا دباؤ تشویشناک حد تک کم ہو گیا تھا۔ مہاتما گاندھی کے ساتھ میرا بین اور لالہ پیارے لال بھی رہا ہو گئے ہیں۔ رہائی کے بعد گاندھی جی بمبئی آ گئے ہیں اور وہاں ہی زیر علاج ہیں۔ مہاتما جی کی رہائی سے سارے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ گاندھی جی کی رہائی محض وائسرائے کے ذاتی فیصلہ پر عمل میں آئی ہے۔

۱۴ اپریل ۱۹۴۴ء کو بمبئی کی بندرگاہ میں ایک ہولناک و تباہ کن آگ لگ گئی جو آس پاس کے مقامات میں پھیل گئی جس میں سیکڑوں جانیں تلف ہو گئیں اور ہزاروں زخمی ہو گئے۔ ہزارہا اشخاص بے گھر ہو گئے۔ پینتالیس ہزار ٹن غلہ جل گیا اور کروڑہا روپیہ کا نقصان مال ہوا۔ اس آتشزدگی کی وجوہات کے متعلق شروع میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں کی جا رہی تھیں جس کی ذمہ دار خود گورنمنٹ تھی۔ کیونکہ ابتدا میں اس آگ کی وجوہات کے متعلق کوئی سرکاری اعلان شائع نہیں کیا گیا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ یہ آگ بمبئی کی بندرگاہ میں آتشگیر مادہ لانے کی وجہ سے ہوا تھا۔ عموماً سامان گولہ بارود تمام بندرگاہوں میں نہیں لایا جاتا ہے اس وجہ سے اس حادثہ کی ذمہ داری گورنمنٹ پر ہے جس نے بمبئی پورٹ ٹرسٹ کی اس اختتامی بابائی لاگو و کر دیا ہے۔ اب گورنمنٹ نے اس حادثہ کی جانچ کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی ہے لیکن اس کا اجلاس خفیہ ہوگا اور نیز رپورٹ کے وہ حصے جو گورنمنٹ کی رائے میں پبلک مفاد یا جنگی مساعی کے خلاف ہونگے شائع نہیں کئے جائیں گے۔

پنجاب پاکستان کی اسکیم کیلئے نہایت ضروری ہے اور بغیر پنجاب کے پاکستان کی اسکیم ناقابل عمل ہو جاتی ہے مسٹر جناح پر یہ امر بخوبی روشن ہے چنانچہ وہ پنجاب کی گورنمنٹ کو لیگ کے تحت لانا چاہتے ہیں لیکن سر سکندر حیات خان ہمیشہ اس سے گریز کرتے رہے اور ان کا کہنا تھا کہ پنجاب کی وزارت لیگی نہیں بلکہ یونینسٹ ہے۔ سر سکندر کی وفات کے بعد یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مسٹر جناح اور سر سکندر میں یہ سمجھوتہ ہو گیا تھا جس کی رو سے سر سکندر نے پنجاب کے باہر پاکستان کی اسکیم کی امداد کرنا منظور کیا تھا اور مسٹر جناح نے پنجاب کے معاملات میں دخل نہ دینے کا معاہدہ کیا تھا۔ اب مسٹر جناح کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ ملک خضر حیات خاں ٹوانہ اور موجودہ وزیر اعظم پنجاب اس سمجھوتہ سے منحرف ہو کر صوبہ میں مسلم لیگ کی وزارت قائم کریں۔ لیکن ملک خضر حیات خاں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ لیگ کی کمیٹی آف ایکشن کی ایک بیٹھک دلی میں ہوئی ہے جس کی شرکت سے ملک خضر حیات خاں نے انکار کر دیا ہے۔ اسی سلسلہ میں فریقین کی جانب سے پریس میں طویل بیانات شائع ہوئے ہیں۔ عنقریب پنجاب کی اسمبلی میں فریقین کے درمیان زور آزمائی ہوگی۔ مسلم لیگ کی طرف سے ہر امکانی کوشش کیا جائیگی کہ موجودہ وزارت کی شکست ہو جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی جو سر فضل حسین کے وقت سے ابتک کامیابی کے ساتھ اس صوبہ میں برسر اقتدار رہی ہے۔ اس چیلنج کا مقابلہ کر سکتی ہے یا نہیں۔ یونینسٹ پارٹی کی کامیابی کے یہ معنی ہونگے کہ پاکستان کی مجوزہ عمارت کو دائمی نقصان پہونچ جائیگا لیکن خود واقعات پاکستان کے قیام کے خلاف رونما ہو رہے ہیں اور ہندوستان کی مغربی سرحد پر روس کی بڑھتی ہوئی طاقت پاکستان کو ناقابل عمل بنانے کے لئے کافی ہے۔

(تنقید کتب)

زنجیریں

آئین شرتپوری صاحب ایک نوجوان ادیب ہیں، جن کے افسانے ملک کے متعدد رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے قبل آپ کا ایک مجموعہ "پتنگے" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، جسے کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

"زنجیریں" سترہ مختلف افسانوں کا مجموعہ ہے۔ آپ افسانہ نگاروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کا مقصد تفریحی لٹریچر پیش کرنا نہیں بلکہ سوسائٹی کی کمزوریوں پر گہری تنقیدی نظر ڈالنا ہے۔

آپ کے افسانے عام طور سے دیہاتی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ جس سے پڑھنے والوں کے دلوں پر خاص اثر پڑتا ہے۔ کتابت چھپائی عمدہ۔

قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ: شمع بک ڈپو دہلی۔

(ب۔ د)

زمانہ

جلد ۸۲ جون ۱۹۴۴ء نمبر ۶

منشی دیانراین نگم مرحوم

(از جناب سائل نقوی معتمد انجمن ترقی اردو بھوپال)

منشی دیانراین نگم مرحوم پر اُن کے انتقال کے ایک سال بعد میں کچھ لکھ رہا ہوں۔ اُردو دنیا جیسے اپنے محسنوں کو بہت جلد بھول جانے کی عادت ہے۔ اس وقفہ کو "کافی دیر" سے تعبیر کرے گی۔ لیکن اُن قوموں کو اگر دیکھا جائے جو آج علم و ادب کی مالک بنی ہوئی ہیں تو کچھ اور ہی کیفیت نظر آئے گی۔ اُن کے وہ ادیب و انشا پرداز جن کے انتقال کو صدیاں گزر چکی ہیں آج بھی اُسی شیفتگی کے ساتھ یاد کئے جاتے ہیں۔ گویا ابھی ابھی اس دنیا سے اُٹھے ہوئے چند ہی روز ہوئے ہیں۔ اُن پر تقریریں کی جاتی ہیں، مقالے لکھے جاتے ہیں تمغے اور وظیفے اُن کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ مختلف پہلوؤں سے اُن کے کلام پر روشنی ڈالی جاتی ہے، اور یہ سلسلہ عہد قدیم سے اس وقت تک برابر جاری ہے۔ اُردو شعراء میں غالب۔ حالی۔ اقبال اور نثر نگاروں میں سرسید۔ آزاد۔ شبلی ایسی ہستیاں ہیں جن پر نسبتاً زیادہ لکھا گیا ہے۔ اب اس کے بالمقابل مغرب کی دوسری زبانوں سے قطع نظر کر کے صرف انگریزی کو لیجئے، اور اس زبان کے شاعر اعظم شیکسپیئر کو بھی اس بحث سے خارج کر کے "کہ عنقا را بلند است آشیانہ" دوسرے شعراء اور انشا پردازوں پر نگاہ ڈالئے مثلاً ورڈسورتھ، گولڈ اسمتھ، ساؤدی، بائرن، ڈکنس، میکالے وغیرہ، ان میں سے ہر ایک پر اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ اُردو کے جملہ مذکورہ بالا صدر نامور وں پر لکھے ہوئے مضامین ان میں سے ایک کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ گذشتہ پچیس سال میں ایسی ایسی باکمال ہستیاں ہم سے چھین لی گئیں جن کی ساری عمریں

شاہجہاں روڈ کی گیسو آرائی میں صرف ہوئی تھیں لیکن اُن کی یادگار قائم کرنے کے لئے کون سی تحریک عمل میں لائی گئی؟ یا ان کے کلام کی ترتیب و اشاعت کا کون سا انتظام کیا گیا؟ غالب کے کلام کی قدردانی ابھی نصف صدی سے آگے نہیں بڑھی۔ صرف چند کتابیں اُن کے حالات پر اور کچھ شرحیں اُن کے کلام کی لکھی گئی ہیں۔ مگر گذشتہ مہینے کسی رسالہ میں یہ طنز آمیز فقرہ میں نے دیکھا تھا کہ لکھنے والوں کو اب بجز غالب کے کوئی اور موضوع ہی نہیں ملتا۔ اسی قسم کے خیال کا اظہار علامہ اقبال کی بابت کہیں میری نظر سے گذرا تھا۔ اُردو رسالوں میں زمانہ۔ اُردو اور نگار صرف ایسے رسالے ہیں، جنھوں نے بعض اکابرین ادب کے نام پر کچھ نمبر نکال کر اُردو صحافت کی لاج رکھ لی۔ ورنہ اس ذیل میں کسی مجلۂ ادب کا نام مشکل ہی سے لیا جا سکتا ہے۔ خود منشی دیا نراین نگم مرحوم نے اپنی زندگی کے بہترین چالیس سال اُردو کی خدمت میں صرف کر دیئے۔ لیکن اُن کے سانحۂ ارتحال پر انھیں کے رسالہ زمانہ اور اُس میں بھی ممالک متحدہ کے ادیبوں کے علاوہ دنیائے اُردو کے کسی رسالہ نے کوئی یادگاری نمبر شائع کیا؟ کسی دوسرے صوبہ کے ادیب نے کچھ لکھنے کی تکلیف گوارا کی؟ خیر! یہ بحث بطور جولامعترضہ کے تھی۔

میں نگم مرحوم کے انتقال کے بعد ایک سال تک خاموش رہا۔ اس کا باعث میری طویل علالت تھی جس نے عرصہ تک مجھے صاحب فراش بنائے رکھا۔ اس دوران میں منجملہ اور تدابیر کے جو مجھے بروئے صحت لانے کے لئے کی گئیں، معالجین نے قید تنہائی کی سزا بھی تجویز کر دی تھی۔ سخت تاکید تھی کہ کوئی ایسی خبر مریض کے کانوں تک نہ پہونچنے پائے جو احساس کی تکلیف کا باعث بن سکتی ہو۔ چنانچہ اس عرصہ میں اس قسم کے تمام حالات سے مجھے بے خبر رکھا گیا۔ کسی قدر افاقہ ہونے پر جو ضروری کاغذات میرے سامنے لائے گئے اُن میں زمانہ کا یادگار نمبر بھی تھا۔ نگم صاحب کو آخری ایام زندگی میں حادثات کا متواتر سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کے بعد ہی آنکھ کے آپریشن کا واقعہ پیش آیا۔ ان حالات نے اُن کی طبیعت کو بہت زیادہ متاثر کر دیا تھا۔ اسی زمانہ میں بغرض دریافت خیریت میں نے ایک خط اُنھیں لکھا۔ اس کے جواب میں (جو اُن کا میرے نام آخری خط تھا) مرحوم نے خلاف معمول کئی یاس انگیز جملے تحریر کئے تھے اور یہ لکھا تھا کہ اگر یہی لیل و نہار ہیں تو ایک دن وہ خبر بھی سُن لیجئے گا جسے لکھکر میں آپ کے دل کو تکلیف دینا نہیں چاہتا۔"

اب زمانہ کے سرورق پر "ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق" اور "یادگار نمبر" دیکھکر میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس کے بعد "مرثیۂ منشی دیا نراین نگم" اور اس کے نیچے شمع کشتہ اور سوگوار عورت کا کارٹون دیکھکر اُس بات کا یقین ہو گیا جس کا دُہرانا اب بھی گوارا نہیں ہے۔ سرورق اُلٹ کر فہرست مضامین پر نظر ڈالی اور سری نرائن صاحب نگم کا مضمون "میرے والد" پڑھنا شروع کیا۔ مضمون پڑھتے پڑھتے دل پر ایک نامعلوم سا اثر ہوا جیسا کہ

میں رعشہ پیدا ہوگیا، اور زمانہ کا یادگار نمبر ناتواں انگلیوں سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔

آن واحد میں بیسویں صدی کے آغاز کا وہ زمانہ سامنے آگیا جب زمانہ سیاست اور ادب کے لیے پہلے اُفق پر طلوع ہوا تھا اور اُس عہد کے قریب قریب تمام نامور شعرا اور انشا پرداز مثلاً نثر میں مولوی ذکاء اللہ، مولانا نذیر احمد، سوامی رام تیرتھ، لالہ لاجپت رائے، عزیز مرزا، اور نظم میں مولانا حالی، نظر، شوق قدوائی، شاد عظیم آبادی، حضرت اکبر اس کی تابانی میں چار چاند لگا رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد یہ منظر نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ اب زمانہ اپنی تمام شباب آفرینیوں کے ساتھ نظر نواز تھا۔ منشی پریم چند، چکبست، سرور جہان آبادی، نادر، اقبال، رواں اس کی روح رواں بنے ہوئے تھے۔ پھر یہ منظر بھی ہٹ گیا۔ اب زمانہ اُس منزل پر تھا، جہاں پختہ کاری، اصابت رائے اور کمال سنجیدگی کے باعث اس کا شمار چوٹی کے رسالوں میں ہوتا تھا۔

نگم صاحب کے نام سے میرے کان اُس وقت آشنا ہوئے تھے جب اُنھوں نے زمانہ کی اشاعت کانپور سے کی تھی، اُس وقت میری نشست و برخاست زیادہ تر سندیلہ کے فاضل تعلقدار راجہ درگا پرشاد صاحب مرحوم کے دولت کدہ پر رہتی تھی، زمانہ اُن کے یہاں آتا تھا، یہ وہ وقت تھا جب حکومت کانگریس کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، اس سے قبل حکومت کے ایک بہت بڑے افسر نے کانگریس کے ساتھ اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اس فیر کوشن کر تعلقداران اودھ بھی کانگریس کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد حکومت کی نگاہ بدل گئی اور اُن رؤسا نے بھی اپنا طرز عمل بدل دیا۔ بہرحال راجہ صاحب کے یہاں زمانہ کا آنا بند ہوگیا، مگر زمانہ ہر ماہ بالواسطہ مجھے مل جاتا تھا۔ حافظ علی سندیلوی زمانہ کے مضمون نگار تھے۔ اس کے علاوہ نادر کاکوروی مرحوم جب کبھی سندیلہ آتے تھے زمانہ اُن کے مطالعہ میں ضرور رہتا تھا۔ اِن دونوں سے میرے عزیزانہ تعلقات تھے۔

زمانہ جس وقت شائع ہوا ہے اُس وقت اُردو صحافت آجکل سے بالکل مختلف تھی۔ اخباروں میں کرزن گزٹ، نیر اعظم، وکٹوریہ پیپر، دبدبۂ سکندری قسم کے اخبار جاری تھے، اور رسالوں کے بجائے پیام عاشق، گلبن سخن، گلچیں، فتنہ، عطر فتنہ نام کے گلدستے بڑی قدر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان میں طرحی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ "زمانہ" اپنے رنگ کا نیا رسالہ تھا، ظاہری اور معنوی خوبیوں کی وجہ سے بہت پسند کیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے شمالی ہند خصوصاً صوبۂ متحدہ کی ادبی فضا پر چھا گیا۔ "زمانہ" کے ساتھ اور اس کے بعد شمالی ہند سے اُردو کے کئی وقیع رسالے شائع ہوئے جنھوں نے زبان و ادب کی بہترین خدمات انجام دیں۔ ان میں اُردوئے معلیٰ، آفتاب، ادیب، اصلاح، عصر جدید، خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ لیکن نامساعد حالات کی بنا پر ایک

یک کرکے سب بند ہوگئے۔ صرف زمانہ ایک ایسا سخت جان تھا جس نے ہر مشکل کا مقابلہ کرکے نہ صرف اپنی ہستی قائم رکھی بلکہ شاہراہِ ترقی کی طرف گامزن رہا۔

جو لوگ اخباری دنیا کا تجربہ رکھتے ہیں وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ کسی اخبار یا رسالہ کی بقا اس وقت تک قطعی غیر ممکن ہے جب تک اُس کی پشت پر کوئی طاقتور سیاسی جماعت یا دولت مند ہاتھ نہ ہو یا وہ اپنے آپ کو کسی تجارتی ادارہ کا آلۂ کار نہ بنا لے۔ زمانہ کو ان چیزوں سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ متفرق اشتہارات بھی جرائد کی آمدنی کے ضامن ہوتے ہیں، نگم صاحب اس معاملہ میں بھی انتہائی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ انھوں نے زمانہ کو ادبی اور صرف ادبی رسالہ بنا دیا تھا، اُردو دنیا میں معیاری ادب کی کس مپرسی قابلِ عبرت حد تک پہونچی ہوئی ہے۔ غرض منفعتوں کے تمام دروازے بند تھے۔ مستقل نقصان کا بار اُن کی ذاتِ خاص پر پڑتا گیا اور وہ نہایت استقلال کے ساتھ اِسے مدتوں برداشت کرتے رہے، مگر یہ حالات یہیں آکر ختم نہیں ہوگئے، اس کے بعد ایک ایسی کڑی منزل آئی جہاں اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا گئے۔

قریب ماضی میں ہندی اُردو کا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک طرف علمبردارانِ اُردو کی اپنے ادیبوں سے بے اعتنائی، دوسری طرف ہندی مصنفوں کی حد سے بڑھی ہوئی قدردانی۔ سیلابِ ہندی بڑے بڑے ادباء کو ساحلِ اُردو سے بہالے گیا۔ منشی پریم چند سے میں کانپور میں اُس وقت ملا تھا جب وہ اُردو ادب میں اپنے افسانوں کے ذریعہ بیش بہا اضافہ فرمارہے تھے، فرمایا "رات بھر لکھتے ہیں، دن بھر لکھتے ہیں، مگر کبھی چالیس پچاس سے زیادہ کی شکل نظر نہیں آتی"۔ اس کے بعد جب دوبارہ ملاقات ہوئی تو اُردو کو چھوڑ کر وہ ہندی دنیا میں داخل ہوچکے تھے، اب دولت، عزت، ثروت اُن کے قدم چوم رہی تھی۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ اس انقلاب میں ہندوؤں کے ساتھ مسلمان اہلِ قلم بھی شامل تھے۔ جب مشاہیر کی قدردانی کا یہ عالم رہا ہو تو نگم صاحب جو ایک معیاری اُردو رسالہ کے مالک و اڈیٹر تھے اُن کی طرف کیسی کیسی آندھیاں آئی ہونگی اُن کا مقابلہ کرنا بڑے جواں مرد کا کام تھا۔ میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُردو کی خدمت و اشاعت میں نگم صاحب نے جس ایثار کا ثبوت دیا ہے اُس کی مثال اس زبان کی تاریخ میں تلاش کرلینا بہت دشوار ہے۔ میر تقی، ناسخ، آتش، مومن، انیس و دبیر کی خودداریاں ضرب المثل کے طور پر مشہور ہیں، لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہوا جس کی مخالفت زبان و ادب کی خدمت کی وجہ سے کی گئی ہو۔ بلکہ یہی بات اُن کی دولت و عزت کا سبب بنی ہوئی تھی۔ یہی خدمت تھی جس کے باعث عوام اُن کے قدموں میں آنکھیں بچھاتے تھے۔ اور شاہی درباروں میں اُن کے لئے اعزاز کی کرسیاں خالی رہتی تھیں، اور اُن کا احترام پرستش کی حد تک پہونچ گیا تھا لیکن نگم صاحب کے ساتھ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوا

طرفداران اُردو نے کسی قسم کی ہمدردی یا ایثار کا ثبوت نہیں دیا، خود ان کی سماج کی طرف سے انھیں دھمکیاں دی گئیں۔ زمانہ کی اشاعت پر اثر ڈالا گیا۔ اس کے علاوہ بہت سے طریقے اُن کے خلاف اختیار کئے گئے مگر وہ کسی اثر سے متاثر نہیں ہوئے۔ ان مشکلات میں پڑ کر انھوں نے نہ صرف اپنا کام جاری رکھا بلکہ اس کی ترقی میں اپنے تمام وسائل و ذرائع وقف کر دیئے۔ یہ داستان بہت طویل ہے، کبھی بشرط فرصت ان پر روشنی ڈالی جائے گی۔

یہ عجیب بات ہے کہ نگم صاحب اور اُن کی ادبی خدمات سے میں روز اوّل سے واقف رہا لیکن مرحوم سے میرا تعارف ۱۹۳۶ء سے پہلے نہ ہو سکا۔ یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عجیب و غریب بھی ہے اور دلچسپ بھی، لہٰذا نہایت اختصار کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں سر راس مسعود مغفور بھوپال میں وزیر تعلیم ہو کر تشریف لائے۔ مرحوم کا قاعدہ تھا کہ جس شہر میں قیام پذیر ہوتے تھے وہاں کی ادبی فضا کے ذرّہ سے لیکر آفتاب تک اپنے گرد جمع کر لیتے تھے، بھوپال کے انھیں ذرّوں میں میرا بھی شمار تھا۔ مرحوم نے اپنے ذاتی صرف سے ایک دار التصنیف کی بنیاد ڈالی تھی اور اُسے کسی وقت بہت بلند درجہ پر پہونچانا چاہتے تھے، اس کام کے لئے وہ ایک اسکیم تیار کر رہے تھے جو افسوس کہ اُن کے ناوقت انتقال کی وجہ سے ناتمام رہی اور اس کا علم بھی خاص خاص ہی لوگوں کو ہے۔ یہاں اس کا ذکر اگرچہ غیر متعلق سی بات معلوم ہوگی لیکن نگم صاحب اور زمانہ ہمیشہ اُردو ہی کے ترقی خواہ رہے اور یہ اسکیم اردو کے لئے اس قدر مفید ہے کہ اگر کبھی بروئے کار آ گئی تو ایک ایسی چیز ہوگی جس کی نظیر ہر زبان کی تاریخ پیش کرنے سے عاجز رہے گی۔ لہٰذا محض اشارۃً اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کبھی اُردو کا کوئی صاحب ثروت ہمدرد اس طرف متوجہ ہو جائے۔ مرحوم کا ارادہ تھا کہ کسی پُر فضا پہاڑی مقام پر ایک درجن کوٹھیاں تعمیر کرائی جائیں، اور ہر کوٹھی کو علم و ادب کے کسی شعبہ سے منسوب کر کے اُس کے جملہ لوازمات سے مکمل کر دیا جائے۔ پھر ہر فن کے ماہر کی خدمات کم از کم ڈھائی سو روپیہ ماہانہ پر حاصل کی جائیں اور اُن سے یہ معاہدہ کر لیا جائے کہ ہر سال چھ ماہ تمام علائق سے منقطع ہو کر کوٹھی میں قیام کریں اور تین سال کے بعد اپنے فن پر ایک رسالہ تیار کر دیا کریں۔ فرماتے تھے "اس کام کے لئے پندرہ لاکھ روپیہ کی ضرورت ہوگی اور میں آسانی سے اس رقم کو جمع کر لوں گا۔ میری زندگی کا یہ آخری کارنامہ ہوگا" جگہ کا انتخاب بھی اُنھوں نے کر لیا تھا۔ لیکن "آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند"۔

بہرحال بھوپال کے دار التصنیف میں میرا نام بھی شامل تھا، اور معاہدہ یہ تھا کہ بجز اس ادارہ کے کسی اور جگہ کے لئے کچھ نہ لکھوں۔ اس سے کچھ ہی قبل مولانا حالی کی فارسی شاعری پر میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا جو اس قدر مقبول ہوا کہ کئی رسالوں نے اس کی نقل کی۔ اسی زمانہ میں مولانا حالی کی صد سالہ یادگار منائے

جانے کا اعلان کیا گیا۔ معلوم نہیں نگم صاحب نے میرا مضمون کہاں دیکھا تھا کہ ان کا ایک خط مجھے ملا جس میں لکھا تھا کہ اس مضمون کے نقل کرنے کی اجازت دیجئے یا مولانا حالی پر کوئی دوسرا مضمون تیار کر دیجئے۔ میں نے خط سر راس مسعود کی خدمت میں پیش کیا۔ مرحوم نے نہایت خوشی سے اجازت دیدی۔ اور میں نے عام منظر سے ہٹ کر "مولانا حالی اور تصوف" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو زمانہ حالی نمبر میں شائع ہو گیا۔ یہاں ایک عجیب لطیفہ لکھا جاتا ہے۔ سر راس مسعود کی جدت پسند طبیعت علم و ادب کی دنیا میں نئے نئے گل کترا کرتی تھی، مجھ سے دریافت فرمایا "نگم صاحب سے آپ کی ملاقات کب کی ہے"۔ میں نے عرض کیا کہ ملاقات کی بنا یہی خط ہے ورنہ ہم نے ایک دوسرے کو کبھی دیکھا تک نہیں۔ فرمایا اچھا اب ایک بات کا وعدہ کیجئے، چونکہ یہ تعارف غائبانہ ہوا ہے لہذا یہ مراسم آئندہ بھی اسی صورت سے رہیں، بالمشافہ ملاقات کا کبھی موقعہ نہ آنے پائے۔" نگم صاحب کو بھی یہ بات کسی طرح معلوم ہو گئی، سُن کر بہت محظوظ ہوئے، اور خود بھی اس پر کاربند رہنے کا ارادہ کیا۔ ایک خط میں مجھے لکھا "یہ جدت خوب ہے، بہت خوب ہے، ہمارے اردو کے مضمون نگاروں میں میرے آپ کے یہ مراسم یادگار رہیں گے ــــــ"

اِن لوگوں کے اخلاق اور وضع کی کہاں تک تعریف کی جائے۔ اِس سلسلہ میں ایک بات قابل تحریر ہے "حالی نمبر" شائع ہو جانے کے بعد نگم صاحب نے زمانہ میں اشاعت کے لئے بڑے اصرار کے ساتھ میرا فوٹو طلب کیا تھا۔ یہ بھی روشناسی کا ایک ذریعہ تھا۔ میں نے خاموشی اختیار کی، مگر مرحوم کو بھی خیال آ گیا، پھر اُنھوں نے اس معاملہ میں مجھے کبھی کچھ نہیں لکھا۔ اسی زمانہ میں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ مرحوم کی زندگی میں کانپور جانے کا مجھے بارہا اتفاق ہوا۔ ایک مرتبہ کانپور اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو پلیٹ فارم پر قریب ہی کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے انھیں میں ایک چھریرے بدن متوسط قامت صاحب کی ڈبہ کی طرف پشت تھی اس گروہ میں میرے ایک شناسا تھے، مجھے گاڑی سے اُترتے دیکھکر اُنھوں نے کچھ کر آواز دی اور بڑے تپاک سے ملنے کے لئے آگے بڑھے۔ میں نے دیکھا کہ میرا نام سُنتے ہی وہ چھریرے بدن والے صاحب چونکے اور بغیر کسی طرف دیکھے بڑی تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ نگم صاحب تھے۔ بظاہر یہ بات معمولی سی معلوم ہو گی لیکن یہی باتیں لوگوں کو بڑا بناتی ہیں، اور بڑوں کی زندگی میں اِنھیں جزئیات کی تلاش کی جاتی ہے۔

منشی صاحب سے میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی، لیکن ہم ایک دوسرے کے حالات سے بہت زیادہ آگاہ رہتے تھے۔ مرحوم کا قاعدہ تھا کہ زمانہ کے لئے مفید مضامین حاصل کرنے میں ہر ممکن کوشش صرف کر دیتے تھے حتیٰ کہ معاوضہ سے بھی کام لیتے تھے، مگر میرے حالات معلوم ہو جانے کے بعد اُنھوں نے

کبھی اشارتاً بھی اس قسم کے خیال کا اظہار نہیں کیا۔ سال بھر میں مشکل سے ایک مضمون لکھنے کا مجھے موقع ملتا تھا۔ ایک مرتبہ یہ غضب کیا کہ بجائے مضمون کے صرف چند غزلیں بھیج دیں اور یقین کر لیا کہ یہ بات نگم صاحب کی ناگواری کا باعث ہوگی، مگر اس کا جواب اُنھوں نے جن الفاظ میں دیا ہے اُسے انتہائی شرافت کی دلیل ہی کہا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"نوازش نامہ اور نظمیں صادر ہو کر باعث شکریہ ہوئیں، آپ کی عنایت اور محبت کی کہاں تک تعریف کی جائے۔ آپ نے ان بیش بہا نظموں کو بھیج کر اپنی گزشتہ عدم توجہی کی کافی سے زیادہ تلافی کر دی"

۱۱۔ مئی ۱۹۴۰ء

اس کے بعد ایک عرصہ تک میں پھر کچھ نہ لکھ سکا اور مجبور ہو کر میں نے انھیں لکھ دیا کہ میری مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ باوجود کوشش کے وقت نہیں نکال سکتا۔ زمانہ کا ہر نمبر میری ندامت میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے، لہذا مجھے زرِ چندہ بھیجنے کی اجازت عطا فرمائی جائے یا رسالہ میرے نام بند کر دیا جائے۔ اس خط کا جواب مرحوم نے جس شرافت کے ساتھ دیا تھا وہ اب تک دل پر نقش ہے۔ لکھا تھا "زمانہ کی سب سے بڑی قیمت یہ ہے کہ آپ جیسے احباب کی نگاہ سے گزر جائے۔ حیف است بر آں سخن کہ سخنداں نہ رسد۔ آئندہ اس قسم کی تحریر لکھ کر آپ میری روحانی تکلیف کا سبب نہ بنیں"۔ کیا اس بلند کردار اور سچی ادبی خدمت کی مثال آسانی سے مل سکتی ہے ؟

جہاں تک خط و کتابت سے میں نے اندازہ کیا مجھے اس امر کا یقین ہو گیا کہ نگم صاحب اپنے سینہ میں ایک حساس دل رکھتے تھے اور دوسروں کے احساسات کی قدر کرتے تھے۔ اُن کی اہلیہ کے انتقال پر میں نے تعزیت کا خط لکھا، اُس میں اپنی خانہ ویرانی کا بھی تذکرہ تھا۔ غم اور ہجوم کار اور ایک جریدہ کے مدیر ہونے کی وجہ سے بہت ممکن تھا کہ وہ یکجائی طور پر سب کا شکریہ ادا کر دیتے، مگر اُنھوں نے فرداً فرداً ہر تعزیتی خط کا جواب دیا۔ مجھے جو خط لکھا اُس میں یہ فقرے قابلِ غور ہیں :-

"گرامی نامہ صادر ہوا۔ آپ کی محبت اور ہمدردی کا شکر گزار ہوں، آپ کا دل دردمند ہے، اس لئے آپ نے میری مصیبت میں اس خلوص سے شرکت فرمائی ہے۔ آپ نے خوب لکھا ہے کہ صبر و استقلال عطا کرنا بھی اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے جس کی مشیت ان صدمات میں کارفرما ہوتی ہے۔"

۲۸۔ ستمبر ۱۹۳۹ء

بہ حیثیت مدیر ہونے کے نگم صاحب کا رتبہ بہت بلند تھا۔ اُن کی ذات میں وہ تمام اوصاف پورے طور پر موجود تھے جو ایک جریدۂ عالی کے اڈیٹر میں ہونا چاہئیں۔ اُن کا ادبی ذوق اس قدر پاکیزہ اور معیار انتخاب

اس درجہ صحیح تھا کہ چالیس سال کی طویل مدت میں ایک مضمون بھی زمانہ میں ایسا نہیں مل سکتا جس پر ادب و اخلاق کے لحاظ سے پستی کا بھی شک کیا جا سکے۔ اِس بیس بائیس سال کے اندر بعض جدت طراز ادیبوں نے ادب کی نئی نئی قسمیں ایجاد کیں اور اپنے خیال میں ایک خاص طرز نگارش کے موجد بھی بن گئے۔ متعدد رسالوں نے اُن کی نظم و نثر کو بلند آہنگ فخر کے ساتھ شائع کیا۔ لیکن کافی تجربہ اور ایک عرصہ کے بعد مذکورہ رسائل نے اِن صاحبان سے اجتناب اختیار کیا اور بعض موجدین اپنی طرز سے خود ہی دست کش ہو گئے۔ نگم صاحب کے ذوقِ سلیم اور دُور رس نگاہ کی داد دینا چاہیئے کہ زمانہ کے دامن میں ان کے شگوفہائے ادبی کے لئے کبھی کوئی گنجائش نہ نکل سکی، اور ان صاحبانِ ایجاد کو اس بات کی حسرت ہی رہ گئی۔ نگم صاحب میں ایک عجیب خوبی یہ تھی کہ زمانہ کے لئے جو مضامین اُنھیں وصول ہوتے تھے بڑی غائر نگاہ سے اُن کا مطالعہ کرتے تھے اور بشرطِ ضرورت ترمیم و اصلاح سے بھی کام لیتے تھے۔ اس بات کے لئے وہ صاحبِ مضمون سے پہلے اجازت حاصل کرتے تھے۔ شعروں پر اساتذہ کی اصلاحیں تذکروں میں درج ہیں، ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک لفظ کی ترمیم یا اسلوبِ بیان کی معمولی سی تبدیلی سے شعر کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ یہی حال نثر کا بھی ہے۔ مگر افسوس کہ نثر کی اصلاحیں اب تک کسی تذکرہ میں جگہ نہ پا سکیں، ورنہ ادب کا یہ بھی بیش بہا ذخیرہ ہوتا۔ بہرحال نگم صاحب کسی مضمون کی ترتیب و زبان میں جب کبھی کوئی ترمیم فرما دیتے تھے تو مضمون کی شان ہی کچھ اور ہو جاتی تھی۔ یہاں صرف ایک مثال لکھی جاتی ہے۔ "مولانا حالی اور تصوف" پر میں نے جو مضمون لکھا تھا اُس میں ایک جگہ مسئلہ "ہمہ اوست" کے مضر نتائج اور یہیں سے "ہمہ از دست" کی تخلیق پر بحث آ گئی تھی اس موقع پر مَیں نے ایک جملہ لکھا تھا کہ "ہمہ اوست نے جب زیادہ فساد برپا کئے" منشی جی نے اِسے اس طرح کر دیا "جب ہمہ اوست نے زیادہ پردے اُٹھائے" اب جن صاحبان کو لطفِ زبان اور تصوف سے لگاؤ ہے وہ اس ترمیم کا مزہ لیں گے اور سمجھیں گے کہ بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔

منشی جی کے کمال کی قدر اُس وقت ہوتی ہے جب زمانہ کے انتخاب و ترتیبِ مضامین پر نگاہ کی جاتی ہے، اور اس امر پر غور کیا جاتا ہے کہ کس طرح زمانہ اُن کی زیرِ نگرانی ہر عہد کے ترقی یافتہ ادب کی رہنمائی کرتا رہا ہے۔ ملک میں بکثرت رسائل مدت سے شائع ہو رہے ہیں۔ ان کے سرسری مطالعہ سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ جو طرزِ ادب اُنھوں نے روزِ اول اختیار کیا تھا باوجود عہد بعہد مذاق و رجحانات کی تبدیلیوں کے وہ اب تک اُسی طرز پر چل رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مفید ثابت ہو کر عدمِ قبول کی تاریکی میں گم ہیں۔ مگر زمانہ نے ہمیشہ وہی ادب اور اُسی نوعیت کے مضامین پیش کئے جس کی ملک کو ضرورت تھی، اور آج سے چالیس سال قبل جس طرح ادبی دنیا کو زمانہ کی رہنمائی درکار تھی یہی خیال اس کی بابت آج کے ادیبوں کا بھی ہے

منشی جی نے اُردو کی خدمت صرف اس اعتبار سے نہیں کی کہ مضامین کو بہترین ترتیب و تہذیب کے ساتھ شائع کردیتے ہوں، بلکہ انھوں نے اُردو میں ایسے شاعر و انشا پرداز پیدا کردیے جو اس زبان کے لئے فخر کا باعث ہیں اور تمام ملک میں اُن کی پیروی کی جارہی ہے۔ پریم چند اور اُن کے افسانے جن کی ملک میں دھوم مچی ہوئی ہے اور جن کی نظیر ملک آج تک پیش نہ کرسکا نگم صاحب ہی کی فیضِ تربیت کا نتیجہ تھے اسی طرح سرور جہان آبادی کی لافانی نیچرل اور قومی نظمیں منشی جی ہی کی رہینِ منت ہیں۔ یہ دو نام تو محض مثال کے طور پر پیش کئے گئے ورنہ کتنے ہی ناظم و ناثر ایسے ہیں جن کی شہرت اور ادبی حیثیت نگم اور صرف نگم صاحب کی زیر بار احسان ہے ایثار کی انتہا یہ ہے کہ اس درمیان میں نگم صاحب نے کبھی اپنا نام آنے نہ دیا۔ پریم چند کی تمام کتابیں، صدہا افسانے اور سرور کا مجموعۂ کلام شروع سے آخر تک دیکھ جائیے منشی جی کا کہیں نام تک نظر نہ آئیگا۔

زمانہ اگرچہ صرف ادبی پرچہ تھا، لیکن نگم صاحب اس کے ناظرین کو سیاسیات سے بے خبر رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کے لئے اُنھوں نے ایک نہایت مناسب طریقہ اختیار کیا تھا۔ رسالہ کے آخری صفحات میں "رفتار زمانہ" کے نام سے ایک عنوان قائم کیا تھا۔ ہر ماہ اس عنوان کے ماتحت سیاسیاتِ عالم پر ایک نظر ڈالی جاتی تھی اور واقعات پر تبصرہ کیا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں نازک موقع اُس وقت آتا تھا جب حکومت کی پالیسی یا ہندو مسلم معاملات و نزاعات پر رائے زنی کی جاتی تھی۔ حکومت کے طرزِ عمل پر اُن کی رائے ہمیشہ آزاد اور ہمدردانہ ہوتی تھی۔ ہندو مسلم مسائل پر وہ جس رائے کا اظہار کرتے تھے اُس سے بہتر اور صحیح رائے کی توقع کسی مسلمان سے بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ "زمانہ" کی اس طویل عمر میں اُن کی رائے پر کسی فریق کو اعتراض کا موقع نہ مل سکا۔ کانپور اُن کی زندگی میں ہندو مسلم فسادات کا مرکز بنا رہا۔ اس کے ناگوار اثرات حدود کانپور سے گزر کر دور دور تک پہونچے اور وہاں کے باشندوں اور پریس نے ان امور میں ناخوشگوار حصہ لیا۔ لیکن زمانہ کے صفحات پر کبھی کوئی ایسی بات نہیں آنے پائی۔ اسی سلسلہ کی ایک سخت کڑی اُردو ہندی کی بحث تھی اور اس کا مرکز نگم صاحب ہی کا صوبہ تھا۔ ادبی اور مقامی رسالہ ہونے کی وجہ سے زمانہ میں اس بحث کا چھڑنا لازمی تھا، چھڑی اور خوب چھڑی، لیکن نگم صاحب نے اس معاملہ میں جو مسلک اختیار کیا تھا وہ اس قابل ہے کہ اس سے سبق حاصل کیا جائے۔

جدید مطبوعات پر تنقید جرائد کا لازمی جزو ہے "زمانہ" میں یہ فرض بڑی خوبی کے ساتھ ادا کیا جاتا تھا زمانہ میں عموماً علمی، ادبی اور سیاسی کتابوں پر تنقید ہوتی تھی۔ ہر تنقید دیکھکر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کس گہری نگاہ سے کتاب کا مطالعہ کیا گیا ہے، اور اس فن کے متعلق تنقید نگار کی معلومات کس قدر وسیع ہے۔ باریک سے باریک غلطی کی طرف اشارہ کیا جاتا تھا۔ مسائل زیر بحث پر تنقیح و جرح کی جاتی تھی۔ زبان خاص

ترمیم و اصلاح پیش کی جاتی تھی۔

نگم صاحب کا برتاؤ اپنے مضمون نگاروں کے ساتھ ایسا شریفانہ تھا جس کی مثال میں نے کسی دوسری جگہ کم دیکھی ہے۔ اکثر یہی طرز عمل ہے کہ اول رسائل کے لئے بڑی منت سماجت سے مضمون حاصل کئے جاتے ہیں پھر مضمون شائع ہو جانے کے بعد اگر بڑا احسان کیا تو وہ نمبر صاحب مضمون کے پاس بھیجدیا گیا ورنہ بعض اوقات تو اسے بھی گوارا نہیں کیا جاتا۔ اس اہم فرض کے ادا کر دینے کے بعد پھر ایڈیٹر کو مضمون نگار سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ اس قسم کے تلخ تجربات اُردو صحافت میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں، مگر نگم صاحب کا طریقہ کار اس کے بالکل برعکس تھا۔ اُن کے دل میں اپنے قلمی معاونین کی بڑی قدر تھی۔ وہ ان کے ساتھ عزیزانہ برتاؤ فرماتے تھے۔ اس اعلیٰ کردار اور حسن سلوک کا نتیجہ تھا کہ زمانہ سے بہتر اور بلند پایہ مضمون نگار اُردو کے کسی دوسرے رسالہ کو حاصل نہ ہو سکے۔ اور جو شخص ایک مرتبہ مضمون اُن کے یہاں بھیج دیتا تھا وہ زمانہ کے دامن سے ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو جاتا تھا۔

صحافتی دنیا کا عموماً یہ دستور ہے کہ ہر بڑی ہستی کے اُٹھ جانے پر لکھدیا جاتا ہے کہ" اس انتقال سے ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا" لیکن دیا نرائن صاحب نگم کا سانحۂ ارتحال ایسا حادثہ ہے جس پر یہ جملہ اپنے صحیح معنوں میں صادق آتا ہے۔ نگم صاحب کے اُٹھ جانے سے اُردو کی محفل میں ایک ایسی جگہ خالی ہو گئی ہے جس کے پُر ہونے کی عرصۂ دراز تک اُمید نہیں۔ ملک جس تنزل کی طرف جا رہا ہے، تہذیبِ قدیم کی خصوصیات جس بیدردی کے ساتھ مٹائی جا رہی ہیں اُنھیں دیکھتے ہوئے کسی طرح یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ایسی مقدس ہستیوں کے نور سے دنیا پھر کبھی معمور ہو سکے گی؟ اُردو کے ایسے دیوانے اس پُر آشوب دور میں پھر بھی پیدا ہونگے؟ مجنوں کے بعد لیلیٰ زندہ تو رہی لیکن نجد کی خاک سے دوسرا مجنوں نہ اُٹھ سکا۔ حسن شمع کی شہرت عشقِ پروانہ کی منت کش ہے جس کے پر اس کے فروغ کے ضامن ہیں۔ "شمع" تو" ہر رنگ میں سحر ہونے تک جلے ہی گی، لیکن کیا پروانوں کی کمی اس کے فروغ حسن پر اثر انداز نہ ہو گی؟ ضرور ہوگی، ماتم ہے۔ تو اس کا

فروغِ شمع جو اَب ہے رہے گا صبحِ محشر تک۔
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

تصحیح

زمانہ بابت ماہ نومبر ۱۹۴۲ء صفحہ ۲۳۲ پر پروفیسر لوگ دھیان آہوجہ کے مضمون بعنوان "شیخ فخرالدین عراقی" کی سطر ۱۳ میں "نواحی مدان" کے بجائے "نواحی ہمدان" پڑھا جائے۔

"وچتر بین"

(از حضرت اثر لکھنوی مدظلہ العالی)

آواز ہے یہ تیری یا بین ہے سُریلی!

اِک دلنواز نغمۂ تسکین جس سے پائیں — بیتاب آرزوئیں، ناکام التجائیں
لہجے کے بانکپن میں شامل ہے اِک جھجک بھی — جس طرح زمزمے میں کھنچ جائے مینڈ ترچھی
شوخی حیا سے مل کر ہے آپ بھی بہکتی — ساغر سے تند صہبا رہ رہ کے ہے چھلکتی
لمسِ لطیف جس کا رنگوں میں رنگ بھر دے — ہونٹوں کی سُرخیوں کو کچھ اور سُرخ کر دے
موہوم ایک لرزش، ہلکی سی مُسکراہٹ — کھِلنے سے پہلے جیسے غنچے کی تھرتھراہٹ
گفتار میں یہ لذت، لذت میں یہ نزاکت — اِک حرفِ نیم گفتہ پیغامِ صد مسرت

وہ راگنی کہ دل کو صرفِ گداز کر دے
شادی و غم سے یکساں پھر بے نیاز کر دے

متھرا کی تو ہے رادھا، موہن کا من جو موہے — کوئل کبھی نہ کوکے تیری صدا جو سُن لے
تیرے وہ بول بھی تو دل میں اُتر گئے ہیں — ہونٹوں پہ جو شکستہ ہو کر بکھر گئے ہیں
آہستہ ختم جیسے تاروں کی تھرتھری ہو — کانوں میں پھر بھی لیکن اک سنسنی بھری ہو

آواز ہے یہ تیری یا بین ہے سُریلی!

غزل

(از جناب احسان دانش)

چپ کھڑے ہیں درمیانِ کعبہ و بتخانہ ہم
کس سے کہدیں کس طرح کہدیں ترا افسانہ ہم

شام سے اس فکر میں ہیں ساقیِ میخانہ ہم
کیسے دیکھیں گے وداعِ شیشہ و پیمانہ ہم

وہ محبت ہی نہیں جسمیں نہوں شکوے گلے
اِک کہانی تم سنائے جاؤ اِک افسانہ ہم

جب یہ دیکھا اپنے مرکز پر ہی ہر شئے برقرار
آ گئے آخر ترے قدموں میں بیتابانہ ہم

نغمہ و ماتم بھی دھوکا شکر و شکوہ بھی فریب
کہہ رہے ہیں جانے کیا افسانہ در افسانہ ہم

آؤ مِل کر تصفیہ کر لیں مقدم کون ہے
حاصلِ میخانہ تم ہو رونقِ میخانہ ہم

ہائے وہ اُنکی پشیمانی وہ اپنی عرضِ شوق
خود پشیماں ہیں کہاں سے کہہ گئے افسانہ ہم

جیتے جی کی انجمن ہے جیتے جی کا سوز و ساز
ہو گئیں جس وقت بند آنکھیں نہ پھر دنیا نہ ہم

جب محبت پر وہ کرتے ہیں مسلسل گفتگو
ایسا کچھ محسوس ہوتا ہے کہ ہیں بیگانہ ہم

طور ٹھنڈا ہو چکا ہے آ گیا موسیٰ کو ہوش
اب تجھے تکلیف دیں گے جلوۂ جانانہ ہم

رُک چلیں احسانؔ نبضیں آ گیا ہنگامِ موت
اب یہیں سے چھیڑتے ہیں دوسرا افسانہ ہم

ازالۂ اوہام

بجواب

اقبال کے شعر و فلسفہ کا پیام

(از حضرت کلیم اعظم گڈھی)

رسالۂ نگار بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۴۳ء میں میرے دوست جناب اختر صاحب تلہری نے "اقبال کے شعر و فلسفہ کا پیام" کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ بادی النظر میں مضمون بہت دلچسپ ہے، مگر جیسا میرے دوست نے اقبال کے کلام پر نظر غائر ڈالنے کی دعوت دی ہے، ادنیٰ تفکر میں اگر ایک طرف اختر صاحب کی غلط فہمیوں کا راز منکشف ہو جاتا ہے اور مومن کا مصرع ان پر چسپاں نظر آتا ہے ع

"میں الزام اُن کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا"

تو دوسری طرف خود اُن کے اشعار سے

شرمائیں نہ سجدہ مجھے کرتے ہوئے قدسی　　خاکی ہوں مگر حامل اسرار خدا ہوں

مجموعۂ اسرار خدا ہے مری فطرت　　صحرا ہوں کہ گلشن ہوں ابھی کیا کہوں ابھی کیا لکھوں

پڑھکر حیرت ہوتی ہے کہ فضائے تصوف میں آتے ہی اُڑان کا شاہین کیونکر زاغ و زغن کے گھونسلے میں اُتر آیا اور صحیح راہ معرفت سے بھٹک کر خار زار آب و گل میں اُلجھ گیا۔ کہیں مذکورہ بالا اشعار علی حزیں کے اس مقولہ کی تصویر تو نہیں "تصوف برائے شعر گفتن خوب است"۔

اختر صاحب نے اقبال کے شعر و فلسفہ کے پیام سے پہلے فلسفۂ اسلام پر غور و فکر کیا ہوتا تو شاید انھیں ایسا مغالطہ نہ ہوتا، چونکہ انھوں نے پہلا ہی قدم غلط اُٹھایا اس لئے اُن کا کل مضمون ہی بے بنیاد ہو گیا ہے

خشتِ اول چوں نہد معمار کج　　تا ثریا می رود دیوار کج

اقبال کے فلسفہ کا پیام درحقیقت اُن لوگوں کے لئے ہے جو غایتِ آفرینش آدم اور حقیقت انسانی کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ قرآن پاک نے انسان کو اسی معرفت کی طرف مختلف طریقوں سے دعوت دی ہے۔ رہ گئی مادی ترقی وہ اسلامی تعلیم میں مرکزی حیثیت نہیں رکھتی، وہ ضمنی چیز ہے اسی لئے اس کا استعمال اس طرح بتایا ہے کہ وہ معرفت کی محرک اور معاون بنے۔

اقبال اسی پاک و بلند نظریۂ معرفت کو بالعموم سب کے سامنے اور بالخصوص مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے

اس کے یہاں مختلف نظریے نہیں تو امتزاج کیسا، اقبال کی دنیا دنیائے آب وگل سے الگ ہے، وہ جس سلطنت کی تلاش میں ہے وہ مادّی نہیں، وہ جس نوعیت کی سرمایہ داری چاہتا ہے وہ بیکن اور نطشے کے خزانۂ خیال میں بھی نہیں، وہ تو یہ چاہتا ہے ؎

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تونے اُسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

کہیں بازوئے حیدر سے بازوئے در فاتحِ خیبر کا مغالطہ نہ ہو جائے۔ بازوئے حیدرؑ کا کمال در معرفت الٰہی کھولنے میں ہے، اسی لئے "فاتحِ بابِ ولایت" ان کا لقب ہے۔ متاعِ اقبال ملاحظہ ہو:-

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی مقامِ بندگی دیکر نہ لوں شانِ خداوندی

کسی نے اس متاع کو نطشے، برگساں یا آئینن کے یہاں بھی دیکھا ہے۔

اقبال صرف مادّی دنیا ہی کو نہیں ٹھکراتا بلکہ وہ عقبیٰ کے نعمات کو بھی ٹھکرا دیتا ہے۔ ؎

تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دُنیا یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

بھلا وہ نطشے کی روشن کی ہوئی آگ میں کیا جلے گا جو یہ کہتا ہو ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ آتشِ فرنگ سرمہ ہے میری آنکھ میں خاکِ مدینہ و نجف

جس کا نظریۂ سیاست یہ ہو وہ مادّی سلطنت کا خواہاں کیسے ہو سکتا ہے ؎

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی
کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہوں یا چنگیز

اقبال کا مقام دین و وطن کے بت خانے سے الگ ہے کیونکہ سارے جھگڑے انہیں گھروں سے نکلتے ہیں ؎

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن اس زمانہ میں کوئی حیدرِ کرار بھی ہے

مادّی سلطنت ایک بے حقیقت اور فانی چیز ہے اس لئے اس کی نگاہ اس مقام پر نہیں جمتی ؎

حقیقت ابدی ہے مقامِ شبیری بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

اقبال کو فقر میں امیری نظر آتی ہے اس کو راج و مزاج سے کیا کام ؎

اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیری

اب یہ سوال ضرور پیدا ہوگا کہ کیا اسلام دنیاوی سلطنت کا دشمن ہے اور مسلمانوں کو صرف اللہ ہو اللہ ہو ہی سکھلاتا ہے تو اس کے لئے اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ دنیاوی سلطنت اقبال کی نظر میں مرکزی حیثیت نہیں رکھتی اس کی حیثیت اضافی ہے اور صرف اس لئے کہ دنیا میں امن و امان ہو اور قانونِ الٰہی کا اجرا ہو، اسکے علاوہ اور

یہ نہیں، اب میں ذرا وضاحت سے اختر صاحب کے ہر الزام کا جواب اقبال کی زبان سے دیتا ہوں :-
اقبال اور نوع انسانی یہ ایشیا کا شاعر اعظم جرمنی کے فلسفی نطشے سے زیادہ متاثر ہے، جو رحم و مروت کا شدید ترین
عالم فلاح کا سوال دشمن ہے ؎

از سستی عناصر انساں دلش طپید
فکرِ حکیم پیکر محکم تر آفرید
افگند در فرنگ صد آشوب تازہ
دیوانۂ بکار گہ شیشہ گر رسید
گر نوا خواہی ز پیش او گریز
در نے کلکش غریو تندر است
نیشتر اندر دل مغرب فشرد
دستش از خونِ چلیپا احمر است
آنکہ بر طرح حرم بتخانہ ساخت
قلب او مومن دماغش کافر است
خویش را در نار آں نمرود سوز
زانکہ بستانِ خلیل آزر است

مذکورہ بالا اشعار سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ "نطشے کے عزم للقوۃ سے کمال عقیدت ظاہر ہوتی ہے۔ نطشے کے دماغ کو کافر کہا ہے کیونکہ وہ خدا کا منکر ہے، مگر قلب کو مومن کہا گیا ہے، یہ خود واضح ایما ہے کہ اقبال کو نطشے کے معاشرتی و تمدنی تصورات سے بہت کچھ اتفاق ہے"۔

اگر اختر صاحب غور فرماتے تو معلوم ہوتا کہ دماغ کو کافر کہکر اقبال نے یہ ثابت کر دیا کہ جب وہ خدا کا منکر ہے تو وہ خدائی قانون جس کی ماتحتی میں دل ہے اور جس سے معاشرتی اور تمدنی تصورات وابستہ ہیں اس سے بھی منکر ہے صرف عزم یا بجزم جو صفات مومن میں سے ہے نطشے کے دل میں پایا جاتا ہے، اس لئے اس کے دل کو مومن کہدیا ورنہ اقبال اور نطشے کے نظریہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اقبال کا دماغ اور دل مومن ہے۔ خدا کا قائل ہے اسلئے وہ تمام معاشرت و تمدن کو احکامِ خداوندی کے ماتحت رکھتا ہے، اور نطشے خدا کا منکر ہے گو دل برادنیٰ تعلق مومن ہے، اس کی معاشرت خود ساختہ قوانین کے ماتحت ہے۔

اس فرق کے بعد اقبال کو نطشے کے فلسفہ سے متاثر سمجھنا بنیادی غلطی ہے، چنانچہ اقبال مرحوم نطشے کے متعلق فرماتے ہیں :-

جو ل جاتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانہ میں
تو اقبال اس کو بتلاتا مقامِ کبریا کیا ہے

یہ تمنا صرف اس لئے ہے کہ اس نے جو عزم للقوۃ کے فلسفے میں خدائی احکام کی ماتحتی اختیار نہیں کی، اور تمدن و تہذیب کو اس کے حکم سے الگ رکھا تو اس سے کیا کیا خرابیاں طبعاً میں آئیں اور آئندہ آئیں گی۔

چونکہ اختر صاحب نے بطور اصول موضوعہ اس بات کو مان لیا ہے کہ اقبال نطشے کے فلسفہ سے متاثر ہے اس لئے اقبال نے جو مابہ وشابہ سے تشبیہیں دی ہیں اُسے بھی اسی تاثر کا نتیجہ ٹھہراتے ہیں، مگر قدرا غور فرمائے

تو معلوم ہوتا کہ جس قوتِ پرواز کے شاہین کو اقبال نے پیش کیا ہے وہاں تعلّے کے خیال نے بھی پر نہیں مارا۔ اقبال شاہین کی تعریف یوں کرتا ہے ؎

کیا میں نے اُس خاکداں سے کنارہ　　　جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو　　　ازل سے ہے فطرت میری راہبانہ
نہ بادِ بہاری نہ گلچیں نہ بلبل　　　نہ بیماریٔ نغمۂ عاشقانہ
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم　　　ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری　　　جواں مرد کی ضربتِ غازیانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا　　　لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ
یہ پورب یہ پچھم، چکوروں کی دنیا　　　مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں　　　کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

ان خیالات کی روشنی میں کیا کہا جاسکتا ہے کہ اقبال نے جس شاہین کو پیش کیا ہے اُس کا صید دنیائے آب و گل کی مادی ترقیاں ہیں، یا اس شاہین کی نگاہ اس سے بلند تر مقام پر ہے وہ اپنے شکار کا یہ پتہ دیتا ہے ؎

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے　　　یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

اب آنکھیں کھول کر شاہینِ اقبال کی اُڑان دیکھیے :-

جوانوں کو مری آہِ سحر دے　　　پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے　　　مرا نورِ بصیرت عام کر دے

مسلمانوں کو شاہیں بچوں سے استعارہ صرف اسی وجہ سے کیا گیا ہے کہ وہ خدا کے قائل اور اس کے احکام کے ماتحت زندگی بسر کرنے اور جملہ ترقیات حاصل کرنے کو جزو ایمان سمجھتے ہیں، اسی لئے اپنا نورِ بصیرت ان میں عام کرنے کی خدا سے دعا کرتا ہے، اور اپنی آہِ سحر ان میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اگر مادی شکار ان شاہیں بچوں سے کرانا مقصود ہوتا تو بجائے آہِ سحر کے وہ خندۂ کامیابی کا آرزومند ہوتا ؎

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں　　　کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

اگر اقبال کے شاہیں کو مادی دنیا اور اُس کی ترقی ہی مدِ نظر ہوتی تو وہ کوہ و بیاباں میں کیوں بسیرا کرتا اور آشیاں بندی کو ذلت کیوں تصور کرتا بلکہ وہ تو تختِ طاؤس کو سامنے رکھتا اور [illegible] قبضہ کرتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مطمحِ نظر اس سے بالاتر ہے جس کے مقابلے میں [illegible]

کرتا ہے۔ شاہیں بچوں کے زاویۂ نگاہ کے انحطاط پر افسوس کرتے ہوئے یوں کہتا ہے ؎

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

موجودہ زمانہ کی غیر اسلامی تعلیم و تدریس کے بارے میں کہتا ہے ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

اگر اقبال کے شاہیں درندہ ہوتے اور معرفت کے بلند مقام پر پہونچنا اُن کی صفات سے خارج ہوتا تو وہ یہ کیوں کہتا،

نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے
شکارِ مُردہ سزاوارِ شاہباز نہیں

اقبال دینی اور دُنیادی ترقی صرف اسلامی تعلیم کے ماتحت عمل نیک کو سمجھتا ہے اس لئے وہ عزمِ بلند سے اپیل کرتا ہے ؎

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر
یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

کلاہ سے مطلب صرف مادّی تاج ہی نہیں بلکہ تاجِ معرفت بھی ہے جس کا حصول تعلیم اسلام کا عین مدعا ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

تو ہُما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری
نہیں مصلحت سے خالی یہ جہانِ مرغ و ماہی

کہیں اس نغمہ کو یوں الاپتا ہے ؎

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

کبھی یوں کہہ اُٹھتا ہے ؎

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اگر اقبال کو خونخواری اور درندگی یعنی صرف مادّی ترقی کی تعلیم ہی مقصود ہوتی تو وہ یہ ہرگز نہ کہتا ؎

ترے صید زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

اگر مادّی دنیا ہی کی ترقی اس کے پیشِ نظر ہوتی تو نوجوانوں کو یہ تعلیم نہ دیتا ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

نہ ہو نومید۔ نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

عام انسانوں کو مخاطب کرکے کہتا ہے ؎

اے مرغکِ بیچارہ ذرا یہ تو بتا تو
تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اقبالؔ کیا فقر چاہتا ہے ؎

اِک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری اِک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری اِک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیری

فلسفی کو مخاطب کرکے کہتا ہے ؎

پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار شکارِ زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا

باغی مرید سے کہلاتا ہے ؎

میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ شاہی زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

مذکورہ بالا تشریحات کی روشنی میں اخترؔ صاحب کے اُن الفاظ کو پڑھیئے " (نطشے سے) اتحادِ خیالات کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ اقبالؔ کو اِس جرمن فلسفی ہی کے مذاق کی تشبیہیں زیادہ پسند ہیں۔ ہمارے اس مشرقی شاعر نے مسلمانوں کو شاہین و باز وغیرہ ہی کی خصلتیں اختیار کرنے کی زیادہ تر تلقین کی ہے جس کا دوسرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ کمزوروں کے شکار کرنے کو برتری حاصل کرنے کا کارنامہ سمجھتا ہے۔ آخر نطشےؔ کی روشن ہوئی تمدنی آگ میں اپنے کو جلانے کا منشا اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ شاہینی قوت کا حاصل کرنا ہی انسانی زندگی کا نصب العین بنا لیا جائے"۔ اخترؔ صاحب نے ؎ خویش را در نارِ آں نمرود ۔۔۔۔ آخر سے اقبالؔ کو نطشے کے تمدن و معاشرت کا مقلد سمجھا ہے۔ حالانکہ اگر غور فرماتے تو معلوم ہو جاتا کہ جس تمدن و معاشرت کی طرف اقبالؔ جاتا ہے وہ خدائی احکام کے ماتحت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا شعر میں نطشےؔ کو نمرود کہا ہے اور چونکہ اس نے اپنی خستہ حال قوم کو اوپر اُچھالا ہے، اس لئے اقبالؔ قوم کے اُچھلنے میں اس کا ہمنوا ہوتا ہے مگر اُسی حد تک جہاں تک خدائی احکام اجازت دیتے ہیں جس کا اشارہ دوسرے مصرع میں ہے یعنی قوت و ترقی، بلندی و رفعت بغیر عزمِ مستحکم و ابتلا میں پڑے ہوئے حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ گلستانِ خلیل جبھی میسر ہو سکتا ہے جبکہ اپنے عزم بالجزم سے آگ میں کود پڑیں، سونا بغیر تاؤ کے کندن نہیں بنتا۔

اگر مسلمان پانچ وقت نہیں چوبیسوں گھنٹے الرحمن الرحیم پڑھتا رہے تو اُس سے جُبن و نامردی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ یثرب و بطحا کے مایۂ ناز پیغمبر صرف رحمۃ للعالمین ہی نہ تھے بلکہ وہ ذو قوۃ، قاہر المضادین، مبید الکافرین بھی تھے۔ اُنھوں نے مکی زندگی میں اگر صبر و استقامت، رضا بالقضا کا درس دیا تو مدنی زندگی میں بے مثال شجاعت و جنگ آزمائی کی داد بھی دی۔

جیسا میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ اختر صاحب نے بطور اصول موضوعہ فرض کر لیا ہے کہ اقبال نطشے کا مقلد ہے اس لئے نطشے کا جو بھی نظریہ ہے اُس پر اقبال کے پیام کو ڈھالتے چلے جاتے ہیں حالانکہ دونوں کے نظریوں میں زمین۔آسمان کا فرق ہے،

قوم کے بیدار کرنے کے مختلف نظریے ہوتے ہیں، لینن۔ موسولینی۔ نطشے۔ ٹالسٹائی۔ برگسیون۔ کارل مارکس مصطفےٰ کمال، جمال الدین افغانی یہ وہ ہستیاں ہیں جن کا ان کی قوم پر احسان ہے۔ انھوں نے اپنے نظریوں سے قوم میں نئی زندگی پیدا کر دی۔ ان لوگوں اور اقبال میں لطیف ہم آہنگی صرف یہی ہے کہ ان لوگوں نے بھی اپنی قوم کو بیدار کیا اور اقبال بھی اپنی قوم کو بیدار کرتا ہے۔ قوم میں بیداری پیدا کرنا ایک نظریہ ہے جس میں اقبال سب کا ہم آہنگ ہے، مگر کس اسلوب سے بیداری پیدا کی جائے۔ اس میں اقبال کا راستہ سب سے جدا ہے، وہ قوم کی بیداری کو قدرتی قانون کے ماتحت ہی دیکھنا چاہتا ہے اور قوم کو اس کا درس دیتا ہے۔

مذکورہ بالا باتیں میری دانست میں کسی طرح غیر منطقی نہیں، ہاں اگر بطور اصول موضوعہ پہلے ہی طے کر لیا جائے کہ اقبال نطشے کا مقلد ہے تو ضرور تضاد لازم آئیگا۔ مگر حقیقت یہ نہیں ہے۔

اقبال کا تضادِ فکر

اختر صاحب نے تمہید مضمون میں یہ فرمایا ہے کہ "ہمیں اجزا کی انفرادی نوعیت سے بحث نہیں بلکہ بحث اس مجموعہ کے مزاج سے ہے جو ان اجزا کی ترکیب ترتیب سے حاصل ہوتا ہے۔"

مگر آگے چلکر انھوں نے مجموعہ کے اجزا کے خواص کو جانچکر اور ان کو متضاد پاکر مجموعہ کو رد کر دیا ہے ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اکثر و بیشتر مرکبات متضاد الخواص اجزا سے اس لئے ترتیب پاتے ہیں کہ ان کا مزاج معتدل بن جائے، کیونکہ متضاد اجزا ہی اعتدال پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اقبال کے کلام کی ترکیب میں اگر وہ متضاد عناصر پاتے ہیں تو ان کو ماننا چاہیئے کہ اقبال کا کلام درجۂ اعتدال رکھتا ہے، مگر افسوس کہ انھوں نے یہ منطقی نتیجہ مستنبط نہیں کیا۔ اختر صاحب غالباً اس دھوکے میں ہیں کہ تمام مرکبات متجانس الخواص اجزا ہی سے مرکب ہوتے ہیں جو واقعہ کے خلاف ہے۔

اقبال کا فلسفۂ خودی اور مظاہر قوت سے مسحوری

اختر صاحب نے اقبال کے مظاہر قوت سے مسحوریت کا ذمہ دار نظریۂ خودی کو ٹھرایا ہے اور جس طرح ورندگی میں نطشے کا مقلد قرار دیا ہے، اسی طرح خودی میں کانٹ، برگسیون نطشے سے ترکیب یافتہ خیالات کا مقلد ٹھرایا ہے۔ یہاں بھی اختر صاحب اقبال کی بلند پروازی کو نہیں پہنچے وہ کانٹ۔ برگسیون۔ نطشے سے کہیں آگے ہے۔ اس کا یہ نظریہ بھی انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ قبل اس کے کہ اس کی وضاحت کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے خودی سے جو مراد لی ہے اسے واضح کر دیا جائے اقبال نے خودی سے مراد حقیقت انسانی لی ہے اور اسی کے اظہار کو انسانیت کی معراج قرار دی ہے۔

نسان صرف دنیاوی معراج حاصل کرنے کے لئے ہی نہیں پیدا کیا گیا ہے، بلکہ اُس کے وجود کا منشا کلامِ الٰہی یہ بتاتا ہے کہ انسان اور جنات اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" اس پر دال ہے۔ امام غزالی علیہ الرحمہ "لیعبدون" کی تشریح یوں فرماتے ہیں "لیعبدون ای لیعرفون" بابِ علم مولا علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں "من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ" لیجئے بابِ علم کا فیصلہ جو فیصلہ ناطق ہے یہ ہے کہ خود شناسی ہی معرفتِ الٰہی کا ذریعہ ہے اور بس، اقبال کہتا ہے ؎

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں — یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا
نگہ پیدا کر اے غافل تجلّی عین فطرت ہے — کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

اب اگر غریب اقبالؔ خودی (جس کی شناخت پر معرفتِ الٰہی منحصر ہے) کی طرف لوگوں کو لے جاتا ہے تو کیا گناہ کرتا ہے۔

اگر دنیا سے انسان کے علاوہ کسی ایک چیز کو قطعًا حذف کر دیا جائے تو کسی نہ کسی انسان کو کسی نہ کسی طرح سے ضرور تکلیف پہونچے گی۔ برخلاف اس کے اگر انسان کا وجود نہ ہو تو کسی مخلوق کو کوئی تکلیف نہ پہونچیگی۔ بلکہ ساری مخلوقات اپنی اصلی حالت پر قائم رہیگی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جملہ مخلوق انسان کے فائدے کی غرض سے پیدا کی گئی ہے۔ اب غور کرنا ہے کہ انسان بیکار تو پیدا نہیں کیا گیا۔ اس کی بھی کوئی غایت ہو گی چنانچہ کلام پاک اس کی غایت کو "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" سے واضح کرتا ہے۔ جب انسان کی فطرت ہی خداشناسی ٹھہری اور وہ اسی لئے عالمِ وجود میں لایا گیا تو معرفتِ الٰہی اُس کے لئے لازمی ٹھہری۔ چنانچہ کلام پاک میں معرفتِ الٰہی کے لئے مختلف مقامات پر تاکید کی گئی ہے۔ اسلام میں تناسخ نہیں، اس لئے فرمایا "ومن کان فی ھذہٖ اعمٰی فھو فی الاخرۃ اعمٰی واضل سبیلا" فرید الدین عطارؒ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے۔ ؎

ہر کہ ایں جا ندید محروم است — در قیامت ز لذتِ دیدار

مولانا آسیؒ فرماتے ہیں ؎

ملنے کی یہی راہ، نہ ملنے کی یہی راہ — دنیا جسے کہتے ہیں عجب راہگذر ہے

"لا یکلف اللہ نفسًا الا وسعھا" کو مدِ نظر رکھئے تو پتہ چلتا ہے کہ خدا نے فطرتِ انسانی میں معرفتِ خداوندی بخشی ہے ورنہ "الا لیعبدون" نہ فرماتا۔ کیونکہ حکیم کا کوئی فعل، کوئی حکم، خالی از حکمت نہیں، اور اُس سے کسی کے لئے ایسا حکم نافذ ہی نہیں ہو سکتا جس کی انجام دہی کی اس میں صلاحیت پیدا نہ کر دی ہو جب ہستیِ انسانی کی غایت معرفتِ الٰہی کی بلندیوں پر پرواز کرنا ہے تو اُسے شاہین سے تشبیہ نہ دیجائے

تو آخر کس چیز سے دی جائے

اگر اقبال خودی کو اتنا بلند مقام نہ دے تو معرفت ہی ناممکن ہو جائے۔ اسی لئے بابِ علم نے معرفتِ الٰہی کے لئے اپنی معرفت جسے اقبال خودی کے غلط سے تعبیر کرتا ہے ضروری قرار دی اور اسی پر معرفتِ خدا کا انحصار رکھا۔

اقبال نے اس فلسفے کے سمجھنے میں اپنی عمر کا گراں قدر حصّہ صرف کیا ہے، اُس نے یورپ سے اس کا سبق نہیں لیا بلکہ یورپ کے فلسفہ کی غلطیاں نمایاں کیں۔ اقبال نے بڑے بڑے صوفیائے کرام سے رفعِ شکوک کئے، غور و فکر سے کام لیا، راتوں کا پچھلا حصّہ ہمیشہ فتحِ باب کے لئے رونے میں گزارا۔ اِن جانکاہیوں کے بعد اُس کو دُرِ مراد ہاتھ آیا۔

اِس فلسفہ کی چھان بین میں نہیں معلوم کس کس سے تبادلۂ خیال کیا ہوگا۔ میری نظروں سے اُن کے دو خط اس قسم کے گزرے ہیں جو اُنھوں نے سیّد شاہ محمد سلیمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ پھلواروی کو کیمبرج اور لاہور سے لکھے ہیں، اور جو "خاتمِ سلیمانی" میں طبع ہو چکے ہیں، ان کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

از کیمبرج۔ ٹرینٹی کالج ۱۸۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء

"اگر یہ ثابت کرنا ہے کہ مسئلہ وحدت الوجود یعنی تصوف کا اصل مسئلہ قرآن کی آیات سے نکلتا ہے، تو وہ کون کون سی آیات ہیں، اور اُس کی تفسیر کیا ہے"...... کیا یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ تاریخی طور پر اسلام کو تصوف سے تعلق ہے۔ کیا حضرت علی مرتضیٰ کو کوئی خاص پوشیدہ تعلیم دی گئی تھی، غرضکہ اس امر کا جواب معقولی، منقولی اور تاریخی طور پر مفصّل چاہتا ہوں"

لاہور۔ ۹ر مارچ ۱۹۱۶ء

"مجھے اس کا یقین تھا کہ مثنوی اسرارِ خودی پر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا، کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے کمالِ روحانی کے ساتھ علم و فضل سے آراستہ کیا ہے"

وحدۃ الوجود کا مسئلہ اس میں ضمناً آگیا ہے، اس مسئلے کے متعلق جو کچھ میرا خیال ہے وہ میں نے پہلے خط میں عرض کر دیا تھا۔ فارسی شعراء نے جو تعبیر اس مسئلہ کی کی ہے اور جو جو نتائج اس سے پیدا کئے ہیں، اُن پر مجھے سخت اعتراض ہے۔ یہ تعبیر مجھے نہ صرف عقائدِ اسلامیہ کے مخالف ہی معلوم ہوتی ہے بلکہ عام اخلاقی اعتبار سے بھی اقوامِ اسلامیہ کے لئے مضر ہے۔ یہی تصوف عوام کا ہے۔ افتخ علی حزیں نے بھی اس کو مدِ نظر رکھا تھا "کہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است" لیکن حقیقی اسلامی تصوف کا میں کیونکر مخالف ہو سکتا ہوں کہ خود سلسلۂ عالیہ قادریہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں نے تصوف

کالٹریچر کرات سے دیکھا ہے بعض لوگوں نے ضرور غیر اسلامی عناصر اس میں داخل کردیئے ہیں۔ جو شخص غیر اسلامی عناصر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہو وہ تصوف کا خیرخواہ ہے نہ مخالف۔ انھیں غیر اسلامی عناصر کی وجہ سے ہی مغربی محققین نے تمام تصوف کو غیر اسلامی قرار دیدیا ہے اور یہ جملہ انھوں نے حقیقت میں مذہب اسلام پر کیا ہے۔ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ تصوف اسلامیہ کی ایک تاریخ لکھی جائے جس سے معاملہ صاف ہو جائے اور غیر اسلامی عناصر سے تقطیع ہو جائے۔ سلاسل تصوف کی تاریخی تنقید بھی ضروری ہے اور زمانہ حال کا علم النفس جو مسائل تصوف پر حملہ کرنے کے لئے طیار کر رہا ہے۔ اس کا پیشتر سے ہی علاج ہونا ضروری ہے۔"

ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے بڑی تحقیق و تدقیق کے بعد قلم اٹھایا ہے، خودی کے مفہوم کو جس نوعیت سے اقبال پیش کرتا ہے یقیناً قابل تحسین ہے اور اسی کی روشنی میں لفظ خودی کا مطلب سمجھنا چاہیئے۔ کانٹ، برگسیان و نطشے کے نظریوں کی روشنی میں نہیں۔

اقبال نے جہاں غیروں سے بے نیازی کا اظہار کیا ہے وہ ملحدین ہیں یا اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ اس میں وہ مجبور ہے کیونکہ جو شخص تعلیم اسلامی کے مطابق حقیقت شناسی سے مکلف نہیں معرفت الٰہی کا مرد میدان نہیں ہو سکتا۔

اختر صاحب نے ؎ گر از دست تو کار نادر آمد .... الخ کو مدنظر رکھکر جو الزام لگایا ہے اور اُسے خطرناک انانیت سے تعبیر کیا ہے وہ محض اقبال کی بلند پروازی اور اسکی صحیح تعلیم نہ سمجھنے پر مبنی ہے۔

اقبال مسلمان اُسے سمجھتا ہے جو احکام الٰہی کا پابند ہو اور اس کے جملہ حرکات و سکنات منشائے خداوندی کے ماتحت ہوں۔ اب غور فرمایئے کہ حقیقت شناس شخص سے گناہ کیوں سرزد ہونے لگا۔ کار نادر سے مراد ان اعلیٰ صفات کا اظہار ہے جسے اہل دنیا عجیب اور انوکھی سمجھکر گناہ تصور کریں گے۔ مگر حقیقتاً وہ گناہ نہیں کیونکہ وہ ایک حقیقت شناس کی ذات سے ظاہر ہوئے ہیں۔

اختر صاحب نے ؎ زندگی از طوفِ دیگر رستن است ...... الخ پر اعتراض کیا ہے کہ یہ انانیت سکھلاتا ہے۔ میں کہوں گا کہ باب علم نے یہی فتویٰ دیا ہے کہ ما سوا سے الگ ہو کر اپنے میں ڈوبو اور گوہر مقصود حاصل کرو۔ حقیقی زندگی یہی ہے۔ یہ اقبال کا فلسفہ نہیں، یہ اعتراض مولا علی کرم اللہ وجہہ پر وارد ہوتا ہے۔ بیدل کہتا ہے ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بسیر سرو و سمن درآ ‎ ‎ تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بچمن درآ

اقبال کی زبان سے خودی کی تعریف: یہ سچ نفس کیا ہے تلوار ہے ؛ خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریِ کائنات

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اندھیرے اُجالے میں ہے تابناک
من و تو سے پیدا من و تو سے پاک

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی
دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی

سُبک اُس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے

کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں
یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

اسے واسطہ کیا کم و بیش سے
نشیب و فراز و پس و پیش سے

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب

خودی کی ہے یہ منزلِ اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

تری خاک اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

خودی شیرِ مولا جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض
نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض

اقبال کا نظریۂ خودی اور نراج اختر صاحب فرماتے ہیں "اس مقام پر ایک چیز اور قابلِ غور ہے" اقبال نے "اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل" میں فرمایا ہے "اسلام بحیثیت ایک نظامِ سیاست کے اصولِ توحید کو انسان کی جذباتی اور ذہنی زندگی میں ایک زندہ عنصر بنانے کا عملی طریقہ ہے۔ اس کا مطالبہ وفاداری خدا کے لئے ہے نہ کہ تخت و تاج کے لئے، اور چونکہ ذاتِ باری تمام زندگی کی روحانی اساس سے عبارت ہے اس لئے اس کی اطاعت کیشی کا درحقیقت یہ مطلب ہے کہ انسان خود اپنی معیاری فطرت (اعلیٰ صفات) کی اطاعت کیشی اختیار

اُوپر کا اقتباس جو اختر صاحب نے پیش کیا ہے خود اُن کے جملہ اعتراضات کا مسکت جواب ہے اور یہ چیز اقبال کی وضع کی ہوئی نہیں ہے بلکہ وہی باب علم کے فرمان "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" کا تشریحی پہلو ہے۔

اس اقتباس کو سامنے رکھتے ہوئے پھر راج و نراج کا سوال اُٹھانا ہی بیکار ہے، اقبال اس بحث سے قطعاً الگ نظر آتا ہے، وہ تو "ہر فرد" ہر گروہ، ہر نظام، ہر حکومت کو اس قانون کے ماتحت دیکھنا چاہتا ہے، جو انسان کو مکمل انسان بنا سکے اور دنیا کی ہر چیز خواہ ریاست ہو یا فقر معرفت الٰہی کی حامل ہو۔

اقبال کا فلسفۂ خودی اور صنفِ نسواں

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ خودی سے مراد اقبال کی کیا ہے، وہ ہر انسان کو اس درجہ پر دیکھنا چاہتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقرر فرما دیا ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کا رتبہ مردوں سے جدا مقرر فرمایا ہے، ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے "یا ایّھا الذین اٰمنوا ان من ازواجکم واولادکم عدوا لکم فاحذروھم" اس کے سامنے حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ ہے وہ کیونکر اس صنف سے غفلت اختیار کرنے کی تعلیم دے، جنھوں نے عورتوں کو ان کے حدود سے بڑھایا اس کا حشر بھی اقبال کے سامنے ہے، موجودہ یورپ کس رنگ میں ہے کسی سے پوشیدہ نہیں۔

اقبال کی مغربی تہذیب وتمدن سے مخالفت

جب کسی قوم کو خداوند کریم دنیاوی سلطنت دیتا ہے تو ضرور اس میں صلاحیت اور نیکوکاری بھی ہوتی ہے، ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ خداوند عالم حکیم نہیں وہ اپنے بندوں کو درندوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ صلاحیت اور نیکوکاری کا مفہوم بہت وسیع ہے اس سے مکمل صلاحیت و نیکوکاری مراد نہیں بلکہ اس سے وہ صلاح و نیکی مراد ہے جو امن عامہ سے متعلق ہے۔ مگر جب یہی بندے اپنی صلاحیت اور نیکوکاری کھو بیٹھتے ہیں اور ان میں درندگی آ جاتی ہے تو وہ سلطنت ارضی ان سے چھین کر جس قوم میں صلاحیت ہوتی ہے بخش دیتا ہے۔ یہی سنتِ الٰہیہ ہے "تلک الایام نداولھا بین الناس" اس پر دال ہے اس نظریہ کے مطابق انگریزوں کو جو حکومت ملی تو یہ اُن کی صلاحیت اور نکوکاری کی دلیل تھی۔ تاریخ بھی ہمیں یہی بتاتی ہے کہ انگریزوں کی حالت ان لوگوں سے اچھی تھی جن سے سلطنتیں چھین کر انھیں دی گئیں اقبال اسی کے ماتحت کہتا ہے ؎

حق جہاں را قسمتِ نیکاں شمرد ....

رہ گیا گھسیٹے کو چمن زار بنانا صرف اس لئے ہے کہ اس کا ملک اس کا قدردان ہے۔ اس جزوی تشبیہ سے مالک کی مکمل تعریف نہیں نکلتی۔ بقیہ اشعار جو یورپ کی تہذیب کے خلاف لکھے گئے ہیں موجودہ دور کی تصویر ہیں یہ کوئی ضروری امر نہیں کہ جو قوم کبھی صالح رہی ہو طالح نہ ہو جائے ؎

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

خودی اور اقبال خاتمۂ مضمون پر میں اپنے دعوے کی دلیل میں اقبال کے وہ اشعار پیش کرتا ہوں جو خودی ابھارنے والے ہیں۔ دیکھا جائے کہ ان اشعار سے اقبال تاراج کا سبق دیتا ہے یا بظاہر قوت کی محوریت کا یا کے خلاف انسان کی کھوئی ہوئی حقیقت شناسی کا۔

اقبال کی تلاش اس دنیا سے آگے ہے ؎

جرأت ہے تو افکار کی دنیا سے گذر جا ہیں بحرِ خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے
کھلتے نہیں اس قلزمِ خاموش کے اسرار جب تک تو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے

اقبال کی خودی کبر و ناز نہیں :-

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں جو ناز بھی ہو تو بے لذتِ نیاز نہیں
عجب مزا ہے مجھے لذتِ خودی دے کر وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں

خودی کی وسعت ملاحظہ ہو :-

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں تو آبجو اسے سمجھا تو کوئی چارہ نہیں
خودی میں ڈوبتے ہیں پھر ابھر بھی آتے ہیں مگر یہ حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ نہیں
عشقِ بتاں سے ہاتھ اٹھا اپنی خودی میں ڈوب جا نقش و نگارِ دیر میں خونِ جگر نہ کر تلف۔

زوالِ نعمت و جاہ کا سبب :-

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبحگاہی کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی
نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیٔ افلاک خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت و جاہ
گراں بہا ہے تو حفظِ خودی ہی سے ورنہ گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں
کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے
جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

درسِ معرفت :-

غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

وہ اپنی لامکانی میں رہیں مست — مجھے اتنا بتا دیں میں کہاں ہوں
خودی کی خلوتوں میں گم رہا ہوں — خدا کے سامنے گویا نہ تھا میں
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی — خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش — خودی کی زد میں ہے ساری خدائی
وہ میرا رونقِ محفل کہاں ہے — مری بجلی مرا حاصل کہاں ہے
مقام اس کا ہے دل کی خلوتوں میں — خدا جانے مقامِ دل کہاں ہے
خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا — مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا
برنگِ بحر ساحل آشنا رہ — کفِ دریا سے دامن کھینچتا جا
کھلے جاتے ہیں اسرارِ نہانی — گیا دورِ حدیثِ لن ترانی
ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار — وہی مہدی وہی آخر زمانی
حکیمی نا مسلمانی خودی کی — کلیمی رمزِ پنہانی خودی کی
تجھے گر فقر و شاہی کا بتا دوں — غریبی میں نگہبانی خودی کی

اب میں اس بیان کو اقبال کے اِس شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل

ایک خیال[1]

(از حضرت منور لکھنوی)

تھوڑا سا بھی لے جو صبر سے کام — گھر میں تری دھوپ سی چھٹک جائے
تھوڑی سی بھی ہو اگر محبت — بوئے عشرت سے گھر مہک جائے

تھوڑی سی بھی ہو جو دل میں اُمید — معلوم ہو خوشگوار برسات
ہو راہِ دراز میں بھی راحت — تھوڑی سی بشر کرے جو خیرات

[1] ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۔ جولائی ۱۹۳۹ء میں مطبوعہ ایک انگریزی نظم کا ترجمہ

حضرت مہر گوالیاری

(ولادت ۱۸۶۹ء وفات ۱۹۴۳ء)

(از فیاض الدین احمد خاں، فیاض گوالیاری، بی۔ اے)

اُردو غزل نے وَلی دکنی سے لیکر جگر مراد آبادی تک کا زمانہ دیکھا، صنفِ سخن وہی رہی رنگِ سخن ہر دَور میں بدلتا رہا۔ یہ وہ شراب تھی جو ہر نئے جام میں ڈھلکر ایک نیا کیف پیدا کرتی تھی۔ بقدرِ ظرف و ذوق ہر پینے والے نے اسے پیا اور میخانے میں دُھومیں مچائیں۔ کبھی "تہِ آتش[۱] دھواں اُٹھایا گیا" کبھی "کرگدن کی شاخ" اور "سقنقور کی گردن" باندھی گئی تو کبھی "تابوت میں اُنگلی" دکھائی گئی۔ "اُسی عطار[۲] کے لڑکے سے دوا لینے" کے افسانے بھی سُنائے گئے۔ اور وہ نشتر بھی لگائے گئے جو اہلِ دل کو زمانہ کے ہر دَور میں تڑپاتے رہیں گے۔

وہ ایک بادہ خوار[۳] ولی "جو عہدِ طفلی میں صیقل آئینہ کو جبکہ وہ یک الف[۴] بیش نہ تھی" گریبان سمجھکر چاک کرنے پر تُل گیا تھا اور جس نے جوانی میں ایک دن "پیش دستی[۵]" کر کے کسی "سراپا ناز" کا شیوۂ جفا ناآشنائی بدل دیا تھا، رشکِ عرفی و فخرِ طالب کہلایا، اور اپنے حریفوں پر اس شان سے غالب آیا کہ اپنے بعد بھی ایک مستقل صدائے بازگشت بن کر گونجتا رہا ۔ اس میدان میں ایسے ثابت قدم مردِ مومن بھی گذرے جنھوں نے "بتخانے[۶] میں مر کر کعبہ میں گاڑ دیے جانے" کے حق پیدا کئے۔ آخری[۷] وقت مسلمان ہونے کا دھیان بھی آیا تو "دشنامِ[۸] مے فروش" کی طرح پی گئے۔ کبھی یہ بانکپن دکھایا کہ محبوب کی زلفوں کے پریشان ہونے کا خطرہ محسوس کر کے "موجِ[۹] ہوا" کو اس کا بَل نکالا جانے کی دھمکی دی تو کبھی اس صبر و تحمل سے کام لیا کہ "لے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی ؛ تو ہمیں آزمائے گا کب تک ؟

۱ ناسخ :- مسی مالیدہ لب پر رنگِ پاں ہے ۔ تماشا ہے تہِ آتش دھواں ہے

۲ میر :- میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب ۔ اُسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

۳ غالب :- یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب ۔ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

۴ غالب :- یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز ۔ چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

۵ غالب :- دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ۔ ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

۶ غالب :- وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے ۔ مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

۷ مومن :- عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن ۔ آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

۸ ریاض خیرآبادی :- یہ اپنی وضع اور یہ دشنامِ مے فروش ۔ ہم سُن کے پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

۹ مومن :- ہم نکالیں گے سُن اے موجِ ہوا بَل تیرا ۔ اُن کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہونگے!

حضرت داغ اسی کاروانِ حیات کے دھڑکتے ہوئے دل تھے، جنھوں نے روزمرہ اور معاملہ بندی کو نئی زندگی بخشی اور جن کے شاگردوں نے اُردو زبان کا پرچم اطرافِ ہند میں لہرا دیا۔ اُن کی بدولت غزل اپنے سادہ مگر صحیح روپ میں جلوہ گر ہوئی، جذبات نے تصنّع اور آورد کا بہروپ، اور نزاکتِ زبان نے تراکیب فارسی کا زیور اُتار پھینکا۔ ہندوستانی زبان کی مٹھاس ہر طبقہ میں لوگوں کا دل لُبھانے لگی اُردو غزل فلسفہ اور تصوّف کا "پائے چوبیں" دُور پھینک کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی۔ اسی سلسلہ کی ایک درخشاں اور اہم کڑی، ناشر الملک، افضل الشعراء پروفیسر نرائن پرشاد ورما مہر گوالیاری تھے۔ جن کا نام نامی ہمیشہ اساتذۂ اُردو کی صفِ اول میں احترام سے لیا جائیگا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شغف و انہماک سے اُردو زبان کے مطالعہ، تحقیق اور تدقیق میں آپ نے اپنی پچھتر سالہ زندگی گزاری، اُسے دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اُردو زبان کے پروفیسر اور علماء تو بہت گذرے لیکن ان میں اس زبان کا ایسا سچا طالب علم کوئی نہ تھا۔

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

اُردو غزل کا جو معیار آپ نے پیش کیا ہے، اُس سے صنفِ غزل کا صحیح مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ حضرت سید احمد شاہ کاکوروی آپ کے دیوان "شعاعِ مہر" کے دیباچہ میں فرماتے ہیں: "کان میں رچے ہوئے الفاظ اور ترکیبیں آپ کے اشعار کا طرۂ امتیاز ہیں۔ عربی۔ فارسی۔ کے نامانوس الفاظ اور ناہموار تراکیب سے آپ نے پرہیز کیا ہے۔ سُست بندش، بے محل مقدرات؛ بیجا گنجلک، بے معنی شوکتِ الفاظ اور دیگر مہملات سے آپ کا کلام مبّرا ہے۔ دِلّی کے محاورہ روزمرّہ اور زبانِ داغ کی سخت پابندی آپ نے کی ہے۔"

حضرت سائل دہلوی جیسے مستند اہلِ زبان نے آپ کی فنّی قابلیت اور پایۂ سخن کا اعتراف کرتے ہوئے "جانشینیِ داغ" کی جو سند آپ کو دی وہ نہ صرف آپ کی بلکہ مُلک کی متفقہ آواز تھی۔"

فلک اور اُس کی جفا، قفس اور اسیری، شاخِ نشیمن و آشیاں، بجلی اور اُس کی تباہ کاری کے پردہ میں متغزلین حاضرو ماسبق نے قلبِ انسانی کے نازک احساسات و جذبات کی کیا کچھ ترجمانی نہیں کی۔ ایک قفس نصیب کی زندگی ہماری مجبور و تہمت زدہ "زندگی سے جس قدر ہم ردیف ہے وہ اہلِ دل و اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ پھر یادِ آسماں کو بھی سُہانے لمحوں کی یاد بن کر دل پر نشتر لگانا ہی چاہیئے۔ لیکن حضرت مہر کا تخیل یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ اس کے آگے اپنی مسلسل اَلَم نصیبی کے اُن محسوسات و تصورات میں کھو جاتے ہیں جن کی پرواز چشمکِ برق کی نبض شناس ہے۔

گری بعدِ اسیری چیخ سے کیوں ٹوٹ کر بجلی کوئی پَر رہ گیا تھا کیا مری شاخِ نشیمن پر

آپ کے کلام میں زبان و محاورہ کے ساتھ جدّتِ ادا، ندرتِ خیال اور روزمرّہ کا چٹخارہ عجیب لطف دیتا ہے :-

پوچھ کر اس لئے ہم سے وہ جفا کرتے ہیں ۔۔۔ کوئی سمجھے کہ یہ ان کا ہی کہا کرتے ہیں !

اس حسنِ تعلیل میں ایک عجیب ہتیلی شوخی ہے جس کا لطف اربابِ ذوق ہی لے سکتے ہیں۔
داخلی کیفیات کی حکاسی اور محسوسات کا ورود جو جانِ تغزّل ہے آپ کے کلام کا خاص جوہر ہے۔

ہم عشق میں اُفتاد اُٹھا کر بھی نہ سنبھلے ۔۔۔ کھاتے ہیں جو ٹھوکر وہ سنبھل جاتے ہیں کیونکر!

اُفتاد اُٹھانے کے سادہ الفاظ میں شاعر نے روح فرسا ناکامیوں اور محرومیوں کا ایک دلگداز افسانہ چھپا دیا ہے
اس شعر کا کمال اُس کا حسنِ ادا اور جذبات کی سادگی ہے جس پر حسن و عشق کی ہزار سادگیاں نثار ہیں۔

مزید نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

وہ مراسم بھی تمھیں یاد ہیں یا بھول گئے ۔۔۔ کبھی مہماں مجھے کرنا، کبھی مہماں ہونا!
میں پشیمان ہوا اُن کی پشیمانی سے ۔۔۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا اُن کا پشیماں ہونا
حضرتِ مہر کا ایمان نہیں جا سکتا ۔۔۔ تو یہ کرلی ہے پیتا بھی ہے گر جامِ شراب
ڈال دو زلف کا سایہ مجھے نیند آ جائے ۔۔۔ رات بھر مجھ پہ جو گذری ہے وہ دن بھر نہ کہوں
آتا ہے اگر اُس کو تو آ کیوں نہیں جاتے ۔۔۔ آنکھوں میں دم آیا ہوا رو کا نہیں جاتا
کیا دیکھ سکے کوئی ترا جلوۂ دیدار ۔۔۔ جس نے تجھے دیکھا اُسے دیکھا نہیں جاتا
کچھ تو دنیا میں رہا حسن کا جلوہ کمیاب ۔۔۔ کچھ کمی دیکھنے والوں کی نظر کی نکلی
محبت میں بھی ہیں اچھے بُرے دن اے دلِ مضطر ۔۔۔ کبھی قسمت اُلٹتی ہے، کبھی تقدیر پھرتی ہے
مغموم تو مدّت سے ہوں، مغموم نہیں کیوں ۔۔۔ معلوم اُنھیں اب تک نہیں معلوم نہیں کیوں
اب وہ ہیں نہ وہ اُن کی محبت ہے الٰہی ۔۔۔ دو روز میں انسان بدل جاتے ہیں کیونکر
میں جی رہا ہوں صرف کسی کے خیال میں ۔۔۔ یہ بھی اگر نہ ہو تو مری زندگی نہ ہو
اب تو دنیا سے بھی اُٹھا نہیں جاتا ہم سے ۔۔۔ اس قدر تو نے ہمیں اے تپِ غم توڑ دیا
کیا بدگمانیاں ہیں کہ خود بھی چلے ہیں مہر ۔۔۔ ہمراہ نامہ بر کو سفر میں لئے ہوئے
سپید ہو گئیں آنکھیں سحر نہیں ہوتی ۔۔۔ الٰہی کتنی شبِ انتظار باقی ہے
خرامِ ناز سے چل کر نکل گیا ہے کوئی ۔۔۔ قیامت ایک سرِ رہگذار باقی ہے

وہ اشعار جو سنتے ہی دل میں اُتر جائیں اور شاعر کے جذبات کے ساتھ اُس کی زندگی کا کوئی پہلو

یا دور نظر کے سامنے آجائے، سادہ تغزل کا ایک لطیف نمونہ ہوتے ہیں، سہل ممتنع اسی سادگی سے عبارت ہے
آپ مشکل سے مشکل محاورات ایسی شگفتگی کے ساتھ رقم فرما جاتے تھے کہ اہل زبان دنگ رہ جاتے تھے

کھلایا ہے کبھی باد صبا نے غنچۂ بھول بھی چمن میں گل کھلاتی ہے تو وہ کیا گل کترتی ہے

حضرت مہر کو زبان و محاورات پر جو دستگاہ حاصل تھی اُس کا یہ ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے۔ مفصل و مبسوط تبصرہ کے لئے دفتر چاہیئے۔ مرحوم کا دیوان "شعاعِ مہر" زبان و محاورات اور سادہ و صحیح تغزل کی ایک معیاری چیز ہے جو محمدی پریس بمبئی سے مرحوم کی حیات ہی میں شائع ہو چکا تھا، اور آج خاص و عام کی دسترس سے باہر نہیں۔

حضرت مہر قوم چھتری کا لیستھ فرقہ سکسینہ دوسرے کے ایک معزز رکن تھے، قومی لقب مدہا اور خاندانی سٹھولے تھا، جو اطراف دلی میں موضع سٹھولی کے نام سے موسوم ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب رائے پراگ داس صاحب دہلوی دیوان بیوتات محمد شاہ بادشاہ غازی تک پہونچتا ہے۔ دلی بگڑی تو اس خاندان کے لوگ مختلف مقامات میں رہتے بستے قصبہ سہسوان، پورہ اکبرآباد میں سکونت گزیں ہوئے، اور سرکار اودھ و گورنمنٹ انگلیشیہ کے دامن میں معزز عہدوں پر ممتاز رہے۔ آپ کے نانا منشی چھب لال صاحب بریلوی بدایوں کی کلکٹری میں ملازم تھے، غدر کے زمانہ میں اپنے پیر و مرشد پنڈت ہرناتھ صاحب نائب دیوان ریاست گوالیار کے پاس چلے آئے۔ اور یہاں قسمت مالوہ میں عہدہ نائب سرصوبات پر فائز رہے۔ آپ کے والد ماجد منشی کنہیا لال صاحب اپنے خسر صاحب کی تحریک سے گوالیار آکر ضلع سیکرگڑھ میں ملازم ہوئے، اور یہیں حضرت مہر کا آفتاب ولادت طلوع ہوا۔

فارسی اور عربی کی کتب متداولہ کا درس آپ نے قاضی ہدایت اللہ صاحب سے جو وہاں قلعہ پر فارسی عربی کے متبحر عالم تھے لیا پھر الہ آباد یونیورسٹی کے انٹرنس کا امتحان بریلی کالج سے اول درجہ میں پاس کیا یکایک درد شقیقہ میں مبتلا ہو جانے سے یہ سلسلۂ تعلیم بادل ناخواستہ منقطع کرنا پڑا۔ لیکن زبان اردو سے جو شغف آپ کو ابتدا سے تھا وہ آخر تک قائم رہا جس نے آپ کو آپکی مادری زبان میں عالم متبحر کا درجہ دیا۔

۱۷ سال کی عمر میں مختار صاحب امروہوی کے توسط سے آپ نے اپنی غزل حضرت داغ کی خدمت میں رامپور بھیجی اور رفتہ رفتہ اُن کے ارشد تلامذہ میں گنے جا کر ہندوستان کے عظیم الشان مشاعروں میں دیگر اساتذۂ وقت کے پہلو بہ پہلو داد سخن حاصل کی، اور نظم و نثر کے پاکیزہ نمونے ملک کے سامنے پیش کئے۔ چنانچہ اہل علم و ادب کی قدردانی سے آپ کو حسب ذیل اعزاز عطا ہوئے۔

(۱) خطاب "عمدۃ الشعراء" و "جانشین حضرت داغ" از حضرت سائل دہلوی ۴ ستمبر ۱۹۱۹ء۔
(۲) "تاج الملک" از حضرت نوح ناروی ۷ دسمبر ۱۹۱۹ء (۳) خطاب "افضل الشعراء" از انجمن بہار سخن بلائی بریلی

۴ جون ۱۹۱۵ء

(۴) انتخاب بطور ممبر تنقیدی انجمن خاصانِ ادب لکھنؤ۔ ۲۱ جنوری ۱۹۲۰ء

(۵) انعام درجہ اول آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس گوالیار دسمبر ۱۹۳۶ء

علاوہ ایک ضخیم دیوان شاعر "مہر" کے آپ نے حسب ذیل تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں:۔

(۱) "رہنمایانِ ہند" یہ کتاب "Prophets of India" کا ایک کامیاب اور نادر ترجمہ ہے، انجمن ترقی اُردو حیدر آباد دکن کی جانب سے بار بار شائع ہوکر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئی، یہ اس کے بے حد مقبول ہونے کا ثبوت ہے۔

(۲) "سعید جوگن" دلّی کی ٹکسالی زبان میں ایک بہترین معاشرتی ناول ہے، جس پر آپ کو "ناثر الملک" کا خطاب ملا۔

(۳) "نثر ثریا" جیسے اعلیٰ پایہ اُردو مضامین کا مجموعہ، مسلم پریس بنگلور سے شائع ہوا، مگر اب عنقا کا حکم رکھتا ہے۔

(۴) "رہبر مضمون نگاری" میٹرک اور انٹرمیجیٹ کے طلبار کے لئے آپ نے حال میں تصنیف کی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ دریا کو کوزہ میں بند کیا تھا۔ زبانِ اُردو میں اپنے موضوع میں بے مثل کتاب ہے۔ یہ کتاب ریاست گوالیار کی کتب درسیہ میں داخل ہے۔

(۵) "محاوراتِ مہر" اُردو زبان کے محاورے ردیف وار ترتیب دیکر اُن پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔

مولوی سید احمد صاحب شاد کاکوروی کے الفاظ میں "آپ ایک پاک طینت، نیک سیرت، منکسر مزاج طباع، خوش خلق، ذی مروّت، مرنجاں مرنج، پابندِ وضع، بغیور، محتاط، بظاہر متین مگر زندہ دل انسان تھے آپ کا مسلک صلح کل، تعصب و کینہ پروری سے معرّا تھا"

آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن   کفر است در طریقتِ ما کینہ داشتن

میں یہ لکھتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ مرحوم اُن معدودے چند ہستیوں میں سے تھے جنہوں نے میری زندگی کو بنایا ہے۔ جب میں میٹرک کا طالب علم تھا حضرت مہر گوالیار میں شعبۂ اُردو کے مدرس اعلیٰ تھے اس لئے سال بھر تک شرفِ استفادہ حاصل رہا۔ اس قلیل مدت میں آپ کی تعلیم سے میرے مذاق شعری نے بہت کچھ جلا پائی۔ اُردو علم و ادب کے متعلق میری معلومات جو کچھ بھی ہے، بڑی حد تک مرحوم ہی کے دامانِ تربیت کی رہینِ منت ہے۔ سلسلۂ تعلیم ختم ہونے کے بعد بھی میں اُن کی قابلیتِ علمی اور معلوماتِ زبانِ اُردو کا اتنا معترف تھا کہ

"بزم اُردو گوالیار" کے سیکریٹری کی حیثیت سے آپ کو بزم کے ماہانہ مشاعروں میں شرکت کے لئے مدعو کرنے کی جرأت مشکل سے ہوتی تھی، اور غزل سُنانے کی فرمائش اگر کبھی مرحوم کی جانب سے ہوتی تھی تو جی ڈرتا تھا کہ بیان وزبان کی نہ معلوم کیا خامیاں نکل آئیں جو "ماسٹر صاحب" کی سماعت پر بار گزریں۔ باایں ہمہ مرحوم کی رودا داری کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۴۳ء کے ایک مشاعرہ کی غزل جب میں نے پیش کی تو مجھے یاد ہے کہ مرحوم نے مطلع اول ہی پر جسے میں نے بہت ڈرتے ڈرتے پیش کیا تھا میری بڑی حوصلہ افزائی فرمائی، اور اس طرح داد دی کہ میں حیرت میں ڈوب گیا! میرا مطلع تھا

ترے قربان میں قاتل کہیں ایسی صورت ہو — اِدھر میں جان سے جاؤں اُدھر تجھکو ندامت ہو

یہ مطلع سُنکر مرحوم آبدیدہ ہو گئے اور فرمانے لگے کہ "یہ اِدھر۔ اُدھر، اہلِ زبان ہی لکھ سکتے ہیں، تم نے کمال کیا ہے!" اُس وقت میں سمجھ سکا کہ اس شعر میں زبان کی کوئی خوبی تھی، ورنہ مجھے تو "اِدھر، اُدھر" کا ہوش ہی نہ تھا، نہ میں ان گہرائیوں اور باریکیوں کا پورا احساس و امتیاز ہی کر سکتا تھا۔

موجودہ بے راہ روی اور ہر خود غلط اُستاذیت کے دور میں جبکہ زبان کو ہر فن کار "اوڑنگے باز" کا تابع سمجھا جاتا ہے اور بیان و زبان کے مسلمہ اُصولوں کی تمام قیود توڑ پھینکی گئی ہیں حضرت مہر ادب قدیم کے "ابو الہول" تھے، جنھیں اپنی جگہ سے ایک انچ سرکنا پسند نہ تھا، فرمایا کرتے تھے کہ "اردو زبان کو خراب کرنے والے ملک میں اکتیس ۳۱ ناظم و ناثر پیدا ہو گئے ہیں جو میرے شمار میں ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر تمام اساتذہ وادیب ہمارے ہی مسلک کے ہیں اور بے راہ روی نہیں کرتے۔" یہ نہیں کہ مرحوم کی نظر میں جدید رنگِ شاعری اور اُس کی مقبولیت نہ ہو لیکن آپ نے اپنے اُصولوں کو ہوسِ شہرت کی بھینٹ چڑھانا کبھی گوارا نہیں کیا۔

سرکار سندھیا کے زیر سایہ ریاست گوالیار کی راجدھانی "لشکر" اور "اُردو" میں کچھ ایسا معنوی ربط رہا ہے کہ یہاں اُردو زبان کے خدمت گزار اور اساتذہ ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ بالخصوص آنجہانی حضرت مضطر خیر آبادی اور حضرت مہر مرحوم گذشتہ نصف صدی سے یہاں کی دنیائے علم و ادب پر اثر انداز رہے اور اپنے فیوض کی زندہ یادگاریں چھوڑ گئے۔ موجودہ بزم اُردو حضرت ضیائی بدایونی کے اعلیٰ مذاقِ سخن اور بلند پایہ ادبیت کی رہینِ منت ہے۔ پروفیسر جاں نثار حسین اختر خلف اصغر حضرت مضطر مرحوم۔ حضرت تاباں خورجوی، وفا باپائیوی۔ ریاض جیوری۔ سودا جیوری۔ ولی۔ انور۔ انعام۔ رضا شاداں۔ مدہوش سے آج بھی گوالیار کی صحبت سخن زندہ ہے۔ اس وقت مقامی حلقۂ ادب میں مختلف المذاق اور مختلف رنگ سخن کے کامل شامل ہیں۔ لیکن میرے علم میں ان میں سے ایسا کوئی بھی نہیں جس نے مرحوم کی علمی قابلیت کے آگے کسی نہ کسی وقت سرِ نیاز و عقیدت خم نہ کیا ہو۔

مرحوم آج ہم میں نہیں لیکن اُن کی محبت و احترام کا جذبہ زندہ ہے اور اُفقِ ملک پر اُن کی خدماتِ نمایاں اُردو مہرِ نیمروز بن کر ہمیشہ چمکتی رہیں گی۔ حضرت مہر کے اُستاد بھائی ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی اور ممتاز الشعرا فصیح اللسان رائے زادہ جناب حُب لال صاحب رعد نے حسبِ ذیل قطعات تاریخ کہے جن سے مرحوم کے ساتھ ان حضرات کے قلبی تعلق اور احترام کا اندازہ ہوتا ہے۔

قطعہ تاریخ از حضرت نوح ناروی

مہر صاحب چل بسے دنیا سے آج کر گئے مُلکِ سخن کو وہ تباہ
نیک خو، فرخندہ پیکر، پاک ذات خوش ادا، والا حشم، عالی نگاہ
واقفِ رازِ بلاغت لاکلام ماہرِ سرِ فصاحت آہ آہ
جلتے جلتے بجھ گئی، شمعِ حیات ہو گیا عالم نگاہوں میں سیاہ
نوح کے دل سے یہ نکلا سالِ فوت
لکھ "غروبِ مہر زریں بارگاہ"
۱۹۴۳ء - ۶ = ۱۹۴۹ء

غروبِ مہر زریں بارگاہ = ۱۹۴۹
تخرجہ نوح کے دل کا یعنی واو - ۶ -
۱۹۴۳ء

قطعاتِ تاریخ از حضرت رعد

(۱)

اُٹھ گیا دنیا سے اک شیریں کلام کیوں نہو۔ دل کو اَلَم بے انتہا
تھے سخن سنج اور نقادِ سخن خاص ملکہ شاعری کے فن میں تھا
تھے مرے اُستاد بھائی وہ بزرگ مجھ پہ کرتے تھے کرم بے انتہا
فکر جب تاریخ لکھنے کی ہوئی غیب سے یہ کان میں آئی ندا
رعد یوں لکھ مہر کا سالِ وفات
"شاعرِ خوش فکر دنیا سے گیا"
۱۹۴۳ء

(۲)

شاعری دنیا میں اک کہرام ہے چل بسا افسوس مہر خوش بیاں
دل تڑپتا تھا کلام مہر سے واہ وا کیا خوب تھا رنگِ زباں
یہ تقاضا ہے دلِ پُر درد کا سالِ رحلت کا دُعا میں ہو بیاں
کاٹ کر پائے خطا اے رعد لکھ
"مہر کا ہو باغ جنت میں مکاں"
۱۹۴۴ - ۱ = ۱۹۴۳ء

تخرجہ پائے خطا یعنی ۱ ۱۹۴۴
۱۹۴۳ء

غزل

(از جناب اختر علی آختر تلہری)

زندگی کا آسرا بھی، موت کا ساماں بھی ہے
سامنے ساحل بھی ہے، اٹھتا ہوا طوفاں بھی ہے

یوں تو عرش و فرش بھی ہیں، روضۂ رضواں بھی ہے
یہ بتا میری تسلی کا کہیں ساماں بھی ہے

التفاتِ ناز تجھکو اور اب کیا چاہیئے
رونیوالی آنکھ بھی ہے اور دلِ سوزاں بھی ہے

نخلبندِ دہر، تو نے یہ تماشا کیا کیا
اِس چمن میں ایک خنداں ہے، تو اِک گریاں بھی ہے

محرمِ اسرارِ حسن و عشق ہے جو خوش نصیب
اپنی بربادی پہ وہ شاداں بھی ہے نازاں بھی ہے

ہوشیار اے تو گرفتارِ طلسمِ کائنات
زندگانی دہر میں مشکل بھی ہے آساں بھی ہے

بجلیوں کی رَو پہ تعمیرِ نشیمن مرحبا!
بدحواسی کا تری آخر کوئی پایاں بھی ہے

دیکھ تو اپنی بہاریں میری سرمستی نہ دیکھ
اس فضائے رنگ و بو میں ہوش کا امکاں بھی ہے

آ رہا ہے پھر کوئی اے بزمِ جاناں ہوشیار
سوز و سازِ ذوق بھی ہے شوق کا طوفاں بھی ہے

آؤ اس کو حادثوں کی زد پہ رکھ کے دیکھ لیں
زندگی کے درد کا آخر کوئی درماں بھی ہے

آستانِ غیر اختر اور یہ سجدے ترے،
یاد تجھکو اپنا وہ میثاق وہ پیماں بھی ہے

"ذراسی دیر"

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

(از سید محمد نواز رضوی بی اے، فاضل شرقیات چک جھمرہ ضلع لائل پور)

افراد

محمد طاہر — ایک وکیل
مخدومہ — اُس کی بیوی
اختر — اُس کا بیٹا
ناظرہ — مخدومہ کی بہن کے بچوں کی کھلائی (۱۳/۱۴ سال کی لڑکی)
ناظرہ کی ماں - بچے - نوکر وغیرہ۔

مخدومہ:- آؤ بیٹی ناظرہ، یہ لو کنجیوں کا گچھا۔ تمام صندوقوں میں قفل لگادو اور سب دروازے احتیاط سے بند کردو۔

(ناظرہ صندوق اور دروازے بند کرنے لگ جاتی ہے)

مخدومہ:- اتنے میں بچوں کو کپڑے پہنا کر، بالوں میں تیل لگا کر کنگھی کردوں۔

ناظرہ:- بہت اچھا بیوی لیکن ذرا جلدی کیجئے۔ (طاہر باہر سے آتا ہے)

طاہر:- بیوی تمہارا کوئی کام وقت پر نہیں ہوتا ہمیشہ ایسے موقعوں پر پیچھے رہ جایا کرتی ہو، اُدھر برات تیار، باجا بج رہا ہے، ڈومنیاں گارہی ہیں، اور تم ابھی تک تیار ہی نہیں ہوئیں۔

(دروازوں کے بند ہونے کی آواز آتی ہے)

مخدومہ:- میں تو ہزار کوشش کرتی ہوں، مگر کوئی نہ کوئی کام بھول ہی جاتا ہے۔ اور بعد میں پریشانی ہوتی ہے۔

طاہر:- اس کے لئے کیا ضروری نہیں کہ تمام باتیں پہلے سے سوچ لو کہ وقت پر پریشانی نہ ہو جھنجھٹ میں نہ پڑو۔ ہاں یہ دروازے کون بند کر رہا ہے۔ کھٹ کھٹ کی آواز کیسی آرہی ہے۔

مخدومہ:- ناظرہ ہے۔

طاہر:- کون ناظرہ؟ بہن معصومہ کے ہاں کی کھلائی؟

مخدومہ:- جی ہاں،

طاہرہ:۔ میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ اس طرح آنے جانے والوں کو کام میں نہ لگا لیا کرو۔ ایک تو پرایا دل ہوتا ہے کوئی چیز گم ہو جائے، ضائع ہو جائے تو ہمیں انھیں غیر متعلق لوگوں پر شک ہوگا۔ دوسرے یہ کہ اس کی مالکہ نے اُسے کسی کام کو بھیجا ہوگا۔ یہ وہ کام کرنے جاتی ہوگی کہیں، سوچی ہوگی، ذرا یہاں بھی ہوتی چلوں، تم نے اسے اپنے کام میں جوت دیا۔ وہ بچاری شرماشرمی تمھارا کام کرنے لگی۔ گھر جائیگی تو اسے قدر عافیت معلوم ہوگی۔ اسمیں ایک تیسرا نقص بھی ہے۔

مخدومہ:۔ اب لگے آپ نقص گنوانے، گھر کی بچی ہے۔ معصومہ بہن کی کھلائی کیا اور میری کیا، میں نے اس سے کام لے لیا تو کیا ہوا۔ اور یہ کام ہی کونسا ہے۔ صندوقوں میں قفل لگانا اور کھڑکیاں دروازے بند کرنا

طاہرہ:۔ یہ لیجئے! آپ کے نزدیک یہ کوئی کام ہی نہیں۔

اتنے بڑے مکان کے تمام دروازے کھڑکیاں بند کرنا، اور سب صندوقوں، الماریوں اور ٹرنکوں میں قفل لگانا۔ کبھی جانے کو کھڑے کھڑے دوپہر ہونے آئی ہے، ہاں تیسرا نقص جو میں تمھیں بتانے کو تھا، وہ یہ ہے کہ اگر ناظرہ کی ماں دیکھ پائے تو وہ بہت بُرا مانے گی۔ اُس کی لڑکی کسی کی کھلائی اور تم نے اُسے یونہی حیلہ معترضہ کے طور پر اپنے کام میں پھانس لیا۔

مخدومہ:۔ اپنی وکالت آپ اپنے موکلوں ہی کے سامنے بگھارا کریں۔ مجھے یہ باتیں ذرا بھی پسند نہیں آتیں اور نہ میں ان پر عمل کرنا چاہتی ہوں۔ آپ نے کونسی ماما میری خدمت کو رکھ دی ہے، جو یہ چھوٹے موٹے کام اُس پر ڈال دوں۔

طاہرہ:۔ ماما؟ تمہاری تنک مزاجی اور تیز زبانی کسی ماما کو یہاں ٹھہرنے بھی دے

مخدومہ:۔ بس جاؤ، مردانہ میں جا کر بیٹھو، بڑے آئے مجھے عقل دینے! میں نے یہ بال دھوپ میں سفید کئے ہیں؟

طاہرہ:۔ مردانے میں جا کر کیا بیٹھوں گا، میں تو برات میں شامل ہونے جا رہا ہوں۔ وہاں سے بلاوے پر بلاوا آ رہا ہے اور تم سگی خالہ ہو مگر ابھی تک وہاں نہ پہونچ سکیں۔ یہ ہے تمھاری عقلمندی اور دانائی۔

ناظرہ:۔ (گاتی اور دروازے بند کرتی جاتی ہے۔ گانا: "چڑیوں کے نظارے ہیں، بلّی کے اشارے ہیں، لو ہو لو ہو اُس گھر میں چلو بیوی، جس گھر میں سلیقہ ہو، جس گھر میں طریقہ ہو۔ ادھر ادھر چڑیوں کے نظارے ہیں چڑیوں کی جو بچوں میں کہیں مٹروں کے دانے ہیں ...."

ناظرہ:۔ بیوی دیکھئے۔ یہ ننھا کھڑکی بند کرنے نہیں دیتا، کہتا ہے پہلے گانا سناؤ پھر دروازہ بند کرنے دونگا

مخدومہ:۔ (پیار سے) ننھے بیٹا، ادھر آؤ، تمھارے بھی کنگھی کر دوں۔ تمھاری خالہ کے ہاں جا رہے ہیں۔

وہاں چل کر اس سے جتنا جی چاہے گا ناشتہ لینا (ناظرہ سے) اری ناظرہ، جلدی دروازہ بند کر، شاید ننھے کے ابا تو چلے بھی گئے۔

طاہر:- اختر کی ٹوپی کہاں ہے، جلدی کرو، ٹوپی پہنا دو، میں اسے ساتھ لئے جارہا ہوں تانگے میں، تم بگھی میں آجانا۔

مخدومہ:- بھلا مجھے کیا پتہ، اس کی ٹوپی کہاں ہے، اس موئے کو خود خیال رکھنا چاہیے اپنی چیزوں کا کمبخت کہیں کا

طاہر:- یہ عورت کون آرہی ہے؟ ناظرہ کی ماں!

مخدومہ:- اری ناظرہ جلدی آ، دروازہ بند کر کے

ناظرہ:- ہائے میں موئی، مجھے مار ڈالا، ہائے میری کمبختی، میں کیا کروں۔ ہائے میری اماں۔

مخدومہ:- کیا ہوا؟ کیوں رونے لگی، کیا ہوا تجھے؟

ناظرہ:- ننھے نے زور سے دروازے کو دھکا دیا، میری انگلی بیچ میں آگئی۔ ہائے ہائے۔ (انگلی سے خون بہتا ہے، روتی ہوئی مخدومہ کی طرف آتی ہے)

ناظرہ کی ماں:- ناظرہ، ناظرہ، اری مُردار تجھے تو بیوی کو بُلانے بھیجا تھا، تو یہاں آکر گھر کے انتظام میں لگ گئی، اب چل دیکھ بیوی جوتیوں سے ٹھیک نہ کریں تو کہنا۔

(ناظرہ کی ماں اُسے مارتی ہے، ناظرہ اور رونے لگ جاتی ہے)

مخدومہ:- جانے دو ناظرہ کی ماں، اس بیچاری کا کیا قصور ہے

ناظرہ کی ماں:- یہ بیوی اسی کی بیوقوفی ہے، آپ کی خطا تو نہیں۔ اسے آتے ہی آپ سے کہنا چاہیئے تھا کہ آپ کو بلانے آئی ہوں، کم بخت، مُردار، نگوڑی۔

طاہر:- (ٹوپی تلاش کر کے لاتا ہے) لو مل گئی ٹوپی، چلو ننھے میرے ساتھ، تمہاری امی بعد میں آئیں گی لو جلدی کرو۔

ننھا:- ابا جان، میں نے ابھی تیل نہیں لگایا، کنگھی نہیں کروائی، برات والے کیا کہیں گے۔

طاہر:- اچھا جلدی کرو۔ (طاہر ننھے کو ساتھ لئے جاتا ہے۔)

ناظرہ کی ماں:- بیوی آپ کو یہ تیاری کل سے کرنی چاہیئے تھی، اب عین وقت پر کپڑے نکالنا شروع کئے ناظرہ آپ کو بلانے ایک گھنٹہ سے آئی ہوئی ہے۔ ایسی بھی کیا (ٹھہر کر) اب کیا کہوں آپ سے۔ مجھے زیب نہیں دیتا (ٹھہر کر) آپ اپنی آپا کے مزاج سے واقف ہی ہیں۔ ذرا سی بے سلیقہ بات کو وہ دیکھ نہیں سکتیں۔ کسی لڑکے سے غذا سستی ہوئی اور وہ اُس کے سر ہوئیں۔

مخدومہ: میں کیا کروں، میرے ہاں تو کوئی نوکر ٹھہرتا ہی نہیں

ناظرہ کی ماں: بیوی اپنی اپنی دانائی اور اپنی اپنی عقل کی بات ہوتی ہے، پھر اپنا اپنا سلوک بھی (ٹھہرکر) ہائے کیا کروں، اب معلوم نہیں۔ ناظرہ کی وہاں جانے پر کیا گت بنے گی۔

مخدومہ:- وہ پٹے گی، ایسی پٹے گی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا

ناظرہ:- اور یہ سب آپ کی بدولت۔

مخدومہ: کمبخت میری بدولت!

ناظرہ:- آپ ہی نے مجھ سے دروازے بند کرنے کو کہا، آپ ہی نے میری اُنگلی توڑ والی- یہ آپ ہی کا قصور ہے۔ میری اس میں کیا خطا۔ میں نے کیا کیا۔

مخدومہ:- بس مُردار، کُتیا کہیں کی، آئی ہے وہاں سے مجھے سبق پڑھاتے۔ ہائے غضب، ماما اصیلوں کا یہ ہیاؤ کہ ہمارے سامنے چونچ کھولیں!

ناظرہ کی ماں:- بس بیوی زیادہ منھ نہ کھلوائیے، ایک تو میری بیٹی کو اتنی دیر کام میں لگائے رکھا، دوسرے اُس کی اُنگلی کچلوادی اور اُوپر سے .... لگیں ہمیں صلواتیں سُنانے۔

مخدومہ:- ناظرہ کی ماں، ہوش کے ناخن لو، تم کس سے باتیں کر رہی ہو، تمھیں آپا جان نے مجھے بُلانے بھیجا ہے یا مجھ سے لڑنے، تم کم بختوں نے مل کر میرا ناک میں دم کر دیا، جان عذاب میں پڑ گئی۔ نگوڑیو! میں نے تمھیں یہاں کب بُلایا تھا، چلو دفان ہو یہاں سے مرداریں کہیں کی (طاہر آتا ہے)

(دُور سے باجے کی آواز اور آتشبازی چھٹتی سنائی دیتی ہے)

طاہر:- بیوی اب تم نے یہ لڑائی کس سے ٹھان رکھی ہے۔ جلدی کرو، برات گلی میں سے گزر رہی ہے تم ہو کہ کانوں میں جیسے روئی ٹھونسے بیٹھی ہو، چلو اور نہیں تو چھت پر سے دیکھ لو (ناظرہ کی ماں سے مخاطب ہو کر) ہیں! تم لوگ ابھی یہیں ہو۔ آپا تمھیں پانی پی پی کر کوس رہی ہیں اور وہاں جانے پر خدا جانے تمھاری کیا درگت ہو۔

ناظرہ کی ماں:- صاحب! ہماری وہاں جو درگت ہوگی، وہ تو بعد میں ہوگی، یہاں بیگم صاحبہ نے ہم پر قیامت ڈھا رکھی ہے۔

طاہر:- اب دیکھنا وہاں آپا کیسی ھگو ھگو کے تمھارے لگاتی ہیں تمھیں کھڑے کھڑے نکال دینگی

ناظرہ کی ماں:- صاحب! ہم تو اُن کے کہنے سے صرف آپ کے ہاں آنے کے چور ہوئے ہیں۔ میں نے ناظرہ کو انھیں بلانے بھیجا۔ اُسے دیر ہوئی تو میں آپ آگئی۔ مرتی کیا نہ کرتی۔ اب تو ہم

مصیبت آئیگی سب آپ کی بیگم صاحبہ کی بدولت ہوگی

طاہر:۔ (بیوی سے) تمھاری ان بدعنوانیوں نے تمھیں اور مجھے دونوں کو کہیں کا نہ رکھا۔ آپا کے ہاں تم اندازہ کرسکتی ہو کہ برادری کی کتنی عورتیں جمع ہونگی، تمھاری آپا کا دل اُس وقت کیا کہتا ہوگا۔ وہ دل میں کُڑھتی ہونگی اور برادری کی عورتیں نہ جانے کہاں کہاں سے آئی ہونگی وہ جو آپس میں چہ میگوئیاں کررہی ہوں گی وہ الگ۔

مخدومہ:۔ ہائے میری بدنصیبی۔ میری کم بختی۔ گھروالے بھی مجھی کو کوستے ہیں۔ اور باہر والوں نے بھی مجھے نکّو بنا رکھا ہے۔ یا اللہ کہاں جاوں، میں کہیں کی بھی نہ رہی۔ بہن کے بیٹے کو سہرا بندھتے نہ دیکھ سکی۔ شہر میں ہوتے ہوئے (ماں کیا کہیں گی، آپا کیا سمجھیں گی (روتی ہے)

(ناظرہ اور اُس کی ماں جاتی ہے)

طاہر:۔ اب رونے دھونے سے کیا فائدہ، چپ ہوجاؤ۔ اپنی کم بختی اور بدنصیبی کو نہ کوسو۔ اپنی عقل کو کوسو، اور آئندہ کے لئے یاد رکھو کہ اپنا کام خود کرنے سے اچھا ہوا کرتا ہے، بیگاری پر بھروسا کرنا حماقت ہے! (برات اور باجے کی آواز بالکل نزدیک آتی ہے۔)

مخدومہ:۔ (دوپٹہ اوڑھتے ہوئے) ننھے کے ابّا! ذرا میرے بٹنوں کی زنجیر یہاں دیکھنا، کتنی دیر سے تلاش کررہی ہوں نہیں ملتی، میں اتنے برات دیکھ آؤں۔

طاہر:۔ (حیرت سے) لو آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا یا خدا! اس کے پھوہڑپن کی کوئی حد بھی ہے۔

(طاہر بٹن تلاش کرتا پھرتا ہے) (مخدومہ آتی ہے)

مخدومہ:۔ کیوں مِل گئے؟

طاہر:۔ کہیں پتا نہیں، میں دماغ سے، دل سے، آنکھوں سے، ہاتھوں سے ہر جگہ ڈھونڈھ چکا، کہیں نہیں ملے۔

مخدومہ:۔ یا اللہ میں کیا کروں، کس سے پوچھوں، کون لے گیا، کہاں چلے گئے، وہ مُردارین دفان ہوگئیں، کہیں وہ نہ اُڑالے گئی ہوں؟

طاہر:۔ اُن بیچاریوں کو خواہ مخواہ الزام دیتی ہو، مفت کا جھگڑا رکھتی ہو۔

مخدومہ:۔ تمھیں ہمیشہ مجھی میں کیڑے ڈالنے آتے ہیں، سب قصور میرے سر تھوپتے ہو، یہ نہیں کہ مرد ہو اور اُن کم بختوں کو ابھی جاکر پکڑو، راستے ہی میں ہونگے۔

طاہر:۔ اب میں برات میں شامل ہوں یا ان عورتوں کے پیچھے بھاگتا پھروں، دنیا کیا کہے گی۔

مخدومہ:۔ بھاڑ میں جائے ایسی برات اور چولہے میں پڑے ایسی شادی، میرا زیور کھو گیا۔ سو روپے سے زیادہ کا نقصان ہو گیا، کچھ سجھائی نہیں دیتا، آنکھیں تلے اندھیرا چھایا جاتا ہے، اور آپ کو براتیں سوجھی ہیں، یا اللہ میں کیا کروں، کدھر جاؤں۔

طاہر:۔ لو اب میں تمہاری آپا کے ہاں واپس جاتا ہوں، مگر وہ مجھے دیکھ کر کیا کہیں گی؟ برات چھوڑ کر کہاں بھاگا پھرتا ہے!

مخدومہ:۔ وہ مُرداریں وہیں گئی ہونگی، جاتے ہی اُن کی تلاشی لینا۔ (ٹھہر کر) ایسا نہ ہو راستے میں کسی کے حوالے کر گئی ہوں (ہاتھ مل کر) ہائے میرے اللہ (طاہر جاتا ہے) مخدومہ اُٹھ کر نئے سر سے تلاش کرتی ہے)

مخدومہ:۔ (اپنے آپ سے) نہ یہ کم بخت شادی ہوتی اور نہ میرا زیور گم ہوتا۔ بعض لڑکیاں بھی ایسی سبز قدم ہوتی ہیں کہ ان کے آتے ہی گھر میں جھاڑو پھر جاتی ہے۔ مگر میرے گھر سے اس کا کیا واسطہ

(مخدومہ کی ماں آتی ہے)

مخدومہ کی ماں:۔ بیٹی کدھر ہو، کیا کر رہی ہو، مخدومہ تمہاری عقل معلوم نہیں کہاں گھاس چرنے چلی گئی میرے دل میں تو یہ ہول تھا کہ کہیں اچانک بیمار نہ ہو گئی ہو۔ مگر تم اللہ رکھے خیریت سے ہو۔ اور اپنے بھانجے کی شادی کے وقت نہ پہونچیں۔ تمہاری بہن تمہارے شریک نہ ہونے سے کلیجہ مسوس کر رہ گئی تمھیں اُس کا ہی خیال کرنا چاہیئے تھا۔

مخدومہ:۔ امّی جان، میں کیا بتاؤں آپ کو۔ میں بہت بڑا نقصان کر بیٹھی ہوں۔

ماں:۔ ہیں کیا ہوا، خدا خیر کرے، یا اللہ، بیٹی کیا ہوا تمھارے دشمنوں کو!

مخدومہ:۔ (رونی صورت بنا کر) بٹن کھو گئے امّی جان۔ میں کہیں کی نہ رہی۔

ماں:۔ (حیران ہو کر) کہاں کھو گئے، کیسے کھو گئے۔ پھر کہیں ڈھونڈا، دیکھا، تلاش کی۔

مخدومہ:۔ میں نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی، گھر کا کونہ کونہ چھان مارا، کہیں ہوتے تو ملتے

اختر (آتا ہے) نانی اماں۔ تسلیم!

نانی:۔ جیتے رہو بیٹا، میری آنکھوں کے نور، دل کے سرور، کلیجے کی ٹھنڈک۔

اختر (ماں سے) پہونچا بھی آئے ہم برات، اب پانچ بجے رخصت ہوگی، اُس وقت جاؤں گا۔ ابا کہاں ہیں برات میں تو میں نے انھیں یہیں تک دیکھا، پھر معلوم نہیں کہاں چلے گئے۔ لو یہ بٹن رکھ لو، میں کوٹ میں گھڑی کی زنجیر کی طرح لگا کر چلا گیا تھا، میں نے سوچا تھا، لوگ سمجھیں گے گھڑی لگائے ہوئے ہے

وقت پوچھیں گے، مگر کسی نے بھی نہ پوچھا۔

مخدومہ:۔ بیٹیا! اماں تیرے صدقے، تیرے واری، مَیں تو انھیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ہلکان ہو گئی تھی

مخدومہ کی ماں۔ یا اللہ تیرا شکر

مخدومہ۔ یا اللہ تیرا شکر کس زبان سے ادا کروں (طاہر کو) ارے کوئی ہے۔ جاؤ کہیں اختر کے ابا کا پتہ لگاؤ۔ بیچاری ناظرہ اور اُس کی ماں مفت میں گھسیٹی پھریں گی۔ (طاہر آتا ہے)

مخدومہ:۔ اختر کے ابا بھی مل گئے، خدایا تیرا رحم، تیرا فضل، تیرا کرم، تو ہی مصیبت میں سب کا یار و مددگار ہے تو ہی سب کا غم خوار و غم گسار ہے۔

طاہرہ۔ تمہاری آپا ان پر سخت ناراض ہو رہی ہیں، وہ بیچاری قسمیں کھا رہی ہیں، قرآن اُٹھا رہی ہیں۔

مخدومہ:۔ الٰہی توبہ!

طاہر:۔ مَیں تم سے یہ مشورہ کرنے آیا تھا کہ کیا قانونی کارروائی کروں؟

مخدومہ:۔ خدا کے لئے اماں جان، اختر کے ابا۔ افضر۔ جانا اُن بیچاریوں کو مصیبت سے بچانا۔

ماں:۔ اور تم بھی چلو بیٹی۔ اب تو بہن سے سرخرو ہو آؤ۔ گو دیر بہت ہو گئی ہے۔

مخدومہ:۔ اماں جان ذراسی دیر کا کیا ہے،

مخدومہ کی ماں:۔ بیٹی ذراسی دیر؟

(سب جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے)

تنقید کتب

"فرحت جہاں"

یہ چھوٹی سی کتاب ایم۔ اسلم صاحب کے تین افسانوں (۱) فرحت جہاں (۲) ملاپ اور (۳) یادگار کا مجموعہ ہے۔ قوم پرورانہ نقطۂ نظر رکھنے والے حضرات کو ان افسانوں کے پڑھنے سے تفریح و لطف کے بجائے یقیناً کوفت ہوگی۔ کیونکہ بعض بعض مواقع پر مصنف صاحب کی تحریر فرقہ وارانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ آپ مسلم لیگ کے مداح ہیں اور کانگریس کو برا بھلا کہتے ہیں۔ زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ بعض جگہ مصنف نے معمولی اخلاق کو بھی اٹھا کر طاق پر رکھ دیا ہے۔ نمونہ کے طور پر ہم دو جگہ سے کچھ عبارت نقل کرتے ہیں جسکے پڑھنے سے ناظرین خود ان افسانوں کے حسن و قبح کا اندازہ کر لیں گے۔

"فرحت جہاں" میں صفحہ ۲۲ پر کانگریس کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ "کانگریس کو مسلمانوں کا گلا کاٹنے کے لئے مختلف صوبوں میں وزارتیں قائم کرنے کا موقع مفید ملگیا، اور کانگریسی وزیروں نے بھی مسلمانوں پر ظلم و ستم کر کے دل کی بھڑاس اچھی طرح نکالی"۔

صفحہ ۲۸ پر مولانا ابوالکلام آزاد کی شان میں لکھتے ہیں:۔ "ابوالکلام آزاد ایسا عالم مسلمان ابھی تک گاندھی کے دروازے پر جاروب کشی کر رہا ہے"۔

لکھائی چھپائی۔ کاغذ عمدہ۔ گردپوش دیدہ زیب۔ انگریزی جلد۔ چھوٹی تقطیع کے ساتھ ضخامت۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ۔ نگارستان ایجنسی دہلی

اسمٰعیل میرٹھی

(از جناب حسن یحییٰ عندلیب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)

لے کہ تری نگہ تھی وا جلوۂ عام کے لئے
حسنِ ازل نے چن لیا سوزِ تمام کے لئے

ذوقِ تپش ملا ترے خاطرِ ناصبور کو
بارگہِ سخن ملی تجھ کو قیام کے لئے

طفلکِ خورد سال کو پیرِ خجستہ پے کا شوق
ننھا سا دل تھا مضطرب تیرے پیام کے لئے

نغمۂ زندگی ترا نالۂ نارسا نہ تھا
شیشۂ دل نہ تھا ترا بادۂ خام کے لئے

پیکِ خیال گامزن باغِ سخن میں ہے کہ ہو
ابرِ سرِ فلک رواں لطفِ خرام کے لئے

مطربۂ غزل یہ تھا ساز بھی گوش برنوا
شاہدِ مے تھا منتظر حجلۂ جام کے لئے

رنگِ سخن کو دیکھ کر آگ چمن میں لگ گئی
بلبلِ خستہ دم بخود ذوقِ کلام کے لئے

عالمِ آب و گل میں تو زیبِ دہِ چمن رہا
چرخِ بلند پست ہے تیرے مقام کے لئے

گلشنِ ہند میں ہے اب شور و فغانِ عندلیب
وقفِ دماغِ باغباں فکرِ نظام کے لئے

برقِ تپاں بھی شعلہ زن چشمِ شفق بھی خونفشاں
کاش! تو ہوتا نالہ کش طائرِ دام کے لئے

صبحِ حیات منتظر شامِ وصال کی رہی
نورِ سحر تھا مضطرب سرمۂ شام کے لئے

ساقیِ عشوہ ساز ہے اب نہ مئے نشاط اثر
کیفِ سرور ہے مگر نقشِ دوام کے لئے

رفتارِ زمانہ

جنگ کا سلسلہ اگرچہ یورپ، برما، چین اور جنوب مغربی بحرالکاہل میں بدستور جاری ہے۔ لیکن جس قدر سخت لڑائیاں اٹلی اور برما میں ہو رہی ہیں اتنی کسی دوسرے محاذ پر نہیں ہو رہی ہیں۔ ہوائی حملے بھی شدت کے ساتھ جاری ہیں۔ اتحادیوں کے ہوائی جہاز ہزاروں کی تعداد میں برطانیہ اور اٹلی کے اڈوں سے اڑ کر رومانیہ، بلغاریہ، ہنگری، جرمنی اور جرمنی کے مقبوضہ یورپ پر بمباری کر کے صنعت و حرفت کے کارخانوں، ریلوے لائنوں، سڑکوں، دریائی راستوں اور فوجی ٹھکانوں کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ یورپ پر نئے حملہ کا پیش خیمہ ہے۔

روس | تقریباً دو مہینے ہوئے روس کے کسی محاذ سے بھی کسی خاص معرکہ کی کوئی خبر نہیں آئی۔ روس کی طرف سے جو سرکاری اطلاعنامے شائع ہوتے ہیں ان میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ "کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی" یا "فریقین کے ہراول دستے سرگرمیاں دکھا رہے ہیں" یا "روسی ہوائی جہازوں نے دشمن کے فوجی ٹھکانوں پر بمباری کر کے نقصان پہنچایا"۔ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ سباسٹوپول فتح کرنے اور کریمیا سے دشمنوں کو نکالنے کے بعد روس کسی جدید اور زیادہ شدید حملہ کی تیاریوں میں مصروف ہے اور دوسری طرف جرمنی روسی حملہ کی روک تھام کرنے کے لئے مورچہ بندیوں میں مصروف ہے۔ لیکن بعض مبصرین روسی محاذ کی خاموشی سے نہایت گہرے معنی نکال رہے ہیں چنانچہ پچھلے دنوں اخبار "اورینٹ" میں "پولی ٹیکس" نے ایک مضمون لکھا تھا کہ روس نے اپنے مقاصدِ جنگ کا اعلان کرتے ہوئے ہمیشہ یہی کہا تھا کہ "اپنے آبائی وطن کو دشمنوں سے چھڑانے کے لئے لڑ رہا ہے" اب چونکہ روس نے دشمنوں کو اپنی سرزمین سے نکال دیا ہے لہٰذا اُس کا مقصدِ جنگ پورا ہو گیا ہے اور وہ اس سے زیادہ خون بہانا نہیں چاہتا۔ اس کے علاوہ مبصرین کا ایک تیسرا طبقہ بھی ہے جس کا خیال یہ ہے کہ روس حملہ کی تیاریوں میں مصروف ہے اور وہ اُسی وقت حملہ کریگا جب برطانیہ و امریکہ مغربی یورپ پر بیٹا حملہ کریں گے۔ گویا وہ مزید جنگی کارروائی کے لئے برطانیہ و امریکہ کے نئے حملہ کا منتظر ہے۔ بہرحال خواہ کچھ ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ آجکل روس کے تمام محاذوں پر ایک پُراسرار جمود و سکون طاری ہے۔

اٹلی | یورپ میں آجکل سب سے زیادہ شدید معرکہ آرائیاں اطالوی محاذ پر ہو رہی ہیں۔ اگرچہ اتحادیوں کی فوجیں کچھ نہ کچھ پیش قدمی ضرور کرتی جاتی ہیں لیکن ان کی رفتار سست ہے جس کے معقول وجوہ ہیں۔ یہ لڑائیاں ایسے علاقہ میں ہو رہی ہیں جو بالکل پہاڑی ہیں۔ یہاں حملہ کرنے والی فوجوں کو اونچی اونچی پہاڑیوں پر چڑھ کر آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ ان پہاڑیوں پر دشمن کی زبردست مورچہ بندیاں ہیں، سڑکیں بہت کم ہیں، اور جو ہیں بھی تو وہ بھی پہاڑیوں سے گھری ہوئی ہیں۔ جن پر دشمن کی توپیں نصب ہیں۔

پھر بھی کافی ہیں یہ مہینہ اتحادیوں کے لئے مبارک ثابت ہوا۔ اور آٹھویں فوج نے خاص طور پر نمایاں سرگرمیاں دکھائیں اور آخر کار کاسینو فتح کر لیا۔ کاسینو کی فتح کے بعد ہی جرمن مارشل کیسلرنگ کا وہ خط دفاع جو "گستاف لائن" کے نام سے مشہور تھا، خاک میں مل گیا۔ آٹھویں فوج کی پیش قدمی کے ساتھ ساتھ پانچویں فوج نے بھی پیش قدمی کی، اور اس نے دریائے گراگلیو کو پار کر کے دشمن کے مورچوں پر حملہ کر دیا۔ یہ لڑائی بڑی سخت اور خونریز تھی کیونکہ دریا کے دوسرے کنارے اونچی پہاڑیوں پر دشمن کی توپیں نصب تھیں۔ پانچویں فوج کے بہادر سپاہیوں نے جان کی بازی لگا کر یہ مہم سر کی، اور فرانسیسی فوج کے سپاہیوں نے دریا کو پار کرتے ہی کئی بستیوں پر قبضہ کر لیا۔ اور اس مورچہ کے اہم ترین مقام کیسل فورٹ پر امریکن اور فرانسیسی سپاہیوں نے اپنا جھنڈا نصب کر دیا۔ اس کے بعد جرمن فوجیں چند میل پیچھے ہٹ کر نئی قلعہ بندیوں میں قائم ہو گئیں جس کا نام "ہٹلر لائن" رکھا گیا تھا۔ اور جو بمقابلہ "گستاف لائن" کے زیادہ مضبوط تھی۔ یہ خط دفاع کاسینو کے مغرب سے شروع ہو کر متعدد اہم مقامات سے گذرتا ہوا ساحل سمندر تک چلا گیا تھا۔ مقامات کے نام ہم نے دانستہ چھوڑ دیئے ہیں، کیونکہ وہ ہمارے ناظرین کے لئے قطعی غیر مانوس اور غیر دلچسپ ہیں۔ بہر حال گستاف لائن کو توڑنے کے بعد ہٹلر لائن پر بھی حملہ کیا گیا، اور اتحادی فوجوں نے اس قدر شدید اور بے پناہ حملے کئے کہ ہٹلر لائن کو بھی توڑ کر رکھ دیا۔ ان حملوں میں امریکن اور پولستانی فوجوں نے زیادہ سرگرمی دکھائی۔ اس لائن کا اہم ترین مورچہ پیڈ ماؤنٹ تھا، جسے پولستانی فوجوں نے نہایت بہادری سے سر کر لیا۔ پانچویں فوج نے جنوب کی طرف سے بڑھنا شروع کیا۔ دوسری طرف آٹھویں فوج نے وادی دریائے لیری میں پیش قدمی شروع کی۔ ۲۲ مئی کی صبح کو اتحادی سپاہ نے آنزیو کے مورچہ سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ اگرچہ اس مورچہ پر دشمن کی قلعہ بندیاں نہایت مضبوط تھیں اور اس نے اتحادی فوج کی شدید مزاحمت کی لیکن اتحادی فوجوں نے پامردی واستقلال سے کام لے کر کامیابی حاصل کی اور پھر دشمن کے مورچوں کو توڑتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ ادھر کاسینو کے مقام سے بھی اتحادی فوجوں نے آنزیو کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اور ۲۵ مئی کو دونوں فوجیں آپس میں مل گئیں۔ یہ جرمنوں کے لئے ایک زبردست خطرہ تھا۔ چنانچہ آنزیو کے مورچوں سے جرمن فوجوں نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔

بہر حال پانچویں اور آٹھویں فوجوں کے تعاون کا یہ نتیجہ ہوا کہ مارشل کیسلرنگ کی فوجیں لگاتار شہر روم کی طرف ہٹتی چلی گئیں حتیٰ کہ اتحادی فوجیں البانی پہاڑیوں تک پہنچ گئیں۔ جن کی بلندیوں سے مقدس شہر روم کی زیارت ہوتی ہے۔

تا دم تحریر جو تازہ ترین خبریں اطالوی محاذ سے موصول ہوئی ہیں، ان سے معلوم ہوا ہے کہ جرمنوں نے شہر روم کو بچانے کی نیت سے شہر مذکور کو خالی کر دینے کا فیصلہ کیا ہے چنانچہ جرمن فوجیں شہر کو خالی کر گئی ہیں اور اتحادی فوجیں روم پر قبضہ کر کے چالیس میل آگے نکل گئی ہیں۔

برما | اطالیہ کے بعد سب سے زیادہ خونریز لڑائیاں ہندوستان و برما کی سرحد پر ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔ جاپانیوں نے پہاڑی راستوں سے گذر کر چھپتے چھپاتے امپھال کے میدان کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور بعض اہم سڑکیں بھی

کئی جگہ سے کاٹ دی تھیں۔ کوہیما، دیماپور، امپھال کو خاص طور پر خطرہ پیدا ہو گیا تھا، مگر اتحادیوں کی تیز جوابی فوجوں نے چاروں طرف حملے کر کے امپھال اور کوہیما کو بچا لیا ہے۔ سب سے زیادہ گھمسان کی لڑائی کوہیما میں ہوئی، جہاں سے بالآخر جاپانیوں کو نکال دیا گیا ہے۔ امپھال اب محفوظ ہے۔ البتہ بشن پور کے علاقہ میں لڑائی ہو رہی ہے جہاں اتحادیوں کا پلہ بھاری ہے۔ بشن پور پر حملہ کرنے سے جاپانیوں کا مقصد یہ تھا کہ امپھال پر قبضہ کر لیا جائے اور جن راستوں سے امریکن جنرل اسٹلویل کی فوجوں کو اور میجر جنرل ونگیٹ آنجہانی کی چنڈٹ فوج کو سامان سپلائی ہوتا ہے ان کو منقطع کر دیا جائے، مگر دشمن اپنے ارادوں میں ناکام رہا ہے۔ اب آسام و برما میں برسات شروع ہو گئی ہے۔ فوجی نقل و حرکت میں دقتیں پیش آئیں گی، اس لئے لڑائیوں میں کوئی خاص سرگرمی نظر نہیں آئیگی۔ البتہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جاپانیوں کا ارادہ ہندوستان سے واپس ہٹنے کا نہیں ہے، اور وہ برسات کا موسم کسی نہ کسی طرح سے آسام کی سرحدی پہاڑیوں ہی میں گزارنا چاہتے ہیں۔ تاکہ موقع پاکر پھر امپھال اور کوہیما پر حملہ آور ہوں۔

شمالی برما میں جنرل اسٹلویل کی چینی و امریکن فوجوں نے زبردست کارنامہ انجام دیا ہے اور انھوں نے شمالی برما کے سب سے بڑے شہر مٹکینا کو گھیر کر اس کے بعض حصوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ مٹکینا کا طیارہ میدان اور ریلوے اسٹیشن اس وقت اتحادیوں کے قبضہ میں ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ جاپانیوں کو اس شہر سے بہت جلد بے دخل کر دیا جائے گا۔

دوسرا محاذ | بالآخر جرمن کو اتحادیوں نے شمالی فرانس کے علاقہ نارمنڈی کے ساحل پر فوجیں اتار دیں۔ حملہ کامیاب رہا اور اس وقت تقریباً ڈھائی لاکھ اتحادی سپاہ مع جملہ قسم کے آلات حرب اور ساز و سامان کے جرمنوں سے نبرد آزما ہے۔ نقصان جان و مال ضرور ہوا ہے مگر توقع سے کم ہوا ہے۔ اس وقت سمندر کی ریتی میں اتحادیوں نے اپنے پاؤں جما لئے ہیں۔ جرمن فوجیں شدید جوابی حملے کر رہی ہیں۔ بایں ہمہ اب تک اتحادیوں کا قبضہ فرانس کے تقریباً ۔۔ مربع میل علاقہ پر ہو گیا ہے۔

چین | جب سے جاپانیوں نے برما کو فتح کر کے برما روڈ سے چین کو جانے والی سڑک کاٹ دی ہے اس وقت سے چین کو جنگی سامان مناسب مقدار میں نہیں پہنچ رہا ہے۔ اس وقت سے اگرچہ چینی فتوحات کی خبریں وقتاً فوقتاً آتی رہتی ہیں لیکن بقول انگریزی اخبار "ڈیلی ہیرلڈ" و روسی اخبار "جنگ اور ورکرس" اب چین کی حالت قابل اطمینان نہیں ہے۔ جاپانیوں نے کثیر فوج کے ساتھ ان ریلوے لائنوں پر حملہ کر کے اپنا قبضہ تقریباً مکمل کر لیا ہے جو کانٹن سے ہانکاؤ اور وہاں سے پیپنگ کو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جاپانیوں نے لونگ ہائی ریلوے کے بہت سے حصہ پر قبضہ کر لیا ہے جس سے جاپانیوں کا مقصد یہ ہے کہ وہ علاقے چینیوں کے قبضہ میں نہ رہنے دئے جائیں جہاں کے ہوائی اڈوں سے امریکن ہوائی جہاز اڑ کر جاپانی شہروں پر بمباری کر سکیں۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ جاپانی اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔ امریکہ کے وائس پریسیڈنٹ مسٹر والیس کے چین میں جانے کی بھی یہی وجہ

بتائی جاتی ہے

چین کی تازہ ترین صورت حال یہ ہے کہ جاپانیوں نے بہت بڑی فوج سے صوبہ ہونان کے دارالحکومت چانگشا پر چڑھائی کردی ہے اور جب تک یہ سطور ناظرین کی نظر سے گذرینگی اُس وقت تک غالباً معلوم ہوجائیگا کہ جاپانی اپنے منصوبوں میں کامیاب ہوئے ہیں یا نہیں

اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ چینی فوجیں دریائے سالوین کے شمالی حصہ کو پار کرکے برما کی طرف بڑھ رہی ہیں اور اُنھوں نے مامین کے راستہ پر آٹھ ہزار فٹ بلند ایک گاؤں پر قبضہ کرلیا ہے۔ اس کے علاوہ چینی فوجیں ٹین چنگ کی طرف بھی بڑھ رہی ہیں جو برما روڈ سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔

بحرالکاہل | بحرالکاہل کی معرکہ آرائیوں کے بارہ میں جو خبریں آتی ہیں وہ عموماً مبہم اور غیر واضح ہوجاتی ہیں۔ ان خبروں سے اتنا معلوم ہوا ہے کہ ڈچ نیوگنی میں لڑائیاں کامیابی کے ساتھ ہورہی ہیں لیکن چونکہ یہ ملک بڑی حد تک غیر معلوم (Un explored) اور کوہستانی ہے اس لئے فتوحات کی رفتار سست ہے۔ اس جزیرہ کے مشرقی حصہ میں ہویاک کے قلعہ پر ابھی تک جاپانی قابض ہیں جس پر اتحادیوں کے سمندری اور ہوائی جہاز گولے اور بم برساتے رہتے ہیں ریفو برٹین میں ایک بہت بڑی جاپانی فوج گھری ہوئی ہے جسے مدد پہونچنے کی کوئی توقع نہیں ہے جزیرہ تیمور میں بھی اتحادیوں نے لڑائی کا سلسلہ جاری کردیا ہے مگر ابھی اس کے نتائج معلوم نہیں ہوئے۔

جزائر کیورائل پر بھی جو شمالی بحرالکاہل میں واقع ہیں، جزائر ایلیوشن کے امریکی ہوائی اڈوں سے دو مرتبہ حملہ کیا گیا۔ اگرچہ ان حملوں کو سرزمین جاپان پر شمال کی طرف سے حملوں کی ابتدا خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن مبصرین کے نزدیک اس طرف سے کوئی حملہ مؤثر نہیں ہوسکتا۔ البتہ جزائر مارشل یا کیرولائن کی سمت سے جو حملے ہوں گے وہ ضرور نتیجہ خیز ہوں گے۔ جزیرہ ترک کو جاپانیوں نے نہایت مضبوط طور پر قلعہ بند کیا تھا، اور بعض کے نزدیک یہ ناقابل تسخیر ہوگیا تھا لیکن امریکن جہازوں نے بار بار حملے کرکے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی ہے۔ لیکن جزائر کیرولائن کا دفاع قدرتی طور پر بہت مضبوط ہے۔ اس لئے خیال کیا جاتا ہے کہ ان جزیروں میں جاپانی زیادہ مدت تک مزاحمت کرسکیں گے۔

جاپانیوں کے ہاتھ سے اب جارحانہ پوزیشن نکل گئی ہے، اور ان کا جنگی بحری بیڑہ بھی منہ چھپاتا پھرتا ہے جس کی نسبت کچھ معلوم نہیں ہے کہ وہ کہاں اور کس طرف ہے۔ البتہ یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ جو طاقت جاپانی بیڑے کی پہلے تھی اب وہ نہیں رہی ہے۔ کیونکہ جاپان کے بہت سے کروزر اور تباہ کن جہاز اور اس کے بہت سے بار بردار جہاز تباہ و برباد ہوچکے ہیں۔

اٹلی میں مارشل باڈوگلیو کی گورنمنٹ کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ روم کے سقوط کے بعد ہی وکٹر عمانوئیل اپنے

البتہ امیرؔ توکے حق میں اٹلی کے تخت و تاج سے دست بردار ہو گئے ہیں۔ اور اب شاہ امرتو نے تشکیل وزارت کا کام آرتیخو بانوری کو سپرد کیا ہے۔ آئندہ سے اطالوی وزرا رخاندان شاہی کے وفادار رہنے کا نہیں بلکہ بانی وطن سے وفادار رہنے کا حلف اُٹھایا کریں گے۔

یوگوسلافیہ میں محبان وطن اور جرمن فوجوں میں جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ پچھلے دنوں جب مارشل ٹیٹو نے زور پکڑا تو جرمن ہائی کمانڈ نے ہوائی جہازوں سے فوجیں بھیجکر مارشل مذکور کے ہیڈ کوارٹر کو گھیر لیا لیکن مارشل ٹیٹو اور ان کے ساتھ مسٹر چرچل کے فرزند نے بھاگ کر پہاڑیوں میں پناہ لی۔

دارالعوام میں برطانوی سیاسیات خارجیہ پر بیان دیتے ہوئے مسٹر چرچل نے بعض باتیں ٹرکی کے خلاف اور بہت سی باتیں اسپین اور جنرل فرانکو کی تعریف میں کہیں جس پر روس اور امریکہ میں کافی نکتہ چینی کی جارہی ہے۔

لطفِ سخن

(منتخب اشعار غزلیات مشاعرہ اولڈ بوائے کمند سروپ کالج سکندر آباد ضلع بلند شہر)

(منشی حافظ الدین صاحب نشتر سکندر آبادی)

توڑ کر نظروں میں دی ساقی نے وہ صہبا مجھے ۔۔۔ جس سے ہر قطرہ نظر آنے لگا دریا مجھے
جب کھُلیں آنکھیں تو رازِ لن ترانی کھُل گیا ۔۔۔ دامنِ جلوہ نظر آیا ہر اک پردا مجھے
میری دنیا تم تھے، دنیا مل گئی جب تم ملے ۔۔۔ کچھ مجھے سود انہیں کیوں ہو غم دنیا مجھے

(منشی ہری کرشن راز ایم۔اے۔سی۔ٹی بلند شہری)

لن ترانی چھوڑ طالب ہوں دکھا جلوا مجھے ۔۔۔ طُور کی تصویر ہے ہستی کا ہر نقشا مجھے
چاک کر کے جامۂ اوراک مجنوں بن گیا ۔۔۔ ذرہ ذرہ وشت کا ہے دامنِ لیلیٰ مجھے
منہدم مقدوں کی تعمیریں ہوئیں اُٹھے حجاب ۔۔۔ رازِ قدرت نے جو سمجھا رازدار اپنا مجھے

(سید نبی ہادی رضوی سکندر آبادی تخلص ہادی)

شمع پر قربان ہونا ہے محبت کا ثبوت ۔۔۔ درس الفت دے رہا تھا جل کے پروانا مجھے

(بابو پرمانند سروپ اختر رئیس سکندر آباد)

پھر وہ مجھ سے آملے پھر آرزوئیں جی اُٹھیں ۔۔۔ پھر نظر آنے لگی نو دیا نئی دنیا مجھے
کچھ نہ کرتا جو کہ دنیا سے قدیمی التفات ۔۔۔ اس لئے ہر بار مر مر کر پڑا جینا مجھے
[illegible] ۔۔۔ مجھ میں آ [illegible] مجھے

نئی زندگی کا پیام

یہ زندگی بھی عجیب زندگی ہے اسکا بنانا اور بگاڑنا خود انسان کے ہاتھ میں ہے۔ ہزاروں لاکھوں انسان محض اپنی ناعاقبت اندیشیوں سے قبل از وقت بوڑھے ہو کر فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں بیشمار انسان انواع و اقسام کی شکایات میں مبتلا ہو کر زندہ درگور ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی مسرتوں سے محروم رہ کر جینے پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ خانگی زندگی وبال جان بن جاتی ہے۔ کاروبار ناقابل برداشت بار معلوم ہونے لگتا ہے ہر طرف مایوسی اور نامرادی چھائی ہوئی رہتی ہے اور جب آرزوؤں اور تمناؤں کا خون دیکھتے دیکھتے یہ بدبخت لوگ تھک جاتے ہیں تو موت ہی کو اپنا محسن اعظم سمجھنے لگتے ہیں۔

انسان اپنی بے احتیاطیوں سے کس قدر خوفناک حال میں پہنچ جاتا ہے۔ اگر احتیاط اور اعتدال سے زندگی بسر کی جائے تو طویل عمر تک آدمی جوان رہتا ہے اور اپنے خانگی و کاروباری فرائض کو بدرجہ اتم انجام دینے کے قابل رہتا ہے۔ دنیا کی مسرتیں اسے حاصل رہتی ہیں اور وہ ایک کامیاب زندگی گذارتا ہے۔ اگر اپنے ہاتھوں جوانی کا ستیاناس کرنیوالی حرکتیں کر کے آدمی جریان، سرعت اور کمزوری باہ جیسی تباہ کن شکایات کا شکار ہو جائے تو بڑھاپا آدبوچتا ہے اور بہار کے ایام بھی خزاں کے ہاتھوں تاراج ہو جاتے ہیں ایسے مایوس اور نامرادوں کو نئی زندگی مل سکتی ہے بشرطیکہ وہ ہمارے مشورہ پر عمل کریں۔ قوت مردمی کی جملہ شکایات کا بہترین اور تیر بہدف علاج **نکسول** استعمال کر کے آپ از سر نو جوان بن جائیں گے۔ اور اس کایا پلٹ سے آپ اپنے اندر وہ دن لوٹے پائیں گے جو ماضی کی کہانیاں ہو کر رہ گئی ہیں۔ قیمت بڑی شیشی جس میں تین ہفتے کی دوا ہے آٹھ روپئے (-/-/8)

چھوٹی شیشی تین روپیہ چار آنہ (-/4/3)

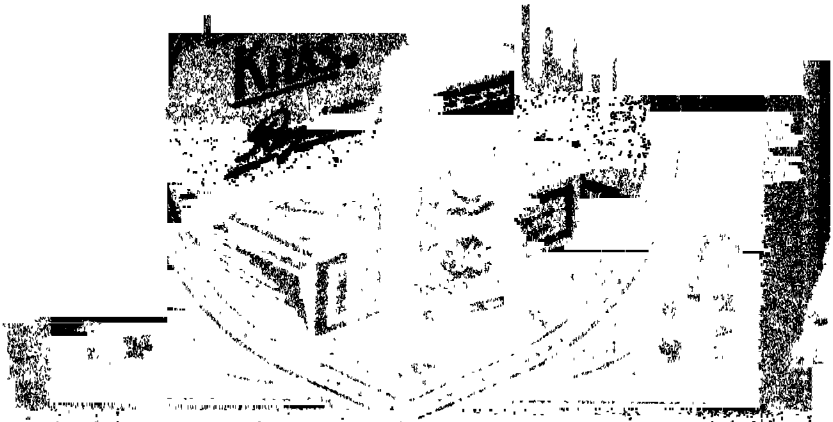
اسپیشل نکسول وقتی لذت کے جوش میں جو لوگ اپنی قوت مردمی برباد کر لیتے ہیں وہ صرف قوت مردمی ہی سے نہیں بلکہ دل و دماغ کی قوتوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں تمام نظام جسمانی کمزور ہو جاتا ہے آنکھوں کی روشنی بھی جواب دینے لگتی اور مایوسی و حسرت کا قابل رحم نمونہ بن جاتا ہے قوت مردمی سے کم ہو جانے سے انسان اپنی زندگی بھی ختم کرنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے ایسے لوگ اسپیشل نکسول استعمال کریں تو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ انکی تمام شکایتیں رفع ہو سکتی ہیں قیمت فی شیشی پچاس روپے -/50

چھوٹی شیشی ساڑھے بارہ روپے (-/8/12)

امریکن سیکس کریم اسے طلا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر نکسول یا اسپیشل نکسول کے ساتھ استعمال کیا جائے تو اسکا اثر برقی رو کی طرح فوراً ظاہر ہوتا ہے۔ خارجی دواؤں میں یہ بہترین دوا ہے جو موجودہ سائنس نے ایجاد کی ہے قیمت فی ٹیوب نو روپیہ چار آنہ

فیش اینڈ ایلیس پر اپرائٹرس چیمبرس - اینکس - فورٹ - بمبئی

کانپور کے اسٹاکسٹ: ڈاکٹر ... ۱۱ ...



[illegible] روشن [illegible]

ایڈیشن دسمبر ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں حسب ذیل تبدیلیاں اور اضافے ہوئے

۱۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے حالات مفصل لکھے گئے۔

۲۔ انجمن ترقی اردو کے قیام اور اس کی ترقی کی تاریخ دی گئی۔

۳۔ دارالعلوم دیوبند کے حالات کے سلسلے میں اس کے بانی مولانا محمد قاسم صاحب کے تعلیمی وصیت نامے کا خلاصہ دیا گیا ہے جس میں مذہبی اداروں کو امراء سے مالی امداد حاصل کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

۴۔ جماعت خاکساران کے حالات اور طریقۂ کار میں نمایاں تبدیلی کی پوری کیفیت درج کی گئی ہے۔

۵۔ جملہ اداروں کے سالانہ جلسوں کے حالات مکمل درج کردیے گئے ہیں

۶۔ سر اسٹیفورڈ کرپس کی تجاویز کے متعلق کانگریس اور مسلم لیگ کے رویہ کی کیفیت درج ہے

۷۔ آل انڈیا مومن کانفرنس اور آزاد مسلم کانفرنس دہلی کے حالات دیے گئے ہیں

۸۔ مذہبی حفاظت کے عنوان کے تحت صوبۂ متحدہ میں ۲۵ سال کے بلووں کی تعداد دی گئی ہے جس سے حیرت انگیز انکشاف ہوا

۹۔ مسلمانوں کے موجودہ منصوبے کے تحت میں دکھایا گیا ہے کہ سیاسی حالات میں تمہ کے ساتھ مسلمانوں کا مستقبل کن وجوہ کی بنا پر روشن ہے۔

مکتبہ جامعہ دہلی قرول باغ

شاخیں اور ایجنسیاں:۔

جامع مسجد دہلی۔ امین آباد لکھنؤ ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی نمبر ۳

پبلشرز یونائیٹڈ لاہور ۔ سرحد بک ایجنسی پشاور

[illegible]

زمانہ

جلد ۸۳ جولائی سنہ ۱۹۴۴ء نمبر ۱

یورپ اور ہندوستان کا کلچرل ارتباط

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی، بی۔ اے، ایل ایل بی)

تہذیب و تمدن کی ترویج و ارتقا ہمیشہ سے اقوام و اجسام کے باہمی اختلاط کی رہین ہے ہرچند تہذیب جدید کا گہوارہ یورپ ہی کو مانا گیا ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ اس کی نشوونما مشرق کے آثار قدیمہ کی آغوشِ تربیت میں ہوئی، ہم ہندوستانیوں نے مغرب سے لیا بھی ہے اور اُسے دیا بھی بہت کچھ ہے۔

سنسکرت زبان کی عالمگیر فیاضیوں سے قطع نظر علوم و فنون اور شعر و ادب کے میدان میں بھی ہندوستانیوں کے کارنامے اہل مغرب کے لئے مشعلِ ہدایت بنے رہے ہیں۔ ریل۔ تار۔ لاسلکی۔ ریڈیو۔ جہاز اور ہوائی جہاز وغیرہ عصر جدید کی پیداوار خیال کی جاتی ہیں، اور ان کی ایجاد و اختراع کا سہرا اہل یورپ کے سر باندھا جاتا ہے۔ مگر قدیم سنسکرت ادب شاہد ہے کہ ہندوستانی اب سے ہزارہا برس پہلے اس نوع کے انکشافات کا فخر حاصل کر چکے تھے۔ چنانچہ ریڈیو۔ تار اور لاسلکی وغیرہ کا خاکہ ہنوز مرقع میں موجود ہے۔ جہاز ریل اور ہوائی جہاز وغیرہ کی ساخت کے گُر و شو کرا کی نسبت تعمیر سے متعلق مشہور تصنیف میں بالتفصیل مندرج ہیں۔ رامچندر جی کا پل باندھ کر سمندر کو عبور کرنا اور ہوائی جہاز میں لنکا سے اجودھیا واپس آنا۔ دکن کی ایک ایسی قدیم عمارت کی دیواروں پر [illegible] میں کھود کر بنائی گئی [illegible] کی تصویر [illegible] ہندوستانی [illegible]

مصر کے بازاروں میں ہندوستانی مصنوعات کا جہازوں میں بھر کر لے جانا وغیرہ بعض اہم تاریخی واقعات ہیں۔

جنگ مہابھارت میں طرفین نے جس جس طرح کے اسلحہ و آلاتِ حرب کا استعمال کیا تھا، دفاع اور جارحانہ اقدام کے جو طور و طریق وضع کئے تھے اُن کی مثال موجودہ ہلاکت آفریں جنگ میں بھی نظر نہیں آتی۔ نجوم، فلسفہ، منطق، ریاضی، طبعیات، طب، جراحی، اقتصادیات، سیاست مدن، دستور قانون، صنعتِ تعمیر، مصوری، موسیقی، شعر و ادب، بت سازی۔ اور علم کیمیا وغیرہ کا پہلا سبق دنیا نے ہندوستان ہی سے سیکھا تھا۔

قدیم سنسکرت ناٹکوں اور دیگر افسانوی ادب کا مغرب کس درجہ زیر بارِ احسان ہے اس کا اندازہ (Marvels beyond Theelandand Ætheohia) نامی یونانی تصنیف کے مطالعے سے بخوبی ہو سکتا۔ پنج تنتر، ہت اپدیش، کتھا سرت ساگر اور درشٹانٹ ساگر وغیرہ کا یورپ کی اڑتیس زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ فزیولوگس گیسٹا رومنورم (Gesta Romanorum) اور (Clericali Discipline) جن کے تراجم یورپ کی تمام ترقی یافتہ زبانوں میں موجود ہیں خالص ہندوستانی پیداوار ہیں۔ گوور اور چاسر کی تاریخ کالنس ٹینس شیکسپیر کے کنگ لیر اور مرچینٹ آف وینس اور پارنل کی ہرمٹ کا ماخذ بھی یہی کتابیں ہیں، جن کی انگریزی شاعری بغایت مرہونِ منت ہے۔ الفونسس کے افسانے بھی کسی گمنام و ناپید ہندوستانی تصنیف سے ماخوذ ہیں۔ سندباد اور شہزادہ بختیار کے افسانے بھی ہندوستان ہی میں وضع ہوئے۔ سندباد ڈی جہاس نامی راہب کے ذریعہ سے مغربی ممالک پہونچا اور بختیار تامل زبان کی مشہور تصنیف الکستور کتھا سے اخذ کیا گیا۔ ڈی۔ لانگ سیمپ نے اپنی کتاب Escia sur leo Fables Indianes میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ تقریباً تمام مغربی افسانے ہندوستانیوں کی فکرِ رسا کا کرشمہ ہیں۔

مغرب کے مزاحیہ افسانے جو آدلاڈ، ربکیس، اسکلٹن اور ڈک ٹارلٹن سے منسوب ہیں، ان سب کا منبع ہندوستان ہے۔ احمقوں کے قصے اور دیگر (Folk Tales) علی بابا چالیس چور، چراغ الہ دین، کلیلہ دمنہ، گل بکاولی اور الف لیلہ وغیرہ بھی ہندوستان ہی میں گھڑے گئے۔ سونے کا انڈا دینے والی مرغی' نامی قصہ مہابھارت سے اڑایا گیا۔ اور سلیمان وغیرہ کی عدالت گستری کی چند روایات ترپٹک نامی بدھوں کی مقدس کتاب سے لی گئیں، ایک بچہ کے لئے دو عورتوں کا نزاع' اور قاضی کا اس کے ٹکڑے کر کے بانٹ دینے کا فتویٰ وغیرہ بھی ہندوستان ہی کی چیز ہے۔ [illegible]

بھی اس دعویٰ کا موید ہے کہ مغرب کے تمام افسانے ہندوستان ہی کا عطیہ ہیں جو ایران و عرب ہو کر یورپ تک پہونچے ہیں۔

برلام اور جوزیفات بودھی ستوا کے مرادف ہیں، اور بدھ کی پیدائش سے متعلق داستانوں پر مشتمل ہیں۔ انگریزی کا مشہور اخلاقی ڈرامہ "ایوری مین" اور "پارڈنرس ٹیل" مصنفہ چاسر انھیں افسانوں سے ماخوذ ہیں۔ اور ہندوستانی افسانوں کی عظمت کا بانگِ دہل اعتراف کرتے ہیں۔ ہومر کی ایلیڈ گریک مائتھالوجی، شیکسپیر کے ڈراموں اور یوروپ کے دیگر چوٹی کے مصنفین کی بعض بہترین تصانیف کا بھی یہی حال ہے۔ ایلیڈ بالمیک کی رامائن کی کہانی سُن سُنا کر ایک اندھے اُمّی شاعر نے اپنی زبان میں نظم کی ہے۔

پیرس سائیکلوپیڈیا میں مرقوم ہے کہ بعض روایات کی بنا پر ہومر کو ایلیڈ اور اوڈیسی نامی مشہور یونانی رزمیہ نظموں کا مصنف قرار دیا جاتا ہے۔ والمیک کی رامائن مہابھارت سے پرانی ہے اور مہابھارت کا عہد تصنیف انگریز محقق ۱۴۰۰ ق م بتاتے ہیں۔ ہومر ۸۵۰ ق م میں غالباً خیوس یا سمرنا میں رہتا تھا پس رامائن کا متذکرہ بالا نظموں سے پرانے ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

پیرس سائیکلوپیڈیا کے مصنفین کا خیال ہے کہ ایلیڈ کا پلاٹ رامائن سے لیا گیا ہے۔ یورپین محقق بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا مضمون مشرقی ہے۔ غالباً ہومر نے رامائن کو کسی دوسرے سیاح سے سُن کر قطع وبُرید کے بعد ایلیڈ کی صورت میں پیش کیا ہے۔ کہیں کہیں رامائن کے واقعات ہو بہو نقل کردیئے گئے ہیں اور کہیں کہیں سہواً ان میں برائے بیت تغیر و تبدّل واقع ہوگیا ہے۔ آگے چل کر لکھا ہے کہ ہومر نے رامائن کے واقعات یونانی رنگ میں رنگ کر ایلیڈ میں قلمبند کئے ہیں۔ اس لئے ان دونوں کے طرز بیان اور واقعات میں سطحی اختلاف تو ضرور ہے لیکن قصّہ کا خاکہ ایک ہی ہے۔

پُرانوں کی دنت کتھائیں گریک مائتھالوجی بن گئی ہیں۔ شیکسپیر وغیرہ مصنفین نے ان بلند ہندوستانی تصانیف پر چھاپہ مارا ہے جواب معدوم ہیں، اور جنھیں مغربی فاتحین نے مصلحتاً دریابُرد کردیا ہے۔

شیکسپیر کی ہیروئنوں کی ایک مثال بھی یورپ آج تک پیدا نہ کرسکا۔ ان کا کردار خالص ہندوستانی ہے۔ یہی ایک بات اس کے سرقہ کی بیّن دلیل ہے۔ اگر ہندوستان کے قدیم کتب خانے تاخت و تاراج نہ کئے گئے ہوتے اور بیشمار قلمی نسخوں کو نذرِ آتش نہ کیا جاتا تو ان ناٹکوں کے سرورق پر شیکسپیر کا فرضی نام کندہ ہونے کی بجائے اس کے اصل مترجم کا نام سنہرے حروف میں جھلملاتا ہوتا۔ ان ناٹکوں [illegible]

گیا مضمر ہے الیسپس فیبلس کی طرح ہندوستان کے تمام افسانے مغربی زبانوں میں منتقل ہوکر کسی نہ کسی ایسے غیر ملکی مصنف کے نام سے منسوب ہیں، جس نے بکمال فخر ترجمہ کو تصنیف کہہ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا ہے۔

ہندوستان کا بیشتر ادبی سرمایہ عربی اور فارسی کی وساطت سے یورپ میں پہونچا ہے، اور اہل عرب و ایران کی طرح یورپ والوں نے بھی اس پر اپنا اپنا رنگ چڑھا کر اُسے اپنانے کی کوشش کی ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک ہی کتاب کے مختلف زبانوں کے تراجم میں یکسانیت نہیں ہے۔ ان میں جابجا حسب حال تصرف و تغیر ہوتا رہا ہے۔ گو اصل قصہ کا ماحصل اور واقعات کا تسلسل بعینہ وہی ہے

سنسکرت ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ وشاکھ دت نامی ناٹیہ کار کی وفات کے بعد ہندوستانی اہل قلم نے سنسکرت کے النکار شاستر سے انحراف کرنا شروع کیا تھا۔ لیکن یہ جدت قبولِ عام کی سند حاصل نہ کر سکی۔ چنانچہ اس نوع کی تمام پیداوار خاک میں ملا دی گئی، یا کم از کم ہندوستان میں نہ پنپ سکی۔ البتہ غیر ملکیوں نے اس سے بغایت استفادہ کیا۔

اس دور کے ادیب شعر و ادب کو ان کڑی قیود سے آزاد کرانے کے متمنی تھے جو النکار شاستر نے عائد کر رکھی تھیں۔ چنانچہ وہ کمر کس کر بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ مگر متقدمین کے مداحوں نے طرز جدید کے نقوشِ اولین پر پانی پھیر کر ان کی سرکوبی کی۔ اور ان کے زمانہ کو افراط تفریط کا عہد قرار دیکر اس کے آثار کو بھی محو و مدغم کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ باہمی کشمکش کے ہاتھوں بیشمار قدیم و جدید ادبی و علمی سرمایہ نیست و نابود ہو گیا۔ اور اب جبکہ گھر والے دونوں ہاتھوں سے اپنا گھر لُٹا رہے تھے باہر والوں کے جو کچھ ہاتھ لگا اُڑا لے گئے۔ اور بالآخر نوبت باینجا رسید کہ ہم دوسروں کے دست نگر بن بیٹھے۔ یہیں سے ہمارے انحطاطِ ادب کی المناک داستان شروع ہوتی ہے۔ یہی وہ ادبی زوال تھا جو ہمارے سیاسی ادبار کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

ابھی تک مغرب ہمارا زلّہ رُبا تھا۔ لیکن اب ہمارے ہاتھ خالی ہو چکے تھے۔ اور اُس کے آگے ہاتھ پھیلانے کا وقت آ گیا تھا۔

سترھویں صدی عیسوی کے اوائل میں مغربی اقوام کی ہوسِ ملک گیری نے سرزمینِ ہند میں پاؤں پھیلانے شروع کئے۔ کچھ ہی عرصہ بعد اطراف ملک میں طوائف الملوکی اور خانہ جنگی کا نقارہ بجنے لگا۔ انھیں باہمی تنازعات کی آڑ لیکر یورپ والے اپنی اپنی سلطنت قائم کرنے کی دھن میں آپس میں دست و گریباں ہو گئے۔ آہستہ آہستہ انگریزوں کا غلبہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ بمبئی اور مدراس کے صوبے ان کے زیر نگیں آ گئے۔ اب ہندوستانیوں کی بھی آنکھیں کھلنا شروع ہوئیں اور وہ اہلِ مغرب سے بدل

برگشتہ ہوکر کنارہ کش ہو گئے۔ ہاں ۱۸۵۷ء کی ٹکر کے بعد لوگوں نے مایوس و مجبور ہوکر مغربی اثر قبول کرنا شروع کیا جس کی پہل مدراس سے ہوئی جہاں کے لوگوں نے انگریزی کو اپنی مادری زبان بنالیا۔ بمبئی والے بہت الگ تھلگ رہے ہاں تلنگی ادب میں کچھ تھوڑی بہت تقلیدِ مغرب کی کوشش ضرور ہوئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ اہلِ بنگال نے بھی اس طرف توجہ مبذول کی اور ملکی و قومی خصوصیتوں کے مطابق ضروری ترمیم و تنسیخ کے ساتھ مغربی خیالات کی ترجمانی کرنا شروع کی۔ اس نوع کی کامیاب مساعی ۱۸۱۷ء میں شروع ہوئیں۔ اور بہت قلیل عرصہ میں بنگالیوں نے نہ صرف اپنی زبان کو جدید ادب کے ذخائر سے مالا مال کیا، بلکہ ایک نئی تحریک کے بیامبر بنکر انھوں نے دیگر صوبوں کی رہنمائی بھی کی۔ اس اعتبار سے یوروپ میں رومیوں کو جو فخر حاصل ہے۔ ایشیا میں بنگالیوں کا بھی وہی مرتبہ ہے۔

جس طرح ریل، ریڈیو، تار اور جہاز وغیرہ دے کر مغرب نے ہمارے بھولے بسرے افسانۂ ماضی کی یاد تازہ کرائی اُسی طرح اُس نے ملکی ادبیات کا بھی سارا پچھلا قرضہ مع سود کے ادا کر دیا۔ اس ضمن میں مغرب سے ہمیں جو کچھ ملا وہ کوئی نئی چیز نہ تھی البتہ اُس کے رنگ روپ، اس کی چمک دمک میں بہت کچھ فرق تھا۔

گذشتہ صدی میں بنگال نے مدھوسودن، بنکم، رمیش چندر، ہیم چندر اور نوین چندر جیسے اہلِ قلم پیدا کئے جنھوں نے مغرب کے ادبی معیار کو پیشِ نظر رکھکر قلم اُٹھایا، اور اپنی ملکی و قومی خصوصیات کو قائم و برقرار رکھتے ہوئے چمنستانِ ادب میں نت نئے گُل کھلائے۔ ہمارے ملکی ادب کی جزئیات پر مغربی تاثرات کی مختصر کیفیت یہ ہے:-

(۱) کرداروں کی امتیازی تخصیص کا اخراج (۲) موضوعات کا تنوع اور وسعتِ نظر (۳) تجزیۂ نفسی و کردار نگاری (۴) جدید خیالات کی اُپج و تقلید (۵) اسالیبِ نو اور اُن کا تتبع (۶) اظہارِ خیال کے جدید مختلف پیرائے (۷) سادگی و شیرینی (۸) فطرتِ انسانی کی مطابعت اور جمالیاتی ذوق کی اصلاح و ارتقاء (۹) نئی اصنافِ ادب کی ایجاد اور جدید اصطلاحات و الفاظ کا اضافہ۔

شبلی کا قول ہے کہ عہد بعہد کی تبدیلیوں کے ساتھ زبان، خیال اور اندازِ بیان کی یکسانیت عین فطرت کے مطابق ہے۔ اس سے دقیانوسی خیالات کا ازالہ اور نئے اچھوتے میدانِ فکر کا اضافہ ہوتا ہے بحر رسم التفات اصناف ادب کی حق رسی اور جدید رجحانات کی افزائش و بالیدگی کے ساتھ مذاقِ سلیم کی تہذیب و تکمیل ہوتی ہے

انگریزوں کے تسلط کے ساتھ ساتھ تعلیم کم از کم اصولاً عام ہوگئی۔ اور درس و تدریس کا مشغلہ کہ فرسودہ ... ہو ... عبادت کے بجائے حبِ منفعت و کسبِ معاش کا ذریعہ بن گیا۔ اب ...

حجرۂ تقدس سے نکل کر جنس سربازار بن گئی اور سونے چاندی کے مول بکنے لگی۔ گو عدل و انصاف کی طرح یہ بھی بہت مہنگی تھی پھر بھی اس کے خریداروں کی کمی نہ رہی۔ چھاپے کی مشینوں کے رواج سے کتابوں کی قلت اور گرانی کی شکایت بھی رفع ہوگئی۔ جس سے نہ صرف عوام کی ان تک رسائی ممکن ہو سکی بلکہ علمی و ادبی صحیفوں کے تحفظ کا بھی بند و بست ہوگیا۔ بہت سی بیش قیمت اور نادر تصانیف قعر گمنامی سے نکل کر منصۂ شہود پر آگئیں۔

اہل مغرب کے قرب و اتصال سے جو پیچیدہ مسائل رونما ہوئے، اُن کے حل کرنے کے لئے اخبارات و رسائل کی اشاعت بھی ہونے لگی۔ اور سیاسی الجھنوں کے پہلو بہ پہلو علمی و ادبی سرگرمیاں بسرعت فروغ پانے لگیں۔ اس سے پیشتر علم و ادب کی اشاعت کا واحد کامیاب ذریعہ صرف اسٹیج تھا۔ لوگ یا تو مشاعرے اور دربار منعقد کر کے اپنے جی کی بھڑاس نکال لیتے تھے، یا پھر ناٹکوں کا سہارا ڈھونڈتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریق اشاعت کتب بینی کے ذوق و شوق کے یکسر منافی ہے۔ حالانکہ اس کی دسترس ناخواندہ عوام تک ہے۔ لیکن خالص نثر کی ٹھوس علمی و ادبی کتب اس قسم کی نمود و نمائش کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ غالباً ناٹکوں اور مشاعروں کی بے پناہ دھوم دھام ہی کے باعث اسلاف نے باقاعدہ ناول نگاری اور طباعت کے طریقوں کی دریافت کی جانب توجہ نہ کی۔ اور ایسی بے شمار طویل نظمیں اور مختصر داستانیں لکھ ڈالیں جو بھی گائی اور بآسانی سنائی جا سکتی تھیں، اور جن میں عصر جدید کی ناول اور افسانہ نگاری کے تمام جوہر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

مغرب نے ہم سے جو کچھ لیا اُسے جلا دیکر ہمیں واپس کر دیا۔ چنانچہ اُسی کے طفیل میں بہت سی غیر ضروری پابندیاں دُور ہوگئیں۔ اور سنسکرت کے النکار شاستر کو طاق نسیان کی زینت بنا دیا گیا۔ اب ادب کے آئینہ میں خواص کی بجائے عوام کی زندگی کے حقائق کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ اظہار خیال کا میدان بہت وسیع اور کشادہ ہوگیا۔ موضوعات کی بہتات کے ساتھ ساتھ مختلف النوع اور متنوع واقعات حیطۂ ادب میں داخل ہونے لگے۔ اور اسلوب بیان میں تکلف و تصنع کی جگہ فطری بے تکلفی، سادگی اور شیرینی گھل مل کر عام ہوگئی۔ موجودہ اُردو نثر کا رنگ اسی تبدیلی کی ایک زندہ مثال ہے۔

مغرب کے زیر اثر فلسفۂ حیات کی توضیح کا انداز ہی نہیں بدلا بلکہ نظریۂ حیات کے ساتھ حسن کاری کے انداز میں بھی اہم تبدیلی واقع ہوئی۔ پہلے حسن فطرت کو صرف زیب داستان کے لئے بے نقاب کیا جاتا تھا۔ اُسے تخیلی، دردسوز تحیر اور تفکر کی نگاہ سے نہ دیکھا جاتا تھا اور وجدانی کیفیات کو دو حالی معیار سے تابع رکھا جاتا تھا۔ اب علوئے روح کے پہلو بہ پہلو نشاط روح کا سامان بھی مہیا کیا جانے لگا۔ پیشتر منظوم زندگی اور [illegible] کی

چھوٹی چھوٹی گتھیوں کو ہیچ سمجھ کر نظر انداز کردیا جاتا تھا۔ اب یہی گتھیں مرقع ادب کا طرۂ امتیاز اور ادبیت کی روحِ رواں ہیں اور وہ قیصرِ ادب روحانیات کے پُراسرار عالم سے نکل کر مادی دنیا کی آنکھوں کو نظارۂ جمال سے خیرہ کرنے لگی ہے۔

پہلے فطرت کی محیطِ کائنات طاقتیں بیشمار دیوتاؤں کے پیکر میں رونما ہوکر خراجِ عقیدت وصول کرتی تھیں مگر اب خود فطرت ہمارے رنج وغم عیش وطرب میں برابر کی شریک ہے۔ مقصدِ حیات کی تکمیل کے لئے مادی و روحانی دونوں پہلوؤں پر نظر رکھنا اور ان میں توازن قائم رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ اب وہ پہلی یکرنگی یکسر مفقود ہو چکی ہے یہ سب موجودہ ہندوستان کی اُن ترقی یافتہ زبانوں کی کہانی ہے جنھوں نے سنسکرت ادب کی روشنی میں مغرب کو دیکھا ہے۔ اُردو کا افسانۂ ماضی بہت کچھ مختلف ہے۔ تاہم مفروضہ عشق کی داستانیں رکیک اخلاقی مذاق بہار یہ رنگ جو عام ایرانی ذہنیت کا آئینہ ہے۔ فارسی کی اس درجہ ہمنوائی کے باوجود اردو ادب سے یہی خارج ہونے لگا ہے اور اس کی جگہ حقائقِ زندگی نے لے لی ہے۔ بیلینیہ اور منظریہ شاعری عام عشقیہ کلام ہی کا جزو منفک ہے۔ حقیقی اور فطری شاعری اقتدائے مغرب ہی کی رہین ہے۔ اس کی ابتدا کیا اور کن حالات میں ہوئی یہ ایک جداگانہ بحث ہے اور ایک دوسری صحبت کا محتاج ہے۔

ہمارے ملکی ادب میں حب الوطنی اور قوم پرستی کا عنصر یکسر عنقا تھا۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ہندوستانیوں کا اس وقت تک غیر ملکی حکومت سے کچھ واسطہ نہ پڑا تھا۔ البتہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں راجپوتانہ کے بھاٹوں نے اس طرف توجہ مبذول کی۔ مگر وہ رجز خوانی کے جوش میں معیارِ فن سے بیگانہ ہو گئے۔ یہ کوششیں اول تو محض وقتی اور مقامی تھیں، دوسرے فوری ہنگاموں سے متاثر ہوکر روا روی کے عالم میں ظہور پذیر ہونے کے باعث ادبیت سے بے رنگ تھیں اس لئے مستقل ادب میں جگہ نہ پا سکیں۔ ہاں اکبر کے عہد میں گوسوامی تلسی داس نے اس رنگ کو اپنے زورِ قلم سے چمکانے کی کوشش کی۔ مگر اکبر کی رواداری نے بہت جلد لوگوں کو اس طرف سے بے نیاز کردیا۔ اس کے بعد دکن کے بعض سنت شاعروں نے تلسی داس کے نقشِ قدم پر چلنے کا بیڑا اٹھایا۔ لیکن اُن کی زبان عام ملکی زبان نہ تھی اور اُن کی مساعی ایک مخصوص طبقہ کے لئے محدود تھیں، اس لئے عالمگیر انقلاب برپا کرنے سے قاصر رہیں۔ پھر بھی ان کے مذہبی اثر سے مرہٹوں کو غیر معمولی عروج حاصل ہوا۔

انگریزوں کے عہدِ حکومت میں بہت جلد لوگوں کو اپنی آزادی کھو بیٹھنے کا احساس ہونے لگا اور چپے چپے سے آزادی و انقلاب کی صدائیں بلند ہونے لگیں، اور لوگوں کے ذہن وطنیت کے تصورات سے آشنا ہونے لگے۔ سب سے پہلے بنکم چندر نے بنگالی میں "بندے ماترم" ذاتی قومی گیت لکھ کر ملک کو چونکا دیا

پیش کیا۔ اس کے ترجمے اُردو، ہندی اور انگریزی وغیرہ تمام ملکی زبانوں میں ہوئے۔ اس کے علاوہ بہت سی آزاد کوششیں بھی ہوئیں۔ بنکم کی وفات کے بعد تو قومی ادب کی باڑھ سی آگئی۔ اُردو میں قومی شاعری کی ابتدا سرور جہان آبادی سے ہوئی۔ چکبست اور اقبال نے انھیں کا تتبع کیا۔ جوش اس رنگ میں اپنی مجاہدانہ روش کی بدولت متقدمین اور بیشمار معاصرین سب سے بڑھ گئے۔ قومی افسانوں کی پہل پریم چند سے ہوئی، اور ناٹکوں کی طرح نیّر با صاحب کے آزادی نامی ناٹک نے ڈالی جو ایک بنگالی ڈرامہ کا ترجمہ تھا۔

رفتہ رفتہ پیٹریالیٹی اور قومیت کی اہمیت کم ہوتی گئی، اور آزاد خیالی کے ساتھ انسانی ہمدردی کے جذبہ کو فروغ ہوا۔ عام سیاسی بیداری کے زیر اثر خواتین بھی پردہ سے نکلکر دنیائے ادب میں مردوں کے دوش بدوش اشہب قلم کو جولان کرنے لگیں۔ تارا، سروجنی، سیتا، شانتا، نرائنا، اُما، مہادیوی اور سُبھدرا دیوی وغیرہ ایسی نامور ہستیاں ہیں جن پر مادر وطن کو جس قدر ناز ہو کم ہے۔ اس سے ہمارا ملکی ادب سطوات کے زاویۂ نگاہ کا بھی آئینہ دار بن گیا ہے۔

ادبی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ نقد و نظر کی صلاحیتیں بھی بڑھتی گئیں۔ سنسکرت میں شرتیوں کے عہد ہی سے تنقیدی مضامین لکھے جانے لگے تھے۔ جو نبندھ ( ) کہلاتے تھے۔ مگر ان کا مقصد صرف کتب مقدسہ کے معانی و مطالب کی توضیح کرنا تھا۔ ادبی و فنی باریکیوں سے انھیں کچھ سروکار نہ تھا۔ ہاں آگے چل کر اس صنف ادب میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔ اور نہایت وسیع اور جامع کتابیں لکھی گئیں۔ ساہتیہ درپن، چتر، گلشن شلپ رتن اور بھرت منیلہ شاستر وغیرہ اسی قبیل سے ہیں لیکن چونکہ سنسکرت ادب النکار شاستر کا مقلد تھا اس لئے جدید ادبی نقطۂ نگاہ سے ان کی اہمیت و وقعت معرض زوال میں آگئی۔ اور سب سے پہلے ناٹکوں کے ذریعہ ان سے انحراف کیا گیا۔ وہ پہلا مرد میدان جس نے ساہتیہ درپن کے خلاف علم بغاوت بلند کیا بدھو سودن دت ہے۔ اس کے تقریباً تمام ناٹک مغربی انداز کے ہیں۔ ہندی میں رام چندر ورما اور اُردو میں طالب بنارسی کو یہ فخر حاصل ہے۔ اُردو میں ابھی فن تنقید کی صرف بنیاد پڑی ہے، تاہم محاسن ادب کو مغربی ڈھنگ پر ہر پہلو سے اُجاگر کرنے کی کوشش کی جانے لگی ہے۔ جدید تنقید کا مقصد ظاہری حسن کو نظر انداز کرکے باطنی خوبصورتی کو بے نقاب کرنا ہے۔

ہندوستانی ادب شروع ہی سے مذہب کا پابند ہے۔ یہاں تمام فنون لطیفہ کی ابتدا اسی کے آغوش میں ہوئی ہے۔ پُران، رامائن، مہابھارت، رام ناٹک، دنیا کی بہترین نظم گیتا، مصنفۂ ویاس، چنڈی مصنفہ گوپی کنکن، مانس منگل اور آنند منگل مصنفۂ بھارت چندر وغیرہ خالص مذہبی تصانیف کہی جا سکتی ہیں۔ ان سب کے رنگ ڈھنگ میں اس قدر یکسانیت و مشابہت ہے کہ شکل ہی سے تمیز ہو سکتی ہے

[illegible] افسانوں کے بجائے دیوتاؤں کے مجسمے دکھائی دیتے ہیں۔ کردار نگاری یا تو سرے سے [illegible]
یا کہیں کہیں صرف ضمنی طور سے اس کی جھلک عود کر آئی ہے۔ اس ضمن میں اُردو کی زبوں حالی [illegible]
ہے، مگر اب ان داغوں کو دھویا جا رہا ہے۔

مغرب کا سب سے بڑا عطیہ ناول اور افسانہ ہیں، اور یہی وہ چیزیں ہیں جو مغرب نے ہم سے سب
زیادہ مستعار لی ہیں۔ لیکن مغربی افسانے قدیم محیر العقول داستانوں اور عامۃ الناس کے محبوب [illegible]
سے مختلف ہیں، افسانوں کی طرح اصناف شعر بھی مغربی تاثرات سے بے بہرہ نہیں ہیں۔ چنانچہ سانیٹ
کی نظم (جو مغرب نے کبھی سنسکرت سے مستعار لی تھی) مسلسل نظمیں اور نوحے وغیرہ اردو میں انگریزی [illegible]
کی نقل ہیں۔

موجودہ دور کے افسانوں پر ہیوگو، ڈیوما، اسکاٹ، ریڈرائڈز، بلیک، ویلز، اوپن ہیم، ترجنیف [illegible]
گورکی اور ٹالسٹائی وغیرہ کی گہری چھاپ موجود ہے۔ ہمارا افسانوی ادب روسی مصنفین کا بہت زیادہ [illegible]
احسان ہے۔ افسانوں کے علاوہ تمام نثری ادب مثلاً طنز و مزاح، خاکوں، مکالموں، مقالوں اور چلتے [illegible]
فقروں وغیرہ کی نشو و نما مغرب ہی کی رہین ہے۔ اس سے پیشتر کا نثری ادب محض نقالی اور آورد کا [illegible]
اُردو کی تمام ابتدائی داستانیں بازاری عشق و ہوس اور گندگی و عریانی کا حیاسوز مرقع ہیں۔

ہند قدیم کی تمام رومانی داستانیں، قیود و رسوم کی پابند تھیں۔ ان کی ہیروئنیں رادھا کی طرح
مقدس آسمانی مخلوق تھیں۔ وہ شرت ٹیگور، بھرت چندر کی ودیا سندر، کنھیا لال، منشی پریم چند اور [illegible]
جوشی کی ہیروئنوں کی طرح اس دنیا کی دیویاں نہ تھیں۔ ان اوپر والیوں کے عشق و محبت کو روحانیت
کے دوسرے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس اندھے عشق میں روحوں کے امتزاج و اتصال کی [illegible]
نام کو بھی نہ تھی۔ یا محض ہجر و وصال کا رونا تھا۔ رام پرشاد جیسے بنگالی مصنفین کے نزدیک محبت [illegible]
مہربادری ہی سے عبارت ہے۔ البتہ شری دھر کتھک، رام لبسوا اور مدھو بابو کے گیتوں میں خال خال
کی حقیقی جھلک نظر آ جاتی تھی۔ والمیک، میراں، سور داس، اور تلسی وغیرہ کے نزدیک معبود حقیقی
حضور میں اظہار عقیدت ہی کا نام عشق تھا۔ ہاں بھاس اور کالیداس کی طرح بیچ بجا شاکے شعرا
حقیقی عشق کے بعض بے نظیر مرقعے اُتارے ہیں مگر ایسی درخشاں مثالیں بہت کم ہیں۔ اور صرف [illegible]
[illegible] تک محدود ہیں۔ ان میں ابھی ٹیگور کی سی عشق آفرینی مفقود ہے۔
[illegible]

مغرب سے ہمیں جو کچھ ملا ہے، وہ بلاشبہ انگریزی زبان ہی کی وساطت سے ہم تک پہونچا ہے۔ لیکن اگر ہندوستان میں انگریزی کو یہ عروج حاصل نہ ہوتا یا ہماری سیاسی صورت حال کچھ اور ہوتی تو بھی یہ تمام چیزیں یا تجارتی اغراض یا تبادلۂ خیالات کے تحت ہم تک پہنچ ہی جاتیں۔ اور شاید اب سے بہت پہلے کسی دوسرے رنگ میں ہم ان سے بہت زیادہ مستفید ہو چکے ہوتے جیسا کہ دنیا کے دوسرے آزاد ممالک کی مثال سے واضح و روشن ہے۔ مگر یہ ہماری سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ ہم نے اس کے لئے بہت بڑی قیمت (یعنی قومی آزادی) ادا کی ہے۔ حالانکہ ہم نے مغرب کی آزادی سلب کئے بغیر ہی سب کچھ دیدیا تھا۔

ایشا اپنشد کا پہلا منتر

(اردو میں)

(از حضرت منور لکھنوی)

سب میں خالق کا جلوہ ہے — جو کچھ ہے اس سے پیدا ہے
یہ دنیا ہے آنی جانی — اس کی ہر اک شئے ہے فانی
اس دنیا کا کون ٹھکانا — اس میں رہ کر دل نہ لگانا
لالچ کرنا ٹھیک نہیں ہے — اس پر مرنا ٹھیک نہیں ہے
دنیا میں کیا شئے اپنی ہے
دولت کس کی ہو سکتی ہے

سچی خوشی کا راز

(بھرتری ہری کا ایک خیال)

ہر سو جو شہرت پھیلی ہوئی ہے — گویا غلاظت پھیلی ہوئی ہے
نارِ سقر گو یہ سر بسر ہے — عظمت کا طالب پھر بھی بشر ہے
اعزاز جوئی یہ ناز کوشی — میری نظر میں ہے بادہ نوشی
ان تین چیزوں سے گر حذر ہو — سچی خوشی سے دائم بسر ہو

تازیانہ

(قحطِ بنگال کا ایک تاثّر)

(از حضرت روشن صدیقی)

بہت ملال ہے تجھ کو کہ سر زمین وطن
بلائے قحط و صد آفات کا نشانہ ہے
مجھے بھی غم ہے کہ آرام خلد کا مسکن
عذابِ آتشِ دوزخ کا آشیانہ ہے

غضب ہے، دورِ حوادث کہ عندلیب اسیر
قفس میں رہ کے بھی محرومِ آب و دانہ ہے
ہزار شعلۂ آلام، اور اِک دامن
عجب مرقع بے مہریٔ زمانہ ہے

اُداس، بھوک کے بنجر، برہنگی مجبور
کِدھر، یہ قافلۂ بے کسی روانہ ہے
اجل بھی کر نہ سکی، پردہ پوشی آلام
کہ بے نقاب رخِ مردۂ شبانہ ہے

نہ موت سے بھی حمایت ہوئی غریبوں کی
وہ آج کشتۂ افسونِ بزدلانہ ہے
مغائرت کی شکایت لب آشنا کیا ہو
مصیبتوں کا ہر انداز محرمانہ ہے

الٰہی شفقتِ ہمسایہ ہے کہاں روپوش
یہاں تو فاقۂ تنہا چراغ خانہ ہے

نصیبِ فاقہ کشاں زہر بھی نہیں ہے جہاں
کھلا ہوا وہیں بابِ شراب خانہ ہے
یہ بے حسی ہے کہ طغیانِ خودکشی، افسوس
یہ زندگی ہے کہ سودائے تاجرانہ ہے
یہی ہیں رحمتِ تہذیبِ نو کی تصویریں
یہی عروجِ بشر کا نگارخانہ ہے
یہی ہے قصرِ مساوات کی نئی تعمیر
یہی وہ عظمتِ انساں کا آستانہ ہے

مگر یہ تذکرۂ تلخ، ہم نشیں! بے سود،
ضمیرِ ہند تو غفلت کا آشیانہ ہے
ہزار تیز ہو نشتر زنی حقائق کی
خطیبِ قوم ہے اور خلد کا فسانہ ہے
رگوں کا خون کیا سرد، بادِ مغرب نے
سکونِ مردہ دلی زیست کا بہانہ ہے

ملے جو چشمِ بصیرت تو فاش ہے ہر راز
کھلا ہوا ورقِ گردشِ زمانہ ہے
ہوا ہے تکملۂ انتباہ بیداری
یہ قحط، ہند کی غفلت پہ تازیانہ ہے

چوتھی صدی ہجری کی عیسائی خانقاہیں

از ڈاکٹر احتشام، ایم۔ اے۔ (علیگ) پی ایچ۔ ڈی پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی

عباسی خلفا کا ابتدائی دَور علمی اعتبار سے تاریخِ تمدن کا ایک اہم باب سمجھا جاتا ہے کیونکہ اسی زمانہ میں عربوں نے ایک طرف ہندوستان اور ایران تو دوسری طرف یونان اور قدیم سامی زبانوں کے جواہر پاروں کو عربی میں منتقل کرلیا تھا۔ ترجمہ کا یہ دَور بہت زمانہ تک جاری رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مطالعہ اور تشریح کے بعد عربوں نے ان بدیسی علوم کو اپنا لیا اور پھر خود ہی موشگافیاں کرنے لگے۔ خلفاء کے دربار میں ہر مذہب و ملت کے علماء جمع ہوتے تھے اور مختلف علمی اور مذہبی مباحث پر تبادلۂ خیالات ہوا کرتا تھا۔ مذہبی رواداری کی اس سے زبردست اور کیا مثال ہوسکتی ہے کہ دسویں صدی عیسوی کا مشہور منکرِ خدا ابن الراوندی جو ابن خلکان کے قول کے مطابق ایک سو چودہ کتابوں کا مصنّف تھا اور جس کی تحریریں زیادہ تر دہریت کی حمایت میں تھیں، اُس کو نہ تو خلیفۂ وقت نے کوئی سزا دی اور نہ جلا وطن کیا۔ اگر گلیلیو (Gali ۱۵) اطالیہ کی بجائے عباسی خلفاء کے بغداد، بصرہ یا کوفہ میں پیدا ہوا ہوتا تو اس کو اپنے حیرت انگیز نظریہ کے صلہ میں حکومتِ وقت سے اذیتیں نہ پہونچتیں، بلکہ حکومت ہر ممکن طریقہ سے اُس کا دل بڑھاتی۔ الجاحظ جو خلیفۂ مامون کے زمانہ میں بحر العلوم تصور کیا جاتا تھا پہلا برہمن کا ذکر جس کشادہ پیشانی سے کرتا ہے[۱] اُس سے روحِ عصر (Zeitgeist) کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں جو علمی تحریکات جاری تھیں اُن کا اصلی نکھار تو چوتھی صدی ہجری ہی میں ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرکزی حکومت یعنی بغداد میں ضعف آچکا تھا اور سلطنتِ اسلامیہ کی بے پناہ وسعتوں میں سیاسی شورشیں بڑھ رہی تھیں۔ ایران اور افریقہ میں خودمختار ریاستیں قائم ہو رہی تھیں جو ہر اعتبار سے آزاد تھیں، اور ان میں سے بعض نام نہاد طور پر خلیفۂ بغداد کو تسلیم بھی کرتی تھیں مگر سیاسی نقطۂ نگاہ سے قطع نظر جب ہم علمی کوششوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ان میں سے ہر ریاست کو علم دوستی میں مصروف پاتے ہیں۔ ایسی علمی سرپرستی جس کی مثال تاریخ تمدن میں بہت کم ملتی ہے، اتنی کم کہ انگلیوں پر گن لیجئے۔ اسی چوتھی صدی ہجری میں جو چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستیں قائم ہوگئی تھیں ان میں سے ایک آل حمدان کی تھی۔ یہ خاندان شام پر حکومت کرتا تھا اور اس کا پایۂ تخت حلب تھا۔ سیف الدولہ

---

[۱] لبیان والتبیین، مطبوعہ قاہرہ ج ۱ ص ۹۰

اس گھرانے کی آنکھوں کا تارا ہے، کیونکہ اس فرمانروا نے مختلف علمائے روزگار کو اپنے دربار میں سمیٹ لیا تھا۔ کیا یہ بات باعث حیرت اور موجب مسرت نہیں ہے کہ ایک ہی وقت میں بے پناہ شاعر المتنبی جس نے اپنی جادو بیانی کی بنا پر نبوت کا دعویٰ کیا تھا، فن موسیقی کے آفتاب ابو الفرج الاصفہانی جس کی بیس ضخیم جلدیں گویّوں کے حالات زندگی، سازوں کی تشریح اور اُن گیتوں پر مشتمل ہیں جو سمرقند سے لیکر اسپین تک گائے جاتے تھے، فلسفی الفارابی، علم نباتات کا ماہر ابن خالویہ جو زبردست نحوی بھی تھا، فلکیات اور ریاضی کا عالم علی بن محمد الشمشاطی مصروف بحث نظر آتے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس عہد کی ادبی خصوصیات میں سب سے اہم "خانقاہی ادب" ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے عیسائی خانقاہوں سے اتنی دلچسپی کیوں ظاہر کی؟ میرے ایک فرانسیسی دوست نے دوران گفتگو میں اس خصوصیت کی وجہ یہ بتائی تھی کہ وہ مسلمان شعرا یا نثر نگار جن سے "خانقاہی ادب" مالا مال ہے شاید پہلے عیسائی رہے ہوں گے، تبدیل مذہب کے بعد بھی انھیں اپنی خانقاہوں سے دبی محبت باقی رہی ہوگی اور اس طرح یہ ادب عالم وجود میں آیا ہوگا اسی طرح تجیم کی بین الاقوامی اورینٹل کانگریس میں ایک مصری قبطی مورخ عزیز عطیہ نے بھی کچھ اسی قسم کی باتیں کہی تھیں مگر حقیقت بالکل برعکس ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ عربوں کی مذہبی رواداری سے غیر مسلم رعایا مسلمانوں سے کچھ اس طرح گھل مل گئی تھی کہ تمام ظاہری سماجی امتیازات مٹ گئے تھے۔ جہاں تک تہواروں کا تعلق ہے یہ کہنا مشکل ہے کہ کون اسلامی تھا اور کون غیر اسلامی۔ مذہبی میلوں میں بھی یہی روح کارفرما تھی، اور تو اور ۳۱۹ھ (۹۳۱ء) میں عراق کے شہر تکریت کی بے پناہ بڑھتی ہوئی آبادی کے زمانہ میں مسلمان اور عیسائی ایک ہی قبرستان میں دفن کئے جاتے تھے۔[۳]

خلفا کے عہد میں عیسائی خانقاہوں کو جو فروغ ہوا اُس کا اندازہ اس زمانہ کے ادب سے ہوتا ہے کیونکہ عربوں کے ادب اور زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عیسائی پادریوں نے دجلہ، فرات، اور نیل کے کنارے اپنی خانقاہیں بنانا شروع کیں۔ اور جو قدیم عمارتیں بوسیدہ ہو چکی تھیں ان کو نئے سرے سے تعمیر کیا۔ یہ خانقاہیں بارونق یوں ہو گئیں کہ ہر خانقاہ کے لئے سیکڑوں بیگھے اراضی حکومت کی طرف سے وقف تھی۔ عیسائیوں نے اپنے مذاق کے مطابق خانقاہ کے گرد باغ لگائے اور نفاست یہ برتی کہ ہر حجرہ کے سامنے انار، زیتون اور دوسرے پھلدار درختوں کے پودے نصب کئے، دجلہ، فرات اور نیل سے چھوٹی چھوٹی نہروں کے ذریعہ پانی لائے اور اس طرح یہ تمام عیسائی خانقاہیں رفتہ رفتہ خوشنما سیرگاہوں کے طور پر

---

[۱] ابن خالویہ کی کتاب "البعث" کا جرمن ترجمہ پروفیسر کنڈرمان Kindermann نے ۱۹۳۶ء میں لائپزگ سے شائع کیا ہے۔

[۲] اس پر ایک مقالہ انگریزی زبان میں شائع کر رہا ہوں

[۳] ابن الاثیر ج ۸ ص ۱۷۱

مشہور ہوگئیں۔ نوجوان عرب شعرا یہاں اپنے احباب کے ساتھ آتے گاتے بجاتے، زیتون اور کھجور کی چھاؤں میں بیٹھے بلاتے، آنکھیں بچاکر بھولی بھالی معصوم ننوں کو بھی دیکھ لیتے، اور پھر جو طبیعت میں گرمی پیدا ہوتی تو اپنی دھن میں شعر موزوں کرتے جاتے۔ اور چونکہ یہ دلکش خانقاہیں عراق، مصر اور شام میں بیشمار پھیلی ہوئی تھیں اس لئے ظاہر ہے کہ زندہ دل و رومان پسند شعرا کی دنیا بھی وسیع ہوگئی۔ اور جب اپنے بیتے ہوئے دنوں کو یاد کرتے تو اشتیاق سے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی اور بے اختیارانہ شعر نازل ہوتے اس طرح خانقاہی ادب کا سرمایہ کافی جمع ہوگیا، اور ادیبوں نے شعرا کے حالات میں ضمناً خانقاہوں کا بھی ذکر کردیا۔ اور ان اشعار کو بھی نقل کرتے چلے گئے جو مختلف خانقاہوں کی یاد یا تعریف میں موزوں ہوئے تھے۔

زخاؤ (Sachau) غالباً مغربی علماء میں وہ پہلا عربی داں ہے۔ جس نے ان "خانقاہی شعرا" پر خاص توجہ منعطف کی ہے[1] اس نے بڑی تحقیق اور محنت سے ان کتابوں کا پتہ لگانا شروع کیا جو عربی مصنفین نے اس موضوع پر لکھی ہیں۔ زخاؤ نے تین کتابوں کے نام گنائے ہیں جن میں خاص طور پر قابل ذکر الشابشتی کی کتاب الدیارات" ہے۔ راقم الحروف نے اس مقصد کے لئے بیسیوں کتابیں چھان ڈالیں، شکر ہے کہ یہ محنت رائگاں نہیں گئی۔ ذیل میں فہرست ملاحظہ ہو۔

نام کتاب	نام مصنف	حوالہ
(۱) کتاب الدیرہ	سری الرفا الموصلی	یاقوت۔ معجم الادبا ج ۴۔ ص ۲۲۷
(۲) کتاب الدیارات الکبیر	الشمشاطی	یاقوت معجم الادبا ج ۵۔ ص ۳۷۶
(۳) کتاب الدیارات	ابن کوجک	یاقوت۔ معجم الادبا ج ۵ ص ۱۰۹
(۴) کتاب الدیرہ	ابن رمضان النحوی	ابن ندیم (فلیوگل) ج ۱ ص ۸۴
(۵) کتاب الدیارات	علی بن محمد الشابشتی	حاجی خلیفہ ج ۳ ص ۲۶ ۵۱
(۶) کتاب الدیارات	خالدی صاحبان	یاقوت۔ معجم الادبا ج ۲ ص ۲۳
	(یہ دو بھائی تھے اور مشترکہ کتابیں لکھتے تھے)	و ج ۶ ص ۲۰۹

مذکورہ بالا کتابوں میں سے آج الشابشتی کے سوا کسی کی تصنیف موجود نہیں ہے۔ دنیا کے تمام مشہور کتب خانے ان جواہر پاروں سے خالی ہیں، اور الشابشتی کی جو کتاب باقی رہ گئی ہے اُس کا صرف ایک ہی نسخہ ہے۔ جو برلن کے شاہی کتب خانہ میں موجود ہے۔ زیر بحث اور نسخہ کی فوٹو کاپی اس وقت نظر کے سامنے ہے۔ مناسب

[1] Abhandlung d. Pr. Wissenschaft Nr. 10 Berlin 1909

معلوم ہوتا ہے کہ اس گرانمایہ قلمی نسخے سے قارئین کو متعارف کر دوں۔

۱۳۵ صفحات ۲۴ × ۱۵ ½۱۵ ز ½۹ سینٹی میٹر

کاغذ گہرا بادامی چکنا اور دبیز، ایک جلد، سیاہ رنگ، جلد کا پہلا حصہ کنارے پر ذرا پھٹا ہوا، کتاب کا نام سرورق میں درج نہیں ہے لیکن کتاب کے اختتام پر "کتاب الدیارات" مرقوم ہے۔ مصنف کا نام موجود نہیں ابتدائی اوراق غائب ہیں۔ پہلی سطر یہ ہے:۔

"الدار التی بناها الدیلمی احمد بن بویه بباب الشماسیه و موقعه احسن موقع وهو نزه کبیر (کثیر؟) البساتین والاشجار ...."

تمت:۔ "تم کتاب الدیارات بحمد الله وعونه وقوته وحسن توفیقه ووافق الفراغ منه فی لیلة صاحبها یوم الخمیس السادس عشر من شهر ربیع الآخر سنة احدی وثلاثین وستمائه۔"

یعنی کتابت ۶۳۱ھ کی ہے۔ اس کے کاتب کا نام "عبدالحلیم ابن محمد ..... الدمشقی درج ہے۔

اس کتاب میں بغداد، کوفہ، مصر وغیرہ کی پچپن ۵۵ مسیحی خانقاہوں کا ذکر ہے۔ تعمیری اعتبار سے دلکش خانقاہوں کی تشریح، گرد و پیش کے مناظر، کنواری ننوں کے احوال اور رنگا رنگ پھولوں کی تعریفیں ہیں۔ اسی ضمن میں اُن تمام ہمعصر یا گذشتہ شعراء کا نام آجاتا ہے جنھوں نے ان خانقاہوں کی تعریف میں اپنی رنگینیاں دکھائی ہیں۔ شعراء کے اشعار نقل کئے گئے ہیں اور اس طرح ان خانقاہوں کو حیات ابدی عطا کی گئی ہے۔ جن شعراء کا نام آتا ہے اُن میں زیادہ تر وہ ہیں جن کا تعلق عباسی خلفاء کے دربار سے تھا خصوصاً جو ہارون الرشید کے عہد سے لیکر المعتضد (المتوفی ۲۸۹ھ) تک پہلے پھولے یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ کوئی جغرافی کتاب نہیں ہے بلکہ انشائے لطیف اور دو مختلف مذاہب کے میل جول کا ایک رنگین مرقع ہے۔ کتاب میں کہیں کہیں الاصفہانی کی کتاب الاغانی کی جھلک آجاتی ہے فرق صرف یہ ہے کہ نہ نغماتی تعارف ہے اور نہ گویوں کے حالاتِ زندگی شامل ہیں۔[۱]

---

[۱] اس نسخہ کے کیٹلاگ آہلوارٹ (Ahlwardt) کے نزدیک اس کا مصنف ابوالفرج الاصفہانی ہے۔ غالباً اس غلطی کی وجہ حاجی خلیفہ (ج ۳ ص ۲۰۶، ۵) کا وہ مختصر اشارہ ہے۔ حاجی خلیفہ نے الاصفہانی کی تصنیفات میں کتاب الدیارات کا نام لیا ہے اور آہلوارٹ کو دوسرا دھوکا اس لئے ہوا کہ اس نسخہ میں الاصفہانی کے ہمعصر [illegible] سیف الدولہ (بادشاہ) کا بھی ذکر ہے۔ یاقوت کی جغرافی ڈکشنری سے مقابلہ کے بعد [illegible] مصنف الشابشتی تھا [illegible] مصنف ہے "الدیارات" [illegible]

ابن خلکان نے الشابشتی کے حالاتِ زندگی مختصراً دیئے ہیں اور اسے چوتھی صدی ہجری کے اخیر کا مصنف بتایا ہے۔ یہ مصر کے شاہی کتب خانہ کا لائبریرین تھا۔ ابن خلکان کے نزدیک یہ عربی نہیں بلکہ غالباً دیلمی زبان کا کوئی لفظ ہے۔ ہم نے یہ نام یعنی الشابشتی ابن مسکویہ کی تاریخ "تجارب الامم" میں متعدد بار دیلمیوں کے سلسلہ میں دیکھا ہے۔ ابن خلکان کے شبہ کی اس سے تائید ہوتی ہے۔

ان خانقاہوں کے نام بھی عجیب عجیب سے تھے، مثلاً عراق کی ایک مشہور خانقاہ کا نام تھا "دیر الکلب" یعنی کتے کی خانقاہ" الشابشتی[1] وجہ تسمیہ یہ بتاتا ہے کہ عوام میں مشہور ہے کہ جن لوگوں کو باؤلے کتے کاٹ کھاتے ہیں وہ یہاں بغرض علاج لائے جاتے ہیں، جھاڑ پھونک اور دواؤں سے اُن کا مرض جاتا رہتا۔ یہ خانقاہ آبادی سے دُور معثیا کے قریب ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھی، اردگرد فطرت کے حسین نظارے اور دفا نشیب میں انگور کی بیلیں، انار کے درخت، زعفران اور نرگس کے لہلہاتے ہرے تختے۔ یہاں سال میں ایک بار عید ہوتی تھی۔ عیسائی اور مسلمان مل جل کر دادِ عیش دیتے۔ رنگ برنگ کے کپڑے پہنتے، اور تھنھوں میں آنسوؤں کو ڈبو دیتے۔ دنیا کے عجائبات میں یاقوت نے "دیر الکلب" کو بھی گنا ہے۔

سامرہ اور بغداد کے درمیان دریائے دجلہ کے کنارے جو کھجور اور زیتون کے جھنڈ میں خانقاہ تھی، وہ کنواریوں کی خانقاہ" (دیر العذارٰی) کہلاتی تھی[2] وجہ یہ تھی کہ یہاں کی کنواری ننیں نسوانی حسن کے لئے مشہور تھیں اور اُن کی معصوم آنکھیں شعراء کو موہ لیتی تھیں۔ کرخ اور دیر السوسی کی یاد میں ایک رومانی عرب شاعر کہتا ہے:۔

"اے ساقی! بانسری اور عود کی دلدوز تانوں کے ساتھ انگور کی بیٹی (شراب) کا خون بار بار پلائے جا!

اے وہ کرخ اور دیر السوسی کی رنگین راتیں! لوٹ آ! کیونکہ یہ تو میرے لئے ایک عارضی جنت تھی"[3]

ہم جس صدی کا ذکر کر رہے ہیں اُس وقت مصر کی عالت بھی کم و بیش یہی تھی۔ اہرام کے پاس جو خانقاہ تھی وہ پکنک اور ہرن کے شکار کے لئے مشہور تھی۔ یہاں تھکے ماندے نوجوان آکر دم لیتے تھے۔ لیکن اس علاقہ کی سب سے مشہور اور بارونق خانقاہ "القُصَیر" نامی تھی۔ یہ مقطم پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھی، جہاں سے نظر اٹھاتے ہی پورا شہر نخلستان اور گرے پڑے ویرانے سمٹے سے نظر آتے تھے۔ مصر کے بادشاہ ابن خمارویہ نے اس خانقاہ کے برابر ایک منارہ بنوا دیا تھا جس کے چاروں طرف چار محرابی کھڑکیاں تھیں، اسی عہد

---

[1] ص ۱۳۲
[2] معجم البلدان ج ۲ ص ۶۳۹
[3] الشابشتی ص ۳۴
[4] الاصفہانی کتاب الاغانی مطبوعہ مصر ۱۹۲۳ء ص ۱۸۴

کا ایک شاعر کہتا ہے :-

"میں نے جانے کتنی راتیں اور کتنے دن خانقاہ القصیر میں گذارے ہیں اس صورت میں کہ نشہ میں فیل تھا": لہ

بہار کی نکھری ہوئی حسین راتوں میں مسلمان اور عیسائی نوجوان اپنی اپنی کشتیوں کو ہاروں قندیلوں اور آلات موسیقی سے آراستہ کرتے تھے ، وجلہ - فرات اور بہر نیل کے کنارے کنارے نغموں کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ یہ زنگارنگ شاہی برات سطح آب پر متحرک نظر آتی تھی امیر و غریب اپنی اپنی حیثیت کے مطابق سامان تفریح ساتھ لاتے ، دریا کنارے تاریخ جشن سے چند دنوں پیشتر اپنے اپنے خیمے نصب کرتے ۔ ان قومی میلوں میں ذات پات اور مذہب کی کوئی تمیز نہ تھی ، ایک مشترکہ تمدن کا مشترکہ تصور حیات نت نئے جلوے دکھاتا رہا ۔

غزل

(حضرت بیتاب بریلوی)

اب کہاں تک میں غم عالم ایجاد کروں
کیوں نہ ہستی ہی کے اسباب کو برباد کروں

ہوش میں آؤں تو آئے غم فردا کی بساط
وجد آ جائے تو دنیا نئی آباد کروں

حامل سوز نہاں نالہ رسا گیر نہیں
کیوں لب زخم کو شرمندۂ فریاد کروں

گو بضاعت نہیں دل میں ہے مگر درد آشنا
جان بھی پیشکش خاطر ناشاد کروں

کر دیا بے حسی مرگ نے اتنا مجبور
اور کچھ ہو کہ نہ ہو شکوۂ صیاد کروں

کچھ اسی شکل سے ہو امن و اماں کی صورت
دل کو میں اور ابھی خوگر بیداد کروں

پھر خزاں لوٹ رہی ہے ورق خندۂ گل
خاک اے برق تجلی میں تجھے یاد کروں

اور اک بار سہی حسرت بربادی دل
پھر تمناؤں کے ویرانے کو آباد کروں

لہ Mez: Renaissance des I ... Ms. P. 395

جذباتِ اثرؔ

(از حضرت اثر لکھنوی)

تیرے ہاتھوں تجھے مٹانے کی
یہ بھی اِک چال ہے زمانے کی

یوں تو مرضی تری، مگر ظالم
انتہا ہو گئی ستانے کی

ہے وہی سجدہ جس میں شامل ہوں
رفعتیں بھی اُس آستانے کی

فکر لازم تھی عیش کے جویا
زندگی کو حسیں بنانے کی

جیسے کچھ کہتے کہتے شرمایا
ہائے رے دلبری بہانے کی

اُٹھ، کہ ہے وقت مائلِ پرواز
نہیں اِک سانس جا کے آنے کی

تم اثرؔ اپنی وضع کیوں چھوڑو
رسم جو کچھ بھی ہو زمانے کی

گلِ مزار

(از حضرت جوہر بدایونی)

آوارۂ وطن ہوں دنیا سے بے خبر ہوں
میں آہِ آتشیں کا بجھتا ہوا شرر ہوں
آغوشِ بیکسی میں دامن کشِ نظر ہوں
دھندلا سا اک دیا میں اُجڑے مزار پر ہوں
شانِ ادائے فطرت مجھ پر مچل رہی ہے
فرقت نصیب گل کی دُنیا بدل رہی ہے

لایا ہے کوئی مجھ کو سوتا ہوا چمن سے
گہوارۂ وطن سے پھولوں کی انجمن سے
پھکتا ہے جسم میرا سوزِ غمِ وطن سے
شعلے نکل رہے ہیں رہ رہ کے جان و تن سے
بُلبل کی نغمہ سنجی لوری سُنا رہی تھی
موجِ نسیم مجھ کو جھولا جُھلا رہی تھی

اے نازشِ چمن، او موجِ بہارِ گلشن
اے پیکِ صبحِ صادق او گلعذارِ گلشن
آغوش میں اجل کی اک سوگوارِ گلشن
روتا ہے زندگی کو ناسازگارِ گلشن
ناکامِ آرزو کی حسرت نکالتی جا
دامن پہ بیکسی کے، آ، اوس ڈالتی جا

ہے ہے کدھر گئی وہ گلشن کی زندگانی
وہ ہمسنوں کی صحبت وہ بزمِ کامرانی
راحتِ مشامِ جاں وہ کافر ادا جوانی
دو دن کی چاندنی تھی دُنیا کا حسنِ فانی
نیرنگیاں فلک کی ہوشِ نظر سے پوچھو
صدمے غمِ وطن کے میرے جگر سے پوچھو

سارجنٹ اسکیم

(از رائٹ آنریبل ڈاکٹر ایم - آر جیکار - مترجمہ محمد یعقوب خاں صاحب کلام - بی - اے)

(۱)

ڈاکٹر سارجنٹ نے ہندوستان میں توسیع تعلیم کے لئے جو اسکیم تیار کی ہے اُس سے کسی معجزہ کی امید رکھنا غلط ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسکیم مذکور میں جو مقاصد، حصولِ مقاصد کے طریقے اور امکانات بیان کئے گئے ہیں، وہ بہت ہی معمولی ہیں۔ اسکیم کا سب سے بڑا اور خاص مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر لڑکے اور لڑکی کو "بنیادی تعلیم" مل جائے اور جن لوگوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی زیادہ صلاحیت ہے، انھیں علمی یا فنی درسگاہوں میں تکمیل کرنے کے لئے مناسب مواقع دئے جائیں۔ وظائف اور مفت تعلیم کا ایک خاص نظام ہوگا جس کے ماتحت اعلیٰ تعلیم غریبوں کی دسترس سے باہر نہیں رہیگی۔ اس اسکیم کے پورے طور سے قائم ہونے کیلئے چالیس برس کا عرصہ درکار ہے۔ اس دوران میں صرف برطانوی ہند میں تین ارب ۱۲ کروڑ روپیہ سالانہ خرچ ہوگا جس میں سے دو ارب ۷۰ کروڑ روپیہ حکومت کو ادا کرنا پڑیگا۔ بمقابلہ اس رقم کے ۱۹۴۰ء میں تعلیم پر فقط تیس کروڑ روپیہ خرچ ہوا تھا جس میں سے ساڑھے سترہ کروڑ روپیہ سرکاری خزانہ سے دیا گیا تھا۔ حساب لگایا گیا ہے کہ اگر تمام برطانوی ہند میں ابتدائی تعلیم عام کر دی جائے تو پانچ کروڑ بیس لاکھ بچوں کو تعلیم دینے کیلئے اٹھارہ لاکھ استادوں اور استانیوں کی ضرورت پڑیگی اور اسکا خرچ دو ارب روپیہ سالانہ ہوگا۔ استانیوں کی تعداد میں خاص طور پر بہت اضافہ ہوگا جن کے لئے تعلیم و تربیت کا کم سے کم معیار، بھرتی کرنیکی شرطیں اور قاعدے اور خدمت کے شرائط ہر جگہ عام ہونگے۔

الغرض ڈاکٹر سارجنٹ کی تعلیمی اسکیم کا یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے جو ہماری محدود نظروں میں تو عظیم الشان معلوم ہوتا ہے لیکن برطانیہ کی تعمیر بعد از جنگ کی اسکیم کے مقابلہ میں بہت ہی حقیر ہے جسکو حکومت نے چند روز ہوئے اپنے وائٹ پیپر میں شائع کیا تھا اور جسے پارلیمنٹ منظور بھی کر چکی ہے۔ ایک ممتاز و معتبر انگریزی اخبار میں اس اسکیم کا خلاصہ حسب ذیل دیا گیا تھا۔

"پندرہ برس کی عمر تک تمام بچے اسکول میں رہیں گے۔ گیارہ سال کی عمر تک تمام بچوں کیلئے ابتدائی مدارس قائم کئے جائیں گے۔ گیارہ سال سے زیادہ عمر کے بچوں کیلئے تعلیم ثانوی کے مدرسے قائم کئے جائیں گے۔ شیر خوار بچوں کی تعلیم و تربیت کیلئے حسب ضرورت نرسری اسکول قائم کئے جائیں گے۔ ۱۸ سال کی عمر تک کام کے اوقات میں کچھ تھوڑا سا جبریہ تعلیم دیا جایا کریگی۔ بالغوں کیلئے ترقی یافتہ فنی تعلیم جاری کیا جائیگی۔ بچوں کی صحت و تندرستی کیلئے مزید سہولتیں

---

[1] De Sargent [2] Basic [3] Technical [4] White paper [5] Primary
[6] Secondary [7] Nurseries.

بہم پہونچائی جائینگی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ اعلیٰ قسم کے تربیت یافتہ مدرس ملازم رکھے جائیں گے۔

اس کی تشریح مشہور عالم دینیات اور ماہر تعلیمات ڈاکٹر ٹیمپل[1] نے اس طرح کی ہے کہ برطانوی اسکیم ایک طرف تو افراد کی مخصوص صلاحیتوں اور رجحانات کو نشو ونما و ترقی دینے کی بہترین کوشش کریگی اور دوسری طرف ایسی فضاو ماحول میں تربیت دی جائیگی جن سے اس امر کی بہترین اُمید پیدا ہوگی کہ جب افراد کے خداداد وجاہت و خصوصیات مندرجہ بالا طریقہ پر نشو ونما و ترقی پا چکیں تو ان سے بہترین پبلک خدمات حاصل کی جاسکیں۔ اسکے علاوہ برطانوی اسکیم کے ماتحت تعلیمی امکانات کے وہ اختلافات باقی نہیں رہیں گے جو مختلف طبقات میں پائے جاتے ہیں اور جن کے باعث برطانیہ کی قومی زندگی کے برادرانہ تعلقات میں افتراق پیدا ہوتا ہے

مصارف کے اعتبار سے اس جدید برطانوی اسکیم پر سات کروڑ پاؤنڈ سالانہ سے زیادہ خرچ آئیگا، اور حکومت برطانیہ اس مزید خرچ کو بخوشی خاطر برداشت کرنے کو تیار ہے۔ جب برطانوی قوم جس کی تعداد صرف چار کروڑ نفوس ہے، اتنے تعلیمی مصارف برداشت کرنے کو آمادہ ہے تو پھر ہندوستان جس کی آبادی چالیس کروڑ ہے اور جسکے وسائل دولت ہنوز سربمہر ہیں اپنی تعلیم کا بار برداشت کرنے پر کیوں نہ آمادہ ہو؟ اگر ہندوستان کے تمام سربمہر وسائل و ذرائع آمدنی سے دانشمندانہ طور پر کام لیا جائے تو یہ تعلیمی مصارف اس کے بوتہ سے ہرگز باہر نہیں ہیں۔

(۳)

جہاں تک یونیورسٹیوں کا تعلق ہے، وہ اس امر کی دل و جان سے خواہشمند ہیں کہ ہندوستان کی قومی تعلیم جلد اور سرگرمی کے ساتھ ترقی کرے کیونکہ ایک طرف تو اُن کامیاب طلبا و طالبات کے لئے جو یونیورسٹیوں سے اسناد تکمیل و فضلیت حاصل کرکے نکلیں گے، روزگار کا بہت وسیع میدان کھل جائیگا اور دوسری طرف تعلیم کا نصب العین ترقی کی ٹھوس بنیادوں پر قائم ہوجائیگا۔ اور تیسری طرف خود یونیورسٹیوں کو اتنی آزادی مل جائیگی کہ آج تک نصیب نہیں ہوئی تھی۔ پس یونیورسٹیوں کو اس بات کا خیال رکھنا لازم ہے کہ ڈاکٹر سارجنٹ کی مرتبکردہ اسکیم کا بھی کہیں وہی حشر نہ ہو جو اس سے قبل دوسری اسکیموں کا ہو چکا ہے یعنی کہیں یہ بھی سکریٹریٹ کی وسیع الماریوں میں زندہ درگور نہ ہوجائے۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ متحد ہوکر مجوزہ اسکیم کو جاری کرائیں اور پوری سرگرمی و توقعات کے ساتھ اسکی تکمیل کریں۔ نظام تعلیم کی از سر نو تعمیر و تنظیم کی ہندوستان میں ایک عرصہ سے ضرورت ہے

چین کو دیکھیے کہ باوجودیکہ وہ ایک منگول[2] ملک ہے جسے سوشل خدمات میں پسماندہ سمجھا جاتا ہے۔ وہاں جنگ کی حالت میں بھی قومی تعلیم کا گلا گھونٹ نہیں دیا گیا۔ اور اگرچہ چین بمقابلہ ہندوستان کے جنگ کی مصیبت میں بہت زیادہ مبتلا ہے پھر بھی وہ اپنی طاقت اور اپنے وسائل اپنے تعلیمی نظام کی نشو ونما و باز تعمیر میں زیادہ صرف کر رہا ہے

---

[1] Dr. Temple
[2] Mongol

چین کے مجوزہ آئین کی ایک دفعہ کی رو سے مرکزی بجٹ کا کم سے کم پندرہ فیصدی حصہ اور صوبہ یا ضلع یا میونسپل بجٹ کا کم سے کم تیس فیصدی حصہ تعلیم کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے۔ گویا مشرق و مغرب یعنی چین و برطانیہ، جو دونوں جنگ میں مبتلا ہیں، اپنی بعد از جنگ تعمیری اسکیم میں اپنے بچوں کی تعلیم کا خیال سب سے زیادہ رکھکر اپنی خوشگوار حقائق بینی کا ثبوت پیش کر رہے ہیں

پس اگرچہ جنگ جاری ہے تو بھی لیکن ماہرین فن کو مستقبل کی تعلیم کا بندوبست فوراً شروع کر دینا چاہیئے۔ یہ کام آسان نہیں اس کے لئے کافی وقت چاہیئے۔ لہذا اگر یہ کام ابھی سے شروع نہیں کیا جائیگا اور اگر ہم اپنا تمام نظام تعلیم ابھی سے مرتب نہیں کریں گے تو جنگ کے ختم ہونے کے وقت ہم خود کو غیر تیار پائیں گے۔ اس کے علاوہ جنگ کے بعد پبلک کی توجہ ایسے بہت سے سیاسی و اقتصادی مسائل کی طرف منعطف ہو جائیگی کہ تعلیم کی طرف کوئی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیگا۔

اب سوال یہ ہے کہ قومی تعلیم کے نقشہ جات مرتب کرنے میں یونیورسٹیاں ہماری بہترین مدد کیونکر کر سکتی ہیں؟ یہ تو ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ ہمارے جیسے ملک میں قومی تعلیم کا نظام جب ہی کامیاب ہو سکتا ہے جب وہ بعض خصوصیات کا حامل ہو۔ تھوڑے سے غور و خوض کے بعد ان خصوصیات کی حسب ذیل تشریح کی جا سکتی ہے:۔

۱۔ نظام تعلیم کی بنیاد تمام قوم کی حقیقی ضروریات پر، صدرجہ کا لحاظ رکھتے ہوئے ہونی چاہیئے تاکہ ہر مرد، ہر عورت اور ہر بچہ کے لئے اپنی شخصیت کو بدرجۂ اتم نشو و نما دینے اور پوری طبعی عمر تک زندہ رہنے کا موقع حاصل ہو۔

۲۔ اس کے اغراض و مقاصد، طور و طریق اور معیار عمل کا قوم کی پوری زندگی کے جملہ شعبہ جات سے اور تمام قوم کی اقتصادی سماجی اور ثقافتی ضرورتوں سے تعلق ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ سماج کے مختلف طبقات نیز طبقات در طبقات سے واسطہ رکھے

۳۔ اس کو عمرانیت کے جدید نظریہ پر مبنی ہونا چاہیئے، جس کی ضروریات کا نقشہ پورے غور و خوض کے ساتھ حکومت اور عوام کو مل جل کر مرتب کرنا چاہیئے۔ نظام تعلیم کی مضبوط بنیاد رکھنے کے لئے عمرانیت کا نظریہ ملک کے موجودہ ارتقائی حالات کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اور اس کے لئے ہمیں یہ فیصلہ کرنا پڑیگا کہ ہماری سماج کیسی ہونی چاہیئے۔ اور کس قسم کے تخیل کی تخلیق کی جائے یعنی ہم موجودہ نظام قائم رہنے دیں جس کی بنیاد رقابت اور حرص پر قائم ہے جس میں ایک شخص کا نقصان دوسرے کا فائدہ ہے۔ یا اس کے بجائے تعاونانہ یعنی امداد باہمی کی وضع کا نظام قائم کریں جس میں مختلف طبقوں کے مشترکہ مفاد کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ کام سیاست دانوں کا نہیں ہے بلکہ ان قومی مفکرین اور تعلیم کے ماہرین کا ہے جن کا تعلق ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے ہے۔ یہ کام یونیورسٹیوں کے کرنے کا ہے اور انہیں کو اس کا بیڑا اٹھانا چاہیئے۔ اگر یہ کام سیاست دانوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا تو احتمال ہے جیسا کہ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ اس مطلب کے شہری پیدا کریں گے جن کی نسبت پچھلے دنوں کسی نے "اچھے نفرت کرنے والوں اور پرجوش جھنڈا بردار" کے الفاظ استعمال کئے تھے

۴۔ اس کا مقصد جدید قسم کے نظم و نسق کرنے والوں کی تخلیق ہونا چاہیئے جو اس نئے دستور مملکت کو چلا سکیں جو جنگ کے بعد وجود میں آئیگا۔ ایسے ارباب حل و عقد کو ہندوستانی ہونا چاہیئے جنھوں نے یونیورسٹیوں میں امکانات و مواقع سے مندرجۂ ذیل طریقہ پر پورا پورا فائدہ اٹھایا ہو۔ اور جن میں نتیجۃً ایسے اوصاف و خصوصیات پیدا ہو گئے ہوں، کہ وہ اپنی ہمدردیوں کی وسعت کے باعث صحیح ہندوستانی نمایندے بن گئے ہوں یعنی جو سنجیدگی کے ساتھ سوچ سمجھکر کام کریں جن میں رواداری بدرجۂ غایت ہو جن کی غیر جانبداری میں بل نہ آسکے، اور ان خصوصیات کے ساتھ ان میں لیڈر بننے، غصہ و اشتعال کو پی جانے، اپنی رواداری و تحمل سے دوسروں کے اشتعال و غصہ کو ٹھنڈا کرنے اور مخالفین کے نقطۂ نظر کو بنظر استحسان دیکھنے پر آمادہ ہونے کے اوصاف بھی ہونے چاہیئے۔

۵۔ اس میں اسکول اور کالج کی زندگی کے ہر مرحلہ میں قومی اتحاد و امن و صلح کے جذبات کو ترقی دینے کی صلاحیت ہونا چاہیئے۔ اور اُن کے حصول کی خاطر ان کو عملی طریقہ بھی اختیار کرنا چاہیئے۔ یہ گویا ہمارے نظام تعلیم کے بہترین اغراض و مقاصد ہونگے، اور اس اتحاد و یکجہتی کو ترقی دینے میں ہمیں موجودہ جنگ سے بھی مدد ملنی چاہیئے جنگ کی قوتیں پہلے ہی سے مصروف عمل ہیں۔ اب یہ ماہرین تعلیم کا فرض ہے کہ ان سے عمدہ اور سائنٹیفک طریقہ پر کام لیں۔

(۳)

اب میں چاہتا ہوں کہ چند عملی تجاویز پیش کروں، تاکہ معلوم ہو کہ ہمارے مقاصد کی تکمیل میں ہماری یونیورسٹیاں ہمیں کس طرح مدد دے سکتی ہیں، انھیں کن امور کی تحقیقات اپنے ذمہ لینا چاہیئے اپنے طلبار کے لئے کس قسم کا ماحول اور کس قسم کی فضا پیدا کرنا چاہیئے، اور طلبار میں کس قسم کے خیالات اور مطامح نظر پیدا کرنا چاہیئے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ تعمیر بعد از جنگ کا کام پوری قوم کی جدوجہد کا کام ہے جس میں یونیورسٹیوں کو بھی حصۂ رسدی ہاتھ بٹانا چاہیئے۔ یہ پیشگوئی کرنا تو بہت آسان ہے کہ جوں جوں ہمارا قومی آزادی کا ارمان پورا ہوتا جائیگا، ہماری یونیورسٹیوں کو وہ کام ہاتھ میں لینا پڑیگا جسے امریکہ کی بعض یونیورسٹیاں بدرجۂ تکمیل پہونچا چکی ہیں، مثلاً وسکنسن یونیورسٹی نے یہ معلوم کرنے کا تجربہ کیا کہ نصاب تعلیم اور طریقۂ تدریس کے سلسلہ میں کون سی باتیں ایسی ہونا چاہیئے جو اہل امریکہ کے دل و دماغ سے بہترین مناسبت رکھیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ایک انڈر گریجویٹ کو آزاد تعلیم پانے کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔

امریکہ کی نیشنل سوسائٹی نے جس کا مقصد ملک کی تعلیم کا مطالعہ کرنا ہے، یہ دریافت کرنے کے لئے کہ کالج کی زندگی کن حالات کی حامل ہونی چاہیئے ۱۲۰ مرتبہ کوشش کی جس پر امریکہ کی تعلیمی دنیا میں ایک اچھا خاصہ تنقیدی طوفان برپا ہو گیا جس کا مقصد صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ ملکی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کس قسم کی یونیورسٹی بالکل بہترین ہو گی چنانچہ متعدد ماہرین تعلیمات کی تحقیقات و تجربات کا نچوڑ "لبرل ایجوکیشن" کی حسب ذیل تعریف ہے جو کسی حد تک ہندستان کے لئے بھی مفید ہو سکتی ہے، یہ محض ہنر کی فنی تعلیم نہیں ہے (یعنی کسی شخص کو کوئی خاص پیشہ سکھلا دیا جائے) اور نہ

فقط تدریس علوم ہی ہے۔ یہ دونوں باتیں ذرائع ہیں، مقاصدِ تعلیم نہیں ہیں، اس لئے دونوں میں خاص امتیاز رکھنا چاہیئے۔ اور ذرائع کو ہمیشہ مقاصد کے ماتحت رکھنا چاہیئے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ ان ذرائع سے جنھیں لبرل تعلیم کہا جاتا ہے طالب علم کے اندر "لبرل ذہنیت" کی تخلیق کرے اور ان قوتوں کو نشوونما دے جنھیں "فہم و ذکا" کہتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے ماہرین تعلیم کے نزدیک اس اصطلاح کا مفہوم وہ قوت ہے جو معاملات زندگی میں انسان کی رہنمائی کرے۔ ایک بڑے مشہور و معروف ماہر تعلیم[1] نے اس قوت کی یہ وضاحت کی ہے کہ یہ وہ "فہم و دانش ہے جس سے میدان عمل میں کام لیا جاسکے۔ بالفاظِ دیگر آپ نے جو کام کبھی نہ کیا ہو اُسے انجام دینے کی قابلیت ہو۔" الغرض اس قسم کی کوشش کرنا ہے کہ طالب علم کے اندر اپنے معاملات زندگی میں اپنی رہنمائی آپ کرنے کا ملکہ یا مادہ پیدا ہو جائے اس تمام جدوجہد کا انحصار اس مفروضہ پر ہے کہ اس قسم کی خاص تعلیم و تربیت کے علاوہ جیسے بینکنگ، تکمیلِ علوم متعارفہ، صنعت و حرفت، ڈاکٹری و قانون وغیرہ ایک ایسی عام لبرل تعلیم بھی ہے جو ہر فرد بشر میں اپنی زندگی کے مدارج بخوبی طے کرنے کے لئے "عقل و فہم" پیدا کر دے۔ گویا "فہم و ذکا" یا "فہم و دانش" کے معنی زندگی کی ہر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کی قابلیت' یا وہ قوت ہے جس کی مدد سے انسان ہر جگہ اور ہر قسم کے حالات میں یہ معلوم کرسکتا ہے کہ وہ ان حالات کا مقابلہ کس طرح کرسکتا ہے۔ اس قوت کے اجزا ترکیبی حسب ذیل معلوم ہوتے ہیں:۔

(۱) ہر چیز کی مناسب قدر و قیمت کا احساس، اور (۲) صورت حالات پر صحیح رائے قائم کرنے کی صلاحیت تاکہ اُس قدر و قیمت کو پوری طور سے حاصل کیا جاسکے۔

ہماری تعلیمی اسکیم کا سب سے پہلا نقص یہ ہے کہ وہ ایک تعلیمی سیڑھی کے مشابہ ہے جس کی پہلی منزل پرائمری اسکول، دوسرا قدم مڈل اسکول و ثانوی تعلیم اور آخری منزل بی، اے۔ یا ایم۔ اے کی ڈگری ہے۔ لکھو کھا طلبا داخل ہوتے ہیں، جن میں سے بہت ہی کم چوٹی تک پہونچتے ہیں۔ بلکہ بہت سے تو چوٹی کے قریب بھی نہیں پہونچتے۔ درمیانی درجوں کو محض آخری منزل تک پہونچنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور ان کی تیاری کو بذات خود کوئی اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ کثیر التعداد طلبا کو جنھیں آخری منزل تک پہونچنے کی کوئی توقع نہیں ہوتی اور جنھیں اپنی تربیت و ماحول کے باعث آخری منزل کی باتوں سے کوئی دلچسپی بھی نہیں ہوسکتی ہے، درمیانی درجوں کی تعلیم سے کوئی فائدہ نہیں پہونچتا ایسے ہی نظام تعلیم کے بارہ میں جس میں اس قدر تضیع اوقات ہوتی ہے۔ ایک امریکن ماہر تعلیم الکزینڈر میکائیل جان[2] نے کہا ہے کہ "درس و تدریس کا کام جس کی آخری منزل گریجویٹوں کا اسکول ہوتا ہے جس میں صرف چند ہزار طالب علم ہوتے ہیں سیڑھی کے نچلے ڈنڈے سے شروع ہوتا ہے یعنی پرائمری اسکول سے جس میں لکھو کھا طلبا ہوتے ہیں۔ جوں جوں طلبا اس سیڑھی پر چڑھتے جائیں گے اور جیسے جیسے تعلیم کا مرحلہ طے کرچکیں گے ہر مرحلہ پر چھنٹا [illegible] درسل سے

(۱) Alexander Maikle John. (۲) Abraham Flexner.

[illegible] جائیں گے۔ حتیٰ کہ آخر میں صرف معدودے چند منتخب اور خوش نصیب طالب علم باقی رہ جائیں گے۔ کیونکہ تعلیمی سیڑھی کے مختلف مدارج میں طلبا کی بڑی اکثریت اسکول کو چھوڑ کر عملی مشاغل میں مصروف ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک گریجویٹ اسکول کی فاضلانہ مصروفیتیں، جن تک وہ پہونچتا تو درکنار قریب بھی نہیں ہو سکیں گے قطعی لایعنی اور بے معنی ہیں۔"

اس کے بعد مصنف مذکور بعض ایسی باتیں کہتا ہے جو ہندوستان پر خاص طور سے صادق آتی ہیں۔ مثلاً وہ کہتا ہے "یاد رکھنا چاہیئے کہ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس تعلیمی سیڑھی کے ابتدائی مدارج لوگ اس غرض سے طے نہیں کرتے کہ وہ چوٹی تک پہونچ جائیں گے، بلکہ اس خیال سے طے کرتے ہیں کہ ممکن ہے کہ سیڑھی کے ادھر اُدھر کہیں اترنے کی جگہ مل جائے جہاں سے وہ دوسری سیڑھیوں کے ذریعہ سے کسی دوسری طرف اور بالکل مختلف منزل پر پہونچ جائیں، اور اگر یہ دوسری منزلیں اور سمتیں اسکول سے تعلق رکھتی ہوئی صاف نظر نہیں آتیں، تو درس و تدریس کی یہ تمام اسکیم ناقابل فہم بن جاتی ہے۔ یعنی متضاد اور غیر متعلق مشاغل کا ایک ابتر طومار۔"

الغرض ایسی تعلیمی اسکیموں کا یہ نقص ایک جزو لاینفک ہے جن میں ابتدائی اور ثانوی درجوں کی تعلیم کو درجۂ اعلیٰ کی تیاری کا سلسلہ سمجھا جاتا ہے، اور ہندوستان کے نظام تعلیم میں تو یہ نقص خاص طور پر نمایاں ہے جس کا باعث بہت سے سیاسی و سماجی نقائص ہیں جن کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔ بس اتنا ہی کہدینا کافی ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع اور مفلس ملک کے لئے جس کی آبادی چالیس کروڑ ہے، جہاں کلچر کے مدارج مختلف ہیں، جس کی اقتصادی اور حرفتی ضرورتیں مختلف ہیں۔ جہاں مختلف قسم کے سماجی خیالات اور مذہبی عقائد رائج ہیں، کوئی تعلیمی نظام مناسب و معقول نہیں ہو سکتا جبتک اس میں ان دو باتوں کا خیال نہ رکھا جائے۔ "(۱) اترنے کے لئے بہت سے مقامات پیدا کئے جائیں جہاں طالب علم مناسب طور پر اصلی تعلیمی سیڑھی کو چھوڑ کر کسی دوسری سیڑھی پر چڑھ سکے، جو دوسری سمت اور مختلف منزل کو جاتی ہو۔ اس قسم کی بہت سی درمیانی اور ضمنی سیڑھیاں خیال میں آسکتی ہیں۔ یہ سیڑھیاں سرگرمی کے کسی محدود میدان میں ہنرمندی سکھائیں گی جن میں مضمون تعلیم تو اسی قسم کا ہوگا جیسے کہ اعلیٰ تعلیمی درجہ کا لیکن جن کا مقصد یہ ہوگا کہ کوئی پیشہ یا روزگار کرنے کی عملی قابلیت پیدا کریں اور نہ یہ کہ محض عام و اعلیٰ مفہوم میں تعلیم دی جائے۔

(۲) یہ ضمنی سیڑھیاں ایک دوسرے سے وابستہ نہ ہونی چاہیئے، بلکہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہونی چاہیئے۔ ہر سیڑھی اپنے کسی خاص مقام و سمت کو جانے والی ہونی چاہیئے تاکہ طالب علم کو کسی خاص مفاد یا پیشہ کے لئے تیار کرے۔ اور چونکہ طالب علم چھوٹی ہی سی عمر میں داخل ہو جائے گا اس لئے یہ توقع نہ رکھنا چاہیئے کہ تعلیم ایسی بنیادی، دور رس اور فاضلانہ ہوگی جیسی کہ اسی شعبۂ تعلیم میں گریجویٹ ہونے کے بعد ہوتی ہے۔

الغرض اپنے نظام تعلیم کی تعمیر جدید میں ہمارا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہم غور و فکر کے ساتھ اترنے کے مناسب

مقامات اس طرح تجویز کریں کہ بڑی تعلیمی سیڑھی کے معقول مواقع پر ہوں۔ یہ بھی خیال رکھیں کہ طالب علم جو کچھ تعلیم بیشتر حاصل کر چکا ہے وہ ایسی ہونی چاہیئے کہ اس کو اترنے کی جگہ پر قیام کرنے اور دوسری سیڑھی پر چڑھنے کے قابل بنا دے، اور اسی کے ساتھ وہ اپنی سابقہ تعلیم سے پورا فائدہ اٹھا سکے۔ اپنے موجودہ نظام تعلیم میں ہم ہر شخص کو تعلیمی سیڑھی پر چڑھاتے چلے جاتے ہیں اور اس بات کا کوئی خیال نہیں رکھتے کہ طالب علم چڑھنے کے قابل بھی ہے یا نہیں ہے جو طلباء ایسے حالات سے مجبور ہو کر جو اُن کی طاقت سے باہر ہیں، سیڑھی چھوڑ دیتے ہیں، اُنھیں سیڑھی سے اُترنے کا کوئی دوسرا مقام نہیں ملتا۔ اور اس طرح وہ پوری طرح تباہ و برباد ہو جاتے اور بالکل نیچے گر پڑتے ہیں اور گرنے سے قبل جس قدر بلند وہ چڑھ گئے تھے اس سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔

ہمیں یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہیئے کہ ہندوستان کی بیشتر آبادی دیہات میں رہتی ہے، اور یہ تقریباً سات لاکھ دیہات ہونگے جو ابھی نشو و نما و ترقی کے محتاج ہیں۔ ہمیں یونیورسٹی اور دیہات کے درمیان کوئی واسطہ یا تعلق پیدا کرنا پڑے گا۔ تجربہ سے یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ غیر تعلیم یافتہ یا کم تعلیم یافتہ لوگوں سے دیہات کی تعمیر جدید نہیں ہو سکتی۔ پس یہ کام ایسے نوجوانوں کو ہاتھ میں لینا پڑیگا جو دل درد مند رکھتے ہیں، معقول تربیت حاصل کر چکے ہیں، اور جنھیں جدید طریقے معلوم ہیں۔ اس قسم کے نصاب تعلیم تجویز کرنے کا ابتدائی مقصد یہ ہوگا کہ وہ تمام ملک کی فرد فرد کی کفالت کرے۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ نہ ہو، جو اعلیٰ تعلیم کے لئے نا اہل ہوں انھیں اس سے خارج کر دیا جائے۔ جو زیادہ تعلیم حاصل کرنا چاہیں ان کے لئے کوئی کام مہیا کیا جائے۔ اور شہروں اور دیہات کے درمیان گہرا تعلق پیدا کیا جائے جو آجکل مفقود ہے، کیونکہ یونیورسٹیاں بڑے بڑے شہروں ہی میں قائم ہیں۔

تعمیر بعد از جنگ کے سلسلہ میں ایک اور اہم بات جو مدنظر رکھنا چاہیئے، وہ ہندوستان کا اتفاق و اتحاد ہے، ہمارے ملک میں بہت سی جماعتیں ہیں۔ اجتماعی جد و جہد کے مشترکہ پلیٹ فارم پر ان سب جماعتوں کے کلچروں کو مل جانا چاہیئے۔ ہمارے ملک میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں اور آجکل اس بات پر بھی جھگڑا ہو رہا ہے کہ عام اظہار خیال کا ذریعہ کون سی زبان ہونی چاہیئے۔ ان زبانوں میں ہر زبان ایک ایک طبقہ کے کلچر کی مظہر ہے۔ اس لئے ایک زبان کے بجائے دوسری زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنانا کامیاب نہیں ہوگا بلکہ برعکس اس کے اس سے ایسی منافرت پیدا ہو جائیگی جس کا فی الحال گمان بھی نہیں ہے تا وقتیکہ یونیورسٹی کی تعلیم میں اس کلچر سے معقول واقفیت نہ پیدا کی جائے جس سے وہ زبان تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا یونیورسٹی میں مطالعہ کی ایک ایسی فیکلٹی قائم کرنا ضروری ہوگا جس کا مقصد عوام کی ذہنی قومی تعمیر ہو۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ اور غالباً یہی تجربہ اس زمانہ کے ہر گریجویٹ کا ہوگا۔ مجھے بارہا محسوس ہوا ہے کہ کچھ

میں خود کو تعلیم یافتہ کہتا ہوں، لیکن مجھے ان ہندوستانیوں کے ذہنی کارناموں کی بہت کم واقفیت ہے، جو میری نسل، جماعت یا صوبے سے تعلق نہیں رکھتے۔ مثلاً مجھے اُردو کے سابق یا موجودہ شعراء کے متعلق کس قدر کم معلومات حاصل ہے، یا میں تامل زبان کے ادب کو کیا سمجھتا ہوں جس کی نفاست اور خوبیاں دُور دُور مشہور ہیں، یا میں بنگالی لٹریچر سے کتنا بے بہرہ ہوں جو حسن و خوبی کا خزانہ ہے۔ اور جسے بنکم چندر چیٹرجی، الیشور چندر دتّا ساگرا ور رابندرا ناتھ ٹیگور کے ادبی کارناموں نے مالامال کر دیا ہے۔ دُور کیوں جائیے، مجھے گجرات کے نرسے مہتہ یا گوردھن رام تریاٹھی ہی کا حال کیا معلوم ہے تلنگی میں کانفرنسیں ہوتی ہیں، مگر میں ان سے کوئی اثر نہیں لیتا۔ تامل زبان کی شاعری کانوں کو تو بھلی معلوم ہوتی ہے، مگر میری سمجھ سے باہر ہے۔ واقعی یہ کتنا ناقص نظام تعلیم ہے کہ مجھ میں وہ قوتیں بیدار نہیں ہو سکیں کہ میں ان چیزوں کو سمجھ کر لطف اندوز ہو سکوں۔ جو ہندوستان کے دوسرے حصوں میں میرے اہل وطن کو اس قدر عزیز اور پیاری ہیں۔ میں ایک اَن پڑھ شخص کی طرح ان جواہر پاروں سے قطعی ناواقف ہوں جو میرے وطن کی دوسری تاریخوں اور ادبیات میں موجود ہیں۔ سوا ان کے جو میرے محدود ماحول یا گرد و پیش میں پیدا ہوئے ہیں۔ میں اپنے ملک کے بڑے بڑے اہل دماغ سے قطعی بیگانہ ہوں اور پھر مجھے دعویٰ ہے کہ میں "ہندوستانی قوم" سے تعلق رکھتا ہوں، جو قلیل ترین مدت میں آزاد و خود مختار ہونے کی آرزو مند ہے۔

اگرچہ مذہب تفرقہ انداز ہو سکتا ہے، لیکن ہمارے لئے یہ بات ممکن ہے کہ ہم ہندوستان کی تہذیب و تمدن اور ایک دوسرے کے کلچر کا مشترکہ احترام کرنے کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع اور متحد ہو جائیں۔ سیاسیات اور کلچر میں ایک ربط ہے جو عام طور سے پہچانا نہیں جاتا۔ تاریخ میں ایسی قوموں کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جو ایسے عناصر سے وجود میں آئیں جو طبقات ترکیبی کلچروں اور تہذیبوں کو سمجھنے، بنظر استحسان دیکھنے، اور احترام کرنے کی مشترکہ کوشش کے لئے مجتمع ہوئے تھے، اسی سے وہ لیسدار جوہر پیدا ہوتا ہے جو بالآخر ان تمام طبقات ترکیبی کو آپس میں چپکا کر ایک فولادی نظام قائم کر دیتا ہے۔ پس ہماری یونیورسٹیوں کا فرض ہے کہ ہندوستان کے اندر جو اہم جماعتیں آباد ہیں ان کی تاریخ اور ان کے دماغی کارناموں سے عام واقفیت حاصل کرنے کی بنا ڈالیں۔ قدیم ہندوستان میں ایک نہایت عمدہ رسم جاری تھی، جسے مناسب ترمیم کے بعد زندہ کر کے موجودہ زمانہ میں بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس رسم کو "اَپ کرم" کہا جاتا تھا۔ یہ رسم اگرچہ بظاہر مذہبی تھی لیکن تعلیمی لحاظ سے بہت اعلیٰ درجہ کی تھی سال میں ایک مرتبہ جب تعلیمی سال شروع ہوتا تھا، کالج کے تمام طلبا ایک جگہ جمع ہو جاتے تھے، اور پرانے زمانہ کے مشہور آدمیوں کے نام لیتے تھے، اُن کے کارنامے یاد کرتے تھے اور اُن کی تعریف و توصیف کرتے تھے، اس رسم کی ادائگی سے دو فائدے تھے۔ ایک تو قوم کے پرانے سورماؤں کے حالات سے گہری واقفیت ہو جاتی تھی اور دوسرے نوجوان طلباء میں ان کے نقش قدم پر چلنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا تھا

رسم مذکورہ ادا کرنے کے بعد طالب علم اپنی سال بھر کی محنت پورے شوق اور سرگرمی کے ساتھ شروع کر دیتا تھا، اس امید کے ساتھ کہ ایک دن اپنے اعلیٰ کارناموں سے شاہیر پاستانی جیسی عزت و شہرت حاصل کر لیگا اس کے علاوہ جس شعبہ کی تعلیم وہ حاصل کرتا تھا اُس میں طالب علم کی معلومات مکمل ہو جاتی تھی ہندوستان کی تعلیم کے موضوع پر لکھنے والے ایک مشہور اہل قلم کو اس بات کا افسوس ہے کہ جدید نظام تعلیم میں اس قسم کی کوئی بات نہیں کھی گئی

لہذا میں تجویز کرتا ہوں کہ یونیورسٹی میں "انڈین کلچر کی ایک فیکلٹی قائم کی جائے جس میں ہر طالب علم کے لئے حصہ لینا لازمی ہو۔ تجربہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ ہندوستان کے اندر جو اہم جماعتیں آباد ہیں۔ ان کے کلچروں اصادیات میں بہت سی باتیں باہمی تعلق رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر مسلمانوں ہی کو لے لیجئے۔ اگرچہ آجکل کے بعض مسلمان خود کو ایک جداگانہ قوم سمجھنے لگے ہیں۔ اگرچہ صحیح النسب مسلمان پہلے پہل ہندوستان میں حملہ آور کی حیثیت سے آئے تھے، لیکن وہ ہندوستانیوں کے ساتھ رہنے لگے، خود کو اپنے گرد و پیش کے مطابق بنالیا اور گرد و پیش نے بھی اُن کو آغوش قبول میں لے لیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ ایسی مثالوں سے معمور ہے کہ اُنھوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر ثقافتی اور دیگر مشاغل اختیار کئے، اور نہایت محنت سے کام کر کے ان کی تکمیل میں قرار واقعی حصہ لیا آرٹ اور کلچر میں میل جول اور گھل مل جانے کا زبردست مادہ ہوتا ہے اور گرد و پیش میں جو یکساں باتیں پائی جاتی ہیں، ان سے خلط ملط کر لینے کا رُجحان بھی ہوتا ہے۔ قدیم ہندوستان میں میل جول کا یہ عمل آزادی کے ساتھ جاری تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ یونیورسٹی میں اس عمل کا گہرا مطالعہ کرنے کا باقاعدہ معقول رکھا جائے۔ ان طریقوں پر کاربند ہو کر ہم بالآخر ہندوستانیوں کی ایک ایسی نسل پیدا کر لیں گے جسے ایک دوسرے کے طریقۂ زندگی اور تخیل سے کامل رغبت ہوگی۔ اور اس طرح ہم اس جھگڑے کو بے اثر بنانے میں کامیاب ہو جائینگے جو سیاسی خواہشوں اور مناقشات سے اکثر پیدا ہوتا ہے۔

ہماری تعلیمی بانہ تعمیر کے ایک خاص پہلو کا تعلق اسی اہم سوال سے ہوگا کہ یونیورسٹی اپنے طلباء کو اس بات کے لئے کس طرح تیار کر رہی ہے۔ کہ وہ ملک کی اخلاقی اور سیاسی زندگی میں حصہ لیں؛ اپنے طور پر یونیورسٹی کے اغراضات بھی قابل تعریف کارنامے ہیں۔ لیکن وہ جذبۂ ایثار یا ایک دوسرے کا بار اٹھانے کی صلاحیت کی جگہ نہیں لے سکتے۔ جس کی بیرونی دنیا میں سخت ضرورت ہے، یہ وہ فرض ہے جس کی ادائگی میں ہر استاد اور ہر طالب علم کو حصہ لینا چاہیئے، وہ محبت کی اس سرچشم جماعت "کے برقرار رکھنے میں مدد بھی دے سکتے ہیں اور روڑے بھی اٹکا سکتے ہیں۔ اس جماعت سے مراد وہ انجمن احباب ہے جن کا ہر مقصد ایک دوسرے پر روشن ہوتا ہے۔

یونیورسٹی کی تعلیم کا اصلی مقصد ایک روایت کی تخلیق ہونا چاہیئے تاکہ ہر طالب علم کی کالج کی زندگی پسندیدہ یادگار باتوں کا ایک مستقل خزانہ ثابت ہو جو اس کو بیرونی زندگی کی مشقتوں میں طاقت اور خوشگواری کے ساتھ

ہمارا دوستی رہے۔ بہرحال آپ جو چاہیں کریں لیکن اس بات کا پورا پورا خیال رہے کہ جب آپ اپنی آئندہ زندگی میں اپنی کالج کی زندگی کو یاد کریں تو آپ کو اس کا احساس ہو کہ وہ دن آپ کی زندگی کے نہایت عمدہ ایام تھے جن میں آپ اپنی تمام خداداد قوتوں کو نشو و نما و ترقی دینے کی لگاتار کوشش کرتے رہے تھے۔ ایسے ایام جبکہ آپ دوسرے طلبا سے بھائی کی طرح ملتے تھے اور ایک دوسرے کی خدمت کرتے تھے، اور جبکہ آپ کے دماغ اور آپ کے کردار پہلو بہ پہلو نشو و نما پا رہے تھے، اور ہمیں وہ بات بھی فراموش نہ کر دینا چاہیئے جو آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک بہت بڑے پروفیسر نے اپنے طلبا سے کہی تھی یعنی:-

"اسکول کی زندگی سے یونیورسٹی کی زندگی میں جو تغیر و تبدل واقع ہوتا ہے وہ آپ کی زندگی بھر میں سب سے بڑا واقعہ ہے...... یونیورسٹی کے اندر ہم ایک نئی زندگی میں قدم رکھ رہے ہیں۔ ہمارے دل امیدوں اور تمناؤں سے معمور ہیں۔ اور وہ دنیا جو اب ہمارے سامنے آ رہی ہے بہت بڑی دلچسپیاں لئے ہوئے ہے۔ اور ہمارے دلوں میں ایک روحانی جذبہ کو بیدار کر رہی ہے۔ اب ہم پہلے سے زیادہ خود مختار ہیں، ہم اپنے کمروں میں بیٹھ کر اپنے دوستوں کو مدعو کرتے ہیں، ہم اپنے آقا آپ ہیں، اور جو چاہے کر سکتے ہیں...... اسکول کی محدود اور تنگ دامن تعلیم کی جگہ اب ایک جدید اور فراخ دامن طرز درس و تدریس لے لیتا ہے۔ اب ہماری کردار میں ایک ہی ٹرم کے اندر اتنی نشو و نما و ترقی ہو جاتی ہے، جتنی پہلے ایک سال میں ہوتی تھی۔ ہمیں اپنے احباب کی صحبت سے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یہاں دوستی کرنے کا ایسا عمدہ موقعہ ملتا ہے جو زندگی میں دوبارہ نہیں ملیگا۔ ہمارا انتخاب احباب اپنے کالج والوں تک محدود نہیں ہے بلکہ یکساں مشاغل اور یکساں مذاق کی وجہ سے تمام کالجوں کے نوجوان کھنچ آتے ہیں۔"

مندرجۂ بالا بیان کا اطلاق جدید ہندوستان پر بھی بخوبی ہوتا ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ یہ باتیں کسی دوسرے ملک کے لئے اتنی اہمیت نہیں رکھتیں جتنی کہ ہمارے وطن کے لیئے رکھتی ہیں، ہمارے کالج، ہماری ہمدردی، ہمارے علم اور ہماری ذکاوت کے حدود کی توسیع کے لئے خاطر خواہ حالات پیش کرتے ہیں۔ جب ذہن لچکدار اور روادار ہوتے ہیں، جب مفاہمت و مصالحت کے جذبات کثیر اور عزت و احترام کرنے کا مادہ لامحدود ہوتا ہے تو مختلف طبقوں اور جماعتوں کے چلبلے نوجوان آپس میں ملکر شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ ایسے زمانہ میں جبکہ خیالات و مطالع نظر کسی دور افتادہ پہاڑ کی دھندلی چوٹیوں کی طرح نہیں ہوتے بلکہ قریب کی روشنیوں کی طرح ہمارے تاریک ادراک اور ناقص نظر انتخاب کو بلند کرتے ہیں، ہمارے تعلقات یکایک مختلف قسم کے نوجوانوں سے ہو جاتے ہیں جن میں سے ہر فرد گو کہ مختصر پیمانہ پر، اپنی ہی قوم کی تاریخ اور ثقافت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ یہ دیکھیئے ہندو بیٹھے ہیں، جن میں بنگالی بھی ہیں، مدراسی بھی، مرہٹہ بھی ہیں، پنجابی بھی ہیں، اور بہاری بھی ہیں۔ ان میں سے ہر شخص کالج کی زندگی اور خیال کی مشترکہ برادری میں اپنے ذاتی گیان اور دھیان، اور خلوت و جلوت کے طور و طریق لیکر آیا ہے

نہیں کہہ سکتا مسلمان بیٹھے ہیں، جن کے دل میں زندگی کی سادہ اسکیم کے خیالات جاگزیں ہیں، جو نامعقول قیود و شرائط کے پابند نہیں ہیں، اور جن کے نزدیک وہ تمام باتیں انسان کے لئے جائز ہیں جن سے زندگی خوشگوار اور پُرلطف ہو سکتی ہیں۔ مسلمان کے قریب پارسی صاحب تشریف فرما ہیں جنھوں نے اپنے آباؤ اجداد کی پُرسکون ثقافت کا جدید کاروباریت سے ایسا جوڑ ملایا ہے کہ کُھل ہی نہیں سکتا۔ ان کے برابر عیسائی نوجوان ہیں جو پُرانی دُنیا کے مذہب کی تفسیر جدید تخئیل کے سانچہ میں ڈھال کر فرما رہے ہیں جسے ان کے فرقہ کے سوا کوئی دوسرا سمجھ نہیں سکتا۔ اسی قسم کی میں بہت سی دوسری مثالیں پیش کر سکتا ہوں جن سے ایک اچھی خاصی نظر فریب تصویر بن جائیگی۔ بہرحال یہ ہے وہ ماحول جو کالج کی زندگی ہم پہونچاتی ہے، اور یہ خود ہمارا قصور بلکہ بدقسمتی ہوگی، اگر ہم اپنے اندر محبت و اتحاد کا مادہ نشوونما دینے میں اس سے کام نہ لیں۔

الغرض رفتہ رفتہ ہم یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ وجوہ اختلاف کے مقابلہ میں ہمارے وجوہ تعلقات کہیں زیادہ ہیں جیسا کہ ایک بڑے پروفیسر نے کہا تھا کہ "ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ باتیں جو ہمیں ایک دوسرے سے ملاتی ہیں، ان باتوں سے زیادہ ہیں جو ہمیں جدا کرتی ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ اختلافات کوئی اہمیت نہیں رکھتے لیکن کیا اس جگہ (کالج میں) ہم اپنے مشترکہ کام کی صورت میں ان اختلافات کا کوئی عملی حل نہیں نکال سکتے؟ پھر کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اختلاف کی باتوں کو جو مصالحت و مفاہمت کی باتوں سے کم ہیں، پس پشت ڈال دیں......

کیا شر کے خلاف جہاد کرنے میں ہمارا مشترکہ مفاد نہیں ہے؛ جس سوال کا جواب ایک نوجوان کو دینا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ اُس کے مذہب و معتقدات کی صحیح نوعیت و خصوصیت کیا ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کو بہترین مصرف میں کس طرح لائیگا، وہ اپنے اخراجات کو کس ڈھنگ پر رکھے گا۔ وہ اپنی خواہشات کو کس طرح قابو میں رکھیگا۔ (تاکہ وہ بلائے بے درماں کی طرح زندگی بھر اس کے پیچھے نہ پڑی رہیں) اور بجائے نفس پرستی اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے اپنی زندگی حق و حقیقت کی تلاش میں کس طرح گذاریگا؟ کیا اپنی مشترکہ ضرورت کے لئے ہم کوئی متفقہ میدان نہیں معلوم کر سکتے؟"

کالج کی زندگی ایک ایسی سوسائٹی پیش کرتی ہے" جس میں کوئی شخص محض اپنی ذات کے لئے کوئی کام نہیں کرتا بلکہ جو کچھ کرتا ہے وہ سوسائٹی کے خادم کی حیثیت سے کرتا ہے۔" یہی وہ زندگی ہے جبکہ ہمیں سماجی اتحاد اور انفرادی خود مختاری کے بظاہر مختلف و متضاد خیالات کو ایک دوسرے سے ملانے کی تدبیر سیکھنا چاہیئے۔ اگرچہ کالج تفریق و تقسیم و نااتفاقی کے تمام جذبات کو مٹا دیتا ہے لیکن یہ نہ ہونا چاہیئے کہ وہ ہماری انفرادی زندگی کو بھی پامال یا کمزور کردے کالج جس قسم کے اتحاد کا متلاشی ہے وہ ہم خیال دماغوں کا اتحاد ہے۔ گیٹے کا قول ہے کہ ایک شخص تنہا کچھ نہیں کرسکتا لیکن وہ شخص جو صحیح موقعہ آنے پر بہت سے دوسرے شخصوں سے متحد ہو جاتا ہے کارنمایاں انجام دے سکتا ہے۔

دلی، زندگی پر بالکل چسپاں ہوتا ہے۔ کالج میں ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہم اپنی انفرادی خود مختاری اور ذمہ داری
ایک جدید حس اور ایک جدید اہمیت دیکر اپنی زندگی اور تجربہ کو مالا مال کریں۔ اگر دیکھا جائے تو اپنی تمام اہم باتوں کے
لحاظ سے یہ وہی مسئلہ ہے جس سے ہماری کالج کے باہر کی زندگی سیاسی اور سماجی دنیا میں دوچار ہوتی ہے یعنی اپنی
حکومت خود اختیاری میں ایک آزاد و خود مختار زندگی بسر کرنے کی خواہش کو اپنے ساتھیوں کے بار بوجھ میں ہاتھ بٹانے
اور ان کی مسرتوں، غموں، امیدوں اور تمناؤں میں پورا پورا حصہ لینے کی قوت ارادی سے ہم آہنگ کیا جائے۔
متعدد اجزائے ترکیبی کی انفرادی قوتوں کو پوری طرح کیونکر حرکت میں لایا جائے، کہ آپس میں مقابلہ یا ٹکر نہ ہونے
پائے، کیونکہ اگر ایسا ہوا تو وہ شخص رفیق کار بننے کے بجائے دشمن بن جائیں گے

یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ خدا وہ دن نہ لائے کہ اتحاد و انضباط کے نام سے ہم کسی ایسے نظام کی پیروی
کرنے لگیں جو جرمن نظام کے مطابق ہو۔ ایک انگریز نے جو ایک جرمن تعلیم گاہ میں تین سال تک تعلیم دے چکا ہے
جرمن نظام کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے: "حکام کو اسکولوں میں بھیجا جاتا ہے جو آکر کلاسوں میں گھس جاتے ہیں
وہاں طلباء کے سامنے مدرس سے جرح کرتے ہیں اور اگر ضرورت سمجھتے ہیں تو اسے فوراً گرفتار کر لیتے ہیں .....
مذہبی تعلیم میں زیادہ تر ہٹلر کے متعلق گفتگو ہوتی ہے یا جرمنی کے جاہ و جلال پر۔ ہٹلر مسیح ثانی ہے مگر مسیح اول سے
بڑا سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ہٹلر کے خلاف صرف ایک ہی سلطنت نہیں ہے بلکہ دنیا بھر اس کی مخالف ہے۔ جرمنی میں فرد
کوئی حیثیت نہیں رکھتا جو کچھ ہے وہ ریاست ہے۔ چنانچہ زیر تعلیم ہر مضمون کا مقصد ریاست ہی کی طرف راجع ہونا
چاہیئے۔ آرٹ کا فرض یہ ہے کہ وہ عوام میں حب وطن کی آگ بھڑکا دے۔ لٹریچر کو بھی خالص وطنی ہونا چاہیئے۔ جو
کتابیں امن و صلح اور بین الاقوامی مفاہمت و مصالحت سے تعلق رکھتی ہیں وہ پرائیویٹ لوگوں کو رکھنی ممنوع
ہیں..... ہر ہفتہ بچوں کو ایک وطنی سبق دیا جاتا ہے جس کا تعلق عہد نامۂ وارسائی، اتحادیوں کے جرائم، یہودیوں
کمیونسٹوں اور ایسے بڑے بڑے جرمن مشاہیر سے نہیں ہوتا ہے جن میں گیٹے، باخ۔ کانٹ کا شمار نہیں بلکہ فریڈرک
اعظم اور بسمارک سے متعلق ہوتا ہے۔ درجہ میں مذہب سے مراد نیشنلزم ہے مدرس اپنے طلباء سے اس قسم کے
سوالات کرتا ہے جن کے اندر جواب کی طرف اشارہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ مثلاً موجودہ زمانہ میں کون ایسا شخص ہے جو اپنی
قربانیوں اور اپنی قوم کی محبت سے مسیح کی زبردست یاد دلاتا ہے؟"

اس کا جواب دیا جاتا ہے "ہر ہٹلر" کون شخص اپنی وفاداری اور پابندی انضباط سے ہم کو حواریین کی یاد
دلاتے ہیں؟" اس کا جواب ہوتا ہے "جنرل گورنگ، ڈاکٹر گوئبلز اور کپتان روہم۔" اسکول میں صبح کی پرارتھنا
(دعا) اس طرح شروع ہوتی ہے:۔

"خداوندا! ہم جرمن بچے تیرے چہرے کے سامنے سے گذر رہے ہیں، اس امر کی التجا کرتے ہوئے کہ تو ہمیں

بھی ایسا ہی بنادے جیسے ہمارے آبا و اجداد تھے۔ تو ہمیں اوائل عمر میں پاک دل اور طاقتور ہاتھ عطا فرما، ہمارے آبائی وطن کی حفاظت کر، یہ سرزمین جو دنیا میں سب سے زیادہ صاحب جلال و جبروت ہے، اسے آزاد اور متحد رکھ۔ یہ ہمیشہ پھلے، اپنا سر افتخار بلند رکھے اور طاقتور رہے، اور تو اپنے طاقتور ہاتھوں سے ہمارے صاحب عظمت و جری چانسلر اور رائش کے پریسیڈنٹ کی حفاظت کر۔ تو ہمارے لیڈروں کو برکت دے۔ آمین!

میں نے یہ کافی لمبا چوڑا اقتباس اس غرض سے دیا ہے کہ پارٹی گورنمنٹ کے آئندہ امکانات کو دیکھتے ہوئے ہمیں ہوشیار رہنا چاہیے۔ تاکہ "وطن پرستی" کے اس جذبہ کے زیر اثر ہو کر ہم اپنے نظام تعلیم کی اصلاح کر کے اسے عوام میں رائج کریں ہم اپنے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی دماغی جمہوریت میں خلل انداز نہ ہوں۔ یہ بات یاد رکھنا قرین دانشمندی ہے کہ عقل انسانی کا آزاد ترین استعمال ایک جمہوری حکومت کا صحیح معیار ہے لیکن ایک آمرانہ ریاست میں ایسا نہیں ہوتا۔ ان دونوں نظامہائے حکومت کے تعلیمی آدرشوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ایک کا مقصد غلامانہ فرمانبرداری کی حوصلہ افزائی ہوتا ہے اور دوسری کا آزادی کو ترقی دینا۔ ایسی فرمانبرداری کو ترجیح دینا غلط ہوگا جس کا مقصد ایسے شہری پیدا کرنا ہے جو سیاسی خیالات کو اشاعت دینے میں کارآمد ہوں۔ ایسے شہریوں کی حیثیت محض مشین کے ایک پہیہ کی سی ہوتی ہے۔ جمہوری ریاست جسے قائم کرنے کا ہم دعویٰ کر رہے ہیں، اس امر کی متقاضی ہے کہ اس کے شہری ایک جدید نظام قائم کرنے میں محرک قوتیں ثابت ہوں۔ خیال و عمل میں باغیانہ جرأت اس کی ضرب المثل ہونا چاہیے۔ البتہ شک و شبہ کر کے، حق و صداقت کی تحقیق کرنا اور مسلسل تحقیقات اس جمہوریت کا مطمح نظر ہوگا جو وہ اپنے نوجوانوں کے سامنے پیش کرے گی۔ کارلائل کا قول ہے کہ: "مفکر آدمی ظلمت کی قوتوں (شیطان یا اہرمن) کا بدترین دشمن ہوتا ہے" اور یہی بات تمام شخصی حکومتوں پر صادق آتی ہے، خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی، خواہ ان کے رخ پر جمہوریت کا نقاب ہی کیوں نہ ہو۔ ہم کو لازم ہے کہ مستقبل کے نظام تعلیم میں جو مستقبل کے شہریوں کا گہوارہ ہے، آزادی کی روح اور عقل و خرد انسانی کا غلبہ قائم رکھیں۔ نوجوانوں کو اس بات کی پوری آزادی ہونی چاہیے کہ وہ بلا مداخلت غیرے اپنی عقل سے کام لیں، اپنے لئے خود فکر کریں، اور اپنی مرضی کے مطابق اپنی نشو و نما کریں۔ روک ٹوک صرف اس وقت ہونی چاہیے جب کہ انضباط اخلاق یا اجتماعی زندگی کا مفاد مد نظر ہو۔ میل جول، بحث و تمحیص، طریقہائے ترغیب و استدلال کو پوری طرح قائم و برقرار رکھنا چاہیے اور حکومت کی جانب سے خود کو ہماری قوم کے گرو بنانے کی کوشش میں کسی فرد پر ہرگز کوئی دباؤ نہ ہونا چاہیے۔ بچوں کا تعلیم گاہوں میں کسی حد تک حب وطن و رشاہیر پرستی کا عنصر ہونا لازمی ہے لیکن مشاہیر کی یہ تقدیس ریاست یا کسی سیاسی جماعت کی غرض کے

نظریہ سے نہیں بلکہ خوبی، نیکی اور صداقت کی بنا پر ہونی چاہیئے۔

کالج کی فضا کا آغوشِ محبت عام طور پر ہر شخص کے لئے کھلا ہوا ہوتا ہے۔ اس فضا کی صلاحیت استحسان واحترام اپنی سادگی اور فراوانی کے باعث تقریباً یاستانی ہوتی ہے۔ اس فضا میں ہیرو جلد بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ احترام ومشاہیر پرستی کے اس جذبہ کو ذلیل سیاسی یا جماعتی مقاصد کے حاصل کرنے کا آلہ کار نہ بنانا چاہیئے۔ کالج لائف کا ایک قابلِ تحسین پہلو یہ ہے کہ اس میں طاقتور اور طاقت بخش قوتیں بہت جلد اثر انداز ہو جاتی ہیں، لہٰذا اس کو اجتماعی زندگی کے مالامال کرنے کا ذریعہ بنانا چاہیئے تاکہ وہ خوبی اور صداقت کی خدمات انجام دے سکے۔ کالج کی فضا میں کبھی کبھی بزدلانہ اور تحماط روش اور بعض اوقات جلدبازی وسودوزیاں کے خیال بھی پرورش پاتے ہیں۔ وہ خصوصیات جو ان کے برعکس ہیں ہمیشہ اس فضا میں پھولتی پھلتی ہیں۔ ہر آدمی کی شخصیت کا کچھ نہ کچھ اثر سوسائٹی پر ضرور پڑتا ہے لیکن برابر کی ٹکر ہونے پر یہ اثرات آسانی سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ کوئی شخص دوسرے پر شعوری طور پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ شخصی کیرکٹر کا یہ عمل اور ردِّ عمل غیر شعوری ہوتا ہے اگر کالج کی گذشتہ زندگی پر غور کیا جائے تو یہ اندازہ کرنا آسان نہیں کہ ہم نے وہاں کی اجتماعی زندگی پر اچھا یا بُرا اثر کس قدر ڈالا تھا۔ البتہ ان لوگوں کے احسانات یاد کرنا آسان ہے جن سے قسمت نے ہمیں کالج میں ملا دیا تھا۔

میں اس بات کے صدر درجہ موافق ہوں کہ آپ دل وجان سے اس آزاد زندگی میں شامل ہو جائیں جو کالج لائف پیش کرتی ہے ما بعض حضرات یہ خیال کرتے ہونگے کہ کیرکٹر میں شعوری طور پر قلب ماہیت یا کایا پلیٹ کرنے کے لئے چار سال کی مدّت بہت ہی کم ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ اور غیر محسوس طور پر کیرکٹر کے عمل وردِّ عمل سے جو تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اُن کے لئے اتنی ہی مدّت بہت زیادہ ہے۔ آپ اس عمر میں بے شمار آزاد سماجی زندگی میں داخل ہونگے تو جوانی کی تمام مسرّتیں جو اس بات کے اولین احساس کے ساتھ محسوس ہوتی ہیں کہ آپ اپنے مالک ہیں۔ نیز اپنی بڑھتی ہوئی قوتوں کا شعور، یہ آپ کی بہترین متاع ہوں گے اور انھیں کو ساتھ لئے ہوئے آپ اپنی کالج لائف کے دروازے سے گذریں گے۔

دانشمندی یہ ہے کہ کالج میں اپنے چار سال کے قیام میں ہم اپنے اندر نئے نئے خیالات قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کریں۔ جب ہم کالج چھوڑ کر بیرونی دنیا میں قدم رکھیں تو ہم کو اس صلاحیت کو جو نوجوانی کا حق ہے اپنے ساتھ لے جانا چاہیئے۔ جوں جوں ہماری عمر گذرتی ہے ہم اپنے گذشتہ تجربہ کے بارسے بوجھل ہوتے جاتے ہیں، ہمارے دماغ کی شریانوں میں جدید خیالات کا دوران کم ہوتا جاتا ہے، یہ شریانیں سخت ہوتی جاتی ہیں اور تمام جدید اور غیر مانوس خیالات کے آزادانہ دوران میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ اور بعد کی زندگی میں جس طرح نئے نئے دوست نہیں ملتے اُسی طرح نئے نئے خیالات بھی پیدا نہیں ہوتے۔ لہٰذا اکثر اس بات کی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ لوگوں سے ملنے جلنے کے بجائے

گوشہ نشینی اختیار کی جائے۔ لہذا ہمارا فرض ہے کہ ہم کالج کے زمانہ میں حیاتِ نَو کے تخم جمع کرلیں تاکہ معمولی مقررہ مدّت کے بعد بھی ہم اپنا یہ عمل تسمین جاری رکھ سکیں۔

اپنشد میں لکھا ہے کہ جوانی دیوتاؤں کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ بس جب تک جوانی قائم ہے ہمیں خوب مسرور و شادماں رہنا چاہیئے۔ یہ ہماری زندگی کا مختصر مگر طاقتور زمانہ ہے جبکہ ہم اپنی زندگی کو خوب بنا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ دنیا میں پاکیزہ جذبات اور غیر دُنیوی آرزوئیں لے کر جائیں، ہماری دوستی، ہمدردی و رفاقتِ احباب کے جذبات محدود نہیں ہو جاتے لہذا ہم انھیں اس حد تک وسعت دے سکتے ہیں کہ ان کے حدود میں وہ تمام باتیں سما جائیں، جو ہمارے رفیقوں کے درمیان جاننے کے قابل ہیں۔ یہ بات بھی اکثر مفید ہوتی ہے کہ کسی ایسے طالب علم سے دوستی کرلی جائے جو کسی غیر ذات برادری میں پیدا ہوا ہو۔ کیونکہ ایسے شخص کو جاننا اور اُس کے ذریعہ سے ان جذبات، ان اُمیدوں بلکہ ان تعصبات یا اختلافات کو سمجھنا جو ہمارے اور اس کے درمیان وجہ مغائرت ہیں اکثر بہت بڑا تجربہ ہوتا ہے۔ یہ تجربہ حاصل کرکے ہم پر ان تمام بشری عناصر کا انکشاف ہو جائیگا جو ان حجابات کے اندر پوشیدہ ہیں، جنھیں ہم بادی النظر میں اس قدر مختلف اور ناقابل فہم سمجھتے تھے۔ مذہبی مُباحثوں اور سیاسی عداوتوں کے دُھندلے پردوں کے پیچھے ہمیں میل جول اور باہمی رفاقت کی حدیں معلوم ہو جائیں گی جنھیں ان مذہبی محبتوں اور سماجی عصبیتوں کی ہوا تک نہیں چھو گئی ہے۔ جو زیادہ عمر میں پہونچکر اس قدر طاقتور ہو جاتی ہیں۔ اگر ایک طرف مذہب حدِ فاصل بن سکتا ہے تو دوسری طرف نوجوانی اور اس کی کشادہ دلانہ جبلّتیں متحد و متفق بھی کرسکتی ہیں۔ کیونکہ ان میں وہ زبردست اور معجزنما طاقت ہے جو ہمجولیوں کے دلوں میں عمیق طور پر جاگزیں ہو جاتی ہیں۔ اپنے فریق مخالف کی زندگی کے بشری عنصر کو معلوم نہ کرسکنا ہی زیادہ عمر میں سب سے بڑی حدِ فاصل بن جاتا ہے۔ اس وقت نہ میل جول کا امکان رہتا ہے اور نہ ہمدردانہ مفاہمت کا باطن جذبہ۔ ہماری کالج کی زندگی ان دونوں باتوں کو بدرجۂ وافر ہم پہونچاتی ہے۔ اگر ہم چاہیں تو کالج چھوڑنے پر فخر کرسکتے ہیں کہ ہمارے گہرے دوستوں میں ایک مسلمان ہے، ایک ہندو ہے، ایک عیسائی ہے، ایک پارسی ہے۔ ہم تب جبلی طور پر ان متضاد باتوں کو محسوس کریں گے جن کو بہ نظرِ استحسان و احترام دیکھتے ہیں جن کی وجہ سے وہ ہم سے مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ کالج میں اگر ہم نے اس قسم کی دوستیاں کرلیں تو آئندہ زندگی میں ہم ان انتہائی نسلی و فرقہ وارانہ مغائرتوں سے محفوظ و مامون رہیں گے، جو ہمیشہ جہالت و تعصب کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسی تمام باتوں میں اولین اقدام ہی اہم ترین ہوتا ہے اور نوجوانی کا یہ پہلا قدم آئندہ زندگی کے دو قدموں کے برابر ہوتا ہے۔" اگر ہم اوائل عمر میں ان رکاوٹوں کو توڑ کر نکل جائیں گے تو ہم ایک ایسے کیرکٹر کی بنیاد قائم کرلیں گے جو آئندہ چلکر اپنے رفیقوں کے ساتھ

تعلقات قائم رکھنے میں خضرِ راہ کا کام دے گا۔"......

زیادہ بہتر ہوگا کہ اس مضمون کا خاتمہ ایک پُرانے رشی کے دانشمندانہ قول پر کیا جائے، جو آب سے صدیوں پہلے ایک وید منتر کے نظم کرنے والے تھے۔ اس قول میں لافانی دانشمندی کا راز مضمر ہے جس کا تعلق اجتماعی تعلیمی زندگی کے آدرش سے ہے اُس زمانہ میں اسی قسم کی اجتماعی تعلیمی زندگی کا رواج تھا۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ پراچین بھارت میں ایسی اجتماعی زندگی کا وجود نہیں تھا۔ ہمیں وقتاً فوقتاً خصوصاً پُرانے کھنڈروں کی کھدائی سے بیش از بیش ثبوت مل چکا ہے کہ ہندوستان قدیم میں ایسی یونیورسٹیاں اور تعلیم گاہیں موجود تھیں جن میں دو ہزار سے دس ہزار تک طلبا جمع ہو کر حق و صداقت کی تلاش کیا کرتے تھے یہاں موقع نہیں کہ اس دلچسپ موضوع پر مزید گفتگو کی جائے۔ بس اتنا کافی ہے کہ جو اقتباس میں ذیل میں دے رہا ہوں وہ ایک کانوکیشن ایڈریس کا ٹکڑا ہے جو اس زمانہ میں فارغ التحصیل طلبا کے سامنے دیا گیا تھا۔ گھر جانے سے پہلے یہ فارغ التحصیل طلبا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک بڑے ہال میں جمع ہوتے اور اُنھیں صدر یونیورسٹی نے یہ ایڈریس سُنایا تھا۔ یہ ایڈریس اگرچہ صدیوں پُرانا ہے مگر اس میں بہت سی باتیں اہم اور نئی ہیں۔ اقتباس یہ ہے:-

"آپس میں ملو، بات چیت کرو، تمہارے دماغ تمام باتوں کو یکساں طور پر سمجھیں بوجھیں تمہارا عمل اور اس عمل کے ثمرات مشترکہ ہوں، تمہارے خیالات و عزائم مشترکہ ہوں، تمہارے دلوں کی تمنائیں ایک ہوں، تاکہ تمہارے درمیان کامل اتحاد پیدا ہو۔" ہندوستان ریویو سے بصد شکریہ

غزل

دنیا کے گلستاں میں کوئی دلکشی نہیں
یا میرے دل میں خیر سے کچھ تازگی نہیں

جس دل میں تیری یاد نہیں اسکو کیا کہوں
بیکار ہے چراغ اگر روشنی نہیں

خوگر نہ رنج کا ہوں نہ راحت پسند ہوں
جینا برائے نام ہے یہ زندگی نہیں

کہتے ہیں لوگ آگیا موسم بہار کا
لیکن ہمارے دل کی کلی تو کھلی نہیں

کیا چیز پھونکے دیتی ہے قلب و جگر کو آج
اک آگ سی لگی ہے مگر آگ بھی نہیں

ہر سجدہ لے کے اُٹھتا ہے مُہرِ قبول کو
برباد جائے جو وہ مری بندگی نہیں

محسوس کر رہا ہے یہ نیساں ترے بغیر
جیسے کہ زندگی میں کوئی لطف ہی نہیں

نیساں اکبرآبادی

کام دیو کا ماتم

(از حضرت منور لکھنوی)

شمع افسردہ کا عالم تھا رتی کا عالم ۔۔۔ دور ہونے نہیں آتا تھا غشی کا عالم
حرکت اب نہ ذرا بھی تھی گوارا اس کو ۔۔۔ تھا اگر کچھ تو غشی کا تھا سہارا اسکو
ہوگی کا اُسے احساس کرانے کیلئے ۔۔۔ اپنے شوہر کا عزادار بنانے کیلئے
ہوگیا صرفِ عمل جذبۂ بیدار اس میں ۔۔۔ حرکت کے نظر آنے لگے آثار اس میں

دیکھنا تھا فلکِ سفلہ کو غم کوش اسے
آگیا گردشِ تقدیر سے اب ہوش اسے

نہ تھی ہر چند وہ پہلی سی غشی کی حالت ۔۔۔ قابلِ رحم تھی معصوم رتی کی حالت
کھولدیں اس نے نصیب لغزشِ حرماں آنکھیں ۔۔۔ ہوش آیا تو ہوئیں اور بھی حیراں آنکھیں
گرچہ رکھتی تھی نظر، دیکھ نہیں سکتی تھی ۔۔۔ دیکھ سکتی تھی، مگر دیکھ نہیں سکتی تھی
صبر سے کام لیا غور سے دیکھا ہر سمت ۔۔۔ کس بیبسی میں بھی ہر طور سے دیکھا ہر سمت

جس کے دیدار کی حسرت تھی نہ پایا اُس کو
نہ کہیں سامنے شوہر نظر آیا اُس کو

ہوش آیا تو ہر اک بات اُسے یاد آئی ۔۔۔ اور فوراً لبِ غنچوں پہ یہ فریاد آئی
مرے مالک مرے آقا، یہ تماشا کیا ہے ۔۔۔ سامنے جو مری آنکھوں کے ہے نقشا کیا ہے
نظر آتے نہیں اب کیوں مرے معبود کہیں ۔۔۔ آپ کیا عالمِ ہستی میں ہیں موجود نہیں
محوِ فریاد جو یوں آنکھ اُٹھا کر دیکھا ۔۔۔ اِک حسیں مرد کے لاشے کو زمیں پر دیکھا

اب منور لکھنوی دنیا کے مشہور اور لافانی شاعرِ اعظم کالیداس کی تصنیف "کمار سمبھو" کا منظوم اردو ترجمہ کر رہے ہیں کے ایک جزو کو حضرت نے ہمارے اصرار پر اشاعت کے لئے مرحمت فرمایا ہے۔ اس حصہ میں شوجی کی نظر قہر سے (عشق کے دیوتا) کی ہلاکت پر کام دیو کی بیوی رتی اپنے محبوب شوہر کا ماتم کر رہی ہے۔ ا۔د

اس کی قسمت میں فنا یونہیں تھی فی النار تھا یہ
رودر[1] کے قہر سے اک راکھ کا انبار تھا یہ

۴
پھٹ رہا تھا غمِ پنہاں سے کلیجہ اس کا — اف وہ خاکستر دلبر سے لپٹنا اس کا
جان پر فرقتِ شوہر سے وہ بن بن جانا — کثرتِ رنج سے پیہم وہ پچھاڑیں کھانا
لوٹنا فرشِ زمیں پر وہ پریشاں ہو کر — رقص کرنا ہمہ تن شعلۂ عریاں ہو کر
سینہ اُبھرا ہوا آلودۂ خاکستر تھا — اور بکھرے ہوئے بالوں کا عجب منظر تھا

شورِ ماتم سے مکدر تھی فضا جنگل کی
آگ سی دل میں لگاتی تھی ہوا جنگل کی

۵
غمِ شوہر سے رتی محوِ فغاں یوں بولی — برق بیتاب کی مانند طپاں یوں بولی
آپ کے پیکرِ خوبی کی یہ حالت کیا ہے — رنگ یہ کیا ہے یہ کیا شکل ہے صورت کیا ہے
دل پہ ڈھاتا تھا غضب حسنِ دل آرا جس کا — سرِ عشاق میں ہر وقت تھا سودا جس کا
جو نہیں آپ تو بیکار ہے جینا میرا — ناتھ! پھر کس لئے پھٹتا نہیں سینا میرا

اف مصیبت یہ پڑی ہے مرے سر پر کیسی
ذات عورت کی بھی کم بخت ہے پتھر کیسی

۶
آہ پامال و زبوں حال مجھے چھوڑ دیا — آنِ واحد میں وہ پیمانِ وفا توڑ دیا
رہ گئی ہوں میں شب و روز تڑپنے کیلئے — آپ کا ہاتھ میسر نہیں تکیے کیلئے
زندگی کا کوئی دنیا میں سہارا نہ رہا — میں سمجھتی تھی جسے جان سے پیارا نہ رہا
داغ کیوں دے گئے منہ موڑ کے مجھکو سوامی — چل دئے آپ کہاں چھوڑ کے مجھکو سوامی

جس طرح بند کوئی توڑ کے پانی بہہ جائے
اور معصوم کنول یکہ و تنہا رہ جائے

۷
خواب میں بھی مجھے پہنچا نہیں نقصان کوئی — کبھی میلا نہ کیا آپنے بدیاں کوئی
کچھ غرض تھی نہ زیاں سے نہ ضرر سے مطلب — کبھی رکھا ہی نہیں فتنہ و شر سے مطلب
آپ کے حق میں نہ کی میں نے برائی کوئی — دلشکن بات بھی لب پر نہیں آئی کوئی

---

[1] رودر شو جی کا ایک نام۔ [2] یہ شعر مترجم کے والد مرحوم ملک الشعرا حضرت آفاق لکھنوی کا ہے جو رام نٹک میں تارا کی زبان سے بالی کی وفات کے موقع پر کہلایا گیا ہے۔

وجہ پھر کیا ہے جو دیدار سے محروم ہوں میں
آہ خوں کردہ نیرنگیِ معصوم ہوں میں
کب سے ہے مائل فریاد و بکا دیکھیں تو
کیا گزرتی ہے رتی پر یہ ذرا دیکھیں تو

۸ آگئی یاد وہ کیا ناتھ کو تقصیر مری
جب جکڑتی تھی کبھی آپ کو زنجیر مری
آپ کا چھیڑ کے لینا وہ غلط نام مرا
مان لینا دمِ تعزیر بھر الزام مرا
مارنا آپکو پالے کے وہ خوش نام کنول
نازنیں وش وہ دل آویز دل آرام کنول
جس کو میں کان کے زیور کا شرف دیتی تھی
جس سے میں آپ کی خلوت میں خبر لیتی تھی
زیرہ گل کا پھر آنکھوں میں وہ پڑتا ہے
آپ کا مجھ سے وہ اس وقت بگڑنا ہے

۹ اب کہاں آہ وہ تقریر حلاوت سے بھری
اب کہاں آہ وہ گفتار محبت سے بھری
مرے ہر طرح خبر گیر رہا کرتے تھے
آئے دن آپ یہی مجھ سے کہا کرتے تھے
آپ کے خانۂ دل میں ہے سکونت میری
آپ کی شکل میں آئینہ ہے صورت میری
چھین لیتی تھیں مرے دل کو وہ پیاری باتیں
اب میں سمجھی کہ بناوٹ کی تھی ساری باتیں
موت سے بچ کے وگرنہ کہیں رہ سکتی تھی
میں بغیر آپ کے زندہ نہیں رہ سکتی تھی

۱۰ اے قدم عالمِ فانی سے اٹھانے والے
اے مسافر عدم آباد کو جانے والے
میں بھی ساتھ آپکا دینے کیلئے آتی ہوں
آپ کی خاک پہ قربان ہوئی جاتی ہوں
مگر کیسا ہی یہ فن کیا ہے ریا ہے کیسی
غیب والوں کی یہ دنیا ہے دغا ہے کیسی
تنگ سب جس سے ہیں تقدیر کا وہ پھیر ہے کیا
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اندھیر ہے کیا
آپ کے دم سے تھا جینے کا مزا دنیا میں
جو نہیں آپ تو ماتم ہے بپا دنیا میں

۱۱ جان سے بڑھکے بھی کچھ آپ ہیں پیارے بھگوان
چھوڑ کر آپ کہاں مجھکو سدھارے بھگوان
جب جس رات کو گشتہ و حیران ہونگے
اپنے عاشق کے تجسس میں پریشان ہونگے
انکا دل شوق سے بادل کے دھڑکتا ہوگا
جب اندھیرے میں کوئی دیکھ نہ سکتا ہوگا
حوصلہ پاؤں اٹھانے کا ملے گا کیونکر
راستہ گھر میں جانے کا ملے گا کیونکر

اب بغیر آپ کے بات ان کی نبے گی کیونکر
کام کی بات وہ رات ان کی نبے گی کیونکر

۱۲ مہ جبینوں کا عبث اب ہے شرابی ہونا نشۂ مے سے وہ آنکھوں کا گلابی ہونا
جوشِ مستی میں وہ اب انکا بہکنا ہے فضول گلِ گلزار کی مانند مہکنا ہے فضول
اب نہیں خاک مزا اُن کی بلا نوشی میں بات پیدا نہیں پہلی سی وہ مدہوشی میں
اب وہ محبوب نگاہی دمِ تقریر نہیں
اب وہ لکنت کا مزا ہی دمِ تقریر نہیں

۱۳ یوں مجھے زار و حزیں چھوڑ کے جانیوالے آہ اے جسمِ حسیں چھوڑ کے جانے والے
آپکے دوست کا اب شب کو نکلنا ہے فضول چاند کا پیرہن نور میں ڈھلنا ہے فضول
اب تو جب پاکھ اندھیرا ہی گزر جاتا ہے چاند چڑھتا ہے مگر چڑھ کے اُتر جاتا ہے
اور چڑھتا بھی اگر ہے تو بہت رُک رُک کر اور چڑھتا بھی اگر ہے تو بہت جھک جھک کر
اب تو بے فائدہ سب اوج و کمال اس کا ہے
دیکھکر آپ کا انجام یہ حال اس کا ہے

۱۴ آم کے بور میں اب پہلی سی وہ بات نہیں حسنِ اعجاز میں وہ شان کرامات نہیں
ٹہنیاں لال ہری وہ اثر انداز نہیں دو جہاں میں کوئی ان کا ہدفِ ناز نہیں
لالہ ملتی ہے خبر کوک سے نر کوئل کی بور سے نام کو اُلجھن نہیں بڑھتی دل کی
اسکی آواز میں لذت تو ہے لیکن بے سود اسکے نغموں میں حلاوت تو ہے لیکن بے سود
کون اس بور کا نخچیر بنے گا ہے ہے
کس کی پلکی کا یہ اب تیر بنے گا ہے ہے

۱۵ خواب وہ شیں ہیں وہ پہلی سی بہاریں مجھکو خوں رلاتی ہیں یہ بھونروں کی قطاریں مجھکو
آپ ہنگام کمیں گاہ میں لاتے تھے انھیں حلقۂ قوسِ دلآویز بناتے تھے انھیں
اب وہ مستی میں کہیں زمزمہ پرداز نہیں انکی آواز بھی پہلی سی وہ آواز نہیں
مل رہی ہے مرے افسانے سے روداد ان کی ہے مشابہ مری فریاد سے فریاد ان کی
سخت جاں میں ہوں مرے ساتھ ہیں گریاں وہ بھی
ہیں مرے حال پریشاں سے پریشاں وہ بھی

ہوش میں آئیے جاگے مری قسمت اُٹھیے ۱۶ روح ہے پھر تن سیمیں کی جو زینت کیجیے
بولئے بولئے ہاں بولئے میرے مالک اب تو آنکھوں کو ذرا کھولئے میرے مالک
پھر عیاں کیجئے اعجاز وہ سوامی اپنا پھر بنا لیجئے کوئل کو پیامی اپنا
اسکے نغموں کی حلاوت سے ہو جادو دل پر نہ کسی کو بھی رہے عشق میں قابو دل پر

اس سے بڑھکر ہے کہاں سحر بیاں اور کوئی
اس سے بہتر نہیں پیغام رساں اور کوئی

آپ کا میری طرف آہ وہ مائل ہونا ۱۷ ہمکناری کے لئے مجھ سے وہ سائل ہونا
مرے قدموں پہ بصد عجز وہ جھکنا ہے ہے اور پھر میرا تامل سے وہ رُکنا ہے ہے
سر تسلیم وہ پھر آہ جھکانا میرا اور پھر آپ کے آغوش میں جانا میرا
آتش شوق کا یوں دل میں ہویدا ہونا سنسناہٹ کا مرے جسم میں پیدا ہونا

بھول سکتے ہی نہیں عیش وہ تنہائی کے
یاد آتے ہیں مزے آہ وہ یکجائی کے

نام تھا چار طرف شہرۂ آفاق تھے آپ ۱۸ عشق بازی میں ہنرمند تھے مشاق تھے آپ
آپ کے پاس تھا دل آپ جگر رکھتے تھے عیش و عشرت کے طریقوں سے خبر رکھتے تھے
اپنے قابو میں کیا دل مجھے اپنا دے کر پھول سے ہاتھ میں وہ پھول سی بنتی لیکر
آپ کا شوق سے تکلیف اُٹھانا ہے ہے ان کو جوشن مرے بازو کا بنانا ہے ہے

اب وہ زیور مرے بازو پہ گراں ہے سوامی
تن سیمیں وہ ان آنکھوں سے نہاں ہے سوامی

جلوؤں پایاں ابھی محتاج ہے زیبائش کا ۱۹ پھر جو اور سے ہو سامان مری آرائش کا
یوں تو ہے عالم اسباب میں شہرت اس کی آپ چاہیں گے تو بڑھ جائیگی عظمت اسکی
دیوتا اسکی سجاوٹ سے تھے نالاں ایسے صفت زلف پریشاں تھے پریشاں ایسے
اس کی تزئین مکمل نہ ہوئی تھی سرکار ہاں اس آئینہ پہ صیقل نہ ہوئی تھی سرکار

اپنے مطلب کے لئے آپ کو بلوا بھیجا
گئی جان آپ کی پیغام یہ اچھا بھیجا

آج ہے آپ سے گلزار جہاں کی زینت ۲۰ کہیں مرغوب نہ آجائے جہاں کی زینت

اپسراؤں کا وہ انداز لُبھالے نہ کہیں   موہنی آپ کے دل پر کوئی ڈالے نہ کہیں
پھانس کر سحر سے نیرنگ سے مکاری سے   آپ کو زیر نہ کرلے کہیں طراری سے
آپ مجھ زار سے بیزار نہ ہوں گے جبتک   اُنکے پھندوں میں گرفتار نہ ہونگے جبتک

شکلِ پروانہ فدا آپ پہ ہوجاؤں گی
اور پھر آپ کے پہلو میں جگہ پاؤں گی

ساتھ دینے کیلئے آپ کا آتی ہوں ابھی ۲۱ اپنی ہستی کو بھی معدوم بناتی ہوں ابھی
مرے محبوب ہے، یہ پھر بھی ندامت مجھکو   لوگ سمجھیں گے سزاوارِ ملامت مجھکو
مدّتوں نام سے بیزار رہے گی دنیا   آئے گا ذکر مرا جب تو کہے گی دنیا
خود کو محبوب کے پہلو میں فنا کر نہ سکی   اپنے خاوند کے مرتے ہی رتی مر نہ سکی

کیوں نہ فی الفور ملی خاک میں دلبر کے بغیر
رہی کچھ دیر تو زندہ ہی یہ شوہر کے بغیر

غزل

(ڈاکٹر عندلیب شادانی)

حُسن سے سب کو گلہ ہے کہ وفادار نہیں   یاں یہ رونا ہے کہ مجبور ہے، مختار نہیں
میں نے دیکھے ہیں ترے لطف کے خواب رنگیں   مجھکو جنت کی بہاروں سے سروکار نہیں
ہوگیا تیرے تصور سے تخیل رنگیں   احتیاجِ چمن و میکدہ رہنما نہیں
سامنا ہو بھی تو خاموش پیاموں کے سوا   دلِ حسرت زدہ کو رخصتِ گفتار نہیں
میری ہر سانس میں فریاد کی کیفیت ہے   پردہ دار اب تو خموشی بھی ہی، گفتار نہیں
چاندنی رات میں آنکھ امنڈ آتے ہیں اشک   گرچہ جدت سے دل زار گرفتار نہیں
گریہ آلود ہوئی میرے لیے چشمِ جمال   مجھ سا دنیائے محبت میں گنہگار نہیں

تیرے معصوم تصوّر سے تو کھیلا ہوں ضرور
یہ بھی ہے جُرم تو اس جُرم سے انکار نہیں

"کاوشہائے بے سُود"

(از حضرت سروش عسکری طبا طبائی)

ظرف اُس ہستیِ مافوق کا ہونا چاہا — میں نے قطرہ میں سمندر کو ڈبونا چاہا
غم و عشرت کو بہم مَیں نے سمونا چاہا — تھام کر دامنِ محبوب کو رونا چاہا
غرق، بے عشرتِ بیکار نہ ہونا چاہا — میں نے طوفان کو کشتی میں ڈبونا چاہا
دلکشی راہِ محبت کی، الٰہی توبہ! — بیخودی نے سرِ منزل مجھے کھونا چاہا
سعیِ ناکام نے کیا شغل نکالا آخر — آنسوؤں سے خطِ تقدیر کو دھونا چاہا
عشقِ گستاخ کی اللہ ری راحت طلبی — رکھ کے سر زانوئے محبوب پہ سونا چاہا
دامنِ تر کی طرح اشکِ ندامت نے مرے — حشر میں نامۂ اعمال کو دھونا چاہا
عشق نے حسن کی آمد پہ سجا منظرِ چشم — ہر مژہ میں گہرِ اشک پرونا چاہا

بن گئے اشک مرے وست کے ماتھے کا عرق
مہر کو رشحۂ شبنم نے بھگونا چاہا

ابھاگا

(از جناب پریم ساگر باسل پٹیالہ)

"بھائی .... دُکھ کا بھاری بوجھ لیکر اب اس دنیا میں چلنے کی طاقت نہیں رہی، دنیا سنسان نظر آتی ہے۔ زندگی کی تمام رنگینیاں، تمام دلچسپیاں رخصت ہو چکیں، بس، ایک ہلچل.... ایک بے چینی رہ گئی ہے، زندگی میں.... بڑی مشکل سے زندگی کی گاڑی کو آگے دھکیل رہا ہوں"۔

ذرا سوچو تو بھائی .... میں کتنا ابھاگا ہوں، تین سال تک دل کو ہاتھوں سے دبائے بیٹھا رہا گذرتے واقعات یاد کر کرکے اس کو تسکین دیتا رہا۔ ایک اُمید تھی جس کی شعاع سے تند و تاریک جیون کبھی کبھی جگمگا اُٹھتا تھا۔ لیکن آج وہ بھی ناامیدی میں تبدیل ہو چکی۔ اُلجھنیں آج کلیجہ مسوسے دیتی ہیں۔ دنیا ایک پیچیدہ پہیلی نظر آرہی ہے مجھے، جسے شاید میں زندگی بھر نہ سمجھ سکوں گا"۔

بھائی .... آج میں بہت دکھی ہوں، بیزار ہو گیا ہوں اس روکھی پھیکی زندگی سے، دل میں میٹھا میٹھا درد اُٹھتا اور گہرے کہرے کی طرح میرے وجود پر چھا جاتا ہے۔ میرا دماغ پریشان کن خیالات اور تفکرات کی قید میں بے طرح جکڑا ہوا ہے۔ آنکھیں روتے روتے سوج گئیں۔ جسم تھک گیا !!"

بھائی ! .... آج میرے دل میں ایک زبردست طوفان اُمڈ رہا ہے، میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ دل میں ہے سب اُگل دوں، سب کچھ بتا دوں تمہیں.... آج میں اپنی زندگی.... اپنی ہستی کا راز بغیر کسی ہچکچاہٹ کے تمہارے سامنے کھول کر رکھ دونگا.... یہی وہ راز ہے جس نے آج تک مجھے تم تک نہ پہونچنے دیا جس کی وجہ سے میں نے تمہیں اس حالت میں اکیلا ہی چھوڑ دیا.... ٹھوکریں کھانے کے لئے !!

.... اُس دفعہ بھائی کی اجازت سے جب میں تمہیں لکھنؤ لینے گیا، تب تم بیمار تھیں، مجھے اس کا پتہ وہاں پہنچنے پر تمہارے نوکر بھیکو سے لگا.... میں نے اُس سے پوچھا۔

"اُن کی تیمارداری کون کرتا ہے؟"

"کوئی رشتے کی لڑکی ہے۔"

اتنا سُن کر صدر پھاٹک سے گذر کر میں اوپر جانے لگا۔ اُس وقت تمہاری بیماری کی خبر سُن کر میں سُن سا ہو گیا تھا۔ آیا تھا دل میں خوشیوں کا طوفان لئے ہوئے.... اور.... سیڑھیوں میں

ب لڑکی بھی بچی نظروں سے مجھے تک رہی تھی۔ میری نگاہیں اُس کے چہرے پر اٹک کر رہ گئیں۔ ایک عجیب
ی کشش محسوس ہوئی مجھے اُس کی بھولی صورت میں! وہ بالکل ہی گُم سُم کھڑی تھی، جیسے بولنا جانتی
ی نہ ہو۔ میں کھٹ پٹ کرتا ہوا تمہارے کمرے کے نزدیک پہنچا۔ اور اندر جانا ہی چاہتا تھا کہ وہ دوڑتی
ی آئی اور بولی "وہاں نہ جائیے" لیکن ایک دم خاموش ہو گئی، جیسے اُس نے ایک اجنبی سے بات کر کے
ری بھاری غلطی کی ہو، وہ شرم سے سمٹی جا رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔

"بھابی کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا... اُس نے آنکھوں ہی سے کمرے کی طرف اشارہ کیا، میں نے سوالوں
کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ "بھابی اندر کیا کر رہی ہیں؟" "میں اندر کیوں نہیں جا سکتا؟" "تم بھابی کی کون ہو؟"
"تو کہاں ہے؟"

اُس نے آہستہ سے جواب میں اتنا ہی کہا "جیجی اندر بیمار پڑی ہے، سو رہی ہے، نیند خراب نہ ہو....
اسی لئے میں نے آپ کو باہر روک لیا ہے۔" "میں نے نہیں" اُس نے ڈرا ہی کہا "بلکہ ڈاکٹر صاحب ہی سوتے
سے جگانے کو منع کر گئے ہیں...... گھر میں اور کوئی نہیں ہے!" "ہوں" اور میں دوسرے کمرہ میں چلا گیا

دن گزرنے لگے، اور وقت کے ساتھ اُس کا حجاب بھی کم ہوتا گیا، یہاں تک کہ اب اُسے میرے سامنے
آنے اور بات چیت کرنے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ ہوتی۔ چاندنی راتوں میں جب ہماری نگاہیں ملتیں
ہم فرطِ مسرت سے جھومنے لگتے، لبوں پر مسکراہٹ کھیل جاتی۔ پھر خود ہی کچھ شرما کر آنکھیں دوسری طرف
پھیر لیتے۔ یہ شرمیلی ادائیں مجھے وہ لطف دیتیں، جس کا اندازہ شاید ہی کوئی کر سکے۔

روز بروز ہم ایک دوسرے میں کھوئے جانے لگے۔ مَیں اُسے... وہ مجھ سے... زیادہ نزدیک سے
دیکھنے کی تمناؤں میں چٹکیاں لینے لگی۔! لیکن یہ کشش کیوں؟

اپنے آپ کو بھلانے کے لئے مَیں نے کئی دفعہ کتاب کے ورقوں میں گم ہو جانے کی کوشش کی، لیکن
دل نہ مانا۔ اُس میں ایک ہیجان تھا، نگاہیں لفظوں پر ٹک نہ سکیں۔

اور وہ رومال پر... کچھ کاڑھنے لگتی... "پریم" ابھی اُس نے اِس لفظ کو..... اس لفظ کے صحیح
مطلب کو نہیں سمجھا تھا، لیکن جیسے وہ بغیر کاڑھے دم نہ لیگی۔

مگر اُس کے ہاتھ ایک دم رُک جاتے، جیسے وہ سوچتی... "اگر یہ رومال اُنھیں دیدوں تو.....؟
لیکن اگر وہ کہدیں "ایسے بہت سے رومال پڑے ہیں میرے پاس... آپ کی چیز آپ ہی کو مبارک ہے"
.....؟ مر جائیگی رنجیدہ ——— لیکن ایک دفعہ کھیلگی ضرور... جھٹ دُشانی پڑی تو...؟ اُٹھا لیگی —!

اس خیال کے زیرِ اثر وہ مسکرا دیتی۔

ایک دن میں بنگلہ والے کمرے میں بیٹھا اسی اُلجھن کو سلجھا رہا تھا کہ جس میں بُری طرح پھنس گیا تھا "چائے لاؤں آپ کے لئے....؟" ایک لوچدار آواز نے میرا سلسلۂ خیالات منقطع کر دیا۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا ریکھا کھڑی تھی۔ "ہاں لے آؤ... مگر بھیکو کہاں ہے؟" جتنے میں میں نے فقرہ ختم کیا وہ گلہری کی طرح بھاگتی ہوئی گئی، اور چائے اور مٹھائی لے آئی۔ ٹرے کو میز پر رکھا کر نیچی نیچی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے چائے پیتے ہوئے کہا "آج میں واپس پٹیالہ جا رہا ہوں۔" مگر وہ خاموش رہی، پھر اچانک بولی "بھلا ایسا آنا بھی کیا؟ اس سے تو نہ آنا ہی اچھا تھا۔... اب اگر آئے ہو تو دو چار دن اور ٹھہر جاؤ...!"

اور نہ معلوم کیوں.... بغیر کچھ سوچے سمجھے میں نے کہہ دیا "اچھا نہیں جاؤں گا۔"

گو تیسرے دن میرا کالج کھلنے والا تھا لیکن صرف اس کی دلجوئی کے لئے کہ کہیں میرے انکار سے اُس کے نازک دل کو ٹھیس نہ لگے، ایک ہفتہ اور ٹھہر گیا۔

ایک دن رات کو میں تیسری منزل پر پڑا ہوا تھا، اُلجھنوں کے دام میں اُلجھا ہوا، کہ ریکھا آگئی۔ ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ دودھ رکھ کر بولی "ابھی ابھی جیجی نے آپ کو بلایا تھا۔ لیکن میں نے کہہ دیا رات ہو گئی ہے، سو گئے ہوں گے، صبح مل لینا۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ابھی تک جاگ رہے ہوں گے۔"

"کیوں کیا بات تھی؟" "مجھے تو معلوم نہیں!" ریکھا چلی گئی۔ میں سوچتا رہ گیا۔

دوسرے دن میرے لوٹنے کی تیاری ہو گئی۔ بھائی کا خط آیا تھا، اُن کی طبیعت علیل تھی، مجھے جلدی آنے کی تاکید کی تھی، پندرہ دن کچھ کم نہیں ہوتے، خواب کی مانند گذر گئے۔ بھائی نے تو چلتے وقت ہی کہا تھا "پریم زیادہ دن نہ لگانا، جلد ہی لوٹ آنا۔" کیونکہ بھائی کی طبیعت عموماً علیل رہتی تھی۔ لیکن اب میرا دل وہاں سے لوٹنے کو بالکل نہیں چاہتا تھا۔ اب میں ریکھا کو بالکل نہ دیکھ سکوں گا۔ یہ خیال آتے ہی میرے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ میں نے تو کبھی اُسے جی بھر کر دیکھا بھی نہیں۔ اُس کی ہنسی.. جب وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دیتی تھی، تو مسرت سے میری آنکھیں بند ہو جاتیں اور مجھے محسوس ہوتا کہ دُنیا اور دُنیا والوں کی ہر چیز میری ذات سے کئی کوس پرے ہٹ گئی ہے۔

"ریکھا! آج میں واپس جاؤں گا" میں نے صبح ہی ریکھا سے کہا۔ یہ ایسی ہوش رُبا خبر تھی جس نے اُس کے اوسان خطا کر دیئے۔ لیکن ضبط سے کام لیتے ہوئے اُس نے کہا "کچھ دن اور ٹھہر جائیے" اُس کا

آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"بھائی کا خط آیا ہے۔ وہ بیمار ہیں۔"

"اچھا"... اُس نے جذبات کو دباتے ہوئے کہا۔ اور اندر چلی گئی۔

اپنے کاموں سے فراغت پاکر میں کمرے میں آیا۔ کلاک نے سات بجائے، میرے جانے میں ابھی تین گھنٹے باقی تھے۔ اتنے میں مُنو آیا۔ میں نے پوچھا "مُنو! بھابی کیا کر رہی ہے؟ اور... اور ریکھا کہاں ہے؟"

"بھابی..... وہ پڑی ہے، اور ریکھی چائے بنا رہی ہے۔ بھیّا.... آج ریکھی بڑی پریشان ہے، پہلے تو اسٹو (stove) ہی نہ جلا، اور جب جلا بھی تو جلدی میں تمام دودھ ہی لڑھکا دیا، اب بھیکو پھر بازار سے دودھ لینے گیا ہے۔"

"جلدی کی کیا بات تھی؟"

"بھیّا تم جا رہے ہو نا....." اُسی وقت ریکھا چائے لیکر آئی۔ میں نے پوچھا۔

"ریکھا! آج چائے کو دیر کیوں ہوگئی؟" لیکن وہ خاموش رہی، اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ درد کی اذیت وہ لہریں سارے جسم میں دوڑ رہی تھیں۔ بھاری من اور سُونی آنکھوں سے چپ چاپ میری طرف دیکھتی رہی۔ جیسے یہی خاموشی میرے سوال کا جواب ہو" ریکھا خاموش کیوں ہو؟ آج میں جا رہا ہوں کیا جاتے وقت دو باتیں بھی نہ کرو گی؟" اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اُس کی آواز بھرا گئی، وہ بول نہ سکی "ریکھا....." اندر سے بھابی کی آواز آئی، اور اس کے سنتے ہی ریکھا آنسو پونچھتی ہوئی اندر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد مُنو ریکھا کا خط لایا، لکھا تھا۔

"....... ! " آج تم جا رہے ہو، نہ معلوم پھر کب ملیں۔ میں نے اپنا سب کچھ تمہارے چرنوں پر بھینٹ کر دیا ہے، اور تمہیں ہی اپنا سب کچھ مان لیا ہے۔ یہی التجا ہے کہ اپنے دل کے کسی کونے میں مجھے تھوڑی سی جگہ دیدینا، اور کبھی کبھی اس بدنصیب کو یاد کر لیا کرنا۔ بھلا نہ دینا مجھے یہی میری پرارتھنا ہے۔"　　　تمہاری ریکھا

ایک ایک لفظ میں درد تھا، میرا دل بھر آیا۔

"بابو جی تانگہ حاضر ہے"! میں نے سر اُٹھا کر دیکھا، بھیکو چلنے کا تقاضا کر رہا تھا۔

"اچھا بھائی چلو" میں اُٹھا اور کمرے سے باہر آیا، میری آنکھیں چاروں طرف ریکھا کو ڈھونڈ رہی تھیں، جاتے ہوئے ایک دفعہ اُس کو صرف ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔ آخر میں

آخر میں تانگے میں جا بیٹھا میرا دل اُمنڈا آ رہا تھا کہ اتنے میں ممتو دوڑا ہوا آیا ۔ اس نے ایک رومال میں لپٹی ہوئی کوئی چیز میرے ہاتھ میں دیدی ۔ دفعتہً میری نظر اوپر کھڑکی کی طرف گئی ۔ دیکھا ہاتھ جوڑے کھڑی تھی ۔ اُس کی خاموش نگاہیں ..... جیسے اُس کی ساری طاقت گویائی سمٹ کر آنکھوں میں آگئی ہو میری آنکھوں میں آنسو آگئے ۔ آخر تانگہ ایک موڑ پر مڑا اور ریکھا آنکھوں سے اوجھل ہوگئی ۔ میرا دل حسرت میں ڈوب گیا ۔ میں نے رومال کھولا ۔ ریکھا کی تصویر ، وہی رُمال جس پر میرا نام لکھا تھا ۔

میں گھر آیا ، بھیّا کی حالت زیادہ خراب ہوگئی تھی ۔ روز بروز حالت بد سے بدتر ہونے لگی ، ڈاکٹروں نے لاہور لے جا کر علاج کرانے کا مشورہ دیا ، میں بھیّا کو لے کر لاہور گیا ۔ لیکن اُنھیں صحت نہ ہوئی ، میرا دماغ پریشان ہوگیا ۔ اِدھر بھیّا کی بیماری ، اُدھر ریکھا کی یاد ۔ سوچتا کیا کروں کہاں جاؤں ..... آخر اسی کشمکش میں دو سال گذر گئے ، مریض جانے کے لئے تیار تھا لیکن مرض پاؤں جمائے کھڑا تھا ۔ آخر موت کی ہچکی نے بھیّا کو اس موذی مرض سے نجات دلائی ۔

بھائی کی موت نے میرے صفحۂ تقدیر کو ہی اُلٹ دیا ۔ گھر سنسان و ویران ہوگیا ، زندگی ہولناک !
میرے دل میں ایک خیال تھا جو مجھے تسکین دے رہا تھا ..... لیکن آج وہ بھی بجھتا رہا ۔
بھابی ! اخبار میں میں نے ریکھا کو اُس کے خاوند چند کانت آئی سی ۔ ایس کے ساتھ دیکھا مجھے محسوس ہوا کہ جیسے وہ میری طرف خاموش نگاہوں سے دیکھ رہی ہے ۔ اُس کے آنکھوں کے سرد خوفناک برفیلے سکون نے میری روح پر کپکپی طاری کر دی ۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرے احساس جامد ہو گئے ہوں روح ساکت اور دل برف کی قاش !! .... لیکن کبھی کبھی یہ الفاظ " میں نے اپنا سب کچھ تمہارے چرنوں پر بھینٹ کر دیا ہے ، مجھے بھلا نہ دینا یہی میری پرارتھنا ہے ۔ " روح کی گہرائیوں میں گونج اُٹھتے ہیں ۔

قطعہ

ڈاکٹر عندلیب شادانی

گلدان میں ہو کہ شاخ پر ہو ہر حال میں پھول خوشنما ہے
لیکن زلفِ سیہ کی شب میں ہر گل مہتاب بن گیا ہے



شربت اکسیر خاص رجسٹرڈ

یہ عجیب و غریب شربت اعلیٰ درجہ کا مقوی معدہ و جگر ہے کثیر مقدار میں خون صالح پیدا کرتا ہے خون کے ہر قسم کے نقص رفع کرتا ہے خون کے سرخ دانوں میں حیرت انگیز اضافہ کرتا ہے غذا کے ہضم میں اعانت کرتا ہے جسم کو قوی اور فربہ کرتا ہے۔ اعضائے رئیسہ کو طاقت پہونچاتا ہے بھوک لگاتا ہے ہر عمر کا آدمی ہر موسم میں بلا تکلف استعمال کرسکتا ہے قیمت فی شیشی جو دس روز کے لئے کافی ہے ایکروپیہ آٹھ آنہ

(ترکیب استعمال کا پرچہ شیشی پر چسپاں ہے)

ہمدرد دواخانہ یونانی ۔ دھلی

جنگ بذاتِ خود بھی موت کا خاتمہ کرے گی

ہم سب کو معلوم ہے کہ موجودہ جنگ کروڑوں انسانوں کا خون پی چکی ہے لیکن معلوم بہت تھوڑے لوگوں کو ہے کہ اتنے انسانوں کا خون پی کر جنگ خود موت کا خون پی کر موت ہی کا خاتمہ کرنے کی فکر میں ہے۔ اس حیرت انگیز حقیقت کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے ہندوستان کے بہترین ماہوار طبی رسالہ "ہمدرد صحت" کا نہایت ضخیم و شاندار نمبر **"جنگ اور طب"** ملاحظہ کیجئے جس میں زمانۂ جنگ کی ان حیرت انگیز طبی تحقیقات پر روشنی ڈالی گئی ہے جن سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ انسان موت کے بس میں نہیں ہوگا بلکہ موت انسان کے بس میں ہوگی۔ ہمدردِ صحت کے دوسرے خاص نمبروں کی طرح **جنگ اور طب** کا خاص نمبر بھی مستقل خریداروں کو پیش کیا جارہا ہے۔

ایک روپیہ سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر پیشگی بھیجکر آپ "ہمدردِ صحت" کے خریدار ہو سکتے ہیں۔ مگر چندہ فوراً بھیج دیجئے ورنہ اس سال کا خاص نمبر آپ کو نہ مل سکے گا۔ وی۔ پی کسی حالت میں نہیں بھیجا جا سکے گا۔

منیجر "ہمدرد صحت" دہلی

زمانہ

جلد ۸۳ اگست ۱۹۴۴ء نمبر ۲

ادب اور عصری ماحول

(از جناب محمد مرغوب احمد صاحب صدیقی ایم اے)

سرمایہ اقتدار کی آخری حدود کو پہونچ چکا ہے اور بقول جارج برنارڈ شا موجودہ جنگ کا سبب یہ ہے کہ سرمایہ داری میں بے پناہ طاقت جمع ہو گئی ہے اور اب وہ انگڑائیاں لے کر خود اپنے ہاتھوں تعمیر کئے ہوئے نظام کو ڈھا رہی ہے۔ اس ڈھائی ہوئی عالی شان عمارت کے سنگریزوں سے بہت سے چھوٹے چھوٹے اور سادہ گھر بنائے جائیں گے جن میں بے گھر اور مفلوک الحال مخلوق کے رہنے سہنے کا انتظام ہوگا اس قسم کے سیاسی عقائد کا اثر ادب پر بھی پڑ رہا ہے، اور ناقد، ادیبوں اور شاعروں کو سمجھا رہے ہیں کہ کوئی ادبی مرقع اس وقت تک مکمل نہ ہوگا جب تک اس میں دورِ حاضرہ کی معاشی زندگی منعکس نہو، دورِ حاضرہ کی معاشی زندگی کیا ہے ؟ ہندوستان میں ابھی تک سرمایہ داری کا دور دورہ ہے۔ مزدور طبقہ ایک بجھی ہوئی اور بے تاثیر زندگی بسر کر رہا ہے۔ جمہور یعنی عوام میں اتنی کشش، جاذبیت، رنگینی اور تاثیر نہیں ہے کہ وہ تخلیقی ادب پیدا کر سکیں یا کسی قسم کے ادبی احساس میں تحریک پیدا کریں ہم سرمایہ داری اور اشتراکیت کی دو دنیاؤں کے درمیان کھڑے ہوئے ہیں مگر سرمایہ داری روبہ انحطاط ہے اور کوئی ادبی رجحان جو اس دنیا سے متاثر ہو شگفتہ یا خوشگوار نہیں کہا جا سکتا۔ اشتراکیت ابھی مردہ ہے اور اس میں ابھرنے کی طاقت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ لہذا ادبی مسئلہ جیسا تھا ویسا کا ویسا ہے ادیب یا شاعر کو [illegible] دنیا کی تصویر کشی کرنا ہے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت کے حقوق کا موازنہ کرنے سے پہلے یہ سوال زیادہ اہم معلوم ہوتا ہے کہ ادب عصری حالات کا آئینہ ہوتا بھی ہے یا نہیں؟ اُردو اور انگریزی ادب کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے اس سوال کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ اگر ہم ادب کو عصری حالات کا آئینہ مان لیں تو اُردو ادب کا پلّہ بالکل خالی ہو جاتا ہے اور انگریزی ادب کے بحرِ میدان میں ولیم کریب (William Crabbe) کی تن تنہا شخصیت نظر آتی ہے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ غالب کی شاعری میں ۱۸۵۷ء کے ہولناک تہلکہ کا ذرا سا بھی اثر نہیں معلوم ہوتا اور شاعرانہ زبوں حالی کے علاوہ اُن کی اور اُن کے ہمعصروں کی شاعری میں کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہیں۔ اسی طرح سے غالب کے خطوط میں اس فضا کا ذرا سا بھی انکشاف نہیں ہوتا جس میں ان کا لکھنے والا ہر وقت سانس لیتا تھا۔ ان خطوط سے ظرافت اور خوش مزاجی ٹپکتی ہے جو کسی طرح بھی اُس زمانہ کے سیاسی ماحول کو آشکارا نہیں کرتی۔ اسی طرح سے انگریزی ادب میں چاسر (Chaucer) کو اپنے دَور کا واقعہ نگار شاعر لکھکر مجنوں گورکھپوری سے زبردست بھول ہوئی ہے۔ سطحی نظر سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "کینٹربری کی کہانیوں" میں چاسر نے اپنے خاص ماحول کے لوگوں کے مرقعے کھینچے ہیں مگر جن کا یہ خیال ہے وہ یہ نہیں جانتے کہ چاسر سے قبل ان مشہور کہانیوں کے بہت سے مسودے موجود تھے جن سے اس نے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا اور انھیں اپنے مقصد کے مطابق استعمال کیا ہے۔

سیاسی اور معاشی ماحول کی طرح کسی زمانہ کا ادب اُس عصر کے ادبی رجحانات کو بھی پورے طور سے ظاہر نہیں کرتا۔ اُردو کی موجودہ شاعری انقلاب پسند اشتراکی شاعری کے نام سے موسوم کی جاتی ہے مگر کیا اس شاعری کی جڑیں اس عصر کی مخصوص زمین میں پیدا ہوئی ہیں اور کیا ہندوستان کی موجودہ فضا اس کی نشو و نما کے لئے خاص طور سے موزوں کہی جا سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب بھی ہمیں اثبات میں نہیں ملتا۔ دورِ حاضرہ کی انقلابی شاعری کا مرکز جوش ملیح آبادی ہیں۔ ان کے اشعار میں ذاتی جذبات کی شعلہ فشانی نظر آتی ہے۔ کسی ادبی رجحان کا ذرا سا بھی پتہ نہیں چلتا۔ ان کی انقلابی شاعری کی بنیادیں انفرادی تخیل پر قائم ہیں اور ہندوستان کے سیاسی اور معاشی ماحول سے ہٹ کر اپنا ایک نیا راستہ بناتی چلی گئی ہیں۔ ایک ایسے فطرتاً باغی کی طرح جو کسی تمدنی نظام سے خوش نہیں رہ سکتا۔ جوش ملیح آبادی ہندوستان کے حالات سے غیر مطمئن نظر آتے ہیں، وہ انقلابی نہیں بلکہ باغی ہیں، وہ عیسیٰ مسیح کی طرح پرانی تہذیب کے کھنڈرات پر نئی تہذیب تعمیر کرنے کا پیام نہیں سناتے بلکہ پرانے کھنڈرات کو برباد کر کے نئے گارے اور چونے سے نئی عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی بغاوت سرمایہ دار انسان اور حکومت، دونوں کے خالقِ عالم تک پہونچتی ہے۔ اور اس دُنیا کا بنانے والا، سرمایہ دارانہ ذہنیت کے ساتھ، آدم

پر جبرو استبداد کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ عیش و طرب سے اجتناب کرنے کے حکم کو سرمایہ دارانہ ذہنیت کا اظہار سمجھتے ہیں، چنانچہ کشمیر جاکر اس حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

ممنوع طرب سے لطفِ پیہم لینے   عصیاں کے شجر کی چھاؤں میں دم لینے
آواز دو کہ کشمیر آپہونچا جوشؔ   اللہ سے انتقام آدم لینے

یہ شکلیں اُن کے دماغ میں سکڑ کر چھوٹی ہوتی چلی جاتی ہیں، حتیٰ کہ آدم محنت و مشقت سے کراہتا ہوا مزدور بن جاتا ہے اور خدا جابر حکمراں، اور پھر ذرا اور قریب آکر سرمایہ دار بن جاتا ہے۔

کلیم الدین احمد نے نہ جانے کیا سمجھ کر لکھدیا کہ جوشؔ کی شاعری عصر حاضر کی فضا میں سانس لیتی ہے ادب میں "نیا پن" سرے سے کوئی چیز ہی نہیں، یہ ایک دھوکا ہے جس میں نقاد قارئین کو اکثر مبتلا کرتے رہتے ہیں۔ انگریزی کا مشہور نقاد ای۔ای۔ کیلٹ اپنی مشہور کتاب "گردشِ ذوق" میں لکھتا ہے "وہ بچے جو اپنے بزرگوں کے خلاف انقلاب پیدا کرتے ہیں اکثر انھیں سے باغیانہ روح ورثہ میں پاتے ہیں اور انھیں سے وہ خیالات حاصل کرتے ہیں جو بغاوت کا سبب ہوتے ہیں، اور گورڈسورتھ اور کولرج خیال کرتے تھے کہ انھوں نے ماضی سے بالکل قطع تعلق کر لیا تھا لیکن وہ حقیقت میں پرانی بنیادوں ہی پر اپنی تعمیریں اٹھا رہے تھے، لہذا پرانے لوگوں کے نظریوں کی تردید کرتے وقت وہ حقیقت میں انھیں نظریوں کو اُن کی منطقی حدود تک پہونچا رہے تھے، اور ان کی انھیں کے ذریعہ سے تردید کر رہے تھے۔ تبدیلی صرف عروج ہوا کرتی ہے، وہ کبھی پرانی چیز کو مکمل طور پر ختم نہیں کرتی۔" انگریزی شاعری میں ڈرائیڈن (Dryden) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے مادّی دنیا سے کبھی باہر قدم نہیں نکالا، اور شیلی اور ورڈسورتھ نے اس کی مادّیت کو ختم کرکے ماورائیت (Transcendentalism) کی بنیاد ڈالی، مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیلی کی ماورائیت کی بنیاد ڈرائیڈن ہی کی شاعری میں پڑ چکی تھی، اور جب ڈرائیڈن لکھتا ہے

"ایک دلچسپ خوش آہنگی سے، ایک آسمانی خوش آہنگی سے، اس آفاق کا نقشہ تیار ہوا۔"

وہ حقیقت میں شیلی کی آسمانی دنیا کی سیر کر رہا ہے، اسی طرح سے شیلی کی ساری رومانیت اٹھارویں صدی کے شاعر ینگ کی نظم "افکارِ شب" اور بلیر کی نظم "قبر" میں موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شیلی اور ورڈسورتھ نے اٹھارویں صدی کے خیالات کو انیسویں صدی کی زبان میں ادا کیا۔

جیسا کہ ہم انگریزی شاعری میں دیکھ چکے ہیں جوشؔ میں بھی کوئی نئی بات نہیں، اُن کی وطن پرستی اقبال، چکبست اور ایسے ہی ہزاروں شاعروں کو ایک ہی تاگے میں پروتی ہوئی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ تک چلی جاتی ہے شاعری میں وہی تخیلی فضا ہے جو ہم میرؔ اور غالبؔ کی عشقیہ شاعری میں پاتے ہیں۔ ان کی

بھی باہر کی طرف نہیں بلکہ اندر ہی کی طرف کھلتی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ "حسن اور مزدوری" میں سڑک پر کنکر کوٹنے والی دوشیزہ جس کو جوش نے حسن سیرت اور حسن صورت دونوں سے مزین کیا ہے، میر اور غالب کے معشوق کی طرح شاعرانہ تخئیل کی پیداوار نہیں ہے۔ کلیم الدین احمد لکھتے ہیں کہ یہ دوشیزہ ایک نقطہ ہے جہاں سے جوش رواں ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ نقطہ ایک اصلی نقطہ نہیں ہے بلکہ سراسر فرضی ہے۔ جوش نے مزدوروں کے حسن کو ایک تخیئلی معیار بخش دیا ہے۔ دیدۂ نمناک میں نازکی بل کھا رہی ہے کاکل عنبریں دھوپ میں لہرا رہے ہیں۔ کم سنی کا لوچ ہے اور چیتھڑوں میں غمگین شباب ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابر کے آوارہ ٹکڑوں میں ماہتاب پنہاں ہے۔ بھلا اس حسن کو مزدور دوشیزہ کے پتھریلے جسم اور سیاہ فام رنگ سے کیا نسبت؟ انقلاب کا نعرہ اور پیام بیداری میں بھی کوئی بات نہیں۔ یہ بھی ایک بے معنی گرج ہے یہ نعرہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ ہندوستان، جب بابر کی فوج شکست کے قریب تھی۔ اس نے اپنا صہبائے رنگیں کا پیالہ توڑ دیا اور اپنے سپاہیوں کو عیش و طرب کی رنگینیاں چھوڑنے کی پرزور تلقین کی۔ جوش بھی قومی سپاہی کی حیثیت سے بابر کا نعرہ دہراتے اور نوجوانوں کو لالہ و نسریں پر جھومنے سے منع کرتے ہیں۔ صرف الفاظ کا ایک جادو ہے اور دور حاضرہ کی نئی لغت اور الفاظ کی نئی ترکیبیں ہیں جو جوش کی شاعری کو ایک نقلی نیاپن بخش دیتی ہے۔ ورنہ ان کی شاعری کو موجودہ زمانہ کی فضا سے ذرہ برابر بھی تعلق نہیں۔ "تخئیلیت" کے بغیر جوش کی شاعری بھی ایک بے جان چیز رہ جاتی ہے۔ اگر جوش کی شاعری سے "تخئیلیت" کا عنصر نکال دیا جائے تو یہ مزدور دوشیزہ، یہ کسان، یہ ضعیفہ سب آن کی آن میں غائب ہو جائیں گے اور صرف سڑک کے کنکر اور ہندوستان کے لہلہاتے ہوئے کھیت باقی رہ جائیں گے۔

احسان بن دانش اور مجاز کا بھی یہی حال ہے، ان کی شاعری بھی اپنے ماحول کی خصوصیات پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی۔ احسان بن دانش "دختر مزدور کی رخصت" اور "سادھو کی چتا" کے باعث مشہور ہوئے۔ "سادھو کی چتا" تو جمالیاتی خوبیاں رکھتی ہے، اس میں انھوں نے جزئیات کی مصوری میں کمال کر دیا ہے۔ ماحول سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ "دختر مزدور کی رخصت" میں انھوں نے ایک ایسے مضمون کو جو ہر دور اور ہر ملک پر صادق آسکتا ہے عصری خصوصیت دیدی ہے۔ اس میں بھی جوش کی شاعری کی طرح "تخئیلیت" کا زبردست عنصر پایا جاتا ہے۔ نفس مضمون ایک غیر طبعی سطح (Un-natural Plane) پر گردش کرتا ہے۔ مزدور کے جذبات کو ایک فرضی بے چینی سے آراستہ کیا ہے اور ایک طرف لڑکی کی عصمت اور جفاکشی کو غیر طبعی رنگ دیکر اور دوسری طرف اسکی اقتصادی حالت کی غیر اطمینانی صورت کو ابھار کر شاعر نے ذاتی جذبات کی شعلہ افشانی دکھائی ہے۔ بیچارے کا سارا

مضمون مصنوعی ہے اور وقتی اثر رکھتا ہے کیونکہ اثر شاعر کے مضمون اور ماحول کا نہیں بلکہ اس کے زور کلام کا ہے۔ مزدور طبقہ میں ایک اطمینانی حالت پائی جاتی ہے اور اُس بے چینی کا اظہار نہیں ہوتا جو احسان بن دانش نے دکھائی ہے۔ مضمون کا اُس عصر سے کوئی تعلق نہیں۔ مزدور طبقہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں ہوتا ہے اور اس قسم کی شاعریوں کو بھی دائمی سمجھنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آواز ؎

اے خالق کونین یہ تو نے بھی سُنا ہے لوگوں کو گماں ہے کہ غریبوں کا خدا ہے

صدا بصحرا ہو کر رہ جاتی ہے۔ مگر یہاں جوش کی طرح لغت نئی اور ترکیب الفاظ بھی نئی ہے۔ اسی طرح مجاز سرمایہ داری اور مزدوری کے صدہا سال پُرانے جھگڑے پر عامیانہ نظر ڈالتے ہیں۔ زمانۂ حال کی سرمایہ داری اور مزدوری کی جھڑپ کے کسی خاص پہلو پر قلم نہیں اُٹھاتے جس سے اس عصر کا امتیازی رنگ نمایاں ہو صرف سرمایہ داری کے خلاف ایک تقریر کرتے چلے جاتے ہیں ؎

کلیجہ پُھنک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے بتاؤں کیا تمھیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے۔

اور پھر بتاتے ہیں کہ سرمایہ داری ایک زبردست وبا اور مصیبت ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ داری پر ایک منظوم تقریر کی جا رہی ہے۔

"واقعیاتی" شاعری کو کم نظر نقاد ایک مخصوص دور کی سماجی حقیقت کا آئینہ سمجھ لیتے ہیں۔ نظیر اکبرآبادی کے بیان میں اکثر ناقدوں نے اس غلطی کا ارتکاب کیا ہے اور ایسے ناقدین کی صف میں نہ صرف مجنوں گورکھپوری، بلکہ پٹنہ کے ہوشمند سید قبیر کلیم الدین احمد بھی نظر آتے ہیں۔ "واقعیاتی" شاعری دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک ایسے مضامین کو لیتی ہے جو شاعر کے مخصوص دَور سے علیحدہ ہو کر کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور اُس عصر کی امتیازی خصوصیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ شاعری ٹھوس معانی میں واقعیاتی شاعری ہوتی ہے دوسری قسم کی واقعیاتی شاعری وہ ہے جس کے لئے شاعر اپنے ماحول سے تو ضرور مضامین اخذ کرتا ہے مگر یہ مضامین اُس دَور کی امتیازی شان کو نمایاں نہیں کرتے بلکہ عام طور سے ہر دَور کے لئے یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ نظیر اکبرآبادی کی اسی قسم کی واقعیاتی شاعری ہے۔ انھوں نے ہولی دیوالی اور میلے ٹھیلوں کے جو نقشے کھینچے ہیں وہ صدہا سال کی پُرانی چیزیں ہیں اور اُن کا اُس زمانہ کے خاص میلانات سے کوئی سروکار نہیں ہے نظیر کے برعکس ولیم کریب (Crabbe) کی شاعری اٹھارویں صدی کے انگلستان کے ایک خاص حصہ کی امتیازی خصوصیات کو نمایاں کرتی ہے۔ کریب اپنے زمانہ کے کچھ خاص اداروں اور رسوم کے نقشے کھینچتا ہے اور اُن پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ اُس نے اپنے گاؤں کے محتاج خانہ پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں جس میں منتظمین کی خود غرضی اور محتاجوں کی کس مپرسی کی عبرتناک تصویر کھینچی ہیں ان تصویروں سے اُس عصر کی

مخصوص فضا پر روشنی پڑتی ہے۔ اس نے مٹی کی کچی دیواروں کا نقشہ کھینچا ہے اور پھر ان کے اندر رہنے والوں کا ذکر کیا ہے ؎

وہ بچے جو ہیں ماں اور باپ کی اُلفت سے نامحرم
وہ ماں اور باپ ہیں، جن کو نہیں اولاد کا کچھ غم
شکستہ دل خواتیں ہیں پڑی غمناک بستر پر
طلاقن عورتوں، بن بیاہی ماؤں کا ہے یاں منظر
وہ وقفِ یاس بیوائیں نہیں جن کا کوئی پُرساں
وہ کہنہ سال جو رہتے ہیں بچوں کی طرح ترساں
ہیں لنگڑے اور اندھے یاں سب عیش و طرب ساماں
نظر آتے ہیں بے عقل اور پاگل بھی بہت شاداں (ترجمہ)

اس کے بعد وہ محتاج خانہ کے خود غرض ڈاکٹر کا ذکر کرتا ہے جس کے چہرے سے تجارت ٹپکتی ہے اور جس کے آنے کی رفتار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فوراً ہی واپس بھی جانا چاہتا ہے ؎

زِ سر تا پا غرور اور آنکھوں میں منظر تجارت کا
نہیں اُس پر اثر کچھ بھی ہے اس دنیائے عبرت کا
فسانہ جلد جانے کا ہے کہتی چال آنے کی (ترجمہ)

اِس کے بعد گاؤں کے پادری کا ذکر کرتا ہے جو اٹھارویں صدی کے پر تکلف اور ظاہر دارانہ مذہب اور اخلاق کا آئینہ دار ہے۔ ولیم کریب کی شاعری کے مطالعہ سے ہمارا دماغ اٹھارویں صدی کی مخصوص فضا میں پہونچ جاتا ہے مگر نظیر کا کلام پڑھکر ہم ہندوستان کے ایک مخصوص سماج میں تو پہونچ جاتے ہیں مگر وقت کا تعین نہیں ہوتا کیونکہ نظیر کی شاعری عصری ماحول سے بیگانہ ہے۔

جوش ملیح آبادی اور کریب کی شاعری کا موازنہ کرنے سے واقعیاتی اور تخئیلی شاعری کے باریک امتیازات معلوم ہوتے ہیں۔ بقول کلیم الدین احمد، جوش اپنے محسوسات مزدور دوشیزہ کے دل میں دیکھنے لگتے ہیں ؎

"غم کے بادل خاطرِ نازک پہ ہیں چھائے ہوئے"

اگر وہ اپنے جذبات سے بے اختیار نہ ہو جاتے اور دوشیزہ کے نفسیاتی حالات کا جائزہ لیتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ دوشیزہ اپنی افتادِ زندگی سے مطمئن ہے۔ کریب یہ غلطی نہیں کرتا۔ اُس کے مشاہدہ میں بے لاگ خارجیت (Disinterested objectivity) پائی جاتی ہے۔ وہ ہر چیز کو ذاتی جذبات

سے بالکل بیزار ہوکر دیکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ اُس کی شاعری صحیح معنوں میں واقعیاتی شاعری ہے اور جوشؔ کی طرح تخئیلی نہیں۔ وہ محتاج خانہ کے لنگڑے اور اندھوں کی حالت پر ماتم کرتا ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہدیتا ہے کہ وہ اپنی اس پست زندگی ہی میں مگن ہیں سہ

ہیں لنگڑے اور اندھے یاں بہت عیش و طرب ساماں
نظر آتے ہیں بے عقل اور پاگل بھی بہت شاداں

وہ عیش و طرب کے صحیح مفہوم اور چاشنی سے یکسر ناواقف ہیں اور یہی شاید ان کی زندگی کی سب سے زیادہ دردناک حقیقت ہے۔ جوشؔ کے یہاں یہ حقیقت مفقود ہے اور ذاتی جذبات کی فراوانی ان کی تصاویر کو مصنوعی اور غیر حقیقی بنادیتی ہے۔

بہرحال مجنوں گورکھپوری کی یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی کہ مزدور اور سرمایہ دار کے جھگڑوں کا فیصلہ ادیب یا شاعر کو کیوں کرنا چاہیئے۔ اگر شاعر سے انسان کو خوش کرنے اور کچھ عرصے کے لئے اِس دنیا کی تلخ حقیقتوں سے کنارہ کش کردینے کی خدمات چھین لی جائیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ خدمات کس طبقہ کے ذمہ رہیں گی۔ مجنوں تو خود بھی روحانیات کے بہت بڑے عالم ہیں اور افسانہ خواں طبقہ کو ایک عرصہ تک روحانی گولیاں کھلاکر مدہوش کرتے رہے ہیں۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ایک سمجھدار ادیب کا جو فرض مجنوں گورکھپوری نے خود ایک عرصہ تک ادا کیا ہے، اب اپنے ہمعصر ادیبوں کو اسی کی انجام دہی سے اجتناب کرنے کی پرزور تلقین کررہے ہیں۔ مزدوروں کی حمایت کے لئے بہت سی انجمنیں قائم ہیں اور یہ لیبر سوسائٹیز کافی اقتدار حاصل کرچکی ہیں۔ ادبی دنیا میں صحافت سے بھی اشتراکیت کا پروپیگنڈا ہورہا ہے مزدوروں کی حمایت میں تقریریں نشر بھی ہوتی ہیں اور شائع بھی ہوتی ہیں۔ سیاسیات، معاشیات اور اسی قسم کی نہ جانے کتنی "یات" پر آئے دن اخباروں میں کہرام مچایا جاتا ہے، اور اب چنداں ضرورت نہیں کہ شاعر بھی ان کہرام مچانے والوں کا ہمنوا بن کر پریشان اور گھبرائے ہوئے انسان کے دماغ کو اتنا پریشان کردے کہ وہ اس کی تاب نہ لاسکے۔

رباعی

باغیٔ عیشِ بے حسی ہوں میں　　　کشتۂ ذوقِ آگہی ہوں میں
آپ ہوں اپنے درپئے آزار　　　مختصر یہ ہے آدمی ہوں میں

شائق جھنڈوی

زنجیر

(از حضرت روشن صدیقی)

کم نگاہوں کی بنائی ہوئی زنجیروں سے
کردیا قیدیِ زندانِ جدائی ہم کو
سر کشیدہ ہے محالات کی دیوار بلند
پر شکستہ ہوئی جاتی ہے محبت کی کمند
زندگی پر درِ کاشانۂ اُمید ہے بند
اب تو ہر سانس ہے فرمانِ جدائی ہم کو

مفتیِ مسندِ تقدیس کا ارشاد بجا
قوم و مذہب کی یہ تفریق ہے برہانِ جلی
کیا یہی عدل ہے اے دشمنِ پیمانِ وفا
حکمِ فرقت پئے دو قالب و یکجانِ وفا
روبرو ہوں نہ کبھی روح شناسانِ وفا
اجنبی بن کے رہیں آہ حبیبِ ازلی

کہہ سکے کون، کہ دل توڑ گئے ہیں کتنے
رسمِ پارینہ و تقویمِ کہن کے نشتر
کتنے غنچے تھے جو اس جبر سے کھل ہی نہ سکے
چاک کتنے ہوئے دامن کہ جو سِل ہی نہ سکے
کتنے درماندۂ فرقت کبھی مِل ہی نہ سکے
آہ! نادانیٔ ابنائے زمن کے نشتر

اُردو میں غلط لفظوں کا استعمال

(از سید اختر علی تلہری)

اس زمانہ کے بہت سے ادیب و شاعر لفظوں اور محاوروں کے استعمال میں موقع و محل کی مناسبت کا لحاظ کرنا اپنے اجتہادی مذاق کے خلاف سمجھتے ہیں۔ نئے لفظوں اور نئی ترکیبوں کی تراش خراش کے شوق میں وہ اس کا ذرا بھی خیال نہیں رکھتے کہ اُردو نے اتنے دنوں کی شکست و ریخت کے بعد جو مزاج پکڑ لیا ہے یہ ابداع و اختراع اس کے بھی موافق ہے یا نہیں۔ تجدد پسندی کا یہ بہاؤ یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کی ایک حد یہ بھی آتی ہے کہ غلط لفظ اور غلط ترکیبیں بھی بغیر کسی پس و پیش کے استعمال کی جاتی ہیں، اور اگر اس غلط روی پر کوئی روک ٹوک ہوتی ہے تو یہ جواب ملتا ہے کہ "ادبی تجدد" یہ قیدیں برداشت نہیں کر سکتا۔ ان چیزوں کی پروا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اُردو کے قلمرو میں توسیع کی گنجائش ہی باقی نہ رکھی جائے۔

اس میں شک نہیں کہ تمدنی دنیا کی طرح ادبی دنیا میں بھی قدامت پسندی کا سکہ چل نہیں سکتا "تجدد" ناگزیر ہے، لیکن "تجدد مطلق" نہیں۔ ادبیات کے اقلیم کے اس حصہ میں صرف وہی "تجدد" ٹھیک ہو سکتا ہے جو "لسانیات" کے قوانین کے مطابق ہو۔ اگر لسانیات کے اصول ملحوظ نہ رکھے گئے تو پھر زبان کی کل درست نہیں رہ سکتی۔ اس کا ارتقا اگر ممکن بھی ہو تو بہت بھدے طریقے سے ہوگا۔

ضرورت کے مطابق ہمیں قطعی طور سے نئے نئے مفہوموں کے لئے نئے نئے لفظ تراشنا ہیں، نئی نئی اصطلاحیں وضع کرنا ہیں۔ زبان کے مزاج کے موافق جو نئے محاورے بھی مل سکیں انھیں اپنی زبان کے دامن میں جگہ دینا ہے مگر ان تمام اجازتوں کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ اس آزادی کے راستہ پر بغیر سوچے سمجھے چلا جائے۔ اگر اس جائز آزادی کی جائز حدبندی سے غفلت برتی گئی تو اس کا یہ نتیجہ نکلنا لازمی ہے کہ ہر عامی سے عامی شخص اپنی بے سوادی کی رَو میں جو غلط لفظ استعمال کر دے اُسے مستند لغات کی صف میں جگہ دے دی جائے۔ اس طرح لفظوں کی چھان بین کا نہ تو ذوق ہی تربیت پا سکتا ہے اور نہ زبان ہی کوئی مزاج پکڑ سکتی ہے۔ ہر زبان کی دنیا میں یہ بے قاعدگی یہ بدنظمی نہایت ہی خطرناک ہے، اس کی اجازت دی ہی نہیں جا سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ جب زبان عمومیت اختیار کر لیتی ہے اور عوام تک

کے شیشۂ اطلس سے نکل کر عوام کی جھونپڑیوں میں قدم رکھتی ہے تو پھر اُسے اطلس و کمخواب کی نفاستوں ہی سے واسطہ نہیں رکھنا پڑتا ہے بلکہ موٹے جھوٹے گاڑھے گزی سے بھی تعلق رکھنا پڑتا ہے "عوامی ادب" میں بہت سے وہ الفاظ اور محاورے جگہ پا جاتے ہیں جو خاصہ کے ادب" میں نہیں ملتے مگر واضح رہے کہ زبان عوام سے گھلنے ملنے کے بعد بھی انھیں اصلاحوں کو سر آنکھوں پر جگہ دیتی ہے جو اس کے مزاج کے موافق خوبصورت طور پر ہو سکتے ہیں۔ "غلط العام فصیح" کا قانون اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے۔ ایک زبان دوسری زبان کے لفظوں کو اپنے مزاج کے موافق اپنانے کا حق رکھتی ہے، مگر یہاں جو بات عرض کی جا رہی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ کثرتِ استعمال کی خراد پر چڑھ کر دوسری زبان کا لفظ ایک نئی شکل اختیار کر لے اور دوسری صورت یہ ہے کہ ایک فرد انفرادی طور سے دوسری زبان کے لفظ جنھیں عوام کے محاورہ سے تعلق نہیں ہے غلط طور پر استعمال کرے۔ ان دونوں صورتوں میں بڑا فرق ہے پہلی صورت میں ایک عام لسانی قانون کارفرما ہے تو دوسری صورت میں مزاج اور انتشار کی حکومت ہے۔

یہاں جس چیز کو روکا جا رہا ہے وہ دوسری صورت ہے۔ انگریزی "لینٹرن" کا "لالٹین" ہو جانا تو لسانی نقطۂ نظر سے بالکل ہی قانونی بات ہے مگر "حق بشر کے حقوق اور افراض کیا ہیں" میں افراض کا استعمال "فرض" کی جمع کی حیثیت سے قطعاً قابلِ اعتراض ہے۔ "افراض" عوام کے محاورے سے تعلق نہیں رکھتا، اردو نے اسے اب تک اپنایا بھی نہیں ہے۔ پھر فرض کی یہ جمع جو کبھی سُنی نہیں گئی کیوں اردو میں استعمال کی جائے اور کیوں اس کے جواز کی سند تجدد کی دنیا میں ڈھونڈھی جائے۔

اس وقت ان چند سطور کے لکھنے کی تحریک جناب ساغر نظامی کے دیوان کے مطالعہ سے ہوئی جناب ساغر مشہور تجدد پسند شاعر ہیں، ان کا ترنم دلوں کو خاص طور سے موہ لیتا ہے۔ اس مجموعہ کی طباعت و کتابت میں حسنِ مذاق کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔

کلام میں تنوع بھی اچھا خاصا موجود ہے، عام طور سے کلام میں کشش پائی جاتی ہے۔ تاہم غور کی نظر ساغر کی شاعری کے تمام اہم پہلو مدنظر رکھتے ہوئے انھیں موجودہ نظم نگاروں کی صفِ اول میں جگہ نہیں دے سکتی، تاہم یہاں ان چیزوں سے بحث منظور نہیں ہے۔ صرف ان بعض لفظوں کا تذکرہ مطلوب ہے جو غلط معلوم ہوتے ہیں۔ وہ بھی خردہ گیری کے مقصد سے نہیں بلکہ اس اصولی مسئلہ کو اہلِ نظر کے سامنے لانے کے لئے کہ الفاظ کے استعمال میں ان انفرادی بے اعتدالیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے اگر کوئی ایسی اکاڈمی ہوتی جو اس قسم کے الفاظ کے متعلق اپنی سوچی ہوئی کبھی ہوئی رائے ظاہر کر سکتی تو کیا کہنا تھا، لیکن آج کل تو پولو اور نیزوں کی گونج کی حالت میں ایسے خواب دیکھنا بھی نادانی ہے۔

ساغر صاحب سے معافی مانگتے ہوئے مختصر طریقے سے وہ لفظ یہاں درج کئے جاتے ہیں وہ الفاظ اور وہ ترکیبیں نظر انداز کی جا رہی ہیں جن میں اردو زبان کا مزاج دیکھتے ہوئے "تنافر" موجود ہے۔

(۱) نئی شراب سے دامن کو لالہ زار کریں — سُرورِ تازہ سے پھر مقدم بہار کریں

"مقدم بہار کرنا" اردو محاورہ کے مطابق نہیں معلوم ہوتا۔ محاورہ میں "خیر مقدم کرنا" رائج ہے "خیر" کا اس مقام سے حذف صحیح نہیں ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ جوش نے بھی کسی نظم میں مقدم خیر کے حذف کے بعد استعمال کیا ہے۔ جوش سے بھی محاورہ کے استعمال میں فروگذاشت ہوئی ہے

(۲) مگر وہ علم نتیجہ ہو جس کا ظلم و جہول — ہے ایک لعنتِ ناپاک کل جہاں کے لئے

جہُول مبالغہ کا وزن ہے جس کے معنی زیادہ جاہل کے ہیں، اس لئے "ظلم و جہول" کی ترکیب اس مقام پر اپنے معنی کے لحاظ سے بہت ہی غیر مناسب ہے۔

"ظلم و جہل" کا یہاں استعمال ہونا چاہیئے تھا۔ "جہول" کی مناسبت سے "ظلوم" کا استعمال مناسب ہوتا "انہ کان ظلوماً جہولاً"

اے علم بردارِ مذہب اے دماغِ منتشر — تو نے مذہب پر کبھی ڈالی بھی ہے گہری نظر

"مُنتَشَر" شین کے فتحہ زبر کے ساتھ مجھے تو صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ حضرت سیماب و حضرت جگر و حضرت آسی لکھنوی نے بھی منتشَر شین کے زبر کے ساتھ نظم کیا ہے۔

"انتشار" عربی مصدر ہے جس کے معنے پھیلنے کے ہیں، پھیلنا لازم ہے، پھیلانا البتہ متعدی ہے، اس کے لئے عربی میں لفظ "نشر" ہے۔ مصدر لازم کا اسم مفعول نہیں بنتا۔ منتشَر شین کے زبر کے ساتھ اسم مفعول بھی ہو سکتا ہے، اسم ظرف کا کوئی محل نہیں لیکن جبکہ لفظ "انتشار" عربی لغات کی تشریح کے بموجب مصدر لازم ہے تو پھر اس کے اسم مفعول کے معنی ہی کیا ہوئے۔ منتشِر شین کے زیر کے ساتھ اسم فاعل ہے اور صحیح ہے مگر وہ نَظَر کا قافیہ نہیں بن سکتا۔ یقیناً باب افتعال اپنی خاصیت کے لحاظ سے لازم نہیں ہے اور انتشار باب افتعال ہی سے ہے لیکن بہت سے وہ لفظ جن کے ف کلمہ کی جگہ "نون" ہے اور ہم مصدر لازم کے معنی پیدا کرنے کے لئے باب "انفعال" کی شکل میں انھیں لانا چاہتے ہیں جو بالخاصہ لازم ہے مگر ف کلمہ کی جگہ پر نون موجود ہونے کی وجہ سے "نون" دو جمع ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں ثقل دُور کرنے کے لئے باب انفعال کا کام "افتعال" سے لے لیتے ہیں۔ اس طریقے سے باب افتعال کے بعض میں آنے والے مصدر مصدر لازم ہی رہتے ہیں۔ منتہی الادب وغیرہ میں "نشر" مادہ کے ذیل میں لفظ "انتشار" سے بحث کرتے ہوئے اس کی خاص طور پر تشریح کر دی گئی ہے۔ علمائے لغت کی تصریح کے بعد انتشار [illegible] متعدی ہو سکنے کا احتمال

پیدا کرنا بالکل ہی بیکار ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جہاں تک عربی لغت کا تعلق ہے منتشَر بفتح الشین اسم مفعول کے صیغہ کی حیثیت سے قطعاً صحیح نہیں ہے۔

اب بحث یہ ہے کہ منتشَر شین کے زبر کے ساتھ اُردو کے تصرفات میں سے ہو تو یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ عام طور سے اُردو میں یہ لفظ شین کے زبر کے ساتھ استعمال نہیں ہو رہا ہے۔ چند افراد کے استعمال سے اُردو کا تصرف ثابت نہیں ہوتا۔ موجودہ منزل میں اس لفظ کے استعمال کو غلط قرار دینا ناگزیر ہے۔ اس مقام پر یہ بھی اس کا تذکرہ بھی کر دیا جائے کہ اس قسم کے غلط الفاظ کے جواز استعمال کی سند میں اُردو یا فارسی کے پُرانے دیوانوں سے دو ایک شعر پیش کرنا کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتا جس طرح موجودہ اساتذہ سے غلطی استعمال میں ہوتی ہے اُسی طرح اُن پُرانے اساتذہ سے بھی غلطی ہوگئی ہے۔ اُن کی غلطی سے اس غلطی کو حق بجانب نہیں ثابت کیا جا سکتا۔ اگر کسی دور کے تمام با سواد ممتاز شعرا کے یہاں سے کسی غلط لفظ کا استعمال ثابت کر دیا جائے تو پھر اُسے اُس زبان کے تصرفات میں شمار کیا جا سکتا ہے اس کی مناسب مثال فارسی میں "کافر" ہے عجمی شعرا نے "ف" کے زیر کو زبر سے بدل لیا ہے۔

اسی طرح کی غلطی ساغر کے اس شعر میں بھی موجود ہے:۔

سایہ کناں فضا میں بہت دور تک ہوا
پیر عقل انحطاط میں خود منہمک ہوا

"منہمَک" دوسرے میم کے زبر کے ساتھ صحیح نہیں ہے، کیونکہ انہماک مصدر لازم ہے اس کا اسم مفعول نہیں ہوتا "میم" کے زیر کے ساتھ صحیح ہو سکتا ہے مگر پھر "تک" کا قافیہ کیونکر بنے گا۔

(۵) "طمانیت" سے خالی تھی کنارِ آرزو جن کی"

صحیح لفظ "طمانینت" دو "نون" کے ساتھ ہے۔ اس کی جب تصغیر بنائی جاتی ہے تو ایک "نون" حذف کر دیا جاتا ہے اور "طُمَیْنَہ" کہا جاتا ہے۔ یہ "طمانیت" کہاں سے حدودِ اُردو میں داخل ہوگئی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اُردو نے "طمانینت" کو "طمانیت" کی شکل میں اب تک اپنایا بھی نہیں ہے "اطمینان" کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت بھی غالباً نہیں ہے۔ یہ ضرور سچ ہے کہ اگر اس لفظ کے استعمال کی ضرورت ہو ہی جائے تو پھر جہاں تک اُردو کے مزاج کا تعلق ہے "طمانیت" "طمانینت" سے زیادہ سُبک اور ہلکا ہے۔

(۶) "بیٹھ کر افسرِ طاؤس" پہ کچھ کام کریں"

لغت میں "افسر" کے معنی تاج یا کلاہ کے ہیں۔ افسر کے اس معنی کے لحاظ سے "افسرِ طاؤس" مضحک سی بات ہے۔ کیا مور کی کلغی پر بیٹھ کر کچھ کام کرنے کا ارادہ ہے؟ اردو میں دوسرا افسر انگریزی "آفیسر" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس کے لحاظ سے بھی کوئی معنی نہیں بنتے۔ اگر "افسر" کے معنی تخت کے ہوتے

تو یہ تخت طاؤس کے معنی نکل سکتے تھے مگر "افسر" کے معنی تخت کے تو میری نظر سے گذرے نہیں۔ ایسا خیال ہوتا ہے کہ جناب ساغر کو "افسر اور اورنگ" میں اشتباہ ہوا۔ "اورنگ" کو انھوں نے افسر سمجھ لیا اور اسی نے افسر طاؤس پر بیٹھکر کچھ کام کرنا شروع کر دیا۔

بہت ممکن ہے کہ بحث کا پہلو بدل کر اب تجدد پسند شعرا کی طرف سے کہا جائے کہ موجودہ اصولِ نقد کی بنا پر لفظوں سے بحث بیکار ہے۔ اصلی چیز مفاہیم و خیالات ہیں، ان کے مقابلہ میں الفاظ و اسالیب بیان کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ لفظوں کا دور گذر چکا اب معنی کا دور ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ مغالطہ ہی مغالطہ ہے۔ لفظوں کا دور جس طرح پہلے تھا اب بھی ہے۔ معنی کی اہمیت گھٹانے کا کوئی سوال نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اچھے لفظوں کے ہاتھ میں پہونچکر معنی بولنے لگتے ہیں۔ اگر بے جان لفظ ہوتے ہیں یا اُن کا اسلوب ادا پھُسپھُسا ہوتا ہے تو اچھے خاصے معانی و مفاہیم کی تازگی ختم ہو جاتی ہے۔ پاکیزہ خیال اگر پاکیزہ لفظوں میں ادا نہیں ہوتا تو خیال کی پاکیزگی دب کر رہ جاتی ہے۔ پاکیزہ لفظ اُس کو اور زیادہ نکھار دیتے ہیں۔ آجکل کی بہت سی نئی ادبی و شعری کوششیں بیشتر الفاظ و طرز ادا کی خرابی کی وجہ سے ناکامیاب ہو کر رہ گئی ہیں۔

آرٹسٹ (فنکار) کی توجہ کا رُخ اگر الفاظ کی طرف پُورے طور سے مڑا ہوا نہیں ہے تو وہ اپنے فن میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ شعر و شاعری کی دنیا میں الفاظ و اسالیب ادا کو ضمنی و ثانوی حیثیت دینا شدید قسم کی غلطی ہے، نیز لفظوں کی صحت و سقم اُن کی فصاحت و عدم فصاحت اُن کی موزونیت و غیر موزونیت سے بحث اب بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی پہلے تھی۔

غزل

(حضرت منوّر لکھنوی)

جب تکا ہوں کو جھکا لیتا ہوں
تجھے آغوش میں پا لیتا ہوں

اِک تجھے دل میں بٹھانے کے لئے
ہاتھ دُنیا سے اُٹھا لیتا ہوں

کیا ان آنکھوں کا زیاں ہوتا ہے
چار آنسو جو بہا لیتا ہوں

آگ جب دل میں بھڑک اُٹھتی ہے
مَیں ہی خود اُس کو بجھا لیتا ہوں

دیکھتا کیا ہوں کسی کی جانب
اپنی تقدیر بنا لیتا ہوں

کیا کہوں کیا نظر آتا ہے مجھے
خود کو جب خود سے چھپا لیتا ہوں

لطفِ کلام

(از مولوی محمد یعقوب خاں صاحب کلام بی۔اے)

تڑپ رہا ہوں شبِ غم بسر نہیں ہوتی
مہم طویل ہے اتنی کہ سر نہیں ہوتی

وہ آنکھوں آنکھوں میں اس طرح بات کرتے ہیں
کہ کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہوتی

کمالِ ضبط ہے یا احترامِ غیرتِ عشق
کہ دل تو روتا ہے پر آنکھ تر نہیں ہوتی

جو لاکھ پردے اٹھا کر نہ دیکھ لے جلوہ
نگہ تو ہوتی ہے لیکن نظر نہیں ہوتی

مری زباں سے مری داستانِ غم نہ سنو
یہ سرگزشت کبھی مختصر نہیں ہوتی

الٰہی خوانِ کرم سے کچھ اور تحفہ دے
کہ خالی خونِ جگر سے گذر نہیں ہوتی

طلوعِ مہرِ مسرت کہاں نصیب کلامؔ
ہماری شام رہینِ سحر نہیں ہوتی

حکومت دو عملی

(از جناب ارشاد فاطمی، ایم۔ اے)

جنگ بکسر اور صلحنامۂ الٰہ آباد ۱۷۶۵ء نے کمپنی کا اقتدار صوبۂ بنگال پر پوری طرح قائم کر دیا۔ شہنشاہ دہلی اور نواب اودھ کی قسمتوں کا فیصلہ تو ہو ہی چکا تھا، نواب بنگال کا اب اپنے صوبے کو واپس آنا محال بلکہ ناممکن تھا۔ میر قاسم کے زوالِ مملکت کے بعد میر جعفر کو دوبارہ مسندِ بنگال ملی مگر ان کا پیمانۂ عمر لبریز ہو چکا تھا، فروری ۱۷۶۵ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ مسندِ مرشد آباد کی آبرو قریب برباد ہو چکی تھی، رہی سہی جو عزت میر جعفر کی شخصیت سے اسے حاصل تھی اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ ہزار وطن فروش ہو، پھر بھی میر جعفر کو شخصی آبرو اور حفظِ مراتب کا بڑا خیال تھا۔ چنانچہ جب شہنشاہِ دہلی کی شکست اور صلحنامہ کی خبر اس کے گوش گذار ہوئی تو بولا "یک آبرو ماندہ آں ہم رفت"۔ اس کے بعد مسندِ مرشد آباد اس کے بیٹے نجم الدولہ کے سپرد ہوئی۔ دربار بنگال میں ایک ایسی جماعت بھی موجود تھی جو فرزندِ میرن بن میر جعفر کے حقوق کی تائید کر رہی تھی در پردہ اس چال کی محرک منی بیگم تھی۔ مگر میرن تو میر جعفر کی زندگی ہی میں اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا، از روئے قانونِ مذہب اثنا عشری مسند نجم الدولہ ہی کے حوالہ ہوئی۔ کمپنی نے اپنے اس نئے انتخاب کی کوئی خبر دہلی دربار کو نہ دی اور رسمی طور سے بھی شہنشاہ ہند کی منظوری حاصل نہ کی۔ مورخ مل (Mill) کمپنی کی اس روش پر معترض ہے۔

۲۰۔ فروری ۱۷۶۵ء کو نواب اور کونسل کے درمیان ایک نیا عہد و پیمان ہوا جس کی مندرجۂ ذیل شرطیں اہم اور قابلِ غور ہیں:۔

۱۔ نواب کو صرف اتنی فوج رکھنے کا حق حاصل ہے جو اس کے رتبہ اور دبدبہ کو قائم رکھ سکے۔

۲۔ نواب انہیں آدمیوں کو ملازم رکھ سکتا ہے جن پر کمپنی کو پورا اعتماد ہے۔

۳۔ نواب حکومت دہلی کو سند و پروانہ وغیرہ وغیرہ کے لئے محض کونسل کلکتہ کے وسیلے سے رجوع کر سکتا ہے۔

شرط نمبر ۳ صلحنامۂ الٰہ آباد کے متضاد ہے کیونکہ قانونِ شرعی کی رو سے کمپنی کو صرف دیوانی کا حق حاصل تھا نہ کہ نظامت کے اعلیٰ حقوق میں مداخلت کا

ان شرائط نے نواب کے حقوق کی روح سلب کر لی۔ علاوہ بنگال، بہار اور اڑیسہ کی ناگفتہ بہی کے نواب
کو پانچ لاکھ روپے ماہانہ انتظام جنگ کمپنی بہادر کو نذر کرنا پڑا۔ ماسوا خود سابقہ مراعات بھی علی حالہ قائم رہیں
یعنی کمپنی کے حکام کو آزادانہ تجارت کی اجازت اور نمک پر چنگی کی وصولی۔ شرط دوم کا در پردہ منشا یہ تھا کہ
راجہ نند کمار کو معزول کر دیا جائے۔ کیونکہ حکومت کو نواب سے راجہ نند کمار کی وابستگی مفاد کمپنی کے لئے
مضرت رساں معلوم ہوتی تھی۔ مورخ ڈاڈول (*Dodwell*) کا خیال ہے:

"The total remval of Nand Kumar had been in fact essential to success of the English plan."

(انگریزوں کے عزائم کی کامیابی کے لئے اشد ضروری تھا کہ نند کمار دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا جائے)
راجہ نند کمار کے علیحدہ ہوتے ہی نظام حکومت درہم برہم ہو گیا۔ نواب کی حالت اُس کٹھ پتلی کی سی ہو گئی
جو بازی گر کے اشاروں پر ناچتی ہے۔ طرفہ یہ کہ کمپنی کے خود غرض حکام بنا اپنا داؤ ڈالکر جو کام چاہتے کر لیتے۔
ملک کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ خود لارڈ کلائیو اس زمانے کی تصویر یوں کھینچتا ہے:

I can only say that such a scene of anarchy, confusion, bribery and extortion was never seen or heard of in any country except Bengal, nor such as so many fortune acquired in so unjust and rapacious manner."

"میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ بنگال کے سوا کسی اور ملک میں کسی نے بے امنی، اختلال و انتشار، رشوت ستانی
اور استحصال بالجبر کا منظر نہ آنکھوں دیکھا اور نہ کانوں سُنا ہو گا۔ کہیں بھی اتنے لوگوں نے ناجائز اور جابرانہ
طریقے سے اتنی دولت نہ حاصل کی ہو گی:

کورٹ آف ڈائرکٹرز (*Court of Directors*) نے ان حالات کی اصلاح کے لئے لارڈ کلائیو کو
ریفارم کمیٹی (*Reform Committee*) کا صدر منتخب کیا اور اس کے دیگر ممبر میجر کارنک *Major Corlac*
مسٹر وراسی لٹ (*Mr Verasellet*) وغیرہ مقرر ہوئے۔ ملک کی حالت اس قدر ابتر ہو گئی تھی کہ اصلاح ناممکن
تھی جس کی مجلس منتخبہ (*Select Committee*) کی رپورٹ محررہ ۱۹ مئی شاہد ہے۔

We beheld the Presidency headstrong, the Govt. almost nerveless, a treasury without money, services without discipline or sprit of in-subordination. Amidst the general stagnation of usefull industry

the individuals were accumulating the chase which they ravished from the insulted Prince and his helpless people who was under the united pressure misery and oppression."

(" ہم نے پریزیڈنسی کو خودسر، حکومت کو بیدم، خزانے کو خالی، ملازمین کو اطاعت و فرمانبرداری سے بے بہرہ پایا، جبکہ صنعت و حرفت بالعموم شکارِ جمود و خمود تھی، لوگ اس مالِ غنیمت کے جمع کرنے میں مصروف تھے جو انھوں نے اس نواب سے جھپٹ لیا تھا جس کی جناب میں وہ مرتکب گستاخی ہوئے تھے اور جس کی رعایا مصائب و مظالم کے بوجھ کے نیچے دب رہی تھی۔")

قبل اس کے کہ کلایو کوئی اصلاح شروع کرتا، ملک کی حفاظت کے لئے دیگر بیرونی طاقتوں سے صلح اور آشتی کرنا ضروری تھا۔ اس لئے نواب وزیر، شہنشاہ اور نظام سے الگ الگ صلحیں کی گئیں۔ مرہٹوں کا اقتدار بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ غازی الدین عماد الملک کے زیر اثر دہلی دربار اور مرہٹوں میں گٹھ جوڑ ساز باز تھا۔ کلایو نے کمپنی کی سرحد مستحکم کرنے کے لئے بلونت سنگھ زمیندار بنارس کو بنارس حوالہ کیا۔

ٹھیک اسی زمانے یعنی ۱۷۶۵ء میں ناواقف برطانوی دارالعوام (House of Commons) نے ہندوستانی معاملات میں دخل دینا چاہا، چنانچہ جارج سوم اور خود دارالعوام کا خیال تھا کہ ہندوستانی تاج کو قائم رکھنے کے لیے شہنشاہ دہلی کی ہر ممکن امداد کی جائے۔ چنانچہ صلحنامہ ہائے الہ آباد و دیوانی بہار و بنگال میں اس خیال کی جھلک نظر آتی ہے۔ خود شاہ عالم نے تین خط جارج سوم کو لکھے مگر نہیں معلوم ان کا کیا حشر ہوا۔

کلایو جب اپنی گہری چالوں سے کمپنی کی بنیادیں مضبوط کر چکا تو بنگال کے اندرونی معاملات کا مسئلہ پیش آیا۔ عہدنامۂ دیوانی صوبۂ بنگال و بہار کے بموجب کمپنی، فوج و صیغۂ مال کی مالک تھی۔ بہ تقاضائے چند مصالح لارڈ کلایو نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں نہ لی۔ ۱۶۔ جون ۱۷۶۷ء کو اُس نے مجلس منتخبہ کو لکھا۔

The first point in politics which hah appealed to consideratin is the form of Govt. We are sensible that since the aquisition of the Diwani, the Power formerly blonging to the Suba (Subedar) of these provinces is totally in fact vested in the E. I. Co. Nothing remains to him but the name and shadow of authority. This name however, this shadow is indispensibly necessary;

or should simply venelerate under a sanction of the Suba. Every encroach ment that may be attempted by foreign power can be effectually grasped without any apparent extraposition of our own authority and all real grevance complained by them, can through the same channel be examined in to and against.

(سیاست کا وہ پہلا نکتہ جو طالب غور ہے یہ ہے کہ طرز حکومت کیا ہو، ہمیں اس کا احساس ہے کہ جب سے ان اضلاع کے صوبہ دار کے اختیارات ہمیں حاصل ہو گئے ہیں، حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں پر آگئی ہے۔ اُس کے پاس نام کو جھوٹ موٹ کی حکومت رہ گئی ہے۔ مگر اس کے بغیر چارہ نہیں۔ ہمیں صرف صوبہ دار کا نام لے کر کام کرنا چاہیئے۔ جب کوئی غیر ملکی طاقت کسی قسم کے اقدام کی کوشش کرے تو میدان میں آئے بغیر ہم اس کا سر کچل سکتے ہیں اور اسی ذریعہ سے تمام حقیقی شکایات کی تحقیق و تفتیش ہو سکتی ہے)

اِس طرح صیغۂ مال اور فوج کمپنی کے اور محکمہ عدل و انصاف نواب کے ہاتھ میں رہا۔ کلایو کی اس نئی چال سے بنگال میں دو عملی حکومت قائم ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام صوبہ کا امن و امان برباد ہو گیا۔ کمپنی کے پاس طاقت اور زور رہا، مگر نواب کے ماتحتوں کے ذمہ ایک غیر ذمہ دار عدالت، کمپنی کے خود غرض حکام، ظالم امین و عامل، اور بیہودہ مقدموں نے رعایا کو لوٹنا اور تباہ کرنا شروع کر دیا۔ اس پر قحط سالی

سمندِ ناز کو اِک اور تازیانہ ہوا

رہزن اور ڈاکو گروہ در گروہ، شہر شہر، گلی گلی، اور کوچہ کوچہ پھرنے لگے۔ دوامی بندوبست *Permanent settlement* سے پہلے تحصیلِ مال کے لئے عام طور سے عامل اور امین مقرر تھے۔ مگر اس بار کمپنی نے ٹھیکہ دار مقرر کئے جنہوں نے ملک کو اور بھی لوٹنا شروع کیا۔ غریب کسانوں کی عزت سر بازار نیلام ہونے لگی۔ اس پر طرفہ یہ کہ کمپنی کے اکثر حکام کی ذاتی تجارت نے عام ملکی تجارت کا گلا گھونٹ دیا۔ غریب دستکاروں اور کپڑا بُننے والوں کے سروں پر وہ وہ ستم توڑے گئے کہ الاماں و الحفیظ۔ حکومت کے اخراجات کے بعد جو روپے محکمۂ مال میں بچتے وہ یا تو کمپنی کے ملازموں کی تنخواہ کھا جاتی یا اس کے سلسلہ تجارتِ چین (*China Investment*) کی نذر ہو جاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صوبۂ بنگال کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ عوام گلیوں میں فاقہ کے مارے پھرنے لگے۔ باوجود ان ابتر حالات کے کمپنی کے مالکوں کا خیال تھا:

"Bengal cow was capable of yielding still milk."

(یہ بنگالی گائے ابھی اور دودھ دے سکتی ہے۔)

مسٹر رچرڈ بیکر (Mr. Richard Becker) ہم عصر کلایو تحریر فرماتے ہیں:-

"The grievous oppression committed on the ryots by the Amins or the Revenue contractors, the oppression on the weavers and the manufacturers by the Company's servants, the trickery of the merchants who used to change unneccessary lbarters are in-to toler."

(جو ظلم و استبداد رعیت پر امین یا دیوانی کے ٹھیکہ دار کرتے ہیں، جو ستم جلاہوں اور دستکاروں پر کمپنی کے ملازم توڑتے ہیں، جو چالیں تاجر اپنے مال کے خواہ مخواہ مبادلے کے لئے چلتے ہیں، انھیں دیکھکر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔)

ملک کی بعینہ یہی حالت تھی جیسا کہ مسٹر گلے (Mr. Glay) اپنی کتاب (Memories of Hastings) ۱۸۵۰ء میں تحریر کرتے ہیں۔

The new Govt of Company censisted of an undigested heap of materials, as wild as the chaos itself.

کمپنی کے نئے ایوانِ حکومت کی تعمیر بہت ہی بے جوڑ سنگ و خشت سے ہوئی تھی، اس لئے ہم آہنگی کا بعید ی امکان بھی نہ تھا۔ اس حکومت اور بے امنی میں کوئی فرق نہ تھا۔"

اِن حالات کے پیشِ نظر کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ۱۷۷۲ء میں وارن ہیسٹنگز کو بنگال کا گورنر مقرر کیا۔ مگر صوبہ کی حالت لارڈ کارنوالس کے عہد تک اطمینان بخش نہ ہوئی۔ قدیم و جدید نظاموں کا گھُل مل کر ایک ہو جانا کھیل نہ تھا۔

آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

غزل

جناب افضل جعفری (افسر حاضری جنگ)

مست آنکھوں سے پیئے جاتا ہوں — دل کو سرشار کئے جاتا ہوں
شوق میں تالفوں کی پکاروں کے — مر کے بھی سانس لئے جاتا ہوں
دیکھ لے جاکے نہ آنے والے — تیرے وعدے پہ جئے جاتا ہوں
اور فرقت میں تمناؤں کو — مَیں دلاسے ہی دیئے جاتا ہوں
زخم سینے کے جگر کے دل کے — کھلتے جاتے ہیں سیئے جاتا ہوں
زندگی تلخ ہوئی جاتی ہے — زہر کے گھونٹ پیئے جاتا ہوں

حسرتِ پارینہ

(از فرحت کانپوری بی ۔اے۔ ایل ایل بی وکیل)

(۱)

طرب انگیز خوابوں کی نئی دنیا میں رہتا ہوں
زبانِ راز میں افسانۂ اسرار کہتا ہوں
جہانِ دل میں رہتا ہوں، نظامِ جبر سہتا ہوں
میں اپنے نغمۂ رنگیں ادا کی رو میں بہتا ہوں

(۲)

میں اُس کی آنکھ کے آنسو کے ہر قطرے میں رہتا ہوں
میں زندہ ہوں کہ مجکو زندگی کا لُطف حاصل ہو
دلِ بے حس کسی بے حس کا میری سمت مائل ہو
اِسی سے زندگی میں موت کے صدمے بھی سہتا ہوں

(۳)

تکلف سے مرا دل برگِ گل کی تہ میں رہتا ہے
چمن میں روز رنگا رنگ جو کلیاں چٹکتی ہیں
دلِ مجبور میں مانند کانٹوں کے کھٹکتی ہیں
مرے دل کی وہ حالت ہے جو آ پڑتی ہے سہتا ہوں
میں زندہ ہوں کہ وہ حُسنِ تغافل کیش اے فرحت
پسِ مردن بنا لے مجکو اپنا نغمۂ الفت

(۴)

دلیلِ سعیِ افسردہ ہے خود ذوقِ تن آسانی
زبانِ حال ہے افسانۂ ماضی و مستقبل
خمارِ اہلِ بزم آئینہ دارِ شورشِ محفل
میں زندہ باوجودِ سعیِ ناکامِ عدو بھی ہوں
میں زندہ باوجودِ کثرتِ جام و سبو بھی ہوں
شبابِ رفتہ کی رُوداد ہے خود چینِ پیشانی
مگر میں حسرتِ پارینہ سے اب تک تو زندہ ہوں

جگر مراد آبادی

(از جناب ماجد حسین صاحب فریدی)

اُردو شاعری کا بہترین دور سنہ ۱۷۳۰ء سے شروع ہوتا ہے اُس وقت وہ ترتیب و تشکیل کے ابتدائی مدارج سے گزر چکی تھی اُس کا قالب بن چکا تھا اور عروض و زبان کی کم سے کم خامیاں رہ گئی تھیں۔ اس وقت سودا۔ میر۔ درد۔ قائم اور سوز نے جدّتِ ادا لطافتِ تخئیل اور وسعت کے کمالات دکھلائے۔ میر کی تنادگی اور درد کی والہانہ ربودگی نے تغزل میں معیاری شان پیدا کر دی۔ چنانچہ داخلی خارجی اور قلبی واردات کی غم انگیز عکاسی میں میر کا ہمسر کوئی نہیں پیدا ہوا۔ اسی طرح درد نے عرفانِ نفس اور کائنات کے روحانی پہلوؤں کو جس طرح بے نقاب کیا ہے وہ بھی انھیں پر ختم ہو گیا۔ سودا نے بھی شگفتگی، طرفگیِ مضامین اور جزئیات نگاری سے شاعری کا ایوان رفیع کیا۔ مصحفی۔ اثر۔ جرأت۔ انشا۔ رنگین وغیرہ کی غزل میں وہی خوبیاں ہیں جو پہلے تھیں۔ صرف میر تقی کا سوز و گداز اور میر درد کا تصوف نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جرأت۔ انشا اور رنگین نے ادنیٰ جذبات اور بازاری معاملات و زبان کا اضافہ کر دیا ہے۔ مومن جدتِ خیال، مضمون آفرینی اور اثر میں اور داغ فصاحت، سلاست، سادگی اور چلبلے پن میں مشہور ہیں۔ ان شعراء کے بعد ہندوستان میں جن شعراء کا طوطی بولا وہ اپنا خاص رنگ پیدا کرنے کے بعد ان شعراء کے اتّباع پر مجبور ہوئے۔ اب جس شاعر کو آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے وہ بڑی حد تک داغ کا متبّع ہے گو کہ اس کا انفرادی رنگ الگ ظاہر ہو جاتا ہے

علی سکندر جگر مراد آبادی کی ولادت تقریباً سنہ ۱۸۹۰ء میں ہوئی۔ جگر کے مورثِ اعلیٰ دہلی کے باشندے اور شاہجہاں کے استاد تھے۔ جگر کے دادا حافظ محمد نور بھی شاعر تھے اور والد بزرگ علی نظر بھی شاعر وزیر لکھنوی کے شاگرد اور صاحبِ دیوان تھے۔ جگر کو اعلیٰ تعلیم کا موقع نہ ملا لیکن فنِ شعر میں اپنی ذہانت اور ذوقِ سلیم کے سبب سے جلد کمال پیدا کر لیا۔ ابتدا میں رسا بلند شہری، داغ دہلوی اور تسلیم لکھنوی کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے منازلِ تلمذ طے کیں، لیکن چند ہی روز اور غیر مسلسل۔ اب جو ان کا رنگ ہے وہ ان کی انفرادی خصوصیت ہے۔

جگر کی شاعری قدیم تغزل اور موجودہ رنگین نگاری کا انوکھا نمونہ ہے۔ داغ کی طرح جگر کی شاعری کا رنگ بھی ٹھیٹ عاشقانہ ہے۔ ان کے کلام میں فانی کا سا فلسفہ، اصغر کا تصوف اور عزیز کی "قابلیت" نہیں

جگر نے داغ کی شاعری کا عمیق مطالعہ کیا ہے، اسی لئے اُن کے کلام میں روانی سلاست اور بے ساختگی داغ کی سی پائی جاتی ہے۔ احسان احمد لکھتے ہیں کہ: "جگر کی زبان میں جو سادگی اور روانی اور نزاکت موجود ہے وہ صرف اسی یگانۂ فن (داغ) کے فیضِ صحبت کا نتیجہ ہے۔" یہ درست ہے کہ جگر کے کلام میں داغ کا رنگ اور نکھر گیا ہے۔ جیسے فانی نے غالب کی طرز کو اس کے پیچ وخم نکال کر درست کر دیا اور جو مناسبت فانی اور غالب کے کلام میں ہے وہی جگر اور داغ کے کلام میں ہے۔ داغ کی شاعری ایک سمندر اور جگر کی شاعری اس کا ایک قطرہ ہے۔

جگر کا کلام پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقی معنی میں تلمیذ الرحمٰن ہیں اور قدرت نے انھیں محبت سے لبریز دل عطا فرمایا ہے، ان کے دل کی تخمیر عشق و محبت سے ہوئی ہے، وہ سچے عاشق ہیں، اُن کی شاعری میں دماغ سے زیادہ دل کار فرما نظر آتا ہے، اس لئے جو کچھ دل سے نکلتا ہے وہ براہ راست دل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ع دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

نفاستِ خیال اور رنگینی کے اعتبار سے جگر اور اصغر کے کلام میں کافی مناسبت و مشابہت ہے، اصغر حیات کے مسرت آفریں اور اندوہ گیں دونوں پہلو پیشِ نظر رکھتے ہیں، لیکن جگر کے سامنے صرف مسرت آفریں پہلو رہتا ہے وہ اسی سے متاثر ہوتے ہیں۔ ذیل کے اشعار سے اندازہ ہو سکے گا کہ جگر کا حسنِ بیان پامال مضامین میں بھی جدت پیدا کر دیتا ہے۔

تا عمر آہ کنج قفس دیکھنا پڑا | اُڑ کر چلے تھے چار قدم آشیاں سے ہم
اے چارہ ساز حالتِ درد نہاں نہ پوچھ | اِک راز ہے جو کہہ نہیں سکتے زباں سے ہم
قسمت نے آہ اسے بھی نظر سے چھپا دیا | روتے لپٹ کے گرد پسِ کارواں سے ہم

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں | محبت کا زمانہ آ رہا ہے

جب تک شباب عشق مکمل شباب ہے | پانی بھی ہے شراب ہوا بھی شراب ہے
وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اس کا کیا علاج | دل مانتا نہیں کہ نظر کامیاب ہے

ذیل کے اشعار میں معلوم ہوتا ہے کہ میر اور داغ دونوں مل کر اپنے قلم سے پھول برسا رہے ہیں۔

چھپتے ہیں اور چھپا نہیں جاتا | اس ادائے حجاب نے مارا
میں ترا عکس ہوں کہ تو میرا | اس سوال و جواب نے مارا

نگاہوں سے چھپ کر کہاں جائیے گا | جہاں جائیے گا ہمیں پائیے گا
ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگ محفل | کسے دیکھ کر آپ شرمائیے گا

جگر اخلاق نگار شاعر نہیں ہے۔ اس کی شاعری کا اخلاقی معیار بہت بلند ہے، وہ انسانی خام کاریوں پر شدید ضرب لگاتے ہیں لیکن حالی کی طرح ضرب کا اثر دیکھنے کے لئے ٹھہر نہیں جاتے۔

تصویر امیدوں کی، آئینہ ملالوں کا — انساں جسے کہتے ہیں محشر ہے خیالوں کا

وفائے دل کو صدقے جان کو نذرِ وفا کر دے — محبت میں یہ لازم ہے کہ جو کچھ ہو فدا کر دے

حسن انجام پہ کس طرح تصدق کر دوں — وہ جو اک لطف ہر اک لغزشِ آغاز میں ہے

جگر کا طرزِ بیان فانی، حسرت اور اصغر سے زیادہ صاف اور سادہ ہے۔ ان کی شاعری سادہ رنگوں سے بنائی ہوئی تصویر ہے مگر مصور کے سحر آفریں قلم نے رنگوں کی آمیزش سے ان میں جادو بھر دیا ہے۔

مولانا قادری جگر کے بارے میں فرماتے ہیں :-

"جگر کا ابتدائی کلام رسا و داغ کی طرح شوخ و بیباک لیکن سادہ و خوشنما ہے، اس کے بعد موجودہ زمانہ کی مشکل پسندی کو دیکھ کر اس طرز میں کہا۔ لیکن اب اُن کی غزل کا انفرادی رنگ نکل آیا ہے اور یہ ایک شاعر کی بڑی کامیابی ہے۔ جگر کی خصوصیت کیف و بیخودی، محویت، و وارفتگی ہے، وہ حسن و عشق کی ادائیں اور معاملے، تصوف کے اسرار و معارف جو کچھ بیان کرتے ہیں کسی خاص جذب و کیف کے ماتحت کرتے ہیں، اسی سبب سے اُن کی غزلیں مسلسل ہوتی ہیں، اور اکثر ایسا ہے کہ غزل مسلسل نہیں، لیکن ساری غزل پر ایک ہی کیف چھایا ہوا ہے۔ ایسی غزلوں کے پڑھنے والے پر بھی ایک پُر کیف عالم طاری ہو جاتا ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور فرماتے ہیں :-

"جگر اس دور کے سب سے زیادہ مقبول اور مشہور غزل گو شعرا میں سے ہیں، ان کو لوگ نہیں پہچانتے، ان کے کلام پر بھی سر دھنتے ہیں۔ جگر کے یہاں داغ، حسرت اور کچھ کچھ مومن کی شان پائی جاتی ہے۔ بعض کے نزدیک ان میں "دعوتِ فکر کم اور دعوتِ کام و دہن زیادہ ہے۔ بجائے والہانہ انداز کے ایک ہیجانی اضطراب کی کیفیت نظر آتی ہے۔" کلیم الدین احمد کے الفاظ میں ان کی شاعری قدیم و جدید رنگِ تغزل کا ایک مضحک نمونہ بن کر رہ گئی ہے۔...... ان کی شاعری کی دنیائے تغزل میں کوئی خاص اہمیت نہیں، مگر یہ سب خیالات اصلیت سے دور ہیں۔ جگر کے یہاں جدید رنگ نہیں قدیم رنگ کا نکھار ہے اور شدت سے ہے، وہ سننے والے اور پڑھنے والے کو اپنی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں، حسرت کو چھوڑ کر اس دور میں تغزل جس کے ہاں سب سے زیادہ پایا جاتا ہے، وہ جگر ہیں...... انھوں نے حسن کو جس جس طرح دیکھا ہے، نفسیاتِ عشق کی جیسی تصویریں کھینچی ہیں اُن سے ہماری شاعری اور بھی رنگین ہو گئی ہے، انھوں نے ہمارے عشق کو حسن پر مسکرانے کی توفیق عطا کی ہے اور رنگِ رخ بانیِ بیداد میں مظلوم کی فریاد کی تصویر کھینچی ہے۔ ان کے ہاں داغ، غالب، اور ریاض کے

مے خانوں سے آگے ایک اور میکدہ آباد ہے جہاں ہر وقت ساغر گردش میں رہتا ہے، اور مۓ گسارانِ محفل خیال کی تشنگی کی تشفی ان کے اشعار کی صہبائے تیز کرتی رہتی ہے۔..... جگر نے اُردو غزل کو حافظ کی رنگینی و سرمستی پھر سے عطا کی۔ حسرت کے ہاں شگفتگی و شادابی ہے، جگر کے ہاں تندی وتیزی، مگر اس دور کے تمام شعراء سے زیادہ سپردگی (Abandonment) اور سرمستی جگر کے ہاں پائی جاتی ہے۔"

پروفیسر مجنوں گورکھپوری فرماتے ہیں :۔

"اصغر کے ساتھ ہی جگر مرادآبادی کی آواز بلند ہوئی، اور ہماری غزلوں کی ساری فضا میں اس طرح گونج اُٹھی کہ ابتک اس کی جگہ کوئی دوسری آواز لے ہی نہیں سکی ہے۔ جگر کی شخصیت اور اُن کی شاعری دونوں مل کر ایک داستان (Legend) بن گئی ہیں۔..... جگر کٹر غزل گو شاعر ہیں اور حسن وعشق کے احساس سے علیحدہ ہو کر اُنھوں نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ اُن کے کلام میں بیشتر وہ ربودگی پائی جاتی ہے جس کو تغزل کا اصلی جوہر بتایا گیا ہے، اور اُن کی زبان اور اندازِ بیان میں جو بے اختیاری ہوتی ہے وہ اُن کی اپنی چیز ہے اور اُردو غزل میں بالکل نیا عنوان ہے۔ عشقیہ زندگی کے واردات و معاملات کی نزاکتوں کو جدید نفسیات کا لحاظ رکھتے ہوئے بیان کرنے میں وہ اکثر قابلِ رشک حد تک کامیاب رہتے ہیں"

جگر کے ہاں محاکاتی اشعار کافی ملتے ہیں، اُن کے مخصوص اور منتخب اشعار میں تخیل نیا ہو یا نہ ہو لیکن اندازِ بیان میں ندرت ضرور ہوتی ہے۔ اُن کے کلام کا وصف ایک خاص قسم کی بیخودی اور سرشاری ہے لیکن اکثر یہ سرمستی سے متجاوز ہو کر بدمستی تک پہونچ جاتی ہے، اور اُن کے جذبات کے ہیجان وارتعاش میں ربودگی نظر آنے لگتی ہے۔ وہ تغزل کے حصار سے باہر نہیں نکلتے لیکن جہاں وہ اس میں ذرا تفکر شامل کر دیتے ہیں وہاں لطف آجاتا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجئے :۔

فکرِ منزل ہے نہ ہوشِ جادۂ منزل مجھے — جا رہا ہوں، جس طرف لے جا رہا ہے دل مجھے
یوں تڑپ کر دل نے تڑپایا سرِ محفل مجھے — اُس کو قاتل کہنے والے کہہ اُٹھے قاتل مجھے
آج ہر زخم نظر آتا ہے پیمانہ بدست — اس میں کچھ شعبدۂ نرگسِ مخمور نہ ہو
دل دھڑکتے ہی پھر گئی وہ نظر — لب تک آئی نہ تھی کہ بات گئی
دل کو برباد کر کے بیٹھا ہوں — کچھ خوشی بھی ہے کچھ ملال بھی ہے

ہماری شاعری کا یہ مفروضہ کہ محبوب ہمیشہ بے وفا ہوتا ہے اور اس پر محبت کا اثر نہیں ہوتا بالکل غلط ہے۔

جگر نے اپنی تمام شاعری میں جگہ جگہ اس کے ثبوت پیش کئے ہیں اور نہایت خوبصورتی سے ایک

مسلسل غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

مانا کہ ہم پہ جور و جفا کیجئے گا آپ
لیکن ہمیں نہ ہوں گے تو کیا کیجئے گا آپ

ہر چند ضبط حد سے سوا کیجئے گا آپ
آنسو نہ تھم سکیں گے تو کیا کیجئے گا آپ

تنہائیاں تو ایک طرف سب کے سامنے
پہروں اُداس اُداس رہا کیجئے گا آپ

ہر چند لائیے گا زباں پر نہ رازِ عشق
نظریں پکار اُٹھیں گی تو کیا کیجئے گا آپ

چھپ چھپ کے جب نہ رو بھی سکیں گے بقدرِ ظرف
گھُٹ گھُٹ کے دل ہی دل میں رہا کیجئے گا آپ

آنسو چھلک اُٹھیں گے جب آ جائے گا خیال
کچھ حقِ دوستی بھی ادا کیجئے گا آپ

یہ خیال کہ عشق ہی حُسن کے لئے بیتاب نہیں ہوتا بلکہ حُسن بھی بے قرار رہتا ہے، دوسری جگہ ادا کرتے ہیں :-

عشق ہی تنہا نہیں شوریدہ سر میرے لئے
حُسن بھی بیتاب ہے اور کس قدر میرے لئے

کس قدر برجستہ کہا ہے :-

میں تو ہر حالت میں خوش ہوں لیکن اسکا کیا علاج
ڈبڈبا آتی ہیں وہ آنکھیں جگر میرے لئے

اور دیکھئے :-

اُف وہ کہنا اُس کا پیہم بانھوں میں بانھیں ڈالکر
میں جگر کے واسطے ہوں اور جگر میرے لئے

بعض جگہ جگر کا محبوب اُس کے سامنے ہوتا ہے وہ اس کو دیکھنا چاہتا ہے مگر رعبِ حُسن سے نگاہ جھک جاتی ہے اور وہ نہیں دیکھ سکتا، کہتا ہے :-

اُٹھتی نہیں ہے آنکھ مگر اُس کے روبرو
نادیدہ اک نگاہ کئے جا رہا ہوں میں

جگر کو گلشن سے محبت ہے وہ اُس کی ہر چیز کو عزیز رکھتا ہے، اُسکے لئے گل و رخسار یکساں ہیں۔

گلشن پرست ہوں مجھے گُل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

محبت میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ محبوب خود عاشق کی طرف دیکھتا ہے اور عاشق نظریں ہٹا لیتا ہے، یہ مصوری قابلِ داد ہے۔

خوشا یہ پندارِ عشق اپنا رہے شکستِ غرور اُن کی
وہ ہم سے نظریں ملا رہے ہیں ہم اُن سے نظریں ہٹا رہے ہیں

حُسن آیا تھا خود منانے کو
سو توجہ ہی عشق نے کم کی

جگر کا حال و قال یکساں ہے، اُنھوں نے یہ اندازہ بالکل صحیح کیا ہے کہ وہ تغزل کیلئے پیدا ہوئے ہیں اور اُن کی فطرت جس رنگ کو پسند کرتی ہے وہ اس میں رنگے ہوئے ہیں۔ اگر جذبات کی رَو میں [illegible]

خیال رکھتے اور اپنی شاعری میں بےراہ روی کو دخل نہ دیتے تو اُن کا پایہ یقیناً داغ کے برابر ہوتا۔ تغزل کے اعتبار سے اُن کا پایہ اُن کے ہمعصروں میں سب سے ممتاز ہے اور یہی خصوصیت اُنھیں ابد تک زندہ رکھ سکتی ہے۔ اب چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

مل کے اک بار گیا ہے کوئی جس دن سے جگر
مجھکو یہ وہم ہے جیسے مرا آغوش نہیں

محبت میں اِک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

جگر وہ بھی زسرتاپا محبت ہی محبت ہیں
مگر اُن کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

سکرِ شباب و یادِ یار، دردِ فراق و انتظار
آنکھ کھلی سُلا دیا، آنکھ لگی جگا دیا

خیر ہو اے نسیمِ ناز، پھیل نہ جائے بوئے راز
تو نے یہ کیا غضب کیا، غنچۂ دل کھلا دیا

دل تو سینے ہی میں رہتا ہے مگر اُن کے حضور
جیسے اب جاتا ہے دل سینے سے اب جاتا ہے دل

لے کے خط اُن کا کیا ضبط بہت کچھ لیکن
تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں نے بھرم کھول دیا

جب سے اُس نے پھیر لیں آنکھیں رنگِ تباہی آہ نہ پوچھ
سینہ خالی آنکھیں ویراں دل کی حالت کیا کہئے

ایک تجلی، ایک تبسم، ایک نگاہِ بندہ نواز
اس سے زیادہ اے غمِ جاناں دل کی قیمت کیا کہئے

شیشۂ دل؟ وہ نازک ہستی، ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا
اس پر کسی کے تیرِ ستم کی مشقِ سیاست کیا کہئے

بادۂ ناب عجب چیز ہے ساقی! لیکن
اور ہی کچھ ترے ہاتھوں میں مزا دیتا ہے

اک مئے بے نام، جو اس دل کے پیمانے میں ہے
وہ کسی شیشے میں ہے ساقی نہ پیمانے میں ہے

بے تحاشا پی رہے ہیں کب سے رندانِ الست
آج بھی اتنی ہی مے ہر دل کے پیمانے میں ہے

ہم نہیں آنے کے واعظ ترے بہکانے میں
اسی میخانے کی مٹی اسی میخانے میں

عجب انقلابِ زمانہ ہے مرا مختصر سا فسانہ ہے
یہی اب جو بار ہے دوش پر یہی سر تھا زانوئے یار پر

اور تو کچھ کمی نہیں آپ کے اقتدار میں
آپ مجھے بھلا سکیں، یہ نہیں اختیار میں

جہاں جگر کا کلام اس قدر خوبیوں سے مملو ہے وہاں اس میں عامیانہ قسم کے تغزل کی بھی فراوانی ہے جگر کے یہاں سب سے بڑی خرابی مصرعوں کے غیر مربوط ہونے کی ہے۔ سادہ الفاظ کے باوجود ان کے بہت سے اشعار معنیٔ درست سے محروم ہیں۔ اُن کے خیالات محدود اور مستعار ہیں۔ مومن کا شعر ہے:-

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اب جگر کا شعر دیکھئے:-

وہ ہمارے قریب ہوتے ہیں
جب ہمارا پتا نہیں ہوتا

اس کے علاوہ جگر نے غلط لفظ بھی نظم کر دیے ہیں جس کی ان جیسے استاد سے توقع نہ تھی۔ لیکن انسان بہرحال انسان ہے اور اس سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم۔اے۔ پی ایچ ڈی، موجودہ دور کے بہت بڑے نقاد ہیں۔ انھوں نے شعرائے غزل گو کے سلسلے میں جگر پر بھی تنقید کی ہے تنقید کا یہ مزاحیہ اسلوب ڈاکٹر صاحب کی خوش طبعی و بذلہ سنجی کی ایجاد ہے جو دوسری جگہ نہ ملیگا۔ جو اعتراض ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے وہ بذاتِ خود درست ہے۔ اس کا اسلوب ملاحظہ ہو۔

میں نہیں بسمل خیام جگر ۔۔۔۔ حافظِ خوش کلام نے مارا

یہ شعر اگرچہ کل دس لفظوں کا مجموعہ ہے لیکن قادر الکلام شاعر نے اس میں ایک پوری داستان بیان کر دی ہے اور اس خوبصورتی کے ساتھ کہ جو باتیں اس میں مذکور نہیں وہ خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہیں اور واقعہ کی مکمل تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

"ایک بادشاہ سیر و شکار یا جنگ کے ارادے سے اپنی فوجیں لیکر نکلا بحیثیت ملک الشعرائے سلطانی جگر صاحب بھی لشکر کے ہمراہ ہیں، چلتے چلتے لشکر ایک مقام پر ٹھیر جاتا ہے "پڑاؤ" ہوتا ہے خیمے لگائے جاتے ہیں، ایک خیمہ جگر صاحب کے لئے مخصوص ہے۔ رات کو آپ کے خیمہ پر پہرا دینے کے لئے ایک حافظ یعنی محافظ بھی آپ کو ملا اس کا نام "خوش کلام" ہے۔ یہ شخص اگرچہ سپاہی ہے مگر شاعر ہے اور اچھا شاعر ہے اسی بنا پر لوگ اسے "خوش کلام" کہتے ہیں ورنہ درحقیقت اس کا نام کچھ اور ہی ہے جو اب کسی کو یاد نہیں۔ "خوش کلام" کا خیال ہے کہ وہ جگر صاحب سے کہیں بہتر شعر کہتا ہے مگر بد ذوق دنیا اس کی قدر نہیں کرتی۔ اسی بنا پر وہ جگر صاحب کا جانی دشمن ہے اور رات دن ان کے دشمنوں کی ہلاکت کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ اس موقع کو اس نے غنیمت جانا۔ طوفانی رات تھی، آندھی چل رہی تھی، پچھلے پہر وہ ظالم جگر صاحب کے خیمہ میں گھس گیا اور تلوار سے آپ کا سر بری طرح زخمی کر دیا، بلکہ اپنے نزدیک آپ کو مار ہی ڈالا۔ اپنے جرم کو چھپانے کے لئے اس نے یہ تدبیر کی کہ جگر صاحب کے خیمہ کی اور آس پاس کے تین خیموں کی طنابیں کاٹ دیں تاکہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ طوفانِ ہوا سے خیمے گر پڑے اور لوگوں کی ہلاکت کا باعث ہوئے۔"

خیموں کے گرتے ہی ایک شور مچ گیا، لوگ جمع ہوئے خیمے اٹھائے گئے اور تو سب صحیح و سلامت تھے لیکن جگر صاحب خون میں تر اور بے ہوش پڑے تھے۔ لوگوں نے سمجھا کہ چوبِ خیمہ آپ کے سر پر لگی ہے تو اس سے سر شق ہو گیا ہے۔ بہرحال آپ کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کی گئیں، آپ نے آنکھیں کھولیں اور لوگوں کو بتایا کہ میں چوبِ خیمہ سے نہیں مرا ہوں بلکہ میرے محافظ "خوش کلام" نے مجھے مارا ہے۔

اگر کسی شعر کا مطلب اُس کے الفاظ ہی کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے تو یقیناً اس شعر کا مطلب یہی ہے جو ہم نے بیان کیا لیکن جگر صاحب کے مخالفین جو اُن کی قادر الکلامی کے قائل نہیں ہیں اس مطلب کو غلط ٹھیراتے ہیں اور دُور از کار تاویلیں کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ خیام " (بروزن صیام) سے شاعر کی مراد ایران کا مشہور شاعر عمر خیّام نیشاپوری ہے اور حافظ کا مطلب محافظ نہیں بلکہ حافظ شیراز کی طرف اشارہ ہے۔ مگر یہ مخالفین کی زبردستی ہے ورنہ خیام ' (بروزن صیام) خیمہ کی جمع ہے' مکتوبی مشابہت کی بناپر اسے " خیّام " (بروزن ایّام) کیونکر سمجھ سکتے ہیں اور بلا وجہ کیوں شاعر کے سر پہ الزام لگایا جائے کہ اُس نے مشدّد (خیّام) کو مخفف (خیام) کر دیا ہے۔" (اقتباس از مقالہ شادانی مطبوعہ ساقی")

ڈاکٹر صاحب کا یہ اعتراض بالکل صحیح ہے' اور ہر شخص کو مان لینا چاہیئے' تردید کرنے کی کوئی وجہ نہیں شادانی صاحب کا ایک اور اعتراض دیکھئے۔ یہ بھی صحیح ہے اور انھوں نے اپنے اسی مخصوص رنگ میں لکھا ہے اس وجہ سے دلچسپ بھی ہے:-

وہ دل کو توڑ کے بیٹھے تھے مطمئن کہ انھیں شکستِ شیشۂ دل کی صدا نے لوٹ لیا (جگر)

عام قاعدہ تو یہی ہے کہ جب کوئی چیز ٹوٹتی ہے تو فوراً اس میں سے آواز بھی نکلتی ہے۔ مگر یہ عاشق کا دل بھی عجیب چیز ہے کہ ٹوٹنے کے گھنٹہ بھر بعد صدا دیتا ہے۔ جگر صاحب کے محبوب نے جگر صاحب کا دل توڑ ڈالا، اس کام سے فارغ ہونے کے بعد منہ دھویا' کنگھی کی، بال سنوارے' سرمہ لگایا، پان کی گلوری بنا کر منہ میں رکھی اور گاؤ تکیہ کے سہارے آرام و اطمینان کے ساتھ تخت پر بیٹھ گیا۔ پیک تھوکنے کے لئے فرش پر سے اُگلدان اُٹھانا چاہتا تھا کہ یکایک دھماکے کی آواز ہوئی غریب کا جی دہل گیا، اُگلدان ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور فرش کی چاندنی پیک کی چھینٹوں سے جامہ وار میں تبدیل ہو گئی' خواصیں دوڑیں کہ ہے ہے کیا ہوا" بی صاحبہ کو سنبھالا تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوا کہ جگر صاحب کا دل تھا جسے توڑنے کے بعد بی صاحبہ اطمینان سے بیٹھ گئی تھیں' اور جس نے ٹوٹنے کے پورے ۵ منٹ ۱۱ سیکنڈ کے بعد آواز دی"
(از رسالہ ساقی")

اس کے علاوہ جگر کے کلام پر ایک اور اعتراض کیا جاتا ہے کہ" جگر کا کلام انسان پر تھوڑی دیر کے لئے خود فراموشی کی کیفیت طاری کر دیتا ہے وہ انسان کو دنیا کی مکروہات اور اُلجھنوں سے ہٹا کر باغ کے اندر ایسے کنج میں لیجاتا ہے جہاں ارغوانی شراب ناب کے جام چھلکتے ہیں' فضا عشوہ طراز محبوب کی مینا پاشیوں سے معمور ہوتی ہے لیکن اس کے کلام میں گہرائی اور گیرائی نہیں ہے' اسی لئے یہ دلکش فضا انسان کے قلب سے بہت جلد محو ہو جاتی ہے۔ اور لوگوں کو یہ خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید جگر کا کلام دیرپا نہ ہو" وہ نقاد لیا

کی اس آواز کو سنتے ہیں کہ "ان کا کلام صرف سامعہ نواز ہے، پڑھنے اور دیکھنے کی چیز نہیں ہے وہ حال کے شاعر ہیں اور اُن کا مستقبل تاریک ہے۔ اس کے باوجود وہ نہیں سنبھلتے" جگر سے اس کا مطالبہ کہ وہ سنبھلتے نہیں، غلط ہے۔ وُہ تغزل "پیدا ہوئے ہیں اور اُن کی فطرت جس چیز کو پسند کرتی ہے وہ اس میں سرتاپا رنگے ہوئے ہیں" اور بقول سرور صاحب کے "لوگ مانیں یا نہ مانیں اُن کے کلام پر سبھی سر دُھنتے ہیں" اس میں شک نہیں کہ جگر کا کلام اپنے حدود میں بہت دلکش ہے اور اُن کی غزلیں اپنی وجد آفرینی اور کیف کے اعتبار سے بہت بلند ہوتی ہیں۔

طوفانِ جذبات

(از حضرت اختر رضوانی۔ لاہور)

یہ کیا مقام ہے ہم نوحہ خواں نہیں ہوتے   خلش تو ہوتی ہے آنسو رواں نہیں ہوتے
کسی بھی رنگ میں شبنم گہر نہیں ہوتی   زمیں کے ذرے کبھی آسماں نہیں ہوتے
مجھے نگاہِ حقارت سے دیکھنے والو!   جو نکتہ چیں ہیں کبھی نکتہ داں نہیں ہوتے
گزر رہے ہیں حوادث جو مجھ پہ غربت میں   زباں پہ آتے ہیں لیکن بیاں نہیں ہوتے
یہ کیا ستم ہے مصیبت میں میری حالت پر   جو لوگ ہنستے ہیں کیوں نوحہ خواں نہیں ہوتے
وہ جن کے ذہن و نظر میں فریب کاری ہے   ہزار پردوں میں چھپ کر نہاں نہیں ہوتے

وہ جن سے تجھ کو وفا کی اُمید تھی اختر
نہیں یہ ہوتے کبھی قدرداں نہیں ہوتے

"سرورؔ[1] سے خطاب"

(از جناب رادھا رمن سکسینہ شوقؔ اٹاوی)

پروردۂ فنا اے رنگیں بیانِ اُردو
بھولی نہیں ہے تجھ کو ابتک زبانِ اُردو

ایوانِ شاعری پر نقش و نگار تیرے
جب تک زباں ہے قائم، ہیں یادگار تیرے

کس شان سے ہوا تو نغمہ سرا چمن میں
جدت کی روح پھونکی اِس محفلِ کہن میں

کوئل کو اور بلبل کو ہمنوا بنایا
گنگا کی گھاٹیوں میں نہرِ فرات لایا

وہ فصلِ گل چمن کی برکھا کی وہ بہاریں
بُلبل کی نغمہ سنجی، طاؤس کی پُکاریں

"بھونرے کی بیقراری"[2] پروانے کی تپش بھی
ہندی کا حُسنِ دلکش کچھ فارسی کشش بھی

اِک رنگِ نَو سے تو نے محفل کو پھر سنوارا
قسمت نے یاوری کی چمکا ترا ستارا

اطرافِ ہند میں یوں شہرت فزا ہوا تو
گلشن میں پھیلتی ہے جس طرح گل کی خوشبو

ہر اِک لَے والہانہ انداز میں یہ گایا
"دلِ[3] بے قرار سوجا" "دلِ بے قرار سوجا"

تری نغمہ سنجیوں کا مشتاق تھا "زمانہ"
تری شاعری تھی گویا تری عمر کا فسانہ

اِک لفظِ آہ میں تھی مضمر تری کہانی
اِک آہ رہ گئی ہے لب پر تری نشانی

محفل سے اُٹھ گیا تو اے تشنہ کامِ حسرت
کیا جامِ زندگی میں تجھ کو ملی نہ لذت؟

گو لاکھ کروٹیں لے نیرنگیِ زمانہ
جنت نشاں رہے گا تیرا نگار خانہ

ہے بزم میں ابھی تک نامِ سُرور باقی
گو تو نہیں مگر ہے "جامِ سُرور" باقی

---

[1] حضرت سرور جہان آبادی مرحوم۔ [2] اس عنوان سے سرور کی ایک نظم بھی ہے۔
[3] حضرت سرور کی ایک مشہور نظم کی طرف اشارہ ہے۔ [4] [illegible]

"بچپن"

(از جناب ستیش مسافر پٹیالوی)

امّی، پاپا اور چچی گھر پر نہیں ہیں، وہ کسی سے ملنے کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ گریشیا، ابنا۔ انو شاہ سونیا اور باورچی کا لڑکا آنندا ریو کھانے کے کمرے میں میز پر بیٹھے ہوئے انتظار کر رہے ہیں اور تاش کھیل رہے ہیں اصل بات تو یہ ہے کہ ان کے سونے کا وقت ہو چکا ہے لیکن جب تک امّی گھر نہ آجائیں بچے سوئیں کس طرح کمرے میں فانوس روشن ہے اور میز پر کاغذ کے پرزے، خشک پھلوں کے چھلکے اور شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھرے ہوئے ہیں۔ ہر کھلاڑی اپنے سامنے دو دو پتے اور نمبروں کو ڈھانپنے کے لئے شیشے کے ٹکڑوں کا ڈھیر رکھے ہے۔ میز کے وسط میں ایک چینی کی پیالی میں پانچ کیو پک رکھے ہوئے ہیں۔ پیالی کے پاس ایک نیم خوردہ سیب، ایک چھری اور ایک رکابی پڑی ہے۔ چھلکے ڈالنے کے لئے بچے کیو پک لگا کر کھیل رہے ہیں۔ فی بازی ایک کیو پک مقرر ہے، اگر کوئی دھوکا کرتا ہے تو اسے فوراً کھیل سے نکال دیا جاتا ہے۔ کمرے میں سوائے کھلاڑیوں کے اور کوئی نہیں ہے۔ آیا اور نوکر باورچی خانے میں کام کر رہے ہیں اور بچوں کا بڑا بھائی وسیا جو پانچویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ تھک تھکا کر ملاقات کے کمرے میں صوفے پر لیٹا ہوا ہے۔

بچے بڑے جوش اور انہماک سے کھیل رہے ہیں۔ سب سے زیادہ بے قراری گریشیا کے چہرے سے ظاہر ہو رہی ہے، نو برس کا ہے، سر گھٹا ہوا، گال پھولے ہوئے اور ہونٹ حبشیوں کے سے موٹے موٹے۔ وہ چوتھی جماعت میں پڑھتا ہے، اس لئے اور بچے اُسے قابل اور چالاک خیال کرتے ہیں، اور گریشیا محض کیو پک جیتنے کی خاطر کھیل رہا ہے۔ اگر نمبروں پر لگانے کے لئے پیالی میں کیو پک نہ رکھے ہوتے تو وہ کبھی کا سو گیا ہوتا۔ اس کی چنچل، حریص بھوری بھوری آنکھیں، دوسرے کھیلنے والوں کے نمبروں کو تک رہی ہیں۔ ہار جانے کا خوف دوسرے کے جیت جانے کا حسد اور اقتصادی جوڑ توڑ جن سے اس کا دماغ بھرا پڑا ہے اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتے کہ وہ پوری توجہ سے کھیل سکے۔ وہ بار بار پہلو بدلتا ہے گویا کانٹوں پر بیٹھا ہو جب وہ بازی جیت جاتا ہے تو اوروں کے ہاتھوں سے کیو پک چھین کر فوراً اپنی جیب کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کی ہر حرکت سے اس کی حرص ظاہر ہو رہی ہے۔ اس کی بہن دینا آٹھ سال کی ہے اس کی روشن آنکھوں سے ٹپک رہی ہے ... ہے کہ کہیں دوسرا نہ جیت لے۔ وہ کچھ ... کھیلنے ...

کیونکہ کھیل سے اُسے کوئی خاص دلچسپی نہیں، ہاں جیت کے خیال سے اُسے خوشی ہو رہی ہے۔ دوسری بہن سونیا جس کی عمر چھ سال، بال گھنگھریالے اور رنگ تندرست و توانا بچوں کا سا نکھرا ہوا ہے، میز پر کہنیاں ٹیک کر بیٹھی ہے۔ اس کے چہرے پر معصومیت کھیل رہی ہے، خواہ کوئی بھی جیتے وہ تو صرف ہنس دیتی اور تالیاں بجانے لگتی ہے۔ آلوشا جو گول مول سا ہے زور زور سے سانسیں لے رہا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نمبروں کی طرف دیکھ رہا ہے، اُسے جیتنے کا مطلق شوق نہیں، وہ تو بس ایک بات سے ڈرتا ہے کہ کہیں کمرے سے چلے جانے کا یا سونے کا حکم نہ مل جائے۔ بظاہر وہ بڑا سیدھا سادا معلوم ہوتا ہے لیکن ہے اصل میں شریر۔ اسے کھیلنے کا اتنا شوق نہیں جتنا اس جھگڑے کو دیکھنے کا جو کہ بچوں کے کھیل میں عام طور پر ہوتا ہے۔ اگر ایک بچہ دوسرے کو مارتا یا گالیاں دیتا ہے تو بہت خوش ہوتا ہے۔ وہ ایک منٹ کے لئے بھی میز چھوڑ کر اس ڈر سے نہیں جاتا کہ کہیں وہ جھگڑا دیکھنے سے محروم نہ رہ جائے، ورنہ وہ تو کبھی کا کہیں بھاگ گیا ہوتا، چونکہ اُسے گننا نہیں آتا اس لئے سونیا نے اُس کے نمبروں کو چھپا رکھا ہے۔ پانچواں کھلاڑی باورچی کا لڑکا اینڈریو ہے۔ اس کا رنگ سیاہی مائل اور چہرہ بیماروں کا سا ہے، اس نے معمولی سوتی قمیص پہن رکھی ہے اور سینے پر ٹین کی صلیب لگی ہوئی ہے۔ وہ بالکل بے حس و حرکت کھڑا ہے، اور خواب آلود نگاہیں نمبروں پر جمی ہوئی ہیں، اسے اپنی یا کسی اور کی جیت سے کوئی دلچسپی نہیں، صرف کھیل کے حسابی پہلو پر غور کر رہا ہے اور سوچ رہا ہے کہ ساری دنیا میں کل کتنے اعداد ہیں اور وہ ایک دوسرے سے کیوں نہیں خلط ملط ہو جاتے۔

سونیا اور آلوشا کے سوا باقی سب باری باری سے اپنے اپنے نمبروں کو زور زور سے بتلاتے ہیں۔ کھیل میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے انھوں نے نمبروں کو نئے نئے دلکش نام دے رکھے ہیں۔ مثلاً سات کو "دستہ" کا گیارہ کو "چھڑیوں" کا اور نوے کو "باوا" کا۔ کھیل بڑے زور شور سے ہو رہا ہے۔

گرشیا اپنے پاپا کا ہیٹ اُچھالتے ہوئے کہتا ہے "تیئیس! سترہ!! اٹھائیس!!!" اب رکھو دیجئے نمبر.....

سونیا دیکھ رہی ہے کہ اینڈریو نے اٹھائیس نمبر کو کھسکا لیا ہے۔ اگر اور کوئی موقع ہوتا تو وہ فوراً شور مچانے لگتی، لیکن چپ رہنے ہی میں اس کا فائدہ تھا، اسلئے خاموش ہو رہی تھی

گرشیا پھر چلاتا ہے، "تیئیس۔ سترہ۔ نو"

"کھٹمل کھٹمل" سونیا چلا اُٹھتی ہے (کھٹمل کی طرف اشارہ کرتی ہے جو کہ میز پر دوڑ رہا ہے) اوپر ادھر

آلوشا کہتا ہے: "اسے مار نا مت، شاید اس کے بھی بچے ہوں......"

سونیا کی آنکھیں کھٹمل کی طرف لگی ہوئی ہیں، اور اس کے بچوں کا خیال کر کے وہ حیران ہو رہی ہے کہ کتنے چھوٹے ہونگے اس کے بچے؟

"تینتالیس۔ ایک" گریشیا کھیلتے ہوئے کہتا ہے اور اس خیال سے ناخوش ہے کہ اینا کے پاس دو چار نمبر ہیں۔ "چھ نمبر"

"کھیل ختم! میں جیت گئی" سونیا بڑے پیارے انداز سے اپنی آنکھوں کو گھماتی ہوئی اور خوشی سے چٹکیاں بجاتی ہوئی چلا اٹھتی ہے

کھلاڑی برا سا منھ بنا لیتے ہیں اور گریشیا نفرت سے سونیا کی طرف دیکھ کر کہتا ہے "اچھا پہلے ذرا دیکھنے تو دو"

گریشیا چونکہ کھلاڑیوں میں سب سے بڑا اور چالاک ہے اس لئے معائنے اور فیصلے کا کام اپنے ذمے لے لیتا ہے، جو کچھ چاہتا ہے دوسروں سے رعب سے کرا لیتا ہے۔ سونیا کے نمبروں کی آہستہ آہستہ لیکن نہایت احتیاط سے تصدیق کی جاتی ہے۔ اور آخرکار سب کھلاڑیوں کو یہ جان کر بے حد رنج ہوتا ہے کہ وہ واقعی جیت گئی۔ اب دوسری بازی شروع ہوتی ہے۔ "کل میں نے ایک بہت عجیب چیز دیکھی تھی"۔ اینا گویا اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتی ہے: "ہوجو نے نہ جانے کس طرح اپنے پپوٹوں کو الٹ لیا کہ جس سے اس کی آنکھیں کسی شیطانی روح کی طرح سرخ سرخ اور ڈراؤنی نظر آنے لگیں"

گریشیا کہتا ہے "میں نے بھی دیکھا تھا۔ آٹھ نمبر۔ اور ہمارے اسکول کا ایک لڑکا اپنے کان بھی ہلا سکتا ہے۔ ستائیس نمبر"

اینڈریو گریشیا کی طرف دیکھتا اور بڑا سنجیدہ منھ بنا کر کہتا ہے "میں بھی اپنے کان ہلا سکتا ہوں...."

"تو پھر ہلاؤ ..." سب پکار اٹھتے ہیں۔

اینڈریو اپنی آنکھیں، اپنے ہونٹ اور اپنی انگلیاں ہلانے لگتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ اس کے کان بھی ہل رہے ہیں، سب زور سے ہنسنے لگتے ہیں۔ سونیا آہ بھر کر کہتی ہے "ہوجو بہت خوفناک آدمی ہے" کل وہ ... کے باغیچے میں چلا آیا، اس وقت میں صرف قمیص ہی پہنے ہوئے تھی، مجھے بڑی شرم آئی"

"کھیل ختم" گریشیا بے تحاشہ چلا اٹھا، اور جھپٹ کر پیالی میں سے کیوپک اٹھا لیا "میں جیت گیا، اگر کسی کو شک ہو تو دیکھ لے"۔ دیکھتے ہی اینڈریو کا رنگ زرد ہو گیا اور نہایت دھیمے لہجے میں بولا "اب میں نہیں کھیل سکتا... کیونکہ میرے پاس اور کیوپک نہیں ہے"۔

گریشیا جواب دیتا ہے "ہاں، تم کیوپک لگائے بغیر تو نہیں کھیل سکتے"۔

اینڈریو اپنا شک رفع کرنے کو پھر اپنی جیبیں ٹٹولتا ہے، لیکن سوائے روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور ایک چھوٹی پنسل کے اور کچھ نہیں نکلتا۔ اس لئے رنجیدہ ہو کر رونی سی صورت بنا لیتا ہے اور جلدی جلدی آنکھیں جھپکانے لگتا ہے

سونیا اس کی رنجیدہ شکل دیکھ نہیں سکتی اور کہتی ہے "تمہاری جگہ میں کیوپک لگائے دیتی ہوں۔ لیکن مجھ میں واپس کر دینا۔ اچھا!"

سونیا اینڈریو کو کیوپک دے دیتی اور بازی پھر شروع ہو جاتی ہے۔

اینا آنکھیں پھاڑ کر کہتی ہے "میرا خیال ہے کہیں گھنٹی بج رہی ہے۔"

سب کھیلنا بند کر دیتے ہیں اور حیرت زدہ، منہ کھولے کھڑکی میں سے باہر تاریکی میں جھانکنے لگتے ہیں، لیمپ کا عکس کھڑکی کے شیشے میں صاف نظر آ رہا ہے

"تمہارا وہم ہی تھا"

"رات کو تو صرف قبرستان ہی میں گھنٹی بجتی ہے" اینڈریو کہتا ہے۔

"لیکن وہاں کیوں بجتی ہے" سب حیرانی سے سوال کرتے ہیں۔

"چوروں کو گرجے سے دور رکھنے کے لئے، وہ گھنٹی سے بہت ڈرتے ہیں۔"

سونیا پوچھتی ہے "چور قبرستان اور گرجے میں کیا لینے آتے ہیں؟"

"یہ تو سب جانتے ہیں، پہرہ داروں کو مارنے کے لئے۔"

ایک منٹ تک خاموشی چھا گئی، سب قدرے خوف زدہ ہو کر دیکھنے لگتے ہیں، کھیل پھر شروع ہو جاتا ہے اب کے اینڈریو جیت جاتا ہے۔ الوشا غصہ ہو کر بے وجہ چلا اٹھتا ہے "اس نے دھوکا دیا ہے"۔

"جھوٹ ہے۔ میں نے کوئی دھوکا نہیں دیا ہے۔"

اینڈریو کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے اس کی زبان چلنے لگتی ہے۔ اور وہ الوشا کے سر پر ایک تھپڑ مارتا ہے الوشا غصے سے لال پیلا ہو جاتا ہے، اور ایک گھٹنا میز پر ٹیک کر اینڈریو کے گال پر ایک تھپڑ مارتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ایک ایک اور تھپڑ لگاتے ہیں اور گالیاں بکنے لگتے ہیں۔ سونیا اس منظر کو برداشت نہیں کر سکتی اور چلانے لگتی ہے۔ کمرے سے طرح طرح کی رونے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ لیکن یہ خیال نہ کیجئے کہ کھیل ختم ہو گیا۔ پانچ منٹ بھی نہیں گذرنے پاتے کہ بچے پھر ہنستے ہوئے باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی آنکھیں تو بے شک نم ہیں۔ اور گالوں پر بھی آنسوؤں کے نشان ہیں لیکن وہ مسکرائے بغیر اب بھی نہیں رہ سکتے۔ الوشا کو بہت زیادہ خوشی ہے۔ کہ چلو کھیل میں کچھ تو گڑبڑ ہوئی۔

وسیا جو پانچویں جماعت میں پڑھتا ہے، نیند کا ماتا کھانے کے کمرے میں آتا ہے۔ گرشیا نے ہاتھ جیب میں ڈال رکھا ہے۔ کیوپکوں کی جھنکار آ رہی ہے۔ وسیا اسے سن کر کہتا ہے "یہ بات ہرگز اچھی نہیں۔ مجھ میں نہیں آتا کہ والدین بچوں کو کیوں کیوپک دیتے ہیں، شاید اس لئے کہ جوا کھیلنا سیکھ جائیں، تربیت کا

طریقہ بہت اچھا ہے۔ افسوس افسوس
لیکن بچوں کا کھیل اتنا دلکش ہے کہ وہ بھی شریک ہونے اور قسمت آزمائی کرنے سے باز نہیں رہ سکتا
"ایک منٹ ٹھہرو، میں بھی آکر شریک ہوتا ہوں" وہ کھلاڑیوں کو مخاطب کرکے کہتا ہے۔
"ابھی لگاتا ہوں" وہ اپنی جیبوں کو ٹٹولتا ہوا کہتا ہے "میرے پاس تو کیوپک نہیں، لیکن ایک روبل ہے، پاپا نے کل دیا تھا۔ میں یہی لگائے دیتا ہوں۔
"نہیں نہیں ہرگز نہیں! ..... ایک کیوپک ہی لگائیے گا"
"ابے احمق ... روبل بڑا ہوتا ہے کہ کیوپک۔ جو بازی جیت لے گا، وہ باقی کے کیوپک مجھے دے دیگا۔
"نہیں جی۔ تم جاؤ" وسیا بُرا سا منہ بنا لیتا ہے اور نوکروں کے کمرے کی طرف ریزگاری لینے جاتا ہے۔ نوکروں کے پاس ایک کیوپک بھی نہیں نکلتا ہے۔ واپس آکر وہ گریشیا سے کہتا ہے "تو پھر تم ہی مجھے کیوپک دے دو۔ اور دو کیوپک جتائے لینا"
گریشیا مشکوک نگاہوں سے وسیا کی طرف دیکھتا ہے اور سوچ رہا ہے کہ کہیں مجھے دھوکا تو نہیں دیا جارہا ہو وہ اپنی جیب کو مضبوطی سے پکڑ کر کہتا ہے "نہیں میں نہیں دونگا"
وسیا غصہ سے آگ بگولا ہو جاتا اور انھیں گدھا۔ احمق گاؤدی، بیوقوف کہہ کر گالیاں دینے لگتا ہے
سونیا اس کے غصے اور غرور سے مرعوب ہو کر کہتی ہے
"وسیا بیٹھ جاؤ، میں تمھاری جگہ کیوپک لگائے دیتی ہوں" وہ بیٹھ جاتا اور اپنے سامنے دو نمبر رکھ لیتا ہے۔ سونیا اپنے نمبر گننے لگتی ہے۔
ذرا ٹھہرو، میرا کیوپک گر گیا ہے۔" گریشیا گھبرائی ہوئی آواز میں کہتا ہے۔ وہ لیمپ اُٹھا لیتا ہے اور کیوپک ڈھونڈھنے کے لئے کرسیوں سے گزر کر میز کے نیچے گھس جاتا ہے۔ وہ پھلوں کے چھلکوں اور دوسری گندی چیزوں کو ٹٹولتے ہیں، ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ لیکن کیوپک نہیں ملتا۔ اب وہ دوبارہ تلاش شروع کرتے ہیں، باہم سر ٹکراتے ہیں، چیختے ہیں۔ اور یہ سلسلہ خاصی دیر تک رہتا ہے، بالآخر وسیا گریشیا کے ہاتھ سے لیمپ چھین کر میز پر رکھ دیتا ہے۔ گریشیا اندھیرے ہی میں کیوپک ڈھونڈھتا رہتا ہے اور آخر ڈھونڈھ ہی لیتا ہے، کھیلنے کے لئے کھلاڑی پھر آ بیٹھتے ہیں۔ الوشا کہتا ہے کہ "سونیا سو گئی"
سونیا اپنا گھنگھریلے بالوں والا سر اپنے بازوؤں پر رکھ کر بڑی میٹھی اور چین کی نیند سو رہی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اسے سوئے ہوئے بہت دیر ہو چکی ہے۔ شاید اس وقت سوئی ہو گی جب اور بچے کیوپک ڈھونڈھ رہے تھے۔

"آپنا اسے کرسی پر سے اُٹھاتی اور کہتی ہے "آؤ میرے ساتھ۔ امّی کی چارپائی پر سو جاؤ! چلو۔ چلو"
سب آپنا کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ وسیا سونے کے لئے بڑبڑاتا اپنے کمرے کی طرف چلا جاتا ہے۔

پانچ منٹ نہیں گذرنے پاتے کہ سونے کے کمرے میں امّی کا بڑا پلنگ ایک عجیب ہی منظر پیش کرتا ہے۔

سونیا سو رہی ہے، انوشتا اس کے پہلو میں لیٹا ہوا خراٹے لے رہا ہے۔ گریشیا اور آپنا بھی ایک دوسرے کے سیر کی طرف پاؤں کئے خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں۔ باورچی کا لڑکا اینڈیو بھی کسی نہ کسی طرح دونوں کے درمیان میں گھس کر لیٹ گیا ہے۔

پاس ہی پلنگ کے ایک کونے میں کیوپک ..... بہت سے کیوپک پڑے ہیں۔ اب ان میں بچوں کے لئے کوئی دلکشی نہیں رہی ہے۔

اچھا۔ سوئیے۔ گڈ نائٹ۔

ہائے اس زندگی کے کیا کہنے　　جب کہ کچھ بھی پتہ نہیں ہوتا۔

شعلہ زار

(از حضرت فکر تونسوی)

کہیں تو باقی ہے سازِ سرور و سوز مگر　　کہ دلربا ہیں ابھی تک حیات کے شعلے
جھلس نہ دیں کہیں تیرے شعور کے پردے　　نظر میں روکی ہوئی ایک بات کے شعلے
یہ ظلمتوں میں ہی بیجاں و گرم و تیز نہیں　　لبِ سحر پہ بھی دھڑکیں گے رات کے شعلے
وہ ایک سجدہ، جو آتش نسب نے روک لیا　　اُسی سے پھوٹے ہیں یہ کائنات کے شعلے
تو برف و سنگ پہ کیا طنز کر سکا اے شیخ　　کہ دیکھ پایا جمود و ثبات کے شعلے
مزاج رکھتی ہے اپنا، روایتوں سے جدا　　مرے جلو میں ہیں حسِ واردات کے شعلے

وہ جیت، میری بساطِ نظر کی اہل نہیں
جبیں پہ جس کی نہ چمکے ہوں مات کے شعلے

بحث و مباحثہ

(از - ا ر بدریشس)

ماہ جون ۱۹۴۳ء کے زمانہ میں جناب محمد عادل مرزا صاحب جالب میرٹھی کے دیوانچہ "جالب کے سو شعر" پر جو تنقید شائع ہوئی وہ جناب سری کرشن داس، انسپکٹر پولیس، چمبہ، کو کچھ خلاف حقیقت نظر آئی۔ ممدوح نے جناب محوی صدیقی لکھنوی کی نظم "نوائے دل" پر اعتراض کئے جو اسی نمبر میں شائع ہوئی ہے اور ادارہ زمانہ پر بھی گرفت کی کیونکہ اس نے اپنے عنوان "رفتار زمانہ" کے ایک پیراگراف میں دو محاورے "سے متعلق" اور "کے متعلق" استعمال کئے تھے۔

محوی صاحب کی غزل میں لفظ "ستم" کئی جگہ آیا ہے، اس کی نسبت ارشاد ہے

(۱) پہلے شعر میں "ستم" بکسر تائے استعمال کیا ہے۔

(۲) دسویں شعر میں اس لفظ کو ایک غیر معروف اور نامانوس طور پر استعمال کر کے بحر میں حذف و سکون پیدا کر دیا ہے۔

جون ۱۹۴۳ء کا پرچہ میرے سامنے ہے۔ اس لفظ پر اعراب نہیں ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دعویٰ کیونکر کیا گیا کہ یہ لفظ "پہلے شعر میں بکسر تائے" استعمال کیا گیا ہے۔ اور اعراب کی عدم موجودگی میں اس کو بفتح تائے کیوں نہ پڑھا جائے۔

دوسرا اعتراض امیر مینائی مرحوم کے اس فرمان پر مبنی ہے کہ الفاظ مثلثہ میں ساکن کو متحرک کرنے کا قاعدہ عام نہیں ہے، بلکہ جس قدر اساتذہ نے تصرف کر لیا ہے اسی قدر جائز ہے" امیر مینائی مرحوم کا بتایا ہوا قاعدہ محض انھیں لوگوں کی جدت پر پابندی عائد کرتا ہے جن کو رتبۂ اجتہاد حاصل نہیں، اور نو آموز ہیں وہ بلند پایہ شاعر اس سے مستثنیٰ ہیں جن کو زمانہ مسند استادی پر متمکن کر چکا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے محوی صاحب اس زمانے کے ایک کہنہ مشق اور مسلم الثبوت شاعر ہیں اور ان پر وہ تعریف صادق آتی ہے جو ان شعراء پر جن کو امیر مینائی صاحب نے لفظ "اساتذہ" سے تعبیر کیا ہے۔ اس لئے اس سند کی بناء پر اس تصرف پر گرفت درست نہیں۔

گو میں شاعر نہیں۔ محوی صاحب پر جو اعتراض کئے گئے ہیں ان کا جواب دینا خود انھیں کا کام ہے باپھر اس کام ہو سری کرشن داس صاحب کے اعتراضوں کی صحت کو بہ نظر اشتباہ دیکھتا ہے۔ یہ نظم ادارے

کے پاس بہ غرض اشاعت آئی تھی بغرض تنقید نہیں آئی تھی کہ وہ اس کو محک امتحان پر کسنے کے بعد شائع کرتا جالب صاحب کا "دیباچہ" بہ غرض تنقید موصول ہوا تھا، محوی صاحب کی نظم کی تنقید اس کا فرض نہ تھا اور جالب صاحب کے شعروں کی تنقید نہ کرتا تو مرتکب بہلو تہی ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ مستند شعراء و نثار کے رشحات قلم شائع کر کے زمانہ ایک قابل قدر ادبی خدمت کر رہا ہے اور ان کے تصرفات پر اعتراض سے احتراز کر کے اور ان کی لغزشوں کی جواب دہی کا بار انھیں پر رکھکر اخلاق صحافت کے ایک اصول پر عامل ہونے کا ثبوت دے رہا ہے۔

جالب صاحب کے ناقد نے کہا ہے کہ "لفظ 'بن' آج کل متروک ہے"۔ اس کی تردید میں حالی صاحب کا فتویٰ پیش کیا گیا ہے لیکن ان کے اس خیال یا دعوے کے ثبوت میں کہ "دہلی اور مضافات دہلی میں وہ کم و بیش برابر بولے جاتے ہیں۔۔۔ وہ ہمیشہ بولے جائیں گے۔۔۔ شعر میں ان کی ضرورت ہمیشہ رہے گی"؛ عصر حاضر کے نثار و شعرا کے کلام سے یہ دکھانا چاہیئے تھا کہ لفظ "بن" آج بھی دہلی اور مضافات دہلی میں بولا جاتا اور مستعمل ہے۔ مستقبل کی نسبت جو رائے ظاہر کی جائے تاوقتیکہ خود مستقبل اس کی اصابت کو ثابت نہ کر دے اس سے استدلال صحیح نہیں۔

محاورات "کے متعلق" اور "سے متعلق" پر اعتراض ہے کہ یہ "فریبندۂ راہ" ہیں۔ اول تو یہ اعتراف کہ مسلم الثبوت اساتذہ نے "متعلق" سے پہلے "کے" استعمال کیا ہے "اعتراض کی وقعت پر اثر انداز ہے"، دوسرے یہ کہ اگر کسی خیال کے اظہار کے لئے دو اسلوب ہیں تو وہ "فریبندۂ راہ" کیوں کر ہو سکتے ہیں۔ زبان کے طالب علم کا فرض ہے کہ وہ اس امر سے آگاہ ہو۔ مثلاً جو لوگ میری طرح تھوڑی سی انگریزی جانتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ (۱) With a view to do اور (۲) With a view to doing دونوں درست ہیں، لیکن اُدیا ران میں سے پہلے کو فصیح خیال کرتے ہیں، اور دوسرے کا استعمال اچھا نہیں سمجھتے۔ امیر مینائی مرحوم کے زمانے میں خواہ "کے" "متعلق کے پہلے نہ آتا ہو، مگر آج کل کے اہل قلم اسے بے تکلف استعمال کر رہے ہیں۔ وہ "سے متعلق" اور "کے متعلق" کے معنی میں فرق و امتیاز کرتے ہیں۔ پہلے میں وہ "متعلق" کو بہ معنی "تعلق و علاقہ" لیتے ہیں اور دوسرے میں بہ معنی "بارہ۔ نسبت"۔ اس لئے امیر مینائی مرحوم کی سند کو استعمال و رواج حال نے مسترد کر دیا۔ یہاں ماہنامہ "نگار" بابت ماہ ہائے جنوری و فروری سنہ ۱۹۴۴ء اور "ہماری زبان" بابت یکم جون سنہ ۱۹۴۴ء سے چند اہل قلم کے چند فقرے یہ دکھانے کو نقل کئے جاتے ہیں کہ وہ ان محاورات کو کن معنی میں لکھتے ہیں:۔

"کے متعلق" (۱) بالشویک حکومت کے متعلق جو لٹریچر ہندوستان تک پہنچا (صفحہ ۳ نگار۔ نیاز فتحپوری)

(۲) وزن سے اہم شعری عنصر کے متعلق یہ پیرایۂ بیان (صفحہ ۳۰ نگار۔ اختر تلہری)
(۳) مجھے ان کے اسلوب تحریر کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ہے (صفحہ ۴۰۔ نگار۔ سیماب اکبرآبادی)
(۴) ادب کے متعلق یہ ترقی پسند نظریہ عام ہوگیا تھا (صفحہ ۶۲۔ نگار۔ سید صفدر حسین)
(۵) ایک ہی چیز کے متعلق دو بار کے تجربے (صفحہ ۹۹ سطر اول۔ نگار۔ حامد حسن قادری)
(۶) اس کانگریس کے متعلق جو گشتی اعلان حیدرآباد سے جاری ہوا۔ (صفحہ ۲ ہماری زبان۔ ادارہ)

"سے متعلق" (۱) یہ ضروری ہے کہ غیر شعر و وزن کے تعلق سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور کرسکتا ہے (صفحہ ۳۰ نگار۔ اختر تلہری)
(۲) پہلا حصہ سیاسی بے لبسی سے متعلق ہے (صفحہ ۵ نگار۔ سید صفدر حسین)
(۳) اب اگر وہ تجربے اور موضوع زندگی کے کسی شعبہ سے متعلق ہیں (صفحہ ۹۹ سطر سوم نگار۔ حامد حسن قادری)
(۴) پچھلے مہینے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا جو اجلاس جبل پور میں ہوا اس میں اردو سے متعلق کئی اہم تجویزیں منظور ہوئیں۔ (صفحہ ۲ ہماری زبان۔ ادارہ)

ادارۂ زمانہ نے ان دونوں محاوروں کو ان کے الگ الگ معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس کے فقرے یہ ہیں:-

(۱) ہندوستان کے متعلق برٹش گورنمنٹ کی پالیسی اظہر من الشمس ہے۔ وہ اس وقت مزید اختیارات کے متعلق کوئی گفت و شنید کرنے پر تیار نہیں۔
(۲) ڈفنس آف انڈیا رولس کے قاعدہ ۲۶، اور اسپیشل کورٹ کرمنل آرڈیننس سے متعلق ہے۔

ادارے کا عمل کسی طرح "فریبندۂ راہ" نہیں معلوم ہوتا۔

جناب سری کرشن داس صاحب کی طرح اتفاق سے میں بھی ایک ایسے مقام سے یہ چند سطریں ان کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں جہاں نہ کسی قسم کی کوئی علمی سرگرمی ہے اور نہ کوئی کتب خانہ

رباعیات

(ڈاکٹر عندلیب شادانی)

گلدان میں ہو کہ شاخ پر ہو — ہر حال میں پھول خوشنما ہے
لیکن زلف سیہ [illegible] شب میں — ہر گل مہتاب بن گیا ہے

روتا ہے مجھے چھوڑ جانے والے — کیا تجھ سے کہوں کہ حال کیا ہے
آنکھیں ہیں کہ آشیان ویراں — طائر جس میں سے اڑ گیا ہے

بحث و مباحثہ

(از ابو الفاضل راز چاند پوری)

زمانہ بابت ماہ اپریل ۱۹۴۴ء (ص ۱۹۹) میں جناب سری کرشن داس صاحب نے حضرت مولانا محوی صدیقی لکھنوی کے مندرجۂ ذیل اشعار پر اعتراض کیا ہے:۔

(۱) دل کو ذوقِ الم نہ ہو جائے	ستم اُن کا کرم نہ ہو جائے
(۲) ہمت ضبط کم نہ ہو جائے	ختم شوقِ ستم نہ ہو جائے
(۳) غیر ممکن کہ جب اُٹھے وہ نگاہ	سر تسلیم خم نہ ہو جائے
(۵) جی دھڑکتا ہے لذتِ غم کا	عزم ترکِ ستم نہ ہو جائے :
(۱۰) اور تھوڑی سی جان باقی ہے	ستم دوست کم نہ ہو جائے

اور اعتراض یہ ہے:۔

"پہلے شعر میں ستم کو بکسر تائے اور دوسرے اور پانچویں اشعار میں بفتح تائے استعمال کیا ہے، اس سے بڑھ چڑھ کر اُنھوں نے دسویں شعر میں اس لفظ کو ایک غیر معروف اور نامانوس طور پر استعمال کر کے بحر میں حذف و سکون پیدا کرنے سے بھی گریز نہیں کیا ......"

خدا معلوم فاضل معترض نے یہ کس طرح سمجھ لیا کہ پہلے شعر میں ستم بکسر تائے استعمال کیا ہے۔ حالانکہ ہر جگہ یہ لفظ صحیح تلفظ کے ساتھ نظم ہوا ہے۔

داس صاحب کی عروض دانی میں شک کرنا تو شاید کفر کے مرادف ہوگا اور حسن ظن کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اُن کے اعتراض کو کسی غلط فہمی یا سہو نظر پر محمول کیا جائے۔

یہ غزل بحر خفیف مسدس مخبون محذوف میں ہے، اور داس صاحب نے جو وزن لکھا ہے، وہ صحیح ہے یعنی فاعلاتن مفاعلن فعلن، مگر اُن کو یہ یاد نہیں رہا کہ صدر (مصرعۂ اولیٰ کا رکن اول) اور ابتدا (مصرعۂ ثانی کا رکن اول) سالم اور مزاحف (مخبون) دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں۔

اب تقطیع اس طرح ہوگی:

(۱) دل کو ذوق - الم نہ ہو - جائے = فاعلاتن - مفاعلن - فعلن

(۹) ستم ان کا - کرم نہ ہو - جائے - فعلاتن - مفاعلن - فعلن

(۱۰) ستم دوس - ت کم نہ ہو - جائے - " " "

شاید مجھے یہ بھی واضح کر دینا چاہیئے کہ "ستم ان کا" میں اُن کا الف اور "ستم دوست" میں دوست کا سین تقطیع میں محسوب نہیں ہوا۔ تفصیل کے لئے بحرالفصاحت یا عروض کی کوئی اور کتاب ملاحظہ کیجئے لفظ ستم کو بفتح تائے نظم کرنے کی سند میں جو اشعار پیش کئے گئے ہیں وہ داس صاحب کے حسنِ نظر پر دال ہیں۔ ع اس سے زیادہ حاجتِ شرح و بیاں نہیں

حضرت جالب میرٹھی کے اشعار کے متعلق نقادِ زمانہ پر جو توجہ فرمائی گئی ہے وہ بھی بظاہر سرسری نظر کی رہینِ منت معلوم ہوتی ہے۔

(۱) بن، واقعی متروک ہے۔ فصحا اس لفظ کو استعمال نہیں کرتے۔ مولانا حالی کا قول اپنی جگہ درست سہی، مگر ع یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

(۲) سجدے کی (ے) ضرور گرتی ہے اور اس کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ع

"آنکھوں سے یوں تو سجدے کئے جا رہا ہوں میں"

اس مصرع میں سجدہ کی جمع اُردو کے قاعدہ سے 'سجدے' لائی گئی ہے اور اُردو زبان کے الفاظ میں حروفِ علت کا دبنا یا گرنا جائز ہے۔

(۳) وہ چشمِ ناز بھی مانوسِ شبنم ہوتی جاتی ہے + ادھر بھی عشق کی تکمیل پیہم ہوتی جاتی ہے

اس شعر میں سب سے پہلی غور طلب بات یہ ہے کہ شاعر کی مراد شبنم سے کیا ہے؟ اگر اس سے مراد صرف شبنم (اوس) ہے جیسا کہ داس صاحب کی تشریح سے ظاہر ہوتا ہے۔

"مراد یہ ہے کہ اُدھر چشمِ ناز شبنم سے مانوس ہوتی جاتی ہے......"

تو چشمِ ناز کا "مانوسِ شبنم" ہونا خلافِ واقعہ ہوگا۔ البتہ اگر شبنم سے مراد "اشک" لی جائے، تو مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ رفتہ رفتہ چشمِ ناز بھی جذبۂ محبت سے متاثر ہو کر اشک آلود یا اشک افشاں ہوتی جاتی ہے۔ اور اس طرح آہستہ آہستہ عشق کی تکمیل بھی ہوتی جاتی ہے۔ لفظ پیہم یقیناً محلِ نظر ہے اور غالباً قافیہ کی ضرورت کے لئے نظم کیا گیا ہے۔

(۴)۔ ا۔ ہندوستان کے متعلق برٹش گورنمنٹ کی پالیسی اظہر من الشمس ہے۔

ب۔ وہ اس وقت نئے اختیارات کے متعلق کوئی گفت و شنید کرنے پر تیار نہیں ہے۔

ج۔ ...... وہ فیڈرل کورٹ کے دو نہایت اہم فیصلے ہیں جو ڈیفنس آف انڈیا رولس کے متعلق

(۳۶) اور اسپیشل کورٹ کرمنل آرڈیننس سے متعلق ہے (ہیں)

(زمانہ جون ۱۹۴۳ء صہ ۳۹)

مندرجۂ بالا تینوں جملوں میں متعلق سے پہلے (کے) اور (سے) بقول داس صاحب بلا تمیز نہیں بلکہ بہ صد تمیز استعمال کئے گئے ہیں۔ پہلے دو جملوں میں (کے) کی ضرورت تھی اور تیسرے میں (سے) کی۔ غالبًا مندرجۂ ذیل مثالیں لائق معترض کے اطمینان کے لئے کافی ہونگی۔

(۱) زمانہ کے متعلق اہل نظر کی رائے ہمیشہ اچھی رہی ہے۔

(۲) تنقید نگاری کی خدمت داس صاحب سے متعلق ہے۔

آہ! دیانراین نگم

(از جناب ص۔ ع۔ فیروز)

اہلِ زمانہ روتے ہیں اور روئیں کیوں نہیں
ہم میں دیا نراین صد افسوس اب نہیں

آنکھوں میں اب اداس ہے یہ آسماں تمام
نظروں میں ہے بھری ہوئی لنغم سے یہ کل زمیں

وحشت سے پُر ہے آج یہ ساری فضائے دہر
تسکین ڈھونڈھتا ہوں یہ ملتی نہیں کہیں

انکے خلوص و خلق کو کیا جانیئے، تھے کیا
ہے یہ بجا جو غم میں ہوں اغیار بھی حزیں

ان کی وہ التفات کی نظریں، وہ فیض عام
دراصل ہے یہی تو لبِ انسانیت کا دیں

یاد آرہی ہے انکی، ہے دل میں ہجوم یاس
طوفان چشم میں ہے بپا اشک آتشیں

کیا موت آپنے چھوڑا ہے اور چھوڑیگی کسے
سب کا ہے ایک وقت تو ہر کے لئے کمیں

فیروز کہتے ہیں جسے باغ جہانِ موت
بالا نشین روحِ نگم آج ہے وہیں

رفتار زمانہ

پچھلی مرتبہ جب ہم نے رفتار زمانہ پر اظہار خیالات کیا تھا اُس وقت سے ابتک جنگ کا نقشہ بالکل بدل چکا ہے اور اتحادیوں کی فتح نزدیک دکھلائی پڑ رہی ہے اور حالات اس قدر تیز رفتاری سے بدل رہے ہیں کہ ان کا ساتھ دینا مشکل ہو رہا ہے۔ یورپ میں جرمنوں کو ایسی لگاتار شکستوں کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے کہ بعید نہیں ہے جو یورپ کی جنگ اگلے مہینہ ختم ہو جائے۔ اس وقت اتحادیوں کا اقبال یاور ہے۔ خود جرمنوں میں پھوٹ پڑ گئی ہے، چنانچہ کچھ فوجی جنرلوں نے ہٹلر اور اُسکی نازی پارٹی کا تختہ اُلٹنے کی سازش کی اور ۲۰ جولائی کو ہٹلر پر بم پھینکا گیا مگر وہ بچ گیا اور اُسکے تقریباً تمام ساتھی زخمی ہوئے اگرچہ یہ سازش دبا دی گئی ہے اور بہت سے جنرلوں کو گولی سے اُڑا دیا گیا ہے لیکن آگ اندر ہی اندر سلگ رہی ہے اور وہ دن بہت قریب ہے جبکہ خود جرمن فوج ہٹلر کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیگی۔

فرانس | فرانس کے مغربی ساحل پر اتحادیوں کے فوج اُتارنے کے ایک ماہ کے اندر ہی اندر نارمنڈی کی لڑائی ختم ہو گئی ہے اور نارمنڈی کا تمام علاقہ اور اس کے آگے کا بہت سا علاقہ اس وقت اتحادیوں کے قبضہ میں آچکا ہے۔ پیرس تک اتحادی فوجیں پہونچ گئی ہیں اور غالباً جب تک یہ سطور ناظرین کی نظروں سے گذریں گے اُس وقت تک پیرس پر اتحادیوں کا قبضہ ہو چکا ہوگا مارشل پٹین کو گرفتار کر کے جرمنی پہونچا دیا گیا ہے۔

مغربی و شمالی فرانس کے علاوہ اتحادیوں نے جنوبی فرانس میں بھی فوجیں اُتار کر مارسیلز، نیس، طولون وغیرہ میں اتنا علاقہ فتح کر لیا ہے کہ اب امریکن فوجیں پیش قدمی کرتے کرتے سوئزرلینڈ کی سرحد تک پہونچ گئی ہیں اور جرمن فوجیں ہر جگہ پیچھے ہٹتی چلی جا رہی ہیں۔ فرانس میں اہم ترین بات یہ ہوئی ہے کہ اب فرانسیسی عوام جو ابتک خاموش تھے دفعتاً جرمنوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور ہر جگہ خونریزی ہو رہی ہے

اٹلی | جو حال جرمنوں کا فرانس میں ہے وہی اٹلی میں بھی ہو رہا ہے۔ اتحادی فوجیں ہر طرف بڑھتی چلی جا رہی ہیں حتی کہ انھوں نے مشہور تاریخی شہر فلورنس پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ مارشل کیسلرنگ نے پیچھے ہٹکر جو نئے مورچے قائم کئے ہیں اتحادی فوجیں مشرق و مغرب دونوں طرف سے پیش قدمی کر کے اُن پر بھی حملے کر رہی ہیں یہاں جرمن فوجیں کسی قدر مزاحمت کر رہی ہیں مگر یہ مزاحمت بھی دیرپا نہیں ہوگی۔

روس | روس کا محاذ جنگ اس وقت خلیج فنلینڈ سے لیکر کوہستان کارپیتھین تک پھیلا ہوا ہے۔ شمال میں روسی فوجیں ریاست اسٹونیا، لٹویا اور لتھونیہ میں گھس گئی ہیں۔ وسط میں روسی فوجیں مشرقی پروشیا یعنی خاص جرمن علاقہ میں داخل ہو چکی ہیں۔ پولینڈ میں روسی فوجوں نے ایک نئی یلغار دریا آسٹاک کی طرف شروع کی ہے اور وارسا میں جو پولینڈ کا دارالحکومت ہے پولستانی محبان وطن سے دست بدست لڑائی تک نوبت پہونچ گئی ہے۔ جنوب مغرب میں روسی فوجوں نے سانڈومیرز سے آگے بڑھکر کراکو پر چڑھائی کر دی ہے اور انھیں کچھ کامیابیاں بھی حاصل ہوئی ہیں۔ جنوب مشرق میں روسی فوجوں نے رومانیہ میں بہت دور تک گھس کر جاسی اور دیگر شہروں پر قبضہ کر لیا ہے اور وہ بحیرۂ اسود کی رومانوی بندرگاہ کانسٹینزہ پر حملہ کر رہے ہیں

بلقان | بلقان میں متعدد ریاستیں ہیں جن میں سے اس وقت یونان دیوگوسلافیہ کا عدم وجود برابر ہے۔ رومانیہ ہنگری ترکی و بلغاریہ موجود ہیں۔ بلقانی ریاستوں میں اتحادیوں خصوصاً روس کے دباؤ ڈالنے سے سب سے پہلے ترکی نے جرمنی سے اپنے تمام سیاسی و اقتصادی تعلقات منقطع کر لئے اور اب وہ کھلم کھلا اتحادیوں کے ساتھ ہو گیا ہے۔

[illegible] رومانیہ کو بھی روس کی طرف سے صلح کی شرطیں پیش کی گئیں جو انھوں نے منظور کر لیں ہیں جسکی [illegible] اتحادیوں کے ساتھ [illegible] اب اسی طرح رومانیہ بھی اتحادیوں سے مل گیا ہے

بلغاریہ بھی صلح کرنا چاہتا ہے، چنانچہ اُس نے گیارہ ڈویژن بلغاری فوجوں کو مقدونیہ و یونان سے ہٹ آنے کا حکم دیدیا ہے۔ فنلینڈ بھی جنگ سے تنگ آچکا ہے اغلب ہے کہ چند روز میں وہ بھی جرمنی سے علٰحدہ ہوکر روس سے صلح کرلے۔ اس کے بعد صرف ہنگری باقی رہ جاتا ہے جس پر روسی فوجیں حملہ کرنے والی ہیں کیونکہ ہنگری نے ٹرانسلوینیہ پر قبضہ کرلیا تھا جو رومانیہ کا ایک جزو تھا۔ الغرض جرمنی کے تمام ساتھی ٹوٹ گئے ہیں یا ٹوٹتے جاتے ہیں، اس کے بعد جرمنی تن تنہا چاروں طرف کے اتحادی حملوں کا کب تک مقابلہ کرے گا!

برما | جاپانی فوجیں جو ریاست منی پور میں گھس آئی تھیں اُنھیں مار کر نکال دیا گیا ہے اور اب ایک بھی جاپانی سرزمینِ ہند پر باقی نہیں رہا ہے۔ بلکہ برعکس ازیں اتحادی فوجیں پیش قدمی کرتی اور جاپانیوں کو بھگاتی ہوئیں پندرہ میل تک برما کے اندر گھس گئی ہیں۔

شمالی برما میں جنرل اسٹلویل کی امریکن اور چینی فوجیں خوب دادِ مردانگی دے رہی ہیں اور لگاتار آگے بڑھتی جارہی ہیں۔ لیکن چونکہ آجکل برسات کا موسم ہے، کوہستانی علاقہ ہے، جگہ جگہ پر ندی نالے ہیں، ریلیں ہیں نہ سڑکیں، باربرداری و رسد رسانی بہت مشکل ہے، اس لئے اتحادی رفتار کا دھیما ہونا ایک قدرتی بات ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اب جاپان اتحادیوں سے مرعوب اور خوف زدہ ہوگیا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ شہنشاہ جاپان اور اُن کے وزیروں کے درمیان کانفرنس ہونے کے بعد شہنشاہ کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا ہے کہ موجودہ لڑائی اس بات کا فیصلہ کردے گی کہ ہماری سلطنت باقی رہے گی یا نہیں رہے گی۔ دوسری طرف جاپان کے نئے وزیر اعظم نے اپنی قوم سے اپیل کی ہے کہ اس وقت جاپانی قوم پر سخت کٹھن وقت آگیا ہے جس کا مقابلہ کرنے کے لئے تمام قوم کو تیار رہنا چاہیے۔

بحرالکاہل اور چین میں کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔

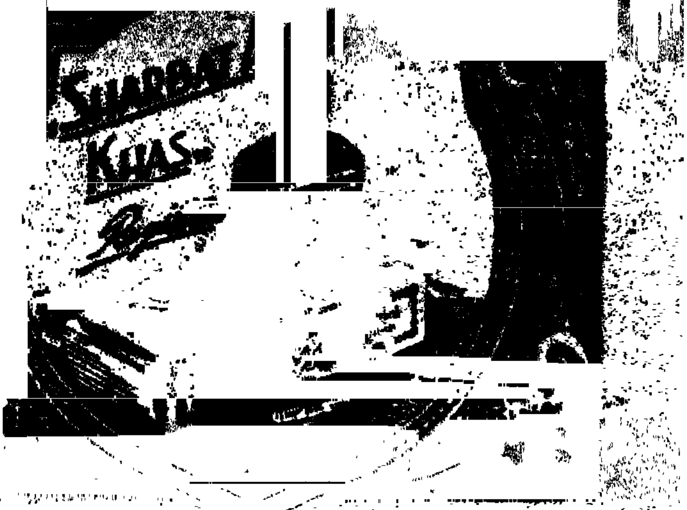
ہندوستان

سری راجگوپال اچاریہ جی نے مہاتما گاندھی کی منظوری سے مسٹر جناح کے سامنے ایک فارمولا پیش کیا ہے، جس میں بعض شرطوں کے ساتھ پاکستان اسکیم کو منظور کرلیا گیا ہے۔ اب اس کے بعد مسٹر جناح اور مہاتما گاندھی میں بمقام بمبئی ملاقات ہوکر گفت و شنید ہونے والی ہے۔

لیکن عین اسی وقت ہز اکسلنسی وائسرائے نے وہ خط و کتابت شائع کرکے جو اُن کے اور مہاتما گاندھی کے درمیان ہوئی تھی، مہاتما جی کی پیش کردہ تمام تعمیری و مصالحتی تجاویز مسترد کردی ہیں۔ اور یہ بھی اشارہ کردیا ہے کہ اگر مسلم لیگ اور کانگریس میں کوئی سمجھوتہ ہو بھی گیا تو کیا ہوگا، ہندوستان میں اور بھی بہت سی جماعتیں موجود ہیں جن کا تحفظ برطانیہ کے ذمّہ ہے۔

بہرحال چند روز میں مہاتما جی اور مسٹر جناح میں گفت و شنید ہونے والی ہے اور تمام ملک کی آنکھیں اسی طرف لگی ہوئی ہیں۔ دیکھیے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

ہندوستانی ادب (افسانہ نمبر) آجکل پنجاب کے اردو رسالوں میں افسانہ نمبر نکالنے کا ایک فیشن سا ہوگیا ہے لیکن ہندوستانی ادب کے افسانہ نمبر میں ایک خاص خوبی ہے یعنی شروع میں افسانہ سے متعلق نصف درجن تھوس اور فاضلانہ مضامین دیئے گئے ہیں جنکے مطالعہ سے افسانہ نگاروں کو یقیناً بہت فائدہ ہوگا۔ [illegible] بہترین حصہ نہیں [illegible] پہلے حصہ میں نصف درجن مقالات ہیں دوسرے حصہ میں افسانے اور تیسرے میں [illegible] فسانے بعض بعض افسانے دلچسپ اور سبق آموز ہیں اور بعض محض تفریحی ہیں۔ ہمیں [illegible] افسانہ بہت پسند آیا۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ ضخامت ۱۳۲ صفحات قیمت ایک روپیہ [illegible] ملنے کا پتہ۔ دفتر ہندوستانی ادب [illegible]


SHARBAT
KHAS

[illegible] آپ کا [illegible] ضامن ہے



[illegible] کیجیے۔ اس کے ذریعے آپ اپنی اضافی مال کی [illegible] کر سکتے ہیں۔ [illegible] ۳۶
کے ذریعے تیار کیا جاتا ہے [illegible] صنعتی اداروں کے گروپ میں شامل
[illegible] ملک اور عوام دونوں کی خدمت کرتا ہے۔ عوام کی خدمت اس طرح کرتا ہے کہ
[illegible] ہے۔ اور ملک کی خدمت اس طرح کرتا ہے کہ [illegible] مال
[illegible] صنعت کو فروغ دے کر ملک کو خوشحالی بخشتا ہے۔
[illegible] کام کرنے کے لئے کروڑوں روپے کا سرمایہ ہے [illegible]
[illegible]

مصنوعات اور کاروبار

[illegible] • [illegible] • [illegible]
[illegible]

زمانہ

جلد ۸۳ — ستمبر ۱۹۴۴ء — نمبر ۳

نظیر اکبر آبادی کی مصوّری

(از مسٹر سلیم جعفر)

مقالہ "نظیر پے نظیر" میں کہا جا چکا ہے کہ نظیر مصوّر ہیں، لیکن وہی کیا، ہر شاعر مصوّر ہے۔ اُس وقت ایک خاص ہستی سے بحث تھی اس لئے اس کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا، ورنہ شعر و شاعری سے عام بحث ہوتی تو اس کے سوا کیا کہا جا سکتا تھا کہ ہر شاعر مصوّر اور اُس کا فن مصوّری ہے۔

جب شاعری مصوری ٹھہری اور شاعر مصور تو پھر مصور کو اس سے کیا بحث کہ وہ کس قسم کی تصویر بناکر پیش کر رہا ہے۔ اس کے سامنے جس طرح کی چیز آجائے گی وہ اسے یا اس کے تمام اثرات کو اپنے ودائع فطری کی مدد سے مترنم و موزوں لفظوں کا جامہ پہنا کر منظر عام پر لے آئے گا۔ بہ ظاہر قدرت کے لامتناہی تنوع کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ مصوری لامحدود تنوع کی مالک ہو، لیکن حقیقۃً یہ صرف دو نوع پر مشتمل ہے ان انواع کی فصلوں کا احاطہ خارج از امکان ہے ایک قسم کی مصوری تاثرات کی مرہون منت ہے۔ اس میں شاعر ان چیزوں کو اپنے ودائع فطری کی مدد سے منظر عام پر لاتا ہے جو اس کے افراد کائنات سے اثر پذیر ہونے کا نتیجہ ہیں، یہ داخلی مصوری یا شاعری ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں ایک سانحہ، ایک حادثہ، ایک واقعہ آنکھوں کے سامنے گزرتا ہے مصور کا حافظہ اسے محفوظ کر لیتا اور اس کی اصلیت و جیتی جاگتی تصویر بیان کر دیتا ہے یہ خارجی مصوری یا شاعری ہے اس لئے نظم یا تو محض داخلی ہو سکتی ہے یا محض خارجی لیکن

شاعر ان سے تجاوز کر جائے اور وہ ایک کی حدود سے نکل کر دوسری کی حدود میں داخل ہو جائے تو پھر وہ دونوں کا مجموعہ ہوگی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک دل فریب صورت دیکھ کر اگر شاعر محض اس کے خد و خال دکھانے پر قناعت کرے گا تو اس کی یہ نظم خارجی مصوری کے قلعے میں محصور رہیگی لیکن اگر وہ اس سے قطع نظر کر کے اس اثر کو بیان کرے گا جو اس مجسمۂ حسن سے اس کے دل پر پڑا ہے تو اس کی تگ و دو داخلی شاعری کی حدود سے آگے نہ بڑھے گی۔ اور اگر وہ خد و خال کا حسن بیان کر کے اس حسن نے جو اثر اس پر کیا ہے اسے بھی بیان کریگا تو یہ نظم دونوں کا معجون مرکب ہوگی۔

اردو میں عام طور سے "رزم و بزم" دو ہی طرح کی نظم مانی گئی ہے لیکن سنسکرت اور اس کی تقلید میں ہندی نے بال کی کھال کھینچی ہے۔ اس نے ۹ طرح کے موضوع شاعری تسلیم کئے ہیں جو یہ ہیں :-

शृंगार (۱) شرنگار۔ مواصلت و مفارقت

हास्य (۲) ہاسیہ۔ ناز و کرشمہ و غمزہ دکھانے کو ہنسی مذاق۔

करुण (۳) کرونا۔ درد و کرب اس حد تک کہ جان پر بن جائے۔

वीर (۴) بیر۔ شجاعت و بسالت۔ رحم و کرم۔

रौद्र (۵) رودر۔ خشگی و رنجش مقدمات برہمی مزاج طرفین۔

भयानक (۶) بھیانک۔ خوف و ہراس۔

वीभत्स (۷) بی بھتس۔ تنفر و تبغض جو کسی مکروہ چیز کو دیکھ کر پیدا ہو۔

शान्त (۸) شانت۔ سکون و اطمینان۔ تصوف۔

अद्भुत (۹) اَدبھت۔ حیرت و استعجاب

دامن اردو ان گلہائے رنگیں سے تہی نہیں ہے اور اصطلاحات رزم و بزم ان پر حاوی ہیں۔ یہ سب موضوع داخلی اور خارجی انہیں دو اصناف کے تحت میں آتے ہیں۔ مثلاً شرنگار کو لیجئے۔ اگر شاعر اپنے تاثرات و واردات قلب کو بیان کرے گا تو وہ خارجی ہوگی کیونکہ وہ مواصلت و مفارقت کے صرف وہ منظر دکھلائے گا جو اس نے دیکھے ہیں اور جن کا مظہر و مورد اس کی ذات نہیں۔

نظیر کی شاعری بھی کلیات سے مستثنیٰ نہیں، ان کی خارجی شاعری کی مثال وہ نظمیں ہیں جن میں انہوں نے محض واقعات کی تصویر کھینچی ہے، مثلاً آگرہ کی تیراکی، کبوتر بازی، ہولی، دوالی وغیرہ۔ ان میں تاثرات ذاتی کو قطعی کوئی دخل نہیں، ان میں ان کا کمال یہ ہے کہ نہایت ہی وضاحت کے ساتھ وہ منظر بیان کرتے ہیں جو انہوں نے دیکھے ہیں۔ "برسات" پر [illegible]

ذیل خارجی شاعری کی مثال ہے۔ اس میں کہیں بھی سوا آخری بند کے تاثر و تخیل کا پتہ نہیں۔ جو کچھ آنکھوں سے دیکھا ہے اُسے نظم کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

برسات کا جہان میں لشکر پھسل پڑا   بادل بھی ہر طرف سے ہوا پر پھسل پڑا
جھڑیوں کا مینہ بھی آ کے سراسر پھسل پڑا   چھتّا کسی کا شور مچا کر پھسل پڑا
کوٹھا جھکا، اٹاری جھکی، در پھسل پڑا

جن کے نئے نئے تھے مکاں اور محل سرا   اُن کی چھتیں ٹپکتی ہیں، چھلنی ہو جا بجا
دیواریں بیٹھتی ہیں، چھلوں کا ہے غل مچا   لاٹھی کو ٹیک کر جو ستوں ہے کھڑا کیا
چھجّا گرا، منڈیر کا پتھر پھسل پڑا

جھڑیوں نے اس طرح کا دیا آ کے جھڑ لگا   سُنیئے جدھر اُدھر سے دھڑاکے ہی کی صدا
کوئی پکارے ہے مرا دروازہ گر چلا   کوئی کہے ہے، ہائے کہوں تم سے اب میں کیا
تم در کو بیٹھے ہو مرا گھر پھسل پڑا

یاراں جب آ کے پختہ مکانوں کے تئیں ہلائے   کچّا مکاں پھر اس کی بھلا کیونکہ تاب لائے
ہر جھونپڑے میں شور ہے ہر گھر میں ہائے ہائے   کہتے ہیں یارو دوڑیو جلدی سے وائے وائے
یا کھے پچھیت سو گئے چھپّر پھسل پڑا

آ کر گرا ہے جو کسی رنڈی کا اب مکاں   اور اُس کے آشنا کی بھی چھت گرتی ہے جہاں
کہتا ہے کھٹے باز ہر اک اُن سے آ کے واں   کیا بیٹھے چھت کو روتے ہو تم اے میاں یہاں
واں چت گلن کا آپ کے سب گھر پھسل پڑا

یاں تک ہر اک مکاں کے پھسلنے کی ہے زمیں   نکلے جو گھر سے اس کو پھسلنے کا ہے یقیں
مفلس غریب ہے یہ موقوف کچھ نہیں   کیا فیل کا سوار ہے کیا پالکی نشیں
آیا جو اس زمیں کے اوپر پھسل پڑا

دیکھو جدھر تدھر کو یہی غل پکار ہے   کوئی پھنسا ہے اور کوئی کیچڑ میں خوار ہے
پیادہ اُٹھا جو بڑھ کے تو کیچڑ اسوار ہے   گرنے کی دھوم دھام یہ کچھ بے شمار ہے
ہاتھی ریلا، اونٹ گرا، خر پھسل پڑا

کوچے میں کوئی اور کوئی بازار میں گرا   کوئی گلی میں گر کے ہے کیچڑ میں لوٹتا
[illegible]

وہ اپنے گھر کے صحن میں آکر پھسل پڑا

کرتی ہے گرچہ سب کو پھسلنی زمین خوار　　عاشق کو پر دکھاتی ہے کچھ اور ہی بہار
آیا جو سامنے کوئی محبوبِ گلعذار　　گرنے کا مکر کرکے، اچھل کود، ایک بار

اُس شوخ گل بدن سے لپٹ کر پھسل پڑا

کیچڑ کے ہر مکاں سے تو بچتا بہت پھرا　　پر جب دکھائی دی کھلے بالوں کی اِک گھٹا
بجلی بھی چمکے حُسن کی مینھ برسے نازکا　　پھسلن جب ایسی آئی تو پھر کچھ نہ بس چلا

آخر وہاں نظیر بھی آکر پھسل پڑا

اِسی موضوع پر ان کی دوسری نظم داخلی شاعری کا نمونہ ہے، اس میں کوئی واقعہ بیان نہیں کیا گیا، چند چیزوں کو دیکھکر دل پر جو اثر ہوا ہے اُسے بذریعہ تشبیہات، جس کی نیرنگیاں تخیل کی رنگ میزیاں ہیں، اور دل تک پہونچایا ہے۔

ساقیا موسمِ برسات ہے کیا روح فزا　　دیکھ کچھ تازگیٔ صنعتِ بےچون وچرا
جا بجا نکلے ہیں اس لطف سے طفلانِ نبات　　اپنے ہاتھوں سے کھلاتی ہے جنھیں نشوونما
کھل رہے ہیں در و دیوار پہ ابوابِ بہشت　　آرہی ہے چمنِ خلد کی ہر گھر میں ہوا
دیکھ سبزوں کی طراوت کو زمیں پڑھتی ہے　　دم بہ دم انبتہ اللہ نباتاً حسناً
برگِ اشجار وہ سرسبز ہیں اور نرم لطیف　　فی المثل حلّہ جنت انھیں کہئے تو بجا
کوہ و صحرا میں وہ سبزی ہے کہوں کیا، گویا　　مخمل تازہ کسی نے ابھی یاں دی ہے بچھا
الغرض دشت تو ہیں کارگہِ مخمل سبز　　اور جو ہیں کوہ تو اُن پر بھی زمرد ہے فدا
جان سے کرتی ہے اب نہایت خضرت وہ سلوک　　جیسے غنچوں سے نسیم سحر اور گل سے صبا
پتے اس لطف سے ہیں بھیگے ہوئے تازہ نہال　　جیسے ہو نازنیں دلبر کے نہانے کی ادا
اس سیہ ابر میں یوں اُڑتے میں بگلے جیسے　　لبِ مالیدہ مسی میں دُرِ دنداں کی صفا
اب میں ساون کے اندھیرے کی کروں کیا تعریف　　جعدِ شیریں کہوں یا زلفِ سیاہِ لیلیٰ
جگنو اس طرح چمکتے ہیں کہ جوں وقتِ سنگار　　ملتے پر ہاتھی کے تنگر ہے گویا جھڑکا

چونکہ ان کی شاعری کا عنصر غالب خارجی ہے اس لیے جب دل پر کوئی اثر پڑتا ہے تو اکثر اسے ایک مصرع یا شعر میں ظاہر کرکے اس کے اسبابِ مختلفہ کو بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں، گویا وہ ایک وکیل ہیں جو اپنے مدعا کو دلائل و شہادت سے ثابت کرتا ہے، وہ ایسے موقعوں پر بہت تمام [illegible]

کی حدود میں پہونچ جاتے ہیں، اور بیشتر ان کی نظم ترجیع بند کی صورت اختیار کر لیتی ہے، کلیات اس قسم کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے، لیکن یہاں "برسات" ہی کی مثالیں پیش کرنی مقصود ہیں اس لئے ناظرین کی توجہ ترجیع بند ذیل کی طرف منعطف کی جاتی ہے۔ اس میں دس بندوں میں مناظر قدرت دکھا کر جن کا داخلی شاعری سے بھی کچھ نہ کچھ تعلق ہے، وہ خارجی شاعری کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں اور پھر یہ بند کہہ کر کوس لمن الملک بجاتے ہیں، اتنی بڑی نظم کا یہاں نقل کرنا خالی از طوالت نہیں اس لئے چند بندوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں سبزوں کی لہلہاوٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاوٹ قطرات کی بہاریں ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا، جل تھل بنا رہے ہیں گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

مارے ہیں موج ڈابر، دریا ڈونڈ رہے ہیں مور و پپیہے کوئل، کیا کیا رمنڈ رہے ہیں
جھڑ کر رہی ہیں جھڑیاں، نالے امنڈ رہے ہیں برسے ہے منہ جھڑا جھڑ، بادل گھمنڈ رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

پھولوں کی سیج اوپر، سوتے ہیں کتنے بن ٹھن سوہیں گلابی جوڑے، پھولوں کے ہار ابرن
کتنوں کو گھر ہے کھاتا، سونا لگے ہے آنگن کونے میں پڑ رہی ہیں، سر منہ لپیٹ سوگن
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو خوش ہیں وہ خوشی ہیں کاٹے ہیں رات ساری جو غم میں ہیں انھوں پر، گزرے ہے رات بھاری
سینوں سے لگ رہی ہیں جو ہیں پیا کی پیاری چھاتی پھٹے ہے ان کی جو ہیں برہ کی ماری
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

گاتی ہے گیت کوئی، جھولے پہ کر کے پھیرا مارو جی آج کیجئے یاں رین کا بسیرا
ہے خوش کسی کو آ کر ہے درد و غم نے گھیرا منہ زرد، بال بکھرے اور آنکھوں میں اندھیرا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے [illegible] رہے ہیں [illegible] کی گلابی آنکھیں پیالے [illegible]

ہوتا ہے ناچ گھر گھر، گھنگھرو جھنک رہے ہیں پڑتا ہے مینہ جھڑا جھڑ، طبلے کھڑک رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

داخلی شاعری کے خلاف جس کا تعلق ہمیشہ زمانۂ حال سے ہوتا ہے، خارجی شاعری کے موضوع ماضی و حال و استقبال، تینوں کے واقعات و حادثات ہو سکتے ہیں۔ ماضی سے ان موضوعات کا تعلق ہوگا جو شاعر کی پیدائش سے پہلے رونما ہوئے ہیں، جنھیں اُس نے اپنے عینِ حیات میں نہیں دیکھا اور جو اس تک بذریعۂ تقریر یا تحریر پہونچے ہیں۔ حال سے اس کے آنکھوں دیکھے واقعات و حادثات متعلق ہونگے۔ واقعات مستقبل اس کے تخیل کا نتیجہ ہونگے۔ تینوں طرح کے موضوع پابندِ زمان و مکان اور دو قسموں میں منقسم ہیں۔ ایک قسم میں وہ موضوع داخل ہیں جو محض وقتی ہیں یعنی وہ علت و معلول کا نتیجہ ہونے کے باعث ماضی سے تعلق ضرور رکھتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک اسباب و علل کا ایک خاص معلول ہونے کی وجہ سے، ایک خاص وقت اور ایک خاص محلِ وقوع سے تعلق رکھتا ہے، اور ایک بار ظاہر ہو کر ہمیشہ کو غائب ہو جاتا ہے، اس کی حیات "دو روزہ" ہے مثلاً غدر ۱۸۵۷ء۔ دوسری قسم میں وہ موضوع داخل ہیں جو متواتر ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں مثلاً عید، بقرعید، شب برات۔ ان کا دامن اپنے ماضی سے بندھا ہوا ہے، لیکن "یک رنگی" اور "نو رنگی" ان کی فطرت میں ہے، کیونکہ زمان و مکان کی تبدیلی گو ان کے تواتر وقوع پر اثر انداز نہ ہو مگر ان کی نوعیت پر ضرور ہوگی۔ تبدیلیٔ زمان و مکان کے ساتھ ساتھ ہی ان ناٹکوں کے کرداروں کا بدلنا اور ان کی اداکاری کا ان کے ماحول و فطرت میں ڈوبا ہوا ہونا ناگزیر ہے۔ اس طرح باوجودیکہ ان میں ایک طرح کا تسلسل ہے لیکن ان کی ہر کڑی اپنی ماقبل اور مابعد کی کڑی سے بالکل نہیں تو تھوڑی بہت ضرور مختلف ہے اور یہی اختلاف اس کو زیبِ انفرادیت سے آراستہ اور ایک خاص زمان و مکان سے وابستہ کرتا ہے۔

خارجی شاعری کے موضوع جو کسی شاعر کے زمانِ حیات سے تعلق رکھتے ہیں، اس وقت کے تمدن کی آئینہ داری کرتے ہیں، خواہ ان کا تعلق متواتر رونما ہونے والے واقعات ہی سے کیوں نہ ہو۔ نظیر کی خارجی شاعری اپنے عہد کے تمدن پر خاصی روشنی ڈالتی ہے۔ اُنھوں نے ہولی، دوالی، راکھی، بھیروں جی کا میلا، جو کچھ لکھا ہے اُس میں صرف وہ کیفیتیں دکھائی ہیں جو خود اُن کے زمانے میں موجود تھیں۔ ان تہواروں کے قدیم ہونے کے باعث ان میں سے چند باتیں ضرور ایسی تھیں جو ان کی پیدائش سے پہلے عرصۂ وجود میں آ چکی تھیں، لیکن کچھ ایسی بھی ضرور تھیں جو بعد میں ان میں شامل کر دی گئیں، یا پہلے تھیں اور اب چھوڑ دی گئیں۔ اور اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ جس طرح نظیر کے عہد میں ہولی منائی جاتی تھی بعینہٖ زمانۂ قدیم میں بھی منائی جاتی تھی [illegible] لازم نہیں آتا کہ اس تہوار کو عہدِ نظیر کے تمدن سے خارج [illegible]

سے قاصر مانا جائے، اس کا اس کی زندگی میں منایا جانا، اس کو ایک خاص زمان و مکان سے وابستہ کرکے اس میں تعیینِ وقت پیدا کرتا اور اسے عصری ماحول کا جزو ثابت کرتا ہے۔ اس میں اس دور کے رجحانات و میلانات موجود ہیں۔ ہولی منانے کا رجحان گو ایک نسل نے دوسری نسل سے ورثے میں پایا ہو لیکن پھر بھی وہ اس کا ذاتی رجحان و میلان ہے اور جس طریقے سے وہ اُسے مناتا ہے، اُس میں ایک خصوصیت ہے جو اسے اس کے دور اور اس کی ذات سے وابستہ کرتی ہے۔ نظیر کی خارجی شاعری کے ایک حصے کو ان کے زمانے کے تمدن و ماحول سے گہرا تعلق ہے۔

نظیر کی داخلی شاعری مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کی مساعیِ جمیلہ سے منظرِ عام پر آئی ہے۔ موصوف کو ایک قلمی نسخہ ہاتھ لگ گیا جو دو دیوانوں پر مشتمل ہے۔ اس میں وہی پرانے عاشق و معشوق کے رونے پیٹنے ہیں لیکن ڈھائی تین سو صفحے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کمزور ضدی بچّے کی طرح دل لگاکر نہیں روتے یعنی رونے لگے تو تار باندھ دیا، بلکہ ہنستے کھیلتے بچّے کی طرح چند منٹ روکر چپ ہوجاتے ہیں۔ ان کی بیشتر غزلوں کا سرمایہ پانچ چار شعر ہیں، شاذ و نادر ہی کوئی غزل سات یا نو یا اس سے زیادہ شعروں کی حامل ہے۔ ان کو پڑھکر محسوس ہوتا ہے کہ ان پر ایک قسم کی فضائے "سطحیت" چھائی ہوئی ہے، ان میں جوش و خروش کی کمی ہے، یہ حیرت انگیز ہے، کیونکہ ان کے سوانح نگاروں کو اس کے کہنے میں دریغ نہیں کہ ان کے شباب کے دامن پر جوانی دِوانی کی ہوسناکیوں کے داغ ہیں۔ لیکن یہ غزلیں بھی اس قادرالکلامی پر شاہد ہیں جو ان کی خارجی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ دراصل نظیر خارجی شاعری کے استاد ہیں اور ان کی داخلی شاعری کو ان کے کمال کا محض ایک ضمنی پہلو (side-show) تصور کرنا چاہیے۔ انکی اسی فطرت اور اسی سعی نے کہ اسکے بیچ میں عمق پیدا نہ ہونے دیا۔ اور اکثر زبان اس سطح سے پست تر ہے جو اُس وقت سے آج تک پسند کی جاتی ہے۔ درحقیقت خارجی شاعری سے عنصرِ تخیل معدوم ہونے اور اس کے موضوع کے لئے زبان روزمرہ میں مصالح بہم پہنچانے کی قابلیت ہونے کے باعث نظیر اس قسم کی کاوشوں سے کچھ دور ہی رہے جو محض غزل گو شعرا کا مسلک تھا اور جن کے موضوع ایرانی موضوعاتِ غزل سے متابہت و مماثلت کی وجہ سے انھیں خزائنِ فارسی سے استفادے کی جانب بے طرح مائل کر رہے تھے۔ اس مخمس کو دیکھئے جو اس سے پہلے خارجی شاعری کے نمونے کے طور پر نقل کیا جا چکا ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ کسی منظر کا بھی تقاضا نہیں کہ ادبِ فارسی سے استفادہ کیا جائے۔

ف اس سلسلہ میں ایک [illegible] کی [illegible] نظیر [illegible] کی [illegible] قسم کی

گو نظیر غزلیں کہہ گئے ہیں اور اُن کی اتنی بڑی تعداد مل گئی ہے کہ دو ڈھائی سو صفحے گھیرتی ہے مگر ان کے کلام کی تنقید کرتے وقت زیادہ تر نظر اس پر رہنی چاہیئے کہ وہ خارجی شاعری کے اُستاد ہیں" اور اس میدان میں ان کی فکر رسا نے کیا گل افشانیاں کی ہیں۔ کیونکہ ان کے کمال کو ان کے میلان طبع سے جدا کر کے اس کا صحیح صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا، سید ابو العلا صاحب حکیم ناطق لکھنوی کی یہ رائے حقیقت سے قریب ترین ہے کہ "نظیر اپنے رنگ کے موجد اور مناظرِ عالم کے مصوّر تھے"۔

رنگِ جذبات

(از حضرت اختر رضوانی)

غم نہیں کہ خانہ ویرانی نہیں
عشق ہی وجہِ پریشانی نہیں

دیکھتے کیا ہیں مجھے اہلِ خرد
کچھ نئی یہ چاک دامانی نہیں

آپ اور یہ بے رُخی ہنگامِ مرگ
آپ نے بھی شکل پہچانی نہیں

لاشِ دل پر نوحہ خوانی کیا کریں
آنکھ میں تو بوند بھر پانی نہیں

ہائے رے تاثیرِ آہِ نیم شب
حسن کے چہرے پہ تابانی نہیں

ہو چکا مدّھم چراغِ آرزو
اب خیالوں میں فراوانی نہیں

کاش تجدیدِ محبت ہو سکے
ولولوں میں شعلہ سامانی نہیں

مجھکو رہنے دو شکارِ رنج و غم
اب مجھے ذوقِ تن آسانی نہیں

وہ ہجومِ غم ہے اختر ان دنوں
کوئی جلوہ وجہِ حیرانی نہیں

آخرش!

(از حضرت روشن صدیقی)

پیشِ نظر خزاں سہی، حدِ نظر خزاں سہی
کیا ہے مگر خزاں کے بعد
آئے گی خود یہی خزاں، بن کے بہارِ گل فشاں
غارتِ گلستاں کے بعد

درد کے بعد اک سکوں، پھونکتا ہے عجب فسوں
رنج ہو جس سے سرنگوں
ایک تسلیِ عظیم، بنتی ہے روح کی ندیم
ضبطِ غمِ نہاں کے بعد

سلسلۂ تغیرات، اور یہ دورِ حادثات
خود ہے فروغِ کائنات
بنتا ہے جنتِ نظر، حُسنِ صحیفۂ سحر
رات کی داستاں کے بعد

اِک بتِ حقیر سا، دانۂ خاک آشنا
بہرِ فروغ مٹ گیا
پھر وہ امینِ ارتقا، اک بڑا شجر بنا

گردشِ این و آں کے بعد

سیلِ تباہ کار نے، شدتِ قہر و غیظ سے
کھیت تباہ کر دیئے
پھر وہی کھیت جی اٹھے، لعل و گہر لئے ہوئے
سیلِ رواں دواں کے بعد

وہم ہے ظلمتِ حجاب، چھا ہی گیا اگر سحاب
چھپ نہ سکے گا آفتاب
روشنی یقیں ضرور، ہوتی ہے مائلِ ظہور
تیرگیِ گماں کے بعد

حالِ وطن زبوں سہی، سر درگوں کا خوں سہی
حُبِّ وطن جنوں سہی
ہاں یہ جنونِ خودنگر، لائے گا اک نئی سحر
اس شبِ رائیگاں کے بعد

ہے یہ نویدِ لازوال، بعدِ زوال ہے کمال
قلبِ حزیں نہ کر ملال
دن وہ خدا دکھائے گا، دورِ وطن بھی آئے گا
سطوتِ دیگراں کے بعد

آریوں کی تاریخ نویسی

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی بی، اے ایل ایل بی)

ہندوستان کا وہ عہد زریں جسے بلاشبہ نہ صرف آریوں بلکہ تہذیب عالم کے انتہائی عروج و کمال زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ تاریخ ہند میں زمانۂ ماقبل تاریخ کے نام سے مشہور ہے، یہ پاک زمین آریوں کا آبائی وطن ہی نہیں ہے بلکہ جملہ علوم و فنون کا سرچشمہ بھی ہے، اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ایسی قدیم ترین قوم جس نے ساری دنیا کو ہر طرح کے علوم و فنون کی تعلیم دے کر زیورِ تہذیب و تمدن سے آراستہ کیا، حیوانوں کی طرح تاریک غاروں میں رہنے والے درندہ صفت ابنائے آدم کو قبائے انسانیت پہنا کر روشنی میں لا کھڑا کیا، اور ہر نوع کے علوم و فنون کی تحصیل و اکتساب میں صدیوں تک ان کی رہنمائی کی، کس طرح تاریخ نگاری کے ادنیٰ فریضہ سے چشم پوشی کر سکتی تھی؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی غلبہ قائم و برقرار رکھنے کے لئے شاید محکوم و مفتوح اقوام کی تاریخ کو تحریف کرکے اس کی اصلیت کا مسخ کر دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان کے اسلاف کے کارناموں کو بھی صفحۂ ہستی سے مٹانا نہایت ضروری ہے۔ ہمارے تقریباً تمام انگریز مورخین نے ہمیں یہ باور کرانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے کہ آریہ ہندوستان کے اصلی باشندے نہیں بلکہ خود انھیں کی طرح اس کے اولین غیر ملکی فاتح ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ مغرب ہی کے بعض راستباز مستشرقین نے اس اختراع کو بہتان ثابت کر دکھایا ہے۔

حیرت ہے کہ اغیار اس حقیقت سے کیوں آنکھ چراتے ہیں کہ ہمیشہ سے آریوں کے نزدیک تارک الدنیا معلمین و مبلغین کے علاوہ عام لوگوں کے لئے ترک وطن مذہباً ممنوع ہے، اور وہ سختی کے ساتھ اس اصول کے پابند چلے آتے ہیں۔

ہندوستان میں بہت سے مغربی حملہ آور طوفانی آندھیوں کی طرح آئے، اُس کی ہمالہ مثال آہل اعد فلک بوس رفعتوں سے سر ٹکرایا اور اپنے خون سے اس مقدس سرزمین کو سیراب کرکے فنا ہو گئے۔ مادر وطن کو گلہ جیسے ناعاقبت اندیش و خود نما کپوتوں ہی کے ہاتھوں نالاں نہیں ہے بلکہ بیداد اغیار سے بھی داد خواہ ہے۔

مسلمانوں کے عہد میں چند [illegible] ہی پانی پھیر دیا [illegible]

ی اور رام داس وغیرہ جیسے دردمندوں نے انھیں بیدار کرنے کی بہت کچھ کوشش کی۔ لیکن اکبر و خانخاناں جیسی شاذ و نادر روشن ضمیر ہستیوں کی بلند نظری اور فراخ حوصلگی نے انھیں پھر موت کی نیند سلا دیا۔ انگریزوں نے ہندوؤں کے دست برد زمانہ سے بچے کھچے آثار قدیمہ کو اپنی تغافل شعاری یا مصلحت کوشی سے مٹانے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ اور اپنے مخصوص رنگ میں ہند قدیم کی جو تاریخ مرتب کی اُسے ہماری قدامت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

غیر ملکی حکمرانوں نے اپنی تاریخی تصانیف (۹) کے متعلق یہ اعلان کر کے کہ وہ اس عہد کے دیگر ممالک کے سیاحوں اور زائرین کے نوشتوں، برآمدہ کتبوں اور سکوں پر مبنی ہیں، ہمیں یقین دلا دیا ہے کہ قدیم ہندوستان میں تاریخ لکھنے کا رواج ہی نہ تھا۔ اس فریب نظر نے ہمیں تلاش و تحقیق کی دردسری سے قطعاً بے نیاز کر کے جو کچھ رطب و یابس میسر تھا اُس پر آنکھ بند کر کے ایمان لانے کے لئے مجبور کر دیا۔ اب جو ہماری آنکھیں کھلیں تو حقیقت تک پہونچنے کی جتنی راہیں تھیں سب مسدود و مفقود ہو چکی تھیں۔ ہاں اس بے سر و سامانی کے عالم میں فرانس، جرمنی اور ہنگری وغیرہ کے فراخ دل محققین نے ہماری دستگیری کی چنانچہ سلوین لیوائی، اسٹین لیکاک، میکس مولر و ہیراد۔ وینٹلر وغیرہ چند وہ معتقد ہستیاں ہیں جنھوں نے ہمیں ہمارے زریں ماضی کی یونہی سی جھلک دکھا کر عظیم الشان آریائی تمدن کی یاد تازہ کرائی۔

بقول ڈاکٹر ضیاء الدین دنیا کا وہ اولین صحیفۂ ندیں جو ضبط تحریر میں آیا، رگوید ہے۔ اس کی تالیف کا زمانہ آریہ نسل کی پستی یا ابتدائے عروج کا زمانہ نہیں ہو سکتا۔ ویدک شاعری کے مسلمہ بلند ترین معیار کے پیش نظر اسے ابتدائی تصنیف نہیں کہا جا سکتا۔ پھر سنسکرت کی ابتدا نثر سے ہوئی ہے اور رگوید منظوم تصنیف ہے۔ اس کے معنی صرف یہ ہو سکتے ہیں کہ سنسکرت میں ابتداءً نثر کی کتابیں لکھی گئیں یہ اور بات ہے کہ آج کی دنیا ان سے روشناس نہ ہو سکی ہو۔ بہرحال یہ کہنا مشکل ہے کہ ویدوں کے بعد آریوں نے تصنیف و تالیف کی طرف قطعاً رُخ ہی نہ کیا، اور اگر انھوں نے کچھ لکھا پڑھا بھی ہو تو صرف ایک ہی موضوع پر ان کی تمام توجہ مرکوز رہی۔

ویدوں کے زمانہ کے جس قدر حالات ہمیں معلوم ہو سکے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں ہندوستان میں جمہوریت کا دور دورہ تھا، اور وہ قدیم رواج و رسوم جنھوں نے جمہور کے آغوش قبولیت میں پرورش پائی تھی، انھیں مرتبہ قانون حاصل تھا، اور یہی اس عہد کی تہذیب و تمدن کے آئینہ دار تھے، چنانچہ برسوں ان کی توضیح و تفسیر ہوتی رہی۔ رفتہ رفتہ پُرانوں اور سمرتیوں میں وقائع نگاری کی جھلک نظر آنے لگی۔

راماین کے عہد سے پیشتر ہندوستان میں شہنشاہیت کا آغاز ہوا، چنانچہ مہاراجہ دشرتھ کے ایک پیشرو

مہاراج دلیپ کے حالاتِ زندگی سنسکرت ادب کا ایک اہم جزو ہیں کہ اس کوشش کو تاریخ نویسی کی ایک نادر مثال کہہ سکتے ہیں، معلوم نہیں کہ مہاراج دلیپ کے حالات کا ماخذ کیا ہے، اور وہ کس موضوع پر مشتمل ہے۔ راجہ دشرتھ اور رام چندر جی کے حالات اُن کے ہمعصر والمیک جی نے نظم کئے ہیں۔ رامائن کی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ ماننا پڑے گا کہ قدیم ہندوستانی مورخین اور عصرِ جدید کے وقائع نگاروں کے زاویۂ نظر میں بہت اختلاف ہے، اور اس کا سبب ہمارا معاشرتی و معیاری اختلاف ہے۔ قدیم ہندوستانی تاجدار ایک خاص مرتبہ رکھتے ہوئے بھی جمہور سے بالاتر نہیں سمجھے جاتے تھے، اور انھیں بھی روحانی پیشواؤں کے سامنے سرِ نیاز خم کرنا پڑتا تھا۔ ہماری تاریخ مہاراج دشرتھ سے لیکر پرتھوی چندر اور پریکشت تک اس قسم کے سیکڑوں واقعات سے بھری پڑی ہے۔ چنانچہ راجاؤں کے حالات قلمبند کرنے میں مصنفین کو بڑی سخت احتیاط برتنا پڑتی تھی، اور اپنی تصنیف میں اِن پہلوؤں کو اجاگر کرنا پڑتا تھا جو سلطنت کے عروج و زوال کے اسباب کو بتانے کی بجائے حقیقی مقصدِ حیات کے حصول کا راستہ متعین کرنے میں ہماری رہنمائی کر سکیں۔ آریوں کو شاذ و نادر ہی تلوار اُٹھانا پڑتی تھی، اندرونِ مُلک میں مکمل امن و امان تھا، بیرونی دنیا کی تسخیر اُنھوں نے علوم و فنون اور اپنی بے پایاں روحانی قوت ہی سے کی تھی۔ مگر اُنھوں نے دوسروں کی آزادی سلب کرنے یا اُن کی سلطنت کو ہڑپ کر لینے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ رامائن کے عہد سے لیکر مہابھارت تک کے طویل زمانہ میں صرف دو بڑی مہمات اہلِ ہند کو پیش آئیں، اور یہ دونوں لڑائیاں اپنے اسباب و نتائج کے اعتبار سے خالص مذہبی معرکہ آرائیاں تھیں۔ قدیم آریوں نے اپنی جملہ جنگی سرگرمیوں اور روحانی فتوحات کے مفصل حالات کا جابجا تذکرہ کیا ہے۔

رامائن کے واقعات کو مہرشی والمیک نے ترتیب دیا، اُن کی اس عرق ریزی کا صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ تاریخی حقائق کی بنا پر مذہب کی حفاظت کے لئے تکمیلِ فرائض سے راعی کی ایک عظیم المرتبت مثال قائم کر دی جائے۔ پھر بھی ان کی اس تصنیف میں دنیا کے ایک بہترین تاجدار کے عہدِ حکومت کے تمام اہم تاریخی واقعات بالتفصیل مذکور ہیں۔ لیکن صرف اس بنا پر رامائن کی اہمیت سے انکار کرنا کہ اس میں بعض ایسے واقعات بھی مرقوم ہیں جو صناعی اور سپہ گری کے معجزات کہے جا سکتے ہیں، ایسی ہی ہٹ دھرمی ہے جیسی یہ کہ ہندوستانیوں کو تاریخ لکھنے کا سلیقہ ہی نہ تھا۔ اور وہ علم التاریخ سے قطعاً ناواقف تھے۔

عقلِ سلیم کسی طرح یہ قبول کرنے کو تیار نہیں ہے کہ رامائن کے بعد مہابھارت کی تصنیف کے وقت تک اس نوع کی کوئی دوسری کتاب لکھی ہی نہ گئی ہو۔ ہاں ہم ان کے اقدام کو محض بیداد اغیار کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔

راماین کے بعد جو اہم تصنیف ہم تک پہونچی ہے وہ مہابھارت ہے، یہ بیشمار راجاؤں کے حالات ہی کی حامل نہیں ہے بلکہ سارے ہندوستان کی اس عہد کی سیاسی صورت حال کا مرقع بھی ہے۔ اس اعتبار سے یہ بھی ایک اہم سیاسی دستاویز ہے۔ ابھی ابھی راماین کے متعلق جو کچھ کہا جا چکا ہے اس کا اطلاق مہابھارت پر بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ پریم ساگر اور سکھ ساگر وغیرہ کتب بھی اس زمرے میں شامل کی جاسکتی ہیں۔

مہابھارت کے بعد ہی ناٹکوں کا سیلاب شروع ہوتا ہے۔ یہ بھی تاریخی حیثیت کے مالک ہیں۔ بھاس کا ایک ناٹک وتسیہ کے راجہ آدین کے سوانح پر مشتمل ہے۔ کالی داس نے دشینت اور اگنی متر کے حالات قلمبند کرنے کے علاوہ اپنی شہرۂ آفاق منظوم تاریخ رگھوونش میں تمام رگھوونشی راجاؤں کے حالات قلمبند کئے ہیں، بھوبھوتی نے مادھو کو حیاتِ جاوید بخشی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام تاریخی صحائف کا ماخذ کوئی نہ کوئی تاریخی نوشتہ ضرور ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا اور کہاں ہے؟ اس سلسلہ میں بودھ ادب کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جسے خود اہلِ مغرب برسوں پہلے ایک تمائی دنیا کو ڈھائی ہزار برس پیشتر کی تاریخ تسلیم کر چکے ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ افسانے، نظمیں اور ناٹک تخیلی پیداوار ہیں اور ان میں واقعیت کا ہونا ضروری نہیں لیکن قدیم سنسکرت ادب پر اس اعتراض کا اطلاق ناممکن ہے، جس کا ثبوت اس کے النکار شاستر کی عائد کردہ کڑی پابندیاں ہیں۔ اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ النکار شاستر کی تدوین ان کتابوں کے بعد ہوئی ہے تو بھی ہمارے دعوے پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ اس سے اس کو تقویت ہی پہونچتی ہے، اور وہ اس طرح کہ النکار شاستر کے مصنفین نے تمام موجودہ ادب کا جائزہ لے کر اور اس کا تاریخی حقائق سے موازنہ کر کے ہی اپنی مجوزہ پابندیاں عائد کی ہونگی، یہ بھی قدیم تاریخی کتب کے وجود سے انکار کی ایک تردید ہے۔

ظاہر ہے کہ قدیم سنسکرت مصنفین کو کسی حال میں حقائق سے انحراف کرنے کی اجازت نہیں ہے، اور اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ متذکرہ بالا کتب النکار شاستر کی متابعت میں ترقیم نہیں ہوئی ہیں۔ پھر ان کتابوں ہی پر کیا منحصر ہے ہماری تمام مقدس کتابیں حتیٰ کہ وید تک منظوم ہیں۔ علاوہ بریں تاریخی واقعات کو محض اس بنا پر کہ وہ نظم میں بیان کئے گئے ہیں قصہ کہانی تسلیم نہیں کیا جا سکتا، جس کا ثبوت مشہور تاریخی تصنیف راج ترنگنی ہے جو منظوم ہونے کے باوجود مغربی مبصرین تک سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے، حالانکہ اس میں بھی ایسی کتنی ہی کہانیاں درج ہیں، جو پرانوں کی طرح دیو مالائی داستانیں کہی جا سکتی ہیں۔ ہرش چرت اور قدرا مداکشش تو بالکل ایسی ہی تاریخی تصانیف ہیں جیسے اسمتھ کا اکبر وغیرہ۔

ڈاکٹر ریز ڈیوڈ رقمطراز ہیں کہ ۔۔۔۔ ق م کا بودھ اور جینی ادب اپنی تاریخی اہمیت کے اعتبار سے نہایت وقیع ہے۔ ڈاکٹر ہودل بھی ڈیوڈ صاحب کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بودھوں اور جینیوں کی

مذہبی تاریخوں کو اس عہد کے ہندوستان کی سیاسی تواریخ نہ کہنا اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنا ہے۔ مزید ثبوت کے لئے بودھ سل کی (Budhistic Records) پیش کی جاسکتی ہے۔

نیتی واکیہ امرت۔ شکرنیتی، برہسپت نیتی، سمرتیوں کا ویوہار ادھیائے، ویرمتر اودے، ود اور تتاکر، یاگیہ ولکیہ اور کاتیائن سب کے سب اصولِ جہاں بانی کے مبسوط تذکرے ہیں۔ برہسپت نیتی تین ہزار ابواب کی ضخیم کتاب ہے اور شکرنیتی ایک ہزار ابواب پر مشتمل ہے، ان سب میں ضمناً اپنے اپنے عہد کے سیاسی حالات مرقوم ہیں۔

چانکیہ کا ارتھ شاستر اور منوسمرتی بھی اسی قبیل کی کتابیں ہیں۔ رامائن میں دشرتھ اور رام کے طرزِ حکومت کو واضح کرنے والے متعدد واقعات مندرج ہیں، ان میں سے مثال کے لئے رام چندر جی کی تاج پوشی اور سیتا جی کے بن باس اور اگنی پریکشا کے واقعات پیش کئے جاسکتے ہیں۔ یہی حال مہابھارت کا بھی ہے جس کی مثال سمبھو پرو کے ابواب ۴، ۷، ۸۵، اور جاتوگرہ پرو کے ایک سو چھتالیسویں باب میں ملتی ہے شکنتلا جب اپنے لڑکے کو لیکر دشینت کے پاس جاتی ہے تو دشینت اپنی رعایا کی مرضی کے بغیر اُسے قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا ییاتی کی شادی دیویانی سے ہوئی تھی مگر اُس نے شرمشٹھا نامی ایک شہزادی کو اپنے حرم میں داخل کرلیا تھا ییاتی کے پانچ لڑکے تھے، بڑا یدو دیویانی کے بطن سے تھا اور تخت کا وارث بھی وہی تھا مگر پورو سب سے چھوٹا اور شرمشٹھا کا لختِ جگر تھا تخت رعایا کی مرضی کے مطابق پورو ہی کو ملا۔ اسی طرح یدھشٹر کی تاج پوشی بھی عمل میں آئی۔

مہابھارت میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب یدھشٹر بھیشم پتامہ کے پاس گئے تو اُنھوں نے دریافت کیا کہ کسی فردِ واحد کو اپنے ہم جنسوں پر حکومت کرنے کا کیا حق ہے؟ اس کے جواب میں پتامہ نے ارشاد فرمایا کہ راجہ عوام کا خادم ہے، حکمراں نہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے ہندوستان میں شہنشاہیت کے آغاز کی تاریخ بھی بیان کردی جس کا علم اُنھیں یقیناً کسی تاریخی کتاب ہی سے ہوا ہوگا۔ افسوس ہے کہ آج ہم اس کتاب کا نام تک نہیں جانتے۔

ذیل کے بعض حقائق سے بھی ہمارے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے کہ ہندِ قدیم میں تاریخ لکھنے کا رواج عام تھا:۔

(۱) پرانے راج درباروں سے ہمیشہ سے پنڈت، شاعر اور بھاٹ وغیرہ وابستہ رہے ہیں، کالی داس اور بان وغیرہ اسی قبیل کے رتن ہیں۔ پنڈت وقائع نگاری کرتے تھے، شاعر اور بھاٹ راجاؤں کے کارنامون کے گیت لکھا اور گایا کرتے تھے، بھاٹوں کی تاریخ کے دو صرف جو ٹوڈ نے راسو اور آلہ کھنڈ ہم تک پہونچے ہیں۔

شاعروں کے متعدد کارنامے ہنوز محفوظ ہیں، پنڈتوں کی مساعی جنھیں خالص تواریخی کہا جاتا ناپید ہیں۔

(۲) آریوں کے یہاں ترپن[54] اور پنڈ دان کی رسم قدیم سے چلی آتی ہے۔ ان موقعوں پر پنڈت خاندان کے مورثِ اعلیٰ تک کا بکھان کرتا ہے۔ جب معمولی گھرانوں تک کے پشتہا پشت کے مفصل حالات پنڈتوں کی پوتھیوں میں مل جاتے ہیں تو راجاؤں کے حالات کا تو کہنا ہی کیا۔ بالخصوص اُس وقت جبکہ راجا ہر دلعزیز رعایا کا چنا ہوا خادم اور ہمہ صفت موصوف ہوتا تھا۔

(۳) اگر ملکی حالات و واقعات کا باقاعدہ ریکارڈ نہ رکھا جاتا تو پھر سلطنت کا کاروبار چل ہی کس طرح سکتا تھا۔ اسمتھ نے اپنی "ابتدائی تاریخ ہند" میں چندر گپت موریا کے وزیر اعظم چانکیہ کے وقائع نگاری خبر رسانی کے محکمہ کو قابل نفرت کہہ کر چھوڑ دیا ہے۔ لیکن اس سے جو منطقی نتیجہ مترتب ہوتا ہے اُس پر کوئی توجہ نہیں کی۔ اور نہ برطانوی ہندی خفیہ پولیس کے کارناموں سے اس کا موازنہ کرنے کی تکلیف گوارا فرمائی ہے۔

(۴) قدیم آریہ مصنفین، ملکی اور غیر ملکی سیاحت کے حالات سفرناموں کی صورت میں جمع کرنے کے بہت شائق تھے۔ چنانچہ بودھ اور جین مبلغین کے متعدد سفرنامے آج تک موجود ہیں۔ ہم نے اپنے مضمون بودھ اور جینی ادب میں تفصیل کے ساتھ ان پر روشنی ڈالی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ مضمون عنقریب "آجکل" میں جو دہلی سے شائع ہوتا ہے، نکل جائیگا۔ یہاں ان کا اعادہ تحصیل حاصل ہے۔

(۵) زمانہ کا ٹھیک ٹھیک تعین کرنے کے لئے سب سے پہلے آریوں ہی نے سنہ سال ماہ اور دن وغیرہ مقرر کئے، چنانچہ دنیا کا قدیم ترین سموت جو ہمیں معلوم ہو سکا ہے وہ بکرمی سموت ہی ہے۔ کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ آریوں نے اپنے تاریخی مقالوں میں اس چیز کا فقدان محسوس کر کے ہی اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہوگی۔

کہا جاتا ہے کہ تاریخ نویسی کی ابتدا عربوں سے ہوئی ہے۔ مگر تاریخ کی کسوٹی پر پرکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قول محض ایک دعویٰ بے دلیل سے زیادہ وقیع نہیں ہے۔ ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو محمد صاحب کی ولادت ہوئی اس کے چالیس سال بعد یعنی ۶۱۱ء میں آپ رسالت و منصب نبوت پر ممتاز ہوئے اور دس برس بعد یعنی ۶۲۱ء میں آپ نے مکہ سے مدینہ کو ہجرت فرمائی اس کے بعد جب تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے پہلے تاریخ لکھی گئی۔ عرب علماء کا قول ہے کہ سب سے پہلے دوسری صدی ہجری میں عبید بن شریہ نے اولین تاریخ عرب تصنیف کی حالانکہ یہ کتاب بھی ناپید ہے۔ اگر اسی کو صحیح مان لیا جائے تو آٹھویں صدی عیسوی سے پہلے عرب تاریخ نویسی سے نابلد محض ٹھہرتے ہیں۔

اہل یورپ کے نزدیک دنیا کا اولین مورخ ہیروڈوٹس نامی ایک یونانی تھا جو ۴۸۴ ق م میں

بقید حیات تھا۔ اس نے اپنی کتابوں میں کشمیر کا حال لکھا ہے اور اس خطۂ ملک کو "کیسپیریا" کہہ کر خطاب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ یونانی مصنف ہندوستان سے ناواقف نہ تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسی زمانہ میں روم، مصر اور یونان تک کے طالبانِ علم ٹکشلا اور نالندہ وغیرہ کے ہندوستانی مدرسوں میں زانوئے تلمذ تہ کرنے آتے تھے۔ عجب نہیں کہ ہیروڈوٹس بھی ان میں سے ایک ہو یا پھر اُس نے کشمیر کا حال کسی قدیم سنسکرت تاریخ سے اخذ کیا ہو۔ بہرحال اس حقیقت کو چھپایا نہیں جاسکتا کہ ایشیا کی طرح اہل مغرب نے بھی جملہ علوم ومعارف کا درس ہندوستان ہی سے لیا ہے یہ اور بات ہے کہ انھوں نے جو کچھ ہم سے لیا اُسے جلا بھی دی اور چمکایا بھی، اور ہم نے سب کچھ فراموش کر دیا۔

بہرکیف اہل مغرب کی تاریخ نویسی ۴۸۴ ق م سے آگے نہیں بڑھ سکتی، جبکہ آریوں کے پاس ہزاروں سال پہلے کی تاریخ کم از کم راماین اور مہابھارت کی صورت میں موجود ہے۔ اہل مغرب انھیں طویل منظومات تو تسلیم کرتے ہیں مگر تاریخ ماننے سے گریز کرتے ہیں جبکہ خود ایسی ہی طویل نظم راج ترنگنی مصنفۂ کلہن کو دنیا کی بہترین تاریخوں میں شمار کرتے ہیں۔ اہل مغرب جو آج تک ایپک یا طویل نظم کی تعریف نہ کرسکے انکار شناسیر کی طویل نظم کی توضیحات کو سمجھ ہی کیا سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ اُن کی رائے کی کیا وقعت ہوسکتی ہے۔ پھر راماین تو خیر راجچندر جی کے عہد ہی کی پیداوار ہے مگر مہابھارت تو خود ناقدین مغرب کے قول کے مطابق جنگِ مہابھارت کے بہت برسوں بعد ویاس جی نے ترتیب دی ہے۔ ہمارے بھی کیسے کیسے مہربان ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ فلاں چیز کس عہد کی پیداوار ہے مگر یہ بتانے کی تکلیف گوارا نہیں فرماتے کہ آخر اس کا ماخذ کون دفترِ تاریخ ہے؟ مہابھارت جیسی ضخیم تصنیف کے تمام واقعات کو نسلاً بعد نسلٍ اس قدر صحت کے ساتھ یاد رکھنا کہ ان کی ترتیب میں سرِمُو فرق نہ آنے پائے، انسانی دماغ کا ایک ایسا معجزہ ہے جسے عقلِ سلیم قبول کرنے سے قاصر ہے اور جس کی مثال آج تک کہیں نظر نہیں آتی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اہل مغرب فقط راج ترنگنی ہی کو کیوں مستند تاریخ تسلیم کرتے ہیں حالانکہ اس میں مصنف نے اپنی پیدائش سے صدیوں پہلے کے واقعات قلمبند کئے ہیں، اور ان کی دانست میں اس کا ماخذ بھی کوئی دوسری کتاب نہیں ہے؟ بات صرف اتنی ہے کہ راج ترنگنی صرف گیارھویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے اور مہابھارت وغیرہ اس وقت ضبطِ تحریر میں آئیں جب اہل مغرب محض وحشیانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ شاید یہ وجہ ہے کہ کلہن کے پیش رو مورخین بان، بلہن مصنف وکرمانکا دیو چریتا اور کلیمندر تک ان کی نگاہیں نہیں پہنچتیں لیکن مقامِ حسرت ہے کہ یہ صریح اغماض بھی آفتابِ حقیقت کی ضیاباری چھپانے میں ناکام ہے۔

کشمیر

(از حضرت سروش عسکری طباطبائی)

وہ سرزمینِ نشاطِ دل ودماغ ، جہاں ہوائیں چلتی ہیں عطرِ عروس میں ڈوب
وہ ارضِ سبزہ و آبِ روان و باغ ، جہاں ہر اک شگوفۂ نورس ہے جانِ محبوب
جہاں گلاب میں پیاسی نگاہ ڈھلتی ہے
جہاں مدام رگِ گل پہ اوس تلتی ہے

جہاں سحاب کے جھولے میں مہر سوتا ہے کنارِ آب ہیں ڈیرے جہاں بہارِ دل
جہاں میانِ شبِ ماہتاب ہوتا ہے کلی کا رقص، ترنم پہ آبشاروں کے
جہاں ہے صوتِ جلاجل پھوار کی چھم چھم
ادائے خاص سے گھنگھرو بجاتی ہے شبنم

ہے رنگ و بو کا تلاطم جہاں گلستاں میں جہاں مچلتی ہے ہر اک نج میں نئی خوشبو
گھٹائیں عطر چھڑکتی ہیں سنبلستاں میں سنوارتی ہیں ہوائیں بہار کے گیسو
فضا میں لیتا ہے انگڑائیاں خمار جہاں
جوان ہوتی ہے دوشیزۂ بہار جہاں

وہ پُر بہار شبستاں ، صبا کا گہوارہ سکون پاتی ہے سلمائے آرزو حسرت
وہ بزمِ ناز وہ فطرت کا آئینہ خانہ سنگار کرتی ہے لیلائے رنگ و حسرت
پری بہار کی گھونگھٹ میں مسکراتی ہے
ہر ایک جھیل نئی آرسی دکھاتی ہے

ہماری دکھ بھری دنیا سے اک الگ دنیا جہاں ہوائے غم و یاس آ نہیں سکتی
وہ عیدگاہِ نظارہ وہ گلشنِ یکتا بہار جس کی خزاں کو بھی باہر نہیں
ہے آب جو یہ جہاں کوہسار کا سایہ
جہاں ہے رحمتِ پروردگار کا سایہ

وہ کیفِ شام و بہارِ سحر کا مجموعہ — وہ نور و نزہت و رنگ و شباب کا مخزن
نسیم و شبنم و لعل و گہر کا مجموعہ — عبیر و عنبر و مشک و گلاب کا مخزن
جہاں کنول متبسم ہیں جوئباروں میں
بہار ہنستی ہے کیسر کے کشت زاروں میں

وہ جوشِ حسن وہ فورِ بہار کی منزل — وہ شعر و نغمہ و کیف و شباب کی دنیا
وہ سبزہ و چمن و جوئبار کی منزل — وہ رنگ و بو کا فسانہ وہ خواب کی دنیا
جسے بسایا ہے نکہت سے غنچہ و گل نے
جنم لیا جہاں فردوس کے تخیل نے

بہار خیز و نظر کش وہ خطۂ رنگیں — جہاں کی فصل مناسب ہے عیش و عشرت کو
وہ اک دیارِ پُر انہار و چشمۂ شیریں — جہاں کی آب و ہوا راس ہے محبت کو
وہ حسنِ نور جہاں کی بہار یہ تصویر
وہ خوابِ عشق جہانگیر کی حسیں تعبیر

وہ ذوق و شوق کی رنگینیوں کا افسانہ — وہ "لالہ رخ" کے سفرہائے شوق کی منزل
نیاز و ناز کی گل چینیوں کا افسانہ — وہ حسن و عشق کی ہنگامہ آفریں محفل
جہاں تجھ ایسے بھی جلوے دکھائے جاتے ہیں
کہ برقِ طور کے خرمن جلائے جاتے ہیں

کسی حسین کے رنگین خواب کا پرتو — طلسمِ رنگ، وہ جادو کیا ہوا گلشن
وہ روزِ ابر و شبِ ماہتاب کا پرتو — وہ دیویوں کا سنگھاسن وہ پریوں کا مسکن
کنول میں روپ جہاں لکشمی دکھاتی ہے
حسین جھیلوں میں وینس سدا نہاتی ہے

وہ سائکی و کلوپیٹرا کا حسیں پرتو — وہ کیوپڈ اور اپولو کی منزلِ دلجو
ہیلن کا تائس و ڈینا کا مہ جبیں پرتو — وہ اک مرقعِ افکارِ ہومر و سیفو
وہ ہر تخیلِ نقش و نگار کی تصویر
وہ ہر تصورِ حسن و بہار کی تصویر

وہ بے شمار مناظر کی پُر سکوں منزل — ازل میں بھی جو دبستانِ مانی و بہزاد

شگفتگی و بہار و شباب کی محفل جسے بجا ہے زمانہ کہے جو خلد آباد
فضا میں جس کی ہے عیش و سُرور کی تاثیر
ہوا میں جس کی شرابِ طہور کی تاثیر

وہ اِک فسانۂ دلکش وہ اِک حسین تمثیل وہ رنگ و نور میں فطرت کی بہترین تصنیف
وہ ایک نظمِ مرصّع وہ ایک خوابِ جمیل وہ اِک مرقعِ رنگیں وہ شاہکارِ لطیف
وہ اِک اچھوتی سی تشبیہ شوخیٔ فطرت
اِک استعارۂ حسن و سلیقۂ قدرت

وہ بوٹے اور شگوفے وہ پھول اور وہ پھل جنھیں ستارے بھی تکتے ہیں فرطِ حیرت سے
وہ سطحِ آب پہ بیلوں کی لہریا آنچل کہ جن پہ حوریں بچھی جاتی ہیں محبت سے
قیامت آبِ کُہسار میں پرتوِ گلِ تر
غضب وہ دامنِ سبزہ میں شبنمی جھالر

بہارِ باغ کی وہ مے پرستیاں ہے ہے وہ جوشِ لالہ و نسرین و نسترن توبہ
نئی نویلی وہ کلیوں کی مستیاں ہے ہے جوان و تازہ نہالوں کا بانکپن توبہ
ادا سے "ملکۂ شب" ہے پسِ حجاب کہیں
کلاہ کج کئے "شہزادۂ گلاب" کہیں

کہیں چنبیلی، کہیں ناز بو، کہیں جوہی کہیں ہے سرو، صنوبر کہیں، کہیں ...
کہیں بنفشہ، کہیں کاسنی، کہیں سیوتی کہیں سپیدہ و شمشاد ہے کہیں ہے ...
گلوں سے جھولیاں خالی بھی ہیں بھری بھی ہیں
چمن میں لاکھوں کنیزیں بھی سنتری بھی ہیں

دھنک کہاں کہ یہ ہے عکسِ ابروئے جسم یہ دھوپ چھاں نہیں گیسو سکھائے جاتے ہیں
ستارے ٹوٹتے ہیں اور نہ گرتی ہے شبنم یہ رونمائی میں موتی لٹائے جاتے ہیں
کرن کا تاج دئے فرق پر بعزّ و وقار
سحر کی اوٹ سے مکھڑا دکھا رہی ہے بہار

یہیں بدلتا ہے کہنہ روایتوں کا نظام بہار بنتی ہے خلعت پہنے زمیں ہر
یہیں سے چلتا ہے نورِ رنگ بکمال کلی چٹکتی ہے [illegible] یہیں ہر

یہیں پہ رسمِ کشودِ حجاب ہوتی ہے
عروسِ لالہ و گل بے نقاب ہوتی ہے

ازل میں قافلۂ رنگ و بو یہیں ٹھہرا
لطافتوں کو میسر ہوا یہیں پہ شباب
یہیں فلک سے صحیفہ بہار کا اُترا
یہاں نہ کیف کی حد ہے نہ مستیوں کا حساب

پہنچ کے آب لبوں تک شراب ہوتا ہے
جبیں پہ آکے پسینہ گلاب ہوتا ہے

کسی نے خوب کہا شرح مختصر یہ ہے
اگر جہان ہے خاتم تو ہے نگیں کشمیر
مگر سروش مرا نقطۂ نظر یہ ہے
کہ چشمِ غور سے دیکھو تو یہ نہیں کشمیر

یہ اِک چھنی ہوئی جاگیر ہاتھ آئی ہے
بشر نے جنتِ گم کردہ پھر سے پائی ہے

رنگِ جذبات

(از حضرت اختر رضوانی)

نہ جانے کیا جنوں میں شغل فرماتے رہے ہیں ہم
کہ آپ اپنے کو خود زنجیر پہناتے رہے ہیں ہم
تجھے ہر لمحہ اپنی شکل میں پاتے رہے ہیں ہم
کہ تیرا عکسِ رُخ پیشِ نظر لاتے رہے ہیں ہم
بہر عنوان اپنی سادہ لوحی کے سہارے پر
بہر عالم فریبِ ذوق کھاتے رہے ہیں ہم
کچھ ایسا وقت بھی آیا ہے احساسِ محبت سے
جنوں کی حد سے بھی آگے گزر جاتے رہے ہیں ہم
ابھی وہ آئیں گے، وہ آ گئے ہیں، وہ آنے والے ہیں
دلِ ناداں کو سو حیلوں سے بہلاتے رہے ہیں ہم
ہمیں شکوہ نہیں احباب کی بے اعتنائی کا
یہاں تو دشمنوں پر پھول برساتے رہے ہیں ہم

ہمیں سے ہے وجودِ مستیِ حسنِ ازل اختر
بہاریں بن کے دو عالم پہ لہراتے رہے ہیں ہم

طوفانِ طرب

(از جناب شایق ہندو)

کیا میکدے میں عیش کا ساماں ہے آجکل ... ہر جامِ مے سے نشرِ بہاراں ہے آجکل
ممنونِ خُم ہیں شام و سحر کے تغیرات ... محکومِ جام گردشِ دوراں ہے آجکل
موجِ صبا میں نفحۂ گیسوئے دوست ہے ... نبضِ فضا میں لرزشِ رُوماں ہے آجکل
گلباز موجِ بادہ سے ہیں صحن و بام و در ... گرد و نواحِ میکدہ بستاں ہے آجکل
ہیں غمزہائے مغبچگاں معرفت فروش ... پیرِ مغاں مبلّغِ عرفاں ہے آجکل
ہر خشتِ خُم سے مے کی تراوش ہے متصل ... ہر ساتگیں رحیق بداماں ہے آجکل
ہے جوفِ خُم میں آتشِ سیال موج زن ... قصرِ سبُو میں شعلۂ سوزاں ہے آجکل
تازہ ہوئی ہے سنتِ فسق و فجور پھر ... مقبولِ عام مشربِ عصیاں ہے آجکل
آلودگی میں اوجِ عبادت کی شان ہے ... تردامنی میں دولتِ ایماں ہے آجکل

کچھ اس طرح بدل سا گیا ہے مزاجِ دہر
ہندوئے سُست دیں بھی مسلماں ہے آجکل

بہار بحیثیت شاعر

(از جناب اثر جلیلی صاحب چشتی اجمیری)

بہار کا نام محمود الحسن خاں ہے، کوٹ ضلع فتحپور ہسوہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وہیں پائی، مولوی فاضل پاس کرکے ناگپور اور پھر فیروزپور (پنجاب) چلے گئے اور وہیں ہائی اسکول کی تعلیم ختم کرکے کالج میں داخل ہوگئے۔ لیکن مزاج نے ماحول کو سازگار نہ پاکر کالج چھوڑنے پر مجبور کیا۔ شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی بالآخر علامہ عیش فیروزپوری کے شاگرد ہوگئے۔ آخر میں کسی وجہ سے آبائی وطن چھوڑنا پڑا اور کسب معاش کے لئے چل کھڑے ہوئے۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں وارد اجمیر ہوئے اور ایسے آئے کہ یہیں کے ہو رہے اور اب تک یہیں قیام ہے۔

بہار مدتوں "عالمگیر" لاہور "شاعر" اکبرآباد اور "نگار" لکھنؤ میں لکھتے رہے ہیں، لیکن ہندوستان کی روایتی قدر ناشناسی سے جس کی بدولت صدہا جواہر ریزے امتداد ایام کے غبار میں دب کر ہمیشہ کے لئے کھو گئے۔ تنگ آکر قطعی گوشہ گیر ہوگئے تھے، لیکن مجھے ہمیشہ ناز رہے گا کہ میں جب سنہ ۱۹۲۹ء میں مستقل طور پر اجمیر آرہا اور ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تو پھر ایک بار انھیں ادبی دنیا کے سامنے آنے پر مجبور کردیا۔ گو وہ جن ایام میں مجھ سے ملے ہیں گوشہ گیر سے تھے لیکن کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے رہتے تھے جو لکھنے کے بعد زیب طاق نسیان ہوتا تھا مگر لکھتے ضرور تھے کیونکہ

چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی

ان سے متعارف ہونے کے بعد سے تا ایں دم کہ میں ان کے جس جذبہ کی صداقت پر فدا ہوں وہ ان کا خلوص اور نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا ہے۔ انھیں اس کی قطعی پروا نہیں کہ آپ ان کے اس فعل کو جو ان سے سرزد ہو رہا ہے کس نظر سے دیکھیں گے، انھیں تو کر گذرنے سے کام۔ چنانچہ اس ناقدری اور جوہر ناشناسی کے باوجود ان کی ادبی پرمایگی اس کی سب سے بڑی ضامن اور شاہد ہے کاش کہ وہ پنجاب یا یو۔پی میں ہوتے تو پھر کوئی ان کی شخصیت کو دیکھتا کہ وہ کس طرح آفتاب بن کر چمکتی لیکن افسوس کہ قسام ازل نے ان کے لئے راجپوتانہ کا ریگ زار منتخب کیا

غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

میں نے جب سب سے پہلا شعر بہار کا سنا جو یہ ہے:-

[illegible] کا مشکل [illegible] نہ جانے تو کبھی آ [illegible]

تو اسے اس عام سطحِ شاعری سے بہت بلند پایا جہاں صرف

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

کو کمالِ شاعری سمجھ لیا گیا ہے اور اسے بھی نہایت کرّ و فر سے پیش کیا جاتا ہے ایسے شعر کہنا شعر کی توہین کرنا ہے۔ بہار نے سچ کہا ہے کہ

سر خریدِ بھی دستارِ فضیلت ہے جہاں میں ہوں

بہار کا مندرجہ بالا شعر بداعتِ اسلوب کی ایسی نادر مثال ہے جیسے اُردو غزل میں صرف غالب کے ہاں پایا جا سکتا ہے۔ غالب اس خصوصیت کا مالک اور اس رنگ کا بادشاہ ہے اور اس کی مقبولیت کا راز اسی خصوص میں پنہاں ہے۔ روایت اور تاریخی شواہد سے علیحدہ ہو کر ذرا تخیل کی دنیا میں آئیے اور دیکھئے کہ "سنتے ہیں لیلیٰ کا یہ دستور تھا" کہ وہ اپنے دروازے پر آئے ہوئے سائلوں کو اپنے ہاتھ سے خیرات دیتی تھی۔ ایک دن دوسرے سائلوں کے ساتھ مجنوں بھی پہونچ گیا اور بھیک طلب کی۔ لیلیٰ حسبِ دستور باہر آئی اور جیسے جو دینا تھا دیدیا مگر ہاتھ سے مجنوں کے کاسہ لے لیا" اور زمین پر دے مارا اور کاسہ توڑ کر واپس اندر چلی گئی۔ گو مندرجہ بالا شعر کا یہ مفہوم نہیں لیکن کسی ایسی ہی کیفیت کو نظم کیا گیا ہے۔ اب ذرا اس سطح سے بلند ہو کر دوسرے پہلو کا مشاہدہ کیجئے، سعدی کہتا ہے کہ

برمُے خود درِ اطماع باز نتواں کرد چو باز شد بدرشتی فراز نتواں کرد

یعنی "مناسب اربابِ ہمت نیست یکے را بلطف امیدوار گردانیدن و باز بنومیدی خستہ گردانیدن"

کیا بداعتِ اسلوب کی اس سے اچھی مثال ہو سکتی ہے کہ

یہ کیا کہ توڑ دیا بھر کے کاسۂ سائل نہ دینا ہو تو کوئی آسرا دیا نہ کرے

جوشؔ اُردو شاعری میں ایک خاص اسلوب اور انداز کے مالک ہیں، جس میں اُن کے نسلی آب و رنگ کو بھی دخل ہے اور جیسا کہ خود اُن کا بھی دعویٰ ہے کہ

"میری شاعری میں آنسو، آہیں اور سینہ کوبیاں بہت ہی کم ہیں، کیونکہ یہ چیزیں انفعالیت سے پیدا ہوتی ہیں اور میں ان چیزوں سے شاذ ہی دوچار ہوا ہوں۔" (روحِ ادب ص۱۳)

گو موصوف نے "بہت ہی کم" اور "شاذ ہی" کہہ کر جواز کا ایک پہلو اپنے قبضہ میں رکھا ہے لیکن موصوف کی مندرجۂ بالا عبارت کے مطالعہ سے قبل بھی جب "شعلہ و شبنم" میں یہ شعر میں نے پڑھا کہ

بیٹھے [illegible] دامن کسی کا ہاتھ میں آ کر نکل گیا۔

تو [illegible] ہوا کہ ایک فلک پرست اقدام میں [illegible] ہے جگر پاش

تو در کنار دیوانگی اور جنون کے عالم میں بھی بہار کے ہاتھ میں آیا ہوا دامن نہیں نکلتا۔

مرے اندازِ وحشت کا تسخر پھر اُڑا لینا ذرا دیکھو تو دستِ شوق میں یہ کس کا دامن ہے

غالب نے اپنی بدقسمتی اور نیرنگیِ روزگار کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے کہ

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانہ کے اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

گو یہ شعر اپنی جگہ نہایت مکمل ہے اور خیال ہوتا ہے کہ اسی مضمون اس رنگ سے شاید اب نہ باندھا جاسکے لیکن بہار نے اس میں بھی جدت اور تازگی پیدا کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔

آہ العالمیں دو دن میں یہ نیرنگیِ عالم چمن میں آنکھ کھولی تھی قفس میں پر نکلتے ہیں

اصغر گونڈوی مرحوم کا ایک شعر ہے کہ

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھدی

بہار نے بھی سجدے سے کعبہ بنایا ہے لیکن کتنے اچھوتے اور پیارے انداز میں کہ

سجدہ کیا ہے یار کے نقشِ کفِ پا کی تلاش کعبہ کیا ہے جس جگہ مشق جبیں سائی ہوئی

اس شعر میں انھوں نے "یار کے نقشِ کفِ پا" کو "کعبہ" کہنے کے لئے جو اسلوب و انداز اختیار کیا ہے یہ اُن کی مشق اور پختگی پر دال ہے۔ "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ" کچھ تو ماحول کے اثرات اور کچھ روایات کے پیشِ نظر ہمارا ہر شاعر یاس و قنوط پر اظہارِ خیال ضروری بلکہ واجبات میں شمار کرنے لگا ہے لیکن جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے متقدمین میں سے لیکر دورِ حاضر تک اُردو میں صرف دو شاعر ایسے گزرے ہیں جنھیں "یاسیات" کا امام کہنا چاہیئے یعنی میر و فانی، باقی کوئی بھی اس رنگ میں ان کے سامنے نہیں چمکتا، گو غالب کبھی کبھی میر سے قریب تر ہونے کی کوشش کرتا ہے، اور بعض اوقات کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ فانی اپنے خاص انداز میں اپنی حرماں نصیبی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ

مری حیات ہے محروم مدعائے حیات وہ رہگذر ہوں جسے کوئی نقشِ پا نہ ملا

اول تو مضمون ہی سراپا درد ہے اور پھر فانی کا اندازِ بیان دو آتشہ ہو گیا لیکن بہار نے اسمیں بھی ایک نئی راہ پیدا کی ہے، اور گو یہ ان کا رنگ نہیں لیکن جہاں تک بیان کا تعلق ہے نہایت کامیاب شعر کہا ہے کہ

مختصر لفظوں میں ہے یہ شرحِ رودادِ حیات آہ کر کے عمر بھر خواب اثر دیکھا کئے

مندرجہ بالا سطور میں جس حقیقت کو بار بار مثالوں کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ بہار کی جدت نگاری اور ابداعِ اسلوب ہے اور یہی ان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ وہ فرسودہ

فرسودہ مضمون کو اس خوش سلیقگی سے باندھتے ہیں کہ ان کا اپنا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے اس دعوے میں حق بجانب نظر آتے ہیں کہ

بجا دا غیار سے میرا تتبع غیر ممکن ہے پہنچنا اس بلندی تک قیامت ہی جاں تیں ہوں

آپ اگر اُن کی ایک ایک خصوصیت سے گذر کر بھی ان کا مطالعہ کریں گے تو ہر جگہ ان کی انفرادیت دامن کش توجہ پائیں گے۔ گو ان کے ہاں تحلیل نفسی کی مثالیں نادر نہیں تو کمیاب ضرور ہیں لیکن اس کے باوجود اس طرف بھی جب آگئے ہیں تو سرگشتہ و حیران نہیں ہوئے منظر نگاری سے انھیں خاص شغف ہے لیکن خالص منظر نگاری مفقود ہے۔ وہ اس وادی میں بھی تغزل کے پھول کھلاتے ہوئے نظر آتے ہیں مثلاً "شب ماہتاب" کو دیکھیے:۔

عروس شب ماہ زہت چکاں ہے زمیں آسماں رہگذر کہکشاں ہے
جوانی ہے ہر شے پہ ہر شے جواں ہے ستاروں کی دنیا تجلی فشاں ہے
تجلی فشاں ہے ستاروں کی دنیا

ہے فردوسِ آشوب کنج گلستاں ضیا پاش ہے گوشۂ شبنمستاں
ہر اک سُو ہے موج تجلی خراماں عروسِ چمن نے چُنی ہے وہ افشاں
کہ شرما گئی ماہ پاروں کی دنیا

دوسری نظم "ایک شام" ملاحظہ فرمائیے، اس میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے۔

فروغِ ماہ مبیں سے سورج کا سُرخ چہرہ اُتر رہا تھا حسین تارے جھلک رہے تھے، فضا کا جوبن نکھر رہا تھا
فلک پہ سر سو جمالِ فطرت کا عکسِ رنگیں بکھر رہا تھا
شفق کی دلکش فضا کے پردوں میں حسن کا فر سنور رہا تھا

"عورت" اُن کی بہترین نظموں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، گو یہ کہنے کی جرأت تو خود میں نہیں پاتا کہ بقول علامہ اقبالؔ "عورت اُن کے اعصاب پر سوار ہے" لیکن ہاں اُنھوں نے نہایت والہانہ انداز میں عورت کی تعریف کی ہے مثلاً:۔

بہشتِ عاشقی ہے عشق کی آنکھوں کا تارا ہے

یا

جہانِ رنگ و بو کا غنچۂ شاداب ہے عورت
حریم حسن کا اک جلوۂ بیتاب ہے عورت

لیکن اس کو محض شاعری سمجھ کر نظر انداز کر دینا ظلم ہوگا۔ اس میں انھوں نے عورت کی نفسیات کو بڑی مشاقی سے اور تجربہ کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

"بھری ہے کوٹ کر مغلوبیت اس کے تخیّل میں"
"یہ مائل ہو نہیں سکتی ہے تذلیلِ محبت کی"

تشبیہات و استعارات کے معاملہ میں وہ متقدمین کے محتاج نہیں ہیں، اور بعض اوقات اس معاملہ میں اُن کی تلاش حیرتناک ہوتی ہے۔ مثلاً "گداگر سے" ایک نظم میں گداگر کو "غبارِ خاطرِ انساں" کہکر وہ بات کہی ہے جو دوسرے رنگ میں مشکل سے کہی جا سکتی ہے، یا

کسی بھونرے کو جب کلیوں پہ رقصاں دیکھ لیتا ہوں
گھڑی بھر میں کئی خوابِ پریشاں دیکھ لیتا ہوں

مندرجہ بالا شعر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مقامی رنگ سے بھی متاثر ہیں، اور اُردو شاعری پر جو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان میں پلی لیکن ابھی تک گل و بلبل و ہزار پر فدا ہے، اس سے خود کو بری دیکھنا چاہتے ہیں، چنانچہ اُن کی ایک مکمل نظم "کوئل" اس کی بہترین مثال ہے۔

جھرنوں میں تلاطم ہے تو کہسار میں ہل چل — جھوم اُٹھے خس و خارِ جبل گونج اُٹھے جنگل
کیوں کوک رہی ہے یہاں بستی کی طرف چل — او باؤری کوئل
اری او باؤری کوئل، اری او باؤری کوئل — بستی کی طرف چل
کالی ہے مگر روح تری پُر زمینا ہے — آتش بجگر شعلہ بدل فتنہ نوا ہے
رگ رگ میں تری عشق کا ہیجان بپا ہے
اس دَور میں لے دیکھے تو ہی راہ نما ہے — تو راہنما ہے
اری او باؤری کوئل، اری او باؤری کوئل — بستی کی طرف چل

بہار صرف شاعر ہیں اور سیاست سے اُنھیں کوئی دلچسپی نہیں، لیکن بایں ہمہ جس فضا اور ماحول میں بیداری نے انھیں ہوش کا پیغام دیا وہ سیاسی ہیجان اور کشمکش کی آماجگاہ تھی، اس لئے ایک حقیقی ادیب و شاعر کی طرح وہ بھی اپنے ماحول سے متاثر نظر آتے ہیں، لیکن اُن کے پیشِ نظر نہ کانگریس کا مطمحِ نظر ہے نہ لیگ کا لائحہ عمل اور وہ کسی جماعت کے دامن سے وابستہ نہیں، چنانچہ اپنی نظم "اُردو" کی تمہید میں خود اس کا اعتراف کیا ہے:-

اسیرِ زلف نہ دلدادۂ چشم گیسو — شہیدِ ناوکِ مژگاں نہ کشتۂ ابرو

مریدِ ساقیِ رعنا نہ پیرِ میخانہ   نہ وقفِ بادۂ رنگیں نہ رہنِ جام و سبو
مہاسبھائی نہ لیگی نہ کانگریسی ہیں   ابوالکلام کا چیلا نہ بندۂ نہرو

بلکہ ان کا مقصدِ حیات بقولِ خود یہ ہے:۔

مجھے ہوئی ہے ودیعت متاعِ علم و ہنر   ہے پُرجواہرِ افکار سے میرا پہلو
عطا ہوا ہے مجھے ذوقِ شعرِ بے پایاں   مری حیات کا مقصد ہے خدمتِ اردو"

لیکن جس وقت اُنھوں نے آنکھیں کھولی تھیں ہمارا ادب "آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے" کی سطح سے بہت بلند ہو چکا تھا، اور ہر طرف آزادی کی دھوم مچی ہوئی تھی وہ بھی ان تاثرات سے بچ کر نہ جا سکے جو اس ماحول کا ناگزیر تحفہ کہے جا سکتے ہیں، چنانچہ اُن کی نظم "محنت کا پھل" اس کی بیّن مثال ہے۔ گو نظم طویل نہیں تو مختصر بھی نہیں لیکن پھر بھی میں اسے مکمل نقل کر دینا چاہتا ہوں۔

چھا رہا ہے ہر طرف ناپاک گیسوں کا دُھواں،
بم اُدھر آتش فگن توپیں اِدھر شعلہ فشاں،
دب گئے آواز سے گولوں کی ناقوس و اذاں،

ہو رہا ہے آہ کس انداز سے ردِّ عمل
کیا یہی ہے دائمی تہذیب کی محنت کا پھل

ہے فضا میں منتشر معصوم بچوں کی فغاں
آسماں پیما ہے بیواؤں کی آہوں کا دُھواں
رو رہا ہے غارتِ رنگِ چمن پر باغباں
خون کے چھینٹوں سے لالہ زار ہیں دشت و جبل
کیا یہی ہے سرفروشِ قوم کی محنت کا پھل

دیکھ وہ مکتب سے نکلا ننگِ کردار و عمل
شعرِ حرکتیں بر لب و دیوانِ حافظ در بغل
جاہلِ مطلق بزعمِ خود حکیمِ بے بدل
سرخ چہرہ، خشمگیں آواز پیشانی پہ بل
کیا یہی ہے مصلحانِ قوم کی محنت کا پھل

پھر رہا ہے نوکری کی فکر میں دیوانہ وار
دورِ حاضر کی متاعِ فضل کا سرمایہ دار

ہوش وارفتہ، نظر آوارہ، نشتر در بغل
کیا یہی ہے مرکزِ تعلیم کی محنت کا پھل

پڑ گئے فرشِ زمیں پر اہلِ خانہ جابجا
کس کو کہتے ہیں بچھونا اور کیسا اوڑھنا
کچھ مویشی، کچھ زمیں، اک ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا

کچھ کدالیں چند کھرپے چند ٹوٹے پھوٹے ہل
دیکھ یہ ہے کاشتکارِ ہند کی محنت کا پھل

اس نظم میں بہار نے ہندوستان کے حالات و کوائف پر بڑی بے لاگ تنقید کی ہے، لیکن جیسا وہ انھوں نے اپنی نظم "شاعر" میں کہا ہے شاعر کو وہ صرف عکاس دیکھنا چاہتے ہیں، مصلح نہیں اُن کے نزدیک شاعر کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ہمیں ہمارے صحیح خد و خال سے آگاہ کردے ناصح اور مصلح نہ بن جائے۔ ان کے نزدیک شاعری نام ہے صرف یہ دکھا دینے کا کہ فلاں چیز کیسی ہے، یہ اس کا کام نہیں کہ وہ یہ بتائے کہ اُسے کیا ہونا چاہیئے اور اس کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ شاعر ایک آئینہ ہے جس میں ہر شخص اپنے معائب و محاسن سے بشرطیکہ وہ اہلیت رکھتا ہو جس طرح مادّی آئینہ کے لئے بصارت ضروری ہے آگاہ ہو سکتا ہے آئینہ بول نہیں سکتا اور نہ معائب کو دُور کرنے اور محاسن کو حاصل کرنے کے طریقے بتا سکتا ہے، چنانچہ وہ خود بھی اس دائرہ سے باہر نہیں نکلتے اور صرف عکاسی پر اکتفا کی ہے۔ مندرجۂ بالا نظم گورنمنٹ کالج اجمیر کے سالانہ مشاعرہ کے لئے وہیں کی ادبی مجلس کے مجوزہ عنوان پر لکھی گئی تھی، اور میں اس واقعہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ دو یا تین بند پڑھے جانے کے بعد صاحب صدر نے جن کا نام لینا مناسب نہیں، روک دیا اور آگے نہ پڑھنے دی۔ اقبال نے سچ کہا ہے کہ

اقبال یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا   موزوں نہیں مکتب کیلئے ایسے مقالات

انسانی انانیت کا خاصہ ہے کہ وہ حقائق سے چشم پوشی کرے اور تخیلات سے دل بہلائے، اُس نے اگر کسی ادب کو سراہا ہے تو اس میں چاپلوسی خوشامد اور مبالغہ ہوگا یا نفسانیت و شہوانیت کا آئینہ دار ہوگا چنانچہ اول الذکر کی مثال قدیم ادب کے بعض نمونے ہیں اور ثانی الذکر کی مثال "ترقی پسند ادب"۔ بہرحال جب میں اس تلخ موضوع پر آگیا ہوں تو دامن بچا کر گذر جانا مناسب نہیں۔ موجودہ دور کے ادبا و شعرا

کا ایک گروہ خود کو ترقی پسند کہتا ہے اور اُن کے اس دعوے نے ادبی دنیا کے سامنے اختلافات کا ایک نیا باب کھول دیا ہے جس پر بالوضاحت گفتگو کرنا اطاعت بیجا کا مرتکب ہونا ہے اور میں استدلالی تردید سے گذر کر صرف ایک مثال پر اکتفا کرونگا۔ ترقی پسند ادب خود کو فراریت کا نہ صرف منکر بلکہ دشمن کہتا ہے اور بزعم خود زندگی کو کشمکش اور تنازع البقا کے لئے آمادہ وہموار کرتا ہے۔ لیکن مقام تاسف ہے کہ جاں نثار اختر جو ترقی پسند شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں، اپنی نظم "دوست! سب کچھ بھول جانے دے مجھے" کے ذیل میں ایک مختصر نوٹ لکھکر کہ "میں فراریت کا قائل نہیں لیکن یہ نظم ایک وقتی جذبہ سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہے۔" خود کو اس الزام "فراریت" سے پاک سمجھ لیں، اور اگر کوئی قدیم اسکول شاعری کا رکن کسی وقتی جذبہ سے مغلوب اور متاثر ہوکر ایسی بات کہدے تو رجعت پسندی اور فراریت سے متہم کیا جائے۔ دوسری مثال ڈاکٹر تاثیر کی ایک نظم "منزل" ہے پہلا بند ہے کہ:-

آج میں دُور، بہت دُور! نکل آیا ہوں،
بے طلب، بے تگ و دو
دل میں کاوش نہ تلاش
نہ کوئی خواہش مخفی نہ تمنائے معاش
ہوس خام نہ سودائے تمام!
دیکھئے چلتا ہوا چلتا ہوا آپہونچا ہوں
پے بہ پے گام بہ گام! کس قدر دُور نکل آیا ہوں،

اللہ اللہ کیا ترقی ہے! ـــــ اور اگر یہ بے طلب، بے تگ ودو، کاوش نہ تلاش، خواہش مخفی نہ تمنائے معاش، ہوس خام نہ سودائے تمام، ہی ترقی پسندی کی علامت ہے اور یہ گریز ہی تنازع البقا کی تعلیم ہے تو متقدمین کی اس تعلیم کو کیوں موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ کہ

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

اور اگر آپ جانبداری کی سطح سے بلند ہوکر دیکھیں تو میں یہ بتانے کی جرأت کروں کہ ترقی یہ ہے کہ

قفس برق و شرر کی زد سے باہر ہی سہی لیکن
گلستاں پھر گلستاں ہے نشیمن پھر نشیمن ہے (بہار)

اپنے مسکنِ مالوف کو ہر معیبت کی آماجگاہ ہونے کے باوجود ہر جنتِ ارضی سے زیادہ محبوب سمجھنا وطن دوستی کی وہ تعلیم ہے کہ ترقی پسندوں کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی ـــــ "لے وائے ہمارے اگر ابن ست ہمارے!"

بقول حضرت جوش "یہ شاعری کھُودری ہے" اور اس کی بیّن دلیل یہ ہے کہ لکھنے والے زبان پر قدرت نہیں رکھتے" اور ستم بالائے ستم یہ کہ وہی پُرانی گریز اور فرار کی تعلیم تو پھر یہ حضرات کیوں شاعری پر کرم فرما رہے ہیں، کاش کوئی انہیں سمجھا دے کہ "مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں"! میں ذیل میں بہار کے چند متفرق اشعار پیش کرتا ہوں جن میں آپ اُولوالعزمی، خودداری اور دعوتِ عمل کی ایسی دلنشین تعلیم پائیں گے جو جدید ترقی پسند شاعری میں عنقا ہے:۔

مجھے تو جبر کی قوت کو آزمانا ہے — رہے رہے نہ رہے شاخِ آشیاں میری
دار و رسن و برق سے کیا کام چلے گا — میرے لئے ایجاد کریں کوئی ستم اور
دام و قفس تو چیز کیا صحنِ چمن بھی لے اڑو — طوفِ حریمِ رنگ و بو غایتِ بال و پر نہیں
مجھے غم اور غم بھی بے پری کا لے معاذ اللہ — گلستاں سے قفس تک کھینچ لایا ہوں نشیمن کو
اب صحرا کے ہر ذرہ کو گلزار بنا سکتے ہیں ہم — کیا غم جو موسمِ گل نہ رہا کیا فکر جو گلشن چھوٹ گیا
تیری ہمت پہ ہے تخریبِ جہنم کا مدار — تری ٹھوکر میں تری خلد کا کاشانہ ہے
اٹھائے جلوہ گاہِ طُور کے احساں بلا میری — سلامت چاہیئے مجھ کو نگاہِ جلوہ زا میری

وہ فلسفۂ حیات میں شاید اقبال سے متاثر ہیں، اُن کے ہاں بھی

زندگی نام ہے اِک سوزِ مسلسل کا بہار — کود پڑ آگ میں گر ہمتِ پروانہ ہو

کی تعلیم پائی جاتی ہے، اور وہ بھی زندگی کو "اک تب و تابِ مسلسل اِک خروشِ مستقل" کہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ غم کو غالب و اقبال کی طرح نہ صرف زندگی کا جزو لاینفک سمجھتے ہیں، بلکہ ان کا تو دعویٰ ہے کہ "غم سے ہوتی ہیں اُجاگر روح کی گہرائیاں" وہ تحصیلِ مقاصد اور تکمیلِ تمنا کو موت کہتے ہیں اور مسلسل حرکت کو زندگی سمجھتے ہیں۔ اُن کا نظریہ ہے کہ "زندگی ہے ہر قدم پر ٹھوکریں کھانے کا نام" ــــ گو وہ محض نقاظ اور تنگ بند شاعر نہیں اور اُن کے یہاں ایسے خشک مسائل بھی نظر آتے ہیں لیکن اس سے ان کی شعریت پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا، وہ ادائے مطالب کے لئے ایسی مترنم بحریں انتخاب کرتے ہیں کہ گویا موسیقی کا دریا بہا جا رہا ہے۔ "کوئل" "تبسم" "شاعر" وغیرہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ گو ان کے کلام میں محاکاتی عنصر کی کمی ہے لیکن ان کا تفحص اور ان کی تخئیل اس کمی کو ایک حد تک پورا کر دیتے ہیں، اور اُن کی فن کارانہ پختگی ان پہ اور جلا کرتی ہے۔ دنیائے ادب بہار کو نہیں پہچان سکی ہے اور ابھی وہ اس ماحول میں ہیں جہاں "سکوتِ اشعارِ پُر معنیٰ کی قیمت" ہوتا ہے اور جہاں "نقادِ سخن بھی منہ دیکھ کر ملتی ہے۔" اور چونکہ وہ گانا نہیں جانتے ہیں اس لئے اگر انہیں یہ شکایت ہے تو درست ہے کہ

جہاں خامۂ شعر و ادب کی قدر کیا جانیں — سکوتِ اشعارِ پُر معنیٰ کی قیمت ہے جہاں میں ہوں

دادِ سخن بھی ملتی ہے منہ دیکھ کر بہار
اب امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

لیکن تجربات و مشاہدات شاہد ہیں کہ "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں" ابتدا کو دیکھئے صرف خیال کو الفاظ اور بحور میں پابند کر دینا کمال سمجھا جاتا تھا، پھر علوئے تخئیل اور مفہوم کو پرکھا جانے لگا۔ اس کے بعد وہ دور آیا جس میں تحت اللفظ پڑھنے میں لوگ کمال حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور اس پڑھنے کی داد دی جاتی تھی، تو تعجب کیا اگر آج "گلے بازی" کی داد ملتی ہے اور جب ....: خیال زمانہ، چنیں نیز ہم نخواہد ماند"

شاید ذیل کے متفرق اشعار سے بہار کی صلاحیت کار کا کچھ اندازہ لگایا جاسکے۔

افسردہ روح، غمزدہ، دل بیقرار ہم
کب تک جئے ہی جائیں گے پروردگار ہم

ہم عکسِ آفتاب کو کہتے ہیں آفتاب
ذوقِ نظر ہے کفر کو ایماں کئے ہوئے

ہے کفر نور پاش سرِ رہگذارِ عشق
ہر بت کھڑا ہے مشعلِ ایماں لئے ہوئے

مجھ پر بھی کھل سکا نہ مرا مقصدِ حیات
جاتا ہوں تیری دید کا ارماں لئے ہوئے

جستجوئے درِ محبوب الٰہی توبہ
اپنی ہستی سے بہت دور ہوا جاتا ہوں

انتہا بھی ہو کرم کی کوئی اے شانِ کرم
روک لے ہاتھ کہ مغرور ہوا جاتا ہوں

چاہیئے اک عمر تکمیلِ تلاشِ یار کو
سونے والے اٹھ ابھی باقی ہے محشر دیکھنا

دیدہ و دانش و خرد صبر و سکون و ضبط و ہوش
دل کے معاملات میں ایک بھی معتبر نہیں

ذرہ ذرہ دہر کا آئینہ دارِ راز ہے
حسن کی خاموشیوں میں غیب کی آواز ہے

ہر کلی شیشہ بکف ہر گل خمستاں در کنار
پچھلی راتوں میں جمال شبنمستاں دیکھئے

اے رہ نوردِ عشق ذرا دیکھ بھال کے
غافل یہیں کہیں ہے قیامت چھپی ہوئی

شاید یہیں ملی ہیں حدیں حسن و عشق کی
ہر چیز پر ہے مہرِ خموشی لگی ہوئی

عشق کے قدموں پہ ہوگی حسنِ سرکش کی جبیں
وہ بھی دن آئے گا اک دن وقت آنے دیجئے

وہ آئے بھی تو ایسے وقت آئے پرسشِ غم کو
جب آنکھوں سے بھی ناممکن ہے شرحِ مدعا میری

یہاں یہ ہنس کے کوئی پوچھ رہا ہے مرا مزاج
سر ڈالے آہ آہ کئے جا رہا ہوں میں

دامن ہے آپ کا کہ گریباں بہار کا
کیا جانے کر رہے ہیں کیسے تار تار ہم

مرحبا ذوقِ نیایش، حبذا جذبِ سجود
آج سر کے ساتھ سنگِ آستاں اٹھتا رہا

بہلا لیا کرتا تھا تری یاد سے دل کو
اب یہ بھی مری خاطرِ نازک پہ گراں ہے

تکمیلِ محبت کیا سنتی تکمیلِ جنوں بھی ہو نہ سکی
دامن گریباں تک پہنچا وہ ہاتھ سے دامن چھوٹ گیا

مرگ و ہستی

(از مسٹر جگدیش سہائے سکسینہ، وکیل شاہجہاں پور)

کہا اک روز مرشد سے یہ میں نے — کہ اے دانائے اسرارِ نہانی
سوئے ملکِ عدم روزِ ازل سے — رواں ہے کاروانِ زندگانی
سمجھ میں یہ نہیں آتا ہے لیکن — حیات اچھی کہ مرگِ ناگہانی
امید و بیم کی حالت نے کھویا — نشاطِ مرگ و لطفِ زندگانی
خوشی جینے کی ہو کیونکر کسی کو — نہیں جب اعتبارِ عمرِ فانی
اجل کی بھی تمنا کیجئے کیا — کہ ہے دل کو نہایت بدگمانی
نہ جانے اس کے پیمانے میں کیا ہے — ہلاہل ہے کہ آبِ زندگانی

پریشاں دیکھ کر مرشد نے مجھ کو — یہ فرمایا ز راہِ مہربانی
کھلے کس طرح رازِ مرگ و ہستی — کہ عاجز ہے کمالِ نکتہ دانی
مگر جب حلق سے بزمِ طرب میں — اترتی ہے شرابِ ارغوانی
یہ نغمہ بے خودی گاتی ہے اس دم — تصدق جس پہ لحنِ خسروانی
یہاں آئے مبتلائے رنجِ ہستی — عبث ہے جستجوئے شادمانی
کبھی وارفتگانِ آرزو کو — نظر آیا نہ روئے کامرانی
وہی ہے سرگزشتِ ابنِ آدم — جو ہے رودادِ غمہائے نہانی
بظاہر موت ہے ہستی سے بہتر — حقیقت بھی یہی ہے یارِ جانی
نہیں مخفی بشر سے راز کوئی — بجز رازِ قضائے ناگہانی
ضرورت پردہ داری کی نہ تھی کچھ — گراں قیمت جو ہوتی زندگانی
یہی رہتی فراقِ جسم و جاں پر — سرِ گورِ غریباں نوحہ خوانی
مگر جب زیست سے بڑھ کر اجل ہو — تو لازم ہے حجابِ زندگانی

کہیں بے کیف ہو جائے نہ دیکھو
مئے ہستی و صہبائے جوانی

رام

(از پنڈت اندرجیت شرما، احیوہ ضلع میرٹھ)

صفحۂ دہر پہ چھانے لگی ظلمت کی گھٹا — پردۂ کذب میں چھپنے لگا حق کا جلوا
قلبِ بیدار پہ طاری ہوا غفلت کا نشہ — نظر آنے لگا ہر سمت درِ حشر کھلا
کوئی سنتا نہیں فریاد بھی مظلوموں کی
ہوتے ہیں جور و ستم جان پہ معصوموں کی

جسمِ خاکی میں ہوئی روح جو راون کی عیاں — خنجرِ جور رہا خلق پہ رشیوں کے رواں
قلبِ دنیا کا ہوا آتشِ غم سے جو تپاں — چرخ پر چار طرف پھیل گیا دودِ فغاں
بے گناہوں کی جو فریاد گئی تا بہ فلک
ہل گیا خوف سے بھگوان کا سنگھاسن تک

ہو کے مجبور پیا آپ ہی جامِ ہستی — اپنے بھگتوں کو دیا آ کے پیامِ ہستی
صبحِ ہستی سے مبدّل ہوئی شامِ ہستی — ہو گیا اور ہی کچھ اور نظامِ ہستی
چار دیوار عناصر میں مقیّد ہو کر
کچھ نرالا ہی زمانہ کو دکھایا منظر

زندگی کا کوئی راون کی سہارا نہ رہا — یعنی بگڑی ہوئی تقدیر کا چارا نہ رہا
جلوۂ حق کے مقابل وہ شرارا نہ رہا — مہر کے حلقۂ آغوش میں تارا نہ رہا
مٹتے ہی نام ستمگر کا مٹا نام ستم
عبرت آموزِ خلائق ہوا انجامِ ستم

فتح و نصرت کی صداؤں سے فلک گونج اٹھا — چنگ ناقوس و راگوں سے فلک گونج اٹھا
رشی منیوں کی دعاؤں سے فلک گونج اٹھا — جے جے کاروں کی نواؤں سے فلک گونج اٹھا
دور سنکٹ کیا بھگتوں کا عجب کام کیا
رام خود ہو کے زمانے کو بھی پھر رام کیا

پتھّر

(از مسٹر کشمیری لال ذاکر بی۔ اے)

اُس کے سینے میں بھی ایک دل تھا جو تڑپ سکتا تھا، اُس کے احساسات بھی محبت کی خنک چھاؤں میں آرام کرنے کی آرزو رکھتے تھے، وہ بھی جذباتِ لطیف کو زندگی کی اندھیاری میں نور کی شعاعیں سمجھتا تھا لیکن وقت کی مسلسل ٹھوکروں نے محبت کی خنک چھاؤں کو صحرا کی چلچلاتی دھوپ میں تبدیل کر دیا، نور کے منبع کو سکھا دیا اور اب شعاعوں کے بجائے تاریکی کی بارشیں ہوتی تھیں ––– اُس کا دل ایک دفعہ نہیں بیسیوں دفعہ تڑپا، اُس نے کئی دفعہ دل کی تیز دھڑکنوں کو سنا لیکن دھڑکنوں کا یہ راگ رفتہ رفتہ نا اُمیدی کے سکوت میں کھو گیا۔ دل تڑپ تڑپ کر آخر بے حس ہو گیا، اُس کے محسوسات مُردہ ہو گئے اور ایک دن ایسا آگیا جب وہ انسان نہیں ایک پتھر بن چکا تھا۔ وقت کی اُونچی پہاڑی سے لڑھکتا ہوا ایک بھاری پتھر، آخر وہ پتھر زندگی کے چوراہے میں آ پڑا ––– انگارے برساتی ہوئی دھوپ، انجماد انگیز ہوا، کڑکتی ہوئی بجلیوں سے کھیلنے والی بارشیں سبھی اُس سے ٹکراتی رہیں –– لیکن وہ پتھر اپنی جگہ پر ہی جما رہا، ہاں کبھی کبھار کوئی چھوٹا موٹا کنکر وقت کی چٹان سے ٹوٹ کر گرتا اور اُس سے آ ٹکراتا تو اُس کے جسم کے تار گویا جھنجھنا اُٹھتے۔ ایک چنگاری سی پیدا ہوتی اور بس۔ ––– حادثات کا بہاؤ آخر اُن چھوٹے چھوٹے کنکروں کو بھی نہ جانے کہاں لے گیا۔ وہ ابھی تک اپنی جگہ پر قائم تھا شاہراہِ زندگی پر آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے مسافر اور منزل کی طرف تیزی سے بڑھنے والے کئی راہرو اُس کے پاس سے گزرے، وہ روز ایسے لوگوں کو دیکھتا، ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا، جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتے۔ جب تک راہوں کے خوفناک اُلجھاؤ اُنھیں جکڑ نہ لیتے۔ لیکن ایسے بھی اوقات آئے تھے جب کسی مسافر نے اُسی پتھر سے ٹھوکر کھائی ہو۔ زندگی کے اِس کبھی نہ ختم ہونے والے راستے پر گرا ہو۔ اپنی چوٹ کو سہلایا ہو اور ایک دفعہ غضب آلود نگاہوں سے اُس سرد پتھر کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی راہ پر پکے یقین کے ساتھ چل پڑا ہو ––– کئی مسافر ٹھوکر کھا کر سنبھلے بھی تھے، اُس ٹھوکر نے اُن کے لئے چراغِ راہ کا کام دیا تھا اور اُنھوں نے پھر کبھی ٹھوکر کھائے بغیر اپنی منزل کو آسانی سے پا لیا تھا ––– اور ایسے کمزور راہ چلنے والوں کی بھی کمی نہ تھی جو ٹھوکر کو ہی منزل سمجھ بیٹھے، جنھوں نے پتھر ہی سے ناتا جوڑ لیا ––– لیکن پتھر اپنی معین جگہ سے ہلا اور وقت کی کروٹوں نے ہر ایک کو اپنے اپنے ٹھکانے لگا دیا۔

ہاں تو رگھو کو ایک پتھر بنا دیا گیا تھا۔ جمود اور سکوت کی زنجیر دل میں جکڑا ہوا۔ اُسے زندگی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کوئی خواہش اُسے مضطرب نہ کرتی تھی ۔۔ وہ ریت نہ تھا جو سراب کا روپ دھار کر دوسروں کو دھوکا دے ۔ وہ پتھر تھا جسے ہر کوئی دیکھ سکتا تھا اور اپنے آپ کو بچا کر گذر سکتا تھا ۔۔۔ لیکن اُس کے دل میں پھر وہی پہلی آرزو دوسری شکل میں ظاہر ہوگئی تھی، وہ چاہتا تھا کہ کوئی اور پتھر وقت کی چٹان کی سب سے اونچی چوٹی سے گرے اور اُس کے دھکے سے وہ اپنی جگہ سے ذرا سرک سکے۔ ذرا حرکت کر سکے۔ لیکن دو پتھروں کے ٹکرانے میں ایک ٹوٹ بھی تو سکتا ہے، اور ٹوٹے ہوئے پتھر کی کیا قیمت؟ ٹوٹی ہوئی موتی کو بھی کوئی نہیں پوچھتا ۔۔۔ اور پھر راہ میں پڑا ہوا ایک حقیر سا پتھر۔ رگھو اکثر خیالات کے جالے تنا کرتا اور آخر خود ہی کو اُن میں جکڑا ہوا دیکھکر اُس خوبصورت گھروندے کو توڑ دیتا۔ اُسے محبت کی ضرورت تھی لیکن ایسی محبت کی نہیں جو زبردستی اُس کے سر منڈھ دی جائے، وہ ایسا اُنس چاہتا تھا جو خود اُس کے دل میں پیدا ہو۔ "رگھو مجھے تم سے محبت ہے" ۔۔ یہ الفاظ اُس نے بارہا سنے تھے، اب وہ اِن لفظوں کو سننا نہیں کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اُسے کوئی بھی مستحق ہستی نظر نہ آئی۔ اُس کی یہ خواہش ماحول کی کرختگی کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی ۔ آخر یہ خواہش ہی اُس کی ہر شے پر چھا گئی۔ ایک طوفان تھا جس نے کناروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا

موہنی نے رگھو کو اپنا جیون ساتھی بنا لیا...... موم کا ایک بڑا سا ڈھیر ایک پتھر سے ٹکرا گیا ۔۔۔ موم جم کر ٹھوس گولے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن ذرا سی گرمی یا ہلکی سی چوٹ اُسے اپنی اصلی حالت میں بھی تو تبدیل کر سکتی ہے۔ ۔۔ عورت پتھر بن بھی تو نہیں سکتی ۔ یا تو وہ ریت کا چمکتا ہوا میدان ہے جو پیاسے اور تھکے ہوئے مسافروں کو فریب دے سکتا ہے اور یا موم کا تودہ جو کسی وقت بھی پگھلایا جا سکتا ہے۔ موہنی خود سے بھی ٹھیک طور سے واقف نہ ہو سکی۔ گوروکل میں پندرہ سال گذار کر اُس نے اپنے متعلق بہت سی غلط باتیں سوچ لی تھیں۔ ضبط اور پابندی کی زندگی گذارنے کے بعد وہ اپنے آپ کو عورت سے بالاتر سمجھنے لگی تھی عورت کی حساس ۔ نرم اور متلون طبیعت کو جیسے اُس نے تیاگ ہی دیا تھا...... اُسے خواہش تھی کہ وہ کسی عام مرد سے نہ بیاہی جائے، مرد کی کمزوریوں سے کھیلنے کی بجائے وہ اُس کی پتھریلی فطرت سے لڑنا چاہتی تھی وہ ایک فاتح بننا چاہتی تھی کھلاڑی نہیں۔ اُس نے جان بوجھکر اپنے آپ کو رگھو کے سپرد کر دیا ۔۔۔ شاہراہِ زندگی پر چلتے چلتے جو راہ میں پڑے ہوئے بڑے سے پتھر سے اُس نے خود ٹھوکر کھائی۔ اپنے زخمی پاؤں دیکھکر وہ مایوس نہیں ہوئی ۔ چلائی نہیں، بلکہ خوش ہوئی کہ اُس کے بھی کسی نے ٹھوکر لگائی ہے۔ ... اب تک وہ ایک صاف اور سیدھے راستے پر ہی چلتی آئی تھی جہاں کانٹے اور پتھر نام کو بھی نہ تھے۔ تکلیف کا ہلکا سا ٹکہ دیکھکر اُس کی مشکل پسند زندگی نے ایک خاص قسم کی مسرت محسوس کی تھی ..... اُس کا خیال تھا کہ راستے

پڑے ہوئے بھاری پتھر کو وہ ایک طرف کر دے گی — اب اُس سے اور کوئی راہگیر ٹھوکر نہ کھائے گا۔

رگھو کو بھی اپنی خواہش کی تکمیل ہوتی نظر آتی تھی — موہنی کی سرد مہری نے کسی حد تک اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا — جوں جوں وہ اُس کے نزدیک آنے کی کوشش کرتا وہ اور کھنچتی جاتی — اُس کی آتشِ شوق جلنے بجھنے کی حد تک بھڑکا دی گئی تھی — ناتجربہ کار موہنی آخر غلطی کر ہی بیٹھی، اُس نے کشش کے کچے دھاگے کو زیادہ کھینچنا شروع کیا۔ آخر ایک لمحہ ایسا آگیا جب وہ دھاگا زیادہ زور برداشت نہ کر سکا۔ ایک آخری جھٹکے سے وہ ٹوٹ گیا اور رگھو اور موہنی اُس کے دونوں سروں کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ایک دوسرے سے بہت دُور دھکیل دیئے گئے۔ اتنی دُور کہ وہ پھر کبھی نہیں مل سکے۔ بادل کے دو ٹکڑے جو ایک دوسرے سے ٹکرا کر بجلی پیدا کر سکتے تھے جھکڑ کے زور سے مخالف سمتوں میں اُڑا دیئے گئے اور اُن کے درمیان آسمان کی بے پناہ وسعت ایک رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی۔

اُس کی شادی کو ایک سال بیت گیا تھا۔ اس عرصہ میں موہنی کسی حد تک اپنی فطرت کو سمجھ گئی تھی۔ کھیل میں مات کھا جانے کے بعد اُسے اپنی خامیاں نظر آنے لگیں، غرور کا موٹا سا پردہ اب اُس کی آنکھوں کے سامنے سے اُٹھ گیا تھا — وہ تو خود شاید اب بھی نہ اُٹھتا لیکن اُسے اُٹھا دیا گیا تھا، وقت کا یہی تقاضہ تھا اور وقت کے تقاضے اٹل ہوتے ہیں — اب اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا — وہ پھر کشش کی اُلجھی ہوئی ڈور کا سرا ڈھونڈنے لگی، ہر اُلجھاؤ اُسے اپنی ایک کمزوری نظر آئی۔ ہر اُلجھاؤ ایک رکاوٹ تھی جس نے اُسے فاتح بننے سے روکے رکھا۔ اب وہ فاتح بننے کے ادھورے سپنوں کی اصلیت پا گئی تھی اب وہ ایک شکست خوردہ اور مجبور سپاہی کی طرح گڑگڑا کر اپنا قصور بخشوانے کے لئے تیار تھی۔

اپنے خاوند کی نظرِ التفات کی ایک بھیک تک سے محروم ہونے کا اُسے رنج تھا — وہ پتھر سے ٹکرا کر چنگاری پیدا کرنے کی بجائے خود کچلی گئی تھی۔

آج صبح سے موہنی کی طبیعت میں بیحد گھٹن اور تھکن تھی — زندگی کی پگڈنڈیاں اُسے زیادہ تاریک اور اُلجھی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں — شاید اُس کا مستقبل ہمیشہ کے لئے سردیوں کی طویل گہری تاریکیوں میں کھو گیا تھا۔ رگھو گو اِس سے عموماً غافل رہتا مگر اُس کی توقعات بھی مجروح ہو کر دم توڑ چکی تھیں — اب وہ اس پیاسے مسافر کی طرح تھا جو ایک سوکھے ہوئے چشمے پر پہنچ کر افسوس تو کرتا ہے لیکن کسی دوسرے چشمے کی چمکتی ہوئی سطح کی کھوج کو بھی ترک نہیں کر دیتا — آج کئی دن سے وہ کافی رات گئے گھر واپس آتا تھا — موہنی اس کی وجہ پوچھ کر خود ہی شرمندہ ہو جاتی، جیسے ہر سوال کا وہ خود ہی جواب ہو — لیکن آج اُس کی ندامت جاگ اُٹھی تھی مستقبل کے سرد اور مضبوط ہاتھوں نے اُسے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا تھا

کھڑکی میں بیٹھے اُس کی نگاہیں دُور اُفق کی طرف اُٹھیں۔ سیاہ بادلوں کا ایک بڑا سا ڈھیر جاذب پھگری ہوئی سیاہی کی بوندکی طرح آہستہ آہستہ آسمان میں پھیلتا جارہا تھا۔ اُس کی مُردہ اُمیدوں کا ایک بڑا سا انبار اُس کی زندگی کے اُفق میں بکھر رہا تھا۔ اُس نے پچھلے ایک سال کے واقعات پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور اُس کی آنکھوں کے کونے بھیگ گئے۔۔ آج رات وہ اپنے کھوئے ہوئے حقوق واپس لینا چاہتی تھی ۔۔۔ اُسے گورو کل میں گذارے ہوئے پندرہ سال ایسی زنجیریں محسوس ہوئیں جنھوں نے ابتک اُس کے دماغ کو جکڑے رکھا تھا، وہ ایک قیدی تھی جو فاتح بننے کے خواب دیکھتے دیکھتے اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔ کھڑکی کی آہنی سلاخوں کو پکڑ کر بیٹھے ہوئے نہ جانے کتنا وقت گذر گیا۔ وہ سلاخیں شاید اُس کی ڈگمگاتی ہوئی زندگی کو سہارا دے رہی تھیں، وہ انھیں چھوڑنا نہیں چاہتی تھی ۔۔۔ اچانک اُس کی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھیں، تاروں کی لرزتی ہوئی شمعیں روشن تھیں۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ یہ چراغ اُس کی مستقبل کی اُلجھی ہوئی پگڈنڈیوں کو روشن کردیں گے۔۔۔ مگر پھر اُس نے آسمان کی وسعت میں پھیلتے ہوئے چند سایوں کی طرف دیکھا جو تاروں کی لرزتی ہوئی شمعوں کو باری باری گل کرتے جاتے تھے۔۔۔ اُس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ کھڑکی کے پاس سے اُٹھ بیٹھی، آہستہ آہستہ اُس نے آہنی سلاخوں کو چھوڑ دیا۔۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتی تھی، کسی کی مدد سے حاصل کی ہوئی زندگی موت سے بھی بدتر ہے ۔۔۔ اُس نے اپنے چہرے کو بڑے سے آئینے میں دیکھا۔ وہ ٹھٹک سی گئی۔ کس قدر حسین اور جوان تھی وہ ۔۔۔ اچانک اُسے اپنے عکس کے پیچھے سے ایک بڑا سا پتھر لڑھکتا ہوا دکھائی دیا ۔۔۔ وہ چیخ اُٹھی ۔۔ وہ کمرے سے باہر بھاگ جانا چاہتی تھی کہ اچانک دروازہ کُھل گیا ۔۔ آندھی چلنا شروع ہوگئی تھی ۔۔ تاروں کے چراغ رفتہ رفتہ بجھ گئے تھے ۔۔۔ مستقبل کی پگڈنڈیاں زیادہ تاریک ہوگئی تھیں ۔۔ دروازے کے کُھلنے کے ساتھ ہی دھماکے کی سی آواز آئی ۔۔۔ رگھو شراب کے نشے میں چُور دہلیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا تھا ۔۔۔ موہنی سر تا پا لرز اُٹھی ۔۔۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ زندگی کی اندھیری رات میں کوئی اور مسافر چوراہے میں پڑے ہوئے بڑے سے پتھر سے ٹکرا گیا ہے۔

رُباعی

(پنڈت اندرجیت شرما ماچھرو میرٹھ)

ہر رنگ میں موجود ہے صورت تیری — ہر پھول میں مستور ہے نکہت تیری
ہر چند کہ دیکھا نہیں آنکھوں نے تجھے — منہ میں مگر دل کے ہے مورت تیری

بحث و مباحثہ

(از جناب سرشار کسمنڈوی)

ماہ اپریل ۱۹۴۴ء کے زمانہ میں سری کرشن داس صاحب نے عنوان بالا کے ماتحت تقریباً دو صفحہ کا ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے، اور مولانا محوی صدیقی لکھنوی کی نظم "نوائے دل" کے چار مصرعوں پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"ماہ جون ۱۹۴۳ء کے زمانہ میں حضرت محوی نے اپنی نظم بعنوان "نوائے دل" میں "ستم" کو کئی اشعار میں باندھا ہے۔

مثلاً شعر اول۔ "ستم اُن کا کرم نہ ہو جائے"
شعر دوم "ختم شوق ستم نہ ہو جائے"
شعر پنجم "عزم ترکِ ستم نہ ہو جائے"
شعر دہم "ستم دوست کم نہ ہو جائے"

پہلے شعر میں ستم کو بہ کسر تائے (غالباً یہ بسکون تائے ہے کتابت کی غلطی سے بکسر تائے چھپ گیا ہے) اور دوسرے اور پانچویں اشعار میں ستم کو بفتح تائے استعمال کیا ہے، اس سے بڑھ چڑھ کر اُنھوں نے دسویں شعر میں اس لفظ کو ایک غیر معروف اور نامانوس طور پر استعمال کر کے بحر میں حذف و سکون پیدا کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ میرا مدعا تقطیع سے بآسانی ذہن نشین ہو سکتا ہے۔ اس نظم کی بحر فاعلاتن مفاعلن فعلن ہے اس مصرعہ کی تقطیع بطور ذیل ہے :-

ف ا ع ل ا ت ن / س × ت م د و (س) × م ف ا ع ل ن / ت ک م ن ہ ہو

ف ع ل ن / جا ئے

ظاہر ہے کہ رکن اول کا حرف دوم بھی ساقط ہے۔ یہی سقم تیسرے شعر کے دوسرے مصرعہ "سیر تسلیم خم نہ ہو جائے" میں بھی موجود ہے۔ یعنی اس مصرعہ کا تیسرا حرف بھی ساقط ہے۔ حضرت داغ دہلوی نے ستم کو ہمیشہ بفتح تائے باندھا ہے"

اس عبارت میں تین اعتراض وارد کئے گئے ہیں۔

(۱) لفظ ستم بار بار استعمال ہوا ہے اور بعض جگہ حرکت تائے میں تغیر و تبدل ہو گیا ہے۔ دونوں

(۲) لفظ ستم بفتح تائے ہے، فتحہ تائے کو بدلا گیا ہے جس کی کوئی سند نہیں۔ تمام اساتذہ نے اس لفظ کو بفتح تائے استعمال کیا ہے۔

(۳) "نوائے دل" کا وزن فاعلاتن مفاعلن فعلن ہے وہ توڑ دیا گیا ہے۔ کچھ اشعار اور مصرع اس وزن پر ہیں کچھ دوسرے وزن پر۔

جواب (۱) کسی لفظ کا ایک نظم میں درآنحالیکہ وہ پانچ چھ شعروں سے زیادہ اشعار کی نظم ہو چار پانچ بار آنا مخل فصاحت نہیں ہے۔ مولانا محوی کی نظمیں عموماً طویل بیس بیس تیس تیس شعروں سے کم نہیں ہوا کرتیں، ایسی صورت میں کسی لفظ کا چار پانچ بار آنا کسی درجہ میں بھی منافی فصاحت نہیں۔

(۲) لفظ ستم بدستور تمام مقامات میں بفتح تائے مستعمل ہوا ہے بسکون تائے یا بکسر تائے کہیں نہیں استعمال ہوا ہے جیسا کہ اپنے حسن ذوق سے سمجھ لیا گیا ہے، اتنی بھونڈی فروگذاشت تو شاید کوئی نومشق شاعر بھی نہیں کر سکتا۔

(۳) تیسرے اعتراض کی بنا صاحبِ اعتراض کی فن عروض سے کامل ناواقفیت ہے۔ اندیشہ یہ ہے کہ وہ فاعلاتن مفاعلن فعلن کے متعلق یہ بھی نہ جانتے ہونگے کہ اس بحر کا نام کیا ہے اور یہ اپنے سالم وزن فاعلاتن مس تفع لن فاعلاتن سے کیونکر فاعلاتن مفاعلن فعلن ہوگیا۔

گذارش طلب یہ امر ہے کہ فاعلاتن مفاعلن فعلن جو وزن بنا ہے اس کے فاعلاتن میں خبن ہونا جائز۔ فاعلاتن کا مخبون فعلاتن ہے اور صدور (پہلے مصرعہ کا رکن اول) اور ابتدا (دوسرے مصرعہ کا رکن اول) میں عروضیوں کی تصریحات ملیں گی کہ رکن فاعلاتن جب صدر وابتدا ہو تو اس کے سالم ومخبون کا اجتماع جائز ہے، یعنی ایک مصرعہ فاعلاتن مفاعلن فعلن کے وزن پر ہو اور دوسرا فعلاتن مفاعلن فعلن پر۔ جیسے کہ ظہیر عشق کا مشہور شعر زبان زد خاص وعام ہے ؎

جس محلہ میں تھا ہمارا گھر　　وہیں رہتے تھے ایک سوداگر

اس شعر میں پہلا مصرعہ فاعلاتن مفاعلن فعلن کے وزن میں اور دوسرا فعلاتن مفاعلن فعلن میں ہے۔

دوسری مثال:۔ امیر مینائی مرحوم ؎

نگہ ناز کام کرتی ہے　　دم میں تم کی تمام کرتی ہے

اس شعر میں پہلا مصرعہ فعلاتن سے شروع ہوتا ہے اور دوسرا فاعلاتن سے۔ ممکن ہے معترض کو اب بھی اس تسلیم کرنے میں کچھ تامل ہو، ذیل میں حضرت ریاض خیرآبادی خلد آشیاں کی ایک پوری غزل ریاض رضواں

مغربی محاذ | اتحادی فوجیں ایٹوریپ سے شمال، شمال مغرب اور شمال مشرق کی طرف اور ہرنٹاوت سے شمال کی طرف اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ تمام علاقہ پر چھا گئی ہیں۔ اب گویا بلجیم کی لڑائی ختم ہو گئی ہے۔ کناڈا کا لشکر بڑی برجن کی طرف استقلال کے ساتھ پیش قدمی کر رہا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دریائے شیلڈ میں والچرن، نوداور بیولینڈ نامی ٹاپو ہیں، وہاں کی جرمن فوجوں کا واحد سلسلۂ آمد و رفت و رسل و رسائل منقطع کر دیا جائے۔ اتحادیوں کی دوسری فوجیں ایٹوریپ سے جانب بریدہ تقریباً دس میل آگے بڑھ گئی ہیں۔ ایک تیسری اتحادی سپاہ ٹلبرگ کے قریب پہونچ گئی ہے۔ نجگیمن کا مشہور مورچہ مثلث نما ہے جس کی چوٹی جانب شمال، اور قاعدہ گھیل فاسی یکسالائن ہے۔ اس مورچے کے داہنے بازو پر جرمنوں نے نہایت شدید جوابی حملے کئے لیکن سب کو شدید نقصان پہونچا کر مسترد کر دیا گیا۔ مورچہ مذکور کے بائیں طرف جنرل ڈیمپسی کی مکتر بند فوج نے ہرٹوجن کبسخ کی طرف سخت حملہ کیا ہے۔ اور مثلث کی چوٹی سے بھی آرنہیم پر شدید حملے کئے جا رہے ہیں، اور جس غرض سے حملے ہو رہے ہیں وہ قریب قریب پوری ہو گئی ہے۔ مختصر یہ کہ جہاں تک ہالینڈ کی لڑائیوں کا تعلق ہے، اتحادی فوجیں اب ایسے مقامات میں مورچہ بند ہو گئی ہیں جہاں سے وہ اپنی سپلائی لائن مضبوط و مستحکم کر لینے کے بعد سرزمین جرمنی پر شدید حملے کر سکیں گی۔

امریکن فوجوں نے ماسترخت سے دریائے ماس کو عبور کر کے سیجفرئیڈ لائن پر سخت حملے کئے اور وہ لائن مذکور میں بمقام اباخ جو آشین سے دس میل جانب شمال ہے رخنہ ڈالنے میں کامیاب ہو گئی ہیں چونکہ اس مقام کے مورچے ٹوٹنے کے بعد اتحادیوں کے لئے روہر کا دروازہ کھل جائیگا اس لئے جرمن مزاحمت بہت سخت ہو رہی ہے، اور غالباً ہوتی رہے گی۔ روہر جرمنی کا وہ علاقہ ہے جو قدرتی دولت سے مالا مال اور صنعت و حرفت کا مرکز ہے۔

مغربی محاذ کے دیگر مورچوں، خصوصاً لکسمبرگ کی مشرقی سرحد پر بھی سخت لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ میٹز کے شمال، نانسی کے مشرق، شمال مشرق اور جنوب مشرق میں بھی میدان داریاں ہو رہی ہیں۔ اپینال کے شمال مشرق اور بلفورٹ سے تقریباً دو سو میل مغرب میں بھی خوب لڑائیاں ہوئیں۔ نانسی کے مورچہ پر جرمنوں نے ایک مرتبہ اس قدر سخت جوابی حملہ کیا تھا کہ قریب تھا مورچہ امریکنوں کے ہاتھ سے نکل جائے اور وہ دریائے موزیل کے پار ہٹ آنے پر مجبور ہو جائیں۔ لیکن اس موقع پر تیسرے امریکن لشکر نے دشمن کا اس قدر بہادری اور پامردی سے مقابلہ کیا کہ دشمن کو منہ کی کھانی پڑی اور مورچہ بچ گیا۔ اس معرکہ میں جرمنوں کے ۱۲۱ ٹینک تباہ و برباد کئے گئے۔

روسی محاذات | ریگا کے شمال میں تمام علاقہ روسیوں نے دشمنوں سے صاف کر دیا ہے۔ اس کے بعد روسی فوج نے شمال، مشرق، مشرق اور جنوب مشرق کی طرف سے ریاست لٹویہ میں یلغاریں کرنا شروع کر دیا۔ بحیرۂ بالٹک کا جزیرہ داگو روسیوں نے لیا ہے۔ دوسرے جزیرہ اوذیل پر حملے ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ روسیوں نے ایک نیا محاذ شمال مغرب میں شروع کیا ہے تاکہ لاتویا کے قریب کسی جگہ ساحل بالٹک تک پہونچ کر لٹویہ کی جرمن فوجوں کی سلسلۂ تعلق منقطع کر دیا جائے۔

وسطی یعنی پولینڈ کے محاذ پر شہر وارسا کی حالت بہت خراب ہے، جہاں پولش فوج نے جو جنرل بور کے ماتحت بہادرانہ مقابلہ چاروں طرف سے نرغہ میں آکر دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ وارسا میں دو مہینہ تک لڑائی جاری رہی جس میں اہل پولینڈ کا بہت اتلاف جان ہوا۔ دریائے وسچولا کی مشرقی سمت سے روسی توپیں شدید گولہ باری کر رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کا مقصد وارسا کی طرف پیش قدمی کرنا ہو کیونکہ اب وہ شہر جرمنوں کے قبضہ میں پوری طرح آگیا ہے۔

ہنگری میں بریگیسل کی طرف سے روسی فوجیں کوہستان کارپتھین کے دروں کو عبور کرکے قراکاؤ کے جنوب میں ریاست چیکوسلاویکیہ کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہیں۔ خاص سرزمین ہنگری میں داخل ہوکر روسیوں نے مقام ماکو پر قبضہ کرلیا ہے۔ دوسری طرف ناگیفراد کی طرف سے بھی ہنگری کی طرف یلغار کی جارہی ہے۔

یوگوسلافیہ میں روسیوں نے فرساق اور بیلا قراکلہ پر قبضہ کرلیا ہے۔ اس کے بعد روسی فوجیں یلغار کرتی ہوئی یوگوسلافیہ کے دارالحکومت بلغراد تک جا پہونچی ہیں۔ جہاں گلی کوچوں میں دست بدست لڑائی ہو رہی ہے۔ یوگوسلافیہ پر روسیوں نے تین طرف سے چڑھائی کی ہے اور وہ دریائے موراوہ کے قریب ایک جگہ جنرل ٹیٹو کی فوج سے مل گئی ہیں یوگوسلافیہ میں نا غریب تک جرمنوں کا تمام سلسلۂ مواصلات توڑ دیا گیا ہے۔ اٹلی کی طرف سے اتحادیوں کی مدد بھی یوگوسلافیہ میں پہونچ رہی ہے اور خود اتحادیوں نے اپنی فوجیں البانیہ اور یونان میں اُتار دی ہیں۔ الغرض اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلقان میں جس قدر جرمن فوجیں موجود ہیں۔ ان سب کی قسمت پر مہر لگ گئی ہے۔ اب یا تو وہ مجبور ہوکر ہتھیار ڈال دینگی یا اُن کا صفایا کر دیا جائیگا۔

اٹلی اٹلی کے محاذ پر اتحادیوں کی پیش قدمی اور جنگی کارروائیاں کچھ سُست رہی ہیں جس کا سبب موسم کی خرابی ہے۔ کیونکہ بحیرۂ روم کے سواحل پر جو ممالک واقع ہیں ان میں برسات کا موسم ستمبر کے مہینہ سے شروع ہوکر جاڑوں بھر رہتا ہے۔ ندی نالے چڑھ جاتے ہیں، زمین دلدلی ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے فوجوں اور سامان جنگ کی نقل و حرکت اور بار برداری مشکل ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہوائی جہازوں کی سرگرمیاں بھی سست پڑ جاتی ہیں۔ دشمن بہت مضبوطی کے ساتھ مورچہ بند ہے اور بڑی سرفروشی سے مقابلہ کر رہا ہے۔ بایں ہمہ اتحادیوں کی اس محاذ پر بھی نمایاں کامیابیاں ہوئی ہیں۔ لشکر ہشتم دو طرفہ یلغار کر رہا ہے اور کوہستان ایپی نائن کے شمالی ڈھلوانوں سے ایک بولونیہ اور دوسری ایمولہ کی سمت پیش قدمی کر رہا ہے۔ تا دمِ تحریر یہ لشکر بولونیہ سے چودہ میل اور ایمولہ سے نو میل کے فاصلہ پر رہ گیا تھا۔ گویا تمام دشوار گذار پہاڑی علاقہ طے کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ ان سڑکوں پر بھی اتحادی فوجوں نے پیش قدمی کی ہے جو فلورنس سے ایک طرف بحیرۂ کو اور دوسری طرف فوصلی کو جاتی ہیں۔ اٹلی کے مغربی محاذ پر بھی اتحادی فوجوں نے بہت کافی پیش قدمی کی ہے بڑھتی بڑھتی ماسّتہ کے قریب پہونچ گئی ہیں۔ مگر مقام مذکور ابھی تک جرمنوں کے قبضہ میں ہے۔ قسینہ سے بھی اتحادی فوجیں صرف نو میل جانب جنوب رہ گئی ہیں۔

بلقان البانیہ اور یونان کے جزیرہ نمائے پلیپونسس میں اتحادیوں نے فوج اتار دی ہے یہاں اب کسی قسم کا خطرہ بھی باقی نہیں رہا تھا کیونکہ ایک طرف تو ان ملکوں سے جرمن فوجیں ہٹا لی گئی ہیں، دوسرے اب رومانیہ اور بلغاریہ بھی دشمنوں میں شامل نہیں رہے۔ بعض لوگ نکتہ چینی کرتے ہیں کہ اتنی دیر کیوں کی گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اتحادی فوجیں ایک ہی جگہ مصروف جنگ نہیں ہیں، انھیں متعدد محاذوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے اس لئے بلقان پر حملہ کی تیاریوں میں تاخیر کا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ اس کے علاوہ پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ بحیرۂ ایجین کے یونانی جزیروں کو بھی دشمن کے پنجہ سے چھڑایا جائے۔ چنانچہ اتحادیوں نے کئی جزیرے چھڑا لئے ہیں۔ کریٹ اور دوسرے جزیرے جہاں اب تک جرمن موجود ہیں وہ بھی رفتہ رفتہ چھڑا لئے جائیں گے یا وہاں سے جرمن فوجیں خود ہی بھاگ جائینگی اسلئے ان جزیروں کو جنگ یورپ میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے بحیرۂ ایجین کے جزیروں سے فوجیں اور سامان لے جانے والے بہت سے طیارے اتحادیوں نے تباہ و برباد کر دئے ہیں۔

بلغاریہ، رومانیہ، یوگوسلافیہ اور ہنگری بھی بلقان میں داخل ہیں۔ رومانیہ جنگ سے علحدہ ہو چکا ہے، یوگوسلافیہ اور ہنگری ابھی لڑ رہے ہیں جن کے حالات ہم روسی محاذات کے سلسلہ میں بیان کر چکے ہیں۔

جاپان کی جنگ جہاں تک چین و جاپان کی لڑائی کا تعلق ہے اب جاپانی اس کوشش میں ہیں کہ چین کے جن ہوائی اڈوں سے امریکن طیارے اڑکر جاپان پر بمباری کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں ان علاقوں پر قبضہ کر لیا جائے چنانچہ اسی مقصد سے اب جاپانی فوجیں جنوبی چین پر زبردست حملے کر کے پیش قدمی کر رہی ہیں۔ چین کی حالت "تشویش انگیز" تو بتائی جاتی ہے لیکن "یاس انگیز" نہیں ہے۔ جاپانیوں نے کوئلن پر قبضہ کر لیا ہے اور وہاں کے ہوائی اڈوں پر بھی ان کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اگر جاپانی فوجیں مغرب کی طرف اور زیادہ بڑھ گئیں تو امریکن ہوائی طاقت کی ترقی میں سخت مشکلات پیدا ہو جائینگی اور چین کے اندر جاپانی فوجوں کو شکست دینا بھی بہت مشکل اور ایک طویل مدت کا کام ہو جائیگا مگر اسے انجام دینا ضرور پڑیگا۔ اب چین کو اس بات کی بہت بڑی شکایت ہے کہ اس نے شمالی اور مشرقی برما کی مہموں کے لئے اپنی فوجیں اتحادیوں کو دیں مگر اتحادیوں نے چین کی ان فوجوں کیلئے جو وسطی اور جنوبی چین میں لڑ رہی ہیں بہت ہی کم مدد دی ہے اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ مسٹر چرچل نے دار العوام میں جنگ پر جو تبصرہ کیا تھا اس میں تو انھوں نے اس امداد کے لئے جو امریکہ نے چین کو دی ہے "ضرورت سے زیادہ" کے الفاظ استعمال کئے تھے لیکن چینی ترجمان اس امداد کو "قابل رحم" کہتے ہیں۔

بحر الکاہل خصوصاً جزائر فلپائن میں اتحادیوں کی چالیں خوب کامیاب ہو رہی ہیں اور وہ دن دور نہیں ہے جبکہ امریکن فوجیں فلپائن میں اتر جائیں گی۔ یہ اطلاع دی گئی ہے کہ بحر ہند میں برطانوی جنگی بیڑہ کی زبردست طاقت پہونچ گئی ہے۔ مگر اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ وہ برما۔ ملایا۔ سماٹرا۔ اور سنگاپور پر کب حملہ کرتا ہے۔

ستمبر کے مہینہ میں جاپانیوں کے ۲۰۲ بحری اور چودہ سو ہوائی جہاز ضائع ہوئے۔ بالکسپاپان واقع بورنیو پر امریکن ہوائی جہازوں نے حملہ کر کے بمباری کی

[illegible] ہوائی اڈوں [illegible] کے علاوہ [illegible] بہت [illegible] جنوبی [illegible] کا سہرا خصوصاً اتحادیوں کے سر رہتا ہے۔

کوبیک کانفرنس مسٹر چرچل نے امریکہ جاکر پریسیڈنٹ روزویلٹ سے مقام کوبیک واقع کناڈا ملاقات کی۔ ہر محکمہ کا اسٹاف ساتھ تھا اور بعد میں مسٹر ایڈن برطانوی وزیرِ خارجیہ بھی پہونچ گئے تھے۔ اس کانفرنس کے متعلق اختتام پر صرف ایک مشترکہ بیان شائع کیا گیا تھا۔ اس سے واقعات پر چنداں زیادہ روشنی نہیں پڑتی۔ بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے معاملات پر غور و خوض کیا گیا ہے اور اس بات پر خاص طور سے تبادلۂ خیالات کیا گیا کہ جاپان کے خلاف جنگ کا کیا نقشہ بنایا جائے۔ ممکن ہے کہ ہندوستان کے متعلق بھی کچھ گفتگو ہوئی ہو۔ لیکن اس کے بارہ میں کچھ بتایا نہیں گیا۔ اس کانفرنس میں مارشل اسٹالین شریک نہیں ہوئے تھے۔

ماسکو کانفرنس کوبیک کے بعد مسٹر چرچل اچانک ماسکو پہونچ گئے۔ آپ کے ساتھ نہ صرف فوجی اسٹاف ہے بلکہ وزیرِ خارجیہ مسٹر ایڈن بھی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانفرنس میں نہ صرف جنگ کے متعلق بات چیت ہوگی بلکہ بعض سیاسی معاملات بھی زیرِ بحث آسکے۔ اور چونکہ کانفرنس کے دوران میں مسٹر چرچل نے لنڈن والی حکومت پولینڈ کے وزیرِ اعظم کو بھی ماسکو میں طلب کرلیا تھا۔ اس لئے پولینڈ کے بارہ میں یقیناً کچھ نہ کچھ گفت و شنید ہوئی تھی۔

تنقیدِ کتب

پودوں کی کہانی خود ان کی زبانی

یہ چھوٹی سی کتاب اُردو زبان میں گویا علم النباتات کی پرائمر ہے۔ جسے مسٹر محمد سعید الدین، بی۔ ایس سی۔ ایم۔ اے (الہ آباد) ایف آر۔ ایم۔ ایس۔ ایف۔ ایف۔ ایس سی۔ ایف ایل۔ ایس (لنڈن) صدر شعبہ نباتیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ نے تصنیف فرمایا ہے۔ اس تصنیف لطیف کے اسلوب بیان کی خصوصیت یہ ہے کہ پودوں کی کہانی خود اُن کی زبانی سنائی گئی ہے۔ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں پودوں نے اپنے رموزِ حیات بیان کئے ہیں۔ دوسرے باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ پودے کس طرح غذا حاصل کرتے اور نشو و نما پاتے ہیں۔ تیسرے باب کا تعلق نائٹروجن سے ہے جو پودوں کی خاص خوراک ہے۔ چوتھے باب میں ایسی نباتات کا بیان ہے جو عام پودوں کی اُمت میں تو شامل نہیں ہیں، لیکن دنیائے نباتات میں داخل ہیں جیسے کوکرمتا یا آکاس بیل وغیرہ۔ پانچویں باب میں پودوں اور درختوں کے پھلوں اور بیجوں کا ذکر ہے۔ الغرض یہ کتاب بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ جہاں کہیں انگریزی یا کسی غیر زبان کا لفظ یا نام آیا ہے۔ اُس کا ترجمہ لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ بیان عام فہم اور سلیس ہو پھر بھی کہیں کہیں حیدرآبادی لغات و محاورات داخل ہوگئے ہیں۔ کتاب میں جگہ جگہ تصویریں اور نقشے دیکر سمجھایا گیا ہے جس سے کتاب کی افادی حیثیت کو چار چاند [illegible]۔ ضخامت [illegible]

قیمت [illegible] ملنے کا پتہ: [illegible] کتاب گھر [illegible] خیریت آباد حیدرآباد دکن

[illegible] صحت [illegible]

یعنی [illegible] سہولت [illegible] کا [illegible]

[illegible] ہوتی ہے

[illegible] لوں کی جو ایسے [illegible] معلومات [illegible] رکھتے

[illegible] صحت لازمی شرط ہے [illegible] صحت آپ کے [illegible]

[illegible] کے علم کی ضرورت ہے کیونکہ ہر صحت [illegible]

[illegible] کا نہایت مشہور و معروف رسالہ ہمدرد صحت جو [illegible]

[illegible] قائم رکھنے کی سائنٹفک معلومات [illegible]

[illegible] دلچسپ افسانے سوالات اور جوابات [illegible]

[illegible] سادہ زبان میں نہایت دلچسپ طریقے سے [illegible]

[illegible] طریقہ [illegible] ہیں۔

[illegible]

زمانہ

جلد ۸۳ — اکتوبر ۱۹۴۴ء — نمبر ۴

تعمیر بعد از جنگ

از لالہ رام رتن گپتا صاحب ایم۔ ایل۔ اے (مرکزی)

جو حضرات دنیا کی از سر نو تعمیر کا نقشہ مرتب فرما رہے ہیں، اُن کی خدمت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلہ میں جو مختلف قومی اور بین الاقوامی اسکیمیں مرتب کی جا چکی ہیں وہ میری نظر سے گذری ہیں۔ ان جملہ اسکیموں میں بیک زبان اس امر کی حمایت و وکالت کی گئی ہے کہ جنگ کے بعد دفاعی پروگرام پر بھی توجہ دینا چاہیے۔ واشنگٹن کی نیشنل پلاننگ ایسوسی ایشن نے جو پمفلٹ ۸ شائع کیا ہے، وہ ان اسکیموں سے ایک قدم اور آگے بڑھ گیا ہے، یعنی اس میں اس بات کی حمایت کی گئی ہے کہ "سوسائٹی کو مادی و روحانی طور پر اس قدر مضبوط و طاقتور تعمیر کیا جائے کہ ہمیں ایسے حملے سے جس کا اب مقابلہ کیا جا رہا ہے، پھر کبھی دو چار نہ ہونا پڑے" اس تخیل میں واقعی حقائق کو صحیح طور پر سمجھا گیا ہے۔ اگر عالم بشری ایک مامون و مصئون اور فارغ البال وجود بننا ہے تو اُسے نہ صرف مادی بلکہ روحانی طور پر بھی قانع و مطمئن ہونا چاہیئے۔

دنیا کی باز تعمیر کی ہر اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ عوام فارغ البال اور طاقتور ہو کر قناعت و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ جلب منفعت کا خیال ہی وہ طاقت ہے جو انسان کے لئے قوت محرک ہے۔ لیکن دنیا بھر کے تمام آلام و مصائب اسی [illegible] تخیل کا نتیجہ ہیں۔ ہم دنیا میں آرام و راحت کے ساتھ رہنے کی اسکیمیں سوچتے ہیں۔ اگر جمعیت خاطر [illegible] ہو تو پُر امن زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ لہذا باز تعمیر عالم کی کوئی اسکیم مکمل نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ [illegible] زندگی بسر کرنے میں عوام کی معاون نہ ہو۔

اقتصادی طور پر اطمینان حاصل ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ کوئی شخص بیکار و بے روزگار نہ ہو، اور صنعت مزدوری کرنے والوں کے لئے کھانے پینے کا سامان کافی ہو۔ بالفاظ مختصر ملک میں بیکاری نہ ہو اور مزدوری کی اُجرت کا معیار بلند رہے، گویا مضبوط اقتصادیات عامہ کی اوّلین شرط یہی ہے۔ بیکاری و بے روزگاری عوام میں بے چینی پھیلاتی ہے، اور جرمنی کی پروپیگنڈا وزارت نے عوام کی اس بے چینی کو قوتِ حرکت میں لاکر اپنا مطلب حاصل کیا۔ جرمنوں نے اہل امریکہ کو خطاب کرتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "آپ لوگ کس چیز کے تحفظ کی تیاریاں کر رہے ہیں؟ کیا ایک کروڑ نفوس کی بیکاری و بے روزگاری کا یا ایک تہائی قوم کے بھوکا ننگا رہنے کے حق کا؟"

جرمن پروپیگنڈا وزارت کی یہ ہوشیاری تھی کہ اُس نے اِس دُکھتی رگ کو پکڑا، اور اگر ماہرین اقتصادیات نے مسائل حاضرہ کا کوئی صحیح حل نہ سوچا تو ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

سب سے بڑا سوال

اب سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ اس زمانہ میں جتنی اسکیمیں سوچی گئی ہیں کیا وہ مقتضیاتِ زمانہ کو پوری کرتی ہیں؟ کوئی بھی اسکیم ایسی نظر نہیں آتی جس کی رو سے موجودہ شرح پیداوار میں پچاس فیصدی کا اضافہ ہوتا ہو۔ بلکہ ان میں تو موجودہ پیداوار میں مزید کمی ہونے کا احتمال پایا جاتا ہے۔ لہذا اگر جنگ کے بعد حالات مزید خراب ہو گئے یا اُن میں قرار واقعی تغیر و تبدل نہ ہوا تو فاتحین کو امن و صلح نصیب نہ ہوگی، اور یہ بات جنگ میں شکست یاب ہونے سے زیادہ ہولناک ہے۔

آجکل دفاعی سرگرمیوں کے باعث پیداوار و روزگار بدرجۂ کمال پہونچے ہوئے ہیں۔ مجلس اقوام نے صنعت و حرفت کی پیداوار کا جو انڈکس نمبر شائع کیا ہے اُس سے یہ اضافہ بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۳۹ء کی پیداوار کو اگر سو قرار دیا جائے تو سالہائے مابعد میں حسب ذیل اضافہ شرح پیداوار میں ہوا:

نام ملک	نام حرفت	سالانہ اوسط ۱۹۴۰ء	۱۹۴۱ء	۱۹۴۲ء	۱۹۴۳ء	مہینہ
کناڈا	مصنوعات مختلف	۱۲۰	۱۹۹	۲۴۴	۲۷۴	جولائی
امریکہ	"	۱۲۷	۱۴۹	۱۷۶	۱۹۹	"
میکسیکو	"	۹۰	۹۸	۱۱۷	۱۲۲	فروری
ہندوستان	ٹیکسٹائل	۱۰۲	۱۱۳	۱۱۷	۱۲۲	"
سویڈن	عام	۹۱	۸۴	۸۸	۸۸	مئی

نقشۂ مندرجہ بالا میں تازہ ترین اعداد و شمار جو فراہم ہو سکے ہیں درج کئے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ

اور دوسرے اتحادیوں نے اپنے اعداد و شمار مجلس اقوام کو بہم نہیں پہنچائے

نقشۂ مندرجہ بالا سے ظاہر ہوگا کہ باستثنائے سویڈن جاپان کی پیداوار کم ہوگئی، اور باستثنائے ہندوستان جہاں بہت کم اضافہ ہوا، دوسرے تمام ملکوں میں صنعت و حرفت کو زبردست فروغ ہوا۔ ہندوستان کے متعلق جو اعداد و شمار مجلس اقوام نے دیئے ہیں، وہ قطعی و صحیح نہیں ہیں، اس لئے ہندوستان کو اس بحث سے خارج کئے دیتے ہیں۔

روزگار و ملازمت

کاروبار اور ملازمتوں میں بھی اوسط سے کہیں زیادہ اضافہ ہوا۔ فرض کیجئے کہ سنہ ۱۹۲۹ء کا انڈکس نمبر سو تھا تو جون سنہ ۱۹۴۳ء تک جنوبی افریقہ میں یہ نمبر ۱۰۹، آسٹریلیا میں ۱۳۵، کناڈا میں ۱۶۹، جاپان میں ۱۹۴، سویڈن میں ۱۹۶، اور امریکہ میں ۲۴۵ تک بڑھ گیا۔ (امریکہ سے ہماری مراد ریاستہائے متحدہ امریکہ ہے) بایں ہمہ ان ملکوں میں سے کسی میں یا برطانیہ وغیرہ میں بیکاری کا مسئلہ پوری طرح حل نہ ہو سکا۔ مثلاً جون سنہ ۱۹۴۳ء میں ملازمتوں یا کام کے متلاشیوں کی تعداد کناڈا میں ۱۵ ہزار، انگلستان میں ایک ہزار، سویڈن میں چھ ہزار، آئرلینڈ میں پچاس ہزار، آسٹریلیا میں سات ہزار تھی اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ان کی تعداد مئی سنہ ۱۹۴۳ء میں گیارہ لاکھ اٹھانوے ہزار تھی۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار کو دیکھتے ہوئے نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ یعنی جب دوران جنگ میں بھی بیکاری بے روزگاری کا مسئلہ حل نہ ہو سکا تو زمانۂ امن و صلح میں کیا ہو سکے گا۔ جنگ کے بعد جب فوجوں کو توڑ دیا جائے گا، تو کیا برخاست شدہ سپاہیوں کو سب سے پہلے کام یا ملازمت کی ضرورت نہ ہوگی؟ حکومت آسٹریلیا کو سیاست دانوں نے اسی وجہ سے مشورہ دیا ہے کہ وہ آسٹریلیا میں اس وقت تک کسی غیر ملکی کو آباد نہ ہونے دے جب تک جنگ سے واپس آنے والا ہر سپاہی کسی ایسے کام یا ملازمت پر مامور نہ ہو جائے جس کا معاوضہ کم سے کم دس پونڈ فی ہفتہ ہو۔ بات واقعی سوچ سمجھکر کہی گئی ہے۔

بہرحال جو حضرات دنیا کی باز تعمیر کی اسکیمیں تیار کر رہے ہیں، ان سے میری گذارش ہے کہ وہ سب سے پہلے انسداد بیکاری کے تکلیف دہ مسئلہ کو حل کریں، انھیں یہ امر فراموش نہ کر دینا چاہیئے کہ جب تک سماج کا نظام اس طرح مرتب نہ ہوگا کہ عوام کو کام اور کھانا اطمینان کے ساتھ میسر آ سکے، اس وقت تک امن و صلح خواب بے تعبیر رہے گا، اور لڑائیاں برابر ہوتی رہیں گی۔ پس جس بات کی ضرورت ہے، وہ محض پلاننگ نہیں ہے بلکہ ایک اعلیٰ تخیل اور معیاری زاویۂ نگاہ کی ضرورت ہے جو سوسائٹی و سماجی نظام اور سوشل جماعت بندی کا از سر نو تعمیر کرے۔

تصحیح ۔ زمانہ جون سنہ ۱۹۴۳ء میں جالب کے سو شعر کی کتاب پر ریویو شائع ہوا تھا جس میں غلطی سے جالب صاحب کو [illegible] لکھ دیا گیا ہے۔ جالب صاحب مراد آبادی ہیں۔ اس غلطی کا ہمیں افسوس ہے۔ ناظرین زمانہ تصحیح فرمالیں۔
(ا۔د)

نرگسِ میخانہ فروز

از حضرت روش صدیقی

جاگ! اے نرگسِ میخانہ فروز

درِ دولت پہ گل افشاں ہے نسیمِ سحری
ہیں نقیبانِ ادب، منتظرِ جلوہ گری
کوکبِ صبح ہے، بیتاب پریشاں نظری
جاگ! اے نرگسِ میخانہ فروز

بوسۂ پا کے لئے جاگ اُٹھی ہے شبنم
نکہتِ گل اسی حسرت میں رواں ہے پیہم
سب ہیں مشتاق، کہ آنکھوں سے ملیں خاکِ قدم
جاگ! اے نرگسِ میخانہ فروز

شفقِ سُرخ ہی کچھ منتظرِ دید نہیں!
چشمِ وارفتۂ دیدار ہے، خورشید نہیں!
آنکھ، کس کی سوئے کاشانۂ اُمید نہیں!
جاگ! اے نرگسِ میخانہ فروز

کوئی آوارہ ہے تیرے لئے تبخانوں میں

کوئی سرگشتہ و حیراں ہے خیابانوں میں
ڈھونڈتا پھرتا ہے کوئی تجھے ویرانوں میں
جاگ! اے نرگسِ میخانہ فروز

کیوں دلِ شیخ حرم منزلِ بیتابی ہے؟
چشمِ صوفی، اثرِ گریہ سے عنابی ہے؟
آنکھ زاہد کی بھی گہوارۂ بےخوابی ہے؟
جاگ! اے نرگسِ میخانہ فروز

خانقاہوں سے ہے اِک تشنگیِ عام قریب!
ساحلِ بحر سے جیسے، شفقِ شام قریب!
لبِ واعظ سے ہے اِک حسرتِ بے نام قریب!
جاگ! اے نرگسِ میخانہ فروز

دیر سے مدرسۂ فکر و نظر برہم ہے
فلسفہ یوں تو ہے خاموش مگر برہم ہے
جام و مینا میں ادھر آتشِ تر برہم ہے
جاگ! اے نرگسِ میخانہ فروز

شکن آلود سی ہے، دانشِ حاضر کی جبیں
کہیں زنجیرِ گماں، توڑ نہ دے ضربِ یقیں
منتظر ہیں ترے رندانِ خرابات نشیں

جاگ! اے نرگسِ میخانہ فروز

اور وہ جنتِ امکاں، وہ ترا میخانہ
ہے جہاں اور ہی تقدیرِ مے و پیمانہ
ہمہ تن چشم ہے تیرے لئے بیتابانہ
جاگ! اے نرگسِ میخانہ فروز

دیکھا ہے

(از جناب محمد یار خاں اختر ایم۔ اے۔ جوناگڈھ)

حسرتِ دل کا داغ دیکھا ہے
ٹمٹماتا چراغ دیکھا ہے؟
اُف شگفتہ شباب کا منظر
موسمِ گل میں باغ دیکھا ہے؟
چشمِ میگوں کی بادہ ریز نظر
کیا چھلکتا ایاغ دیکھا ہے؟
آرزومند دل کی ویرانی
کوئی اُجڑا سا باغ دیکھا ہے؟
حُسن میں امتزاجِ ظلم و کرم
گلِ لالہ میں داغ دیکھا ہے؟
تنگیٔ روزگار کا شکوہ
کیا کسی نے فراغ دیکھا ہے؟
گلِ رنگیں یہ پرتوِ خورشید
حُسن کو بد دماغ دیکھا ہے؟
ظلمتِ یاس میں شعاعِ اُمید
گوہرِ شب چراغ دیکھا ہے؟
سادگی میں اختر کو رنگینی
منظرِ باغ و راغ دیکھا ہے؟

نظیرؔ کی بے اعتدالیاں

(از۔ ع۔ ایم۔ اے)

نظیرؔ کی زندگی میں اُن کی شاعری کو وہ فروغ حاصل نہیں ہو سکا جس کا متمنی ہر شاعر رہتا ہے۔ ممکن ہے آگرہ کے گلی کوچوں میں اُن کے اشعار پڑھے جاتے ہوں مگر یہ واقعہ ہے کہ اُس زمانہ کے خواص نے اُن کے کلام کو کبھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ آج جب کہ نظیرؔ کو آغوشِ لحد میں سوئے ہوئے ایک صدی سے زائد مدت گزر چکی ہے بعض لوگ تلافیٔ مافات کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کی کوششوں کا مقصد یہ ہے کہ خواص کی نظر میں بھی نظیرؔ کو قعرِ گمنامی سے نکال کر شرف و قبولیت کا تاج عطا کیا جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ لوگ اُن اسباب پر غور نہیں کرتے جن کی بدولت نظیرؔ آج تک خواص کے نزدیک قابلِ التفات نہ سمجھے گئے، ورنہ اُن کو معلوم ہو جاتا کہ زمانہ نے اُن کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی، بلکہ "حق بحقدار رسید" کے اصول پر وقت نے اُن کو وہی دیا جس کے وہ حقیقتاً مستحق تھے۔

میاں نظیرؔ نے کافی طویل عمر پائی، اُن کا عہدِ حیات میرؔ و سوداؔ سے لیکر شاہ نصیرؔ تک رہا لیکن اُن کی جوانی کا وہی زمانہ ہے جب انشاؔ و مصحفیؔ میدانِ شاعری میں دادِ سخنوری دے رہے تھے۔ اس لئے ان کو میرؔ کا ہم عصر سمجھنا حقیقتاً بڑی غلطی ہے۔

اُردو شاعری کی تاریخ میں میرؔ و سوداؔ کا زمانہ نہایت اہم ہے۔ اس دور میں یہ الفاظ قائمؔ نہ صرف "ریختہ طور غزل کو پہونچ چکا تھا" بلکہ خود صنفِ غزل بامِ عروج پر تھی۔ عشق و عاشقی کے مختلف مضامین نازک ترین پیرائے میں باندھے جا چکے تھے۔ زبان میں سلاست و روانی پیدا ہو چکی تھی، سوز و گداز اور دل بستگی و خستگی شاعری کی جان بن چکی تھی۔ سوداؔ شکوہِ الفاظ سے قصیدہ کی عمارت کو مستحکم اور ارفع و اعلیٰ بنا چکے تھے اور میدانِ شاعری کے نئے سواروں کے لئے چارہ کار محض یہ رہ گیا تھا کہ وہ اسالیبِ بیان میں ندرت پیدا کریں یا تازہ اور نئے خیالات کا اضافہ کریں۔ غرض یہ فضا تھی جب انشاؔ اور اُن کے معاصرین نے شاعری کے گہوارہ میں اپنی آنکھیں کھولیں۔

غزل کا میدان باوجود تنگ و محدود ہونے کے شعراء کی محبوب جولانگاہ تھا۔ انشاؔ۔ مصحفیؔ اور جراتؔ مانے ہوئے تھے۔ لیکن انشاؔ و مصحفیؔ کی معاصرانہ چشمک نے مضامین میں جدت اور تنوع پیدا کرنے کے

اُن کی طبیعت ابتذال ور کاکت کی طرف مائل کردی۔ پھر اس زمانہ کی عیش پرستی اور خراب سوسائٹی نے شعرا کو اپنے سانچہ میں ڈھال لیا اور رنگین کی بدولت ہوسناکی کے اظہار کے لئے ایک نیا آلہ یعنی "ریختی" جیسی اختراع کا سہرا بھی اپنے سر لیا۔ مدعا یہ کہ اس عہد میں اظہار خیال کے لئے نئے سانچے ضرور تیار کئے گئے۔ مگر شاعری میں کوئی خاص ترقی ظہور پذیر نہیں ہوئی۔ انشا اور جرأت دونوں ظریف طبع تھے اس لئے اُن کی بعض غزلیں صرف ہزل کا درجہ رکھتی ہیں مصحفی متین تھے اور اُن کی طبیعت غزل سے مناسبت رکھتی تھی۔ لیکن انشا کی مسخرگی نے لبسا اوقات اُن کو بھی رکاکت وسخافت کی دلدل میں دھنس جانے کے لئے مجبور کردیا۔ اس سبب سے وہ بھی کھل کر اپنی طبیعت کا جوہر نہ دکھا سکے لیکن انشا کی دشنام نوازی سے جب کبھی انھیں فرصت ملی، میر و سودا کو مطمح نظر مان کر انھوں نے غزل کی قدیم روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش کی۔

نظیر انشا و مصحفی کے معرکوں سے بے خبر تھے، اس لئے انھوں نے اپنے فطری رجحان کو فنِ شعر میں رہبر بنایا۔ وہ طبیعت کے اعتبار سے نہایت مرنجانُ مرنج، حرص وطمع سے بے نیاز اور اپنی کھال میں مست رہنے والے انسان تھے۔ معلمی پر گزر اوقات تھی۔ سولہ سترہ روپیہ ماہوار پر ملازم تھے اور اسی پر قانع رہ کر انھوں نے اپنی تمام عمر گزار دی۔ ہر طبقہ کے لوگوں سے میل جول رکھتے تھے، اس میں اشرف وارذل، حقیر وکبیر ادنیٰ واعلیٰ کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ ہندو مسلمان سب سے ربط وضبط تھا، ہر قسم کے میلوں ٹھیلوں میں شرکت کرتے تھے، کوئی سوانگ ہوتا اُس میں نظیر موجود رہتے، کوئی کشتی کا اکھاڑہ یا تیراکی کا میلہ ہوتا، وہاں اُن کی حاضری لازمی تھی۔ غرض نہایت رندمشرب اور لااُبالی مزاج کے آدمی تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسا انسان جو غم و رنج کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دے خستگی ودل برشتگی کی کیفیت کہاں سے پیدا کرسکتا ہے۔ اور چونکہ یہ کیفیت پیدا نہیں کرسکتا غزل بھی اُس کے اُفتادِ مزاج کے مطابق نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ نظیر اپنے زمانہ کے رواج کے مطابق غزل کہنے کے باوجود اس صنف میں کوئی ترقی نہ کرسکے۔ اور اسی سبب سے نظیر کے معاصرین انھیں خاطر میں نہیں لائے۔ ادھر غزل میں انھیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی، اُدھر اس صنف میں جو مقبولیت حاصل تھی وہ اس امر سے ظاہر ہے کہ شاعر اس وقت تک شاعر نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک غزل گوئی میں اس کو کمال حاصل نہ ہوجاتا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ اس قبولیت سے محروم رہے جس کے مستحق اُن کے معاصر شعرا قرار دیئے گئے۔ لیکن اس کے باوجود ایک صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"جب اس کا جی چاہتا ہے اُن کی (معاصرین کی) معرکۃ الآرا غزلوں کی زمین میں فکرِ فلک پیما کے کرشمے دکھا جاتا ہے۔۔۔ یہ وہ شیوہ بیان ہے جس کا کلام صفائی وسادگی میں میر و انیس کے ہم پایہ ہے

واقعہ یہ ہے کہ اُن کی تمام غزلیں پھیکی اور بے کیف سی ہیں، کہیں اتفاقیہ طور پر ایک آدھ شعر کام کا نکل آتا ہے ورنہ زیادہ تر ایسی غزلیں ہیں جیسے وہ غزل جس کا ایک مصرع ہے:-

"ہے ہمارے پاس بھی اب تک نشانی آپ کی"

اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ بعض غزلوں کی تازگی و نزاکت کو شاعری کا صحیح معیار مقرر کر دیا جائے تو نظیر کا نام شاعروں کی فہرست سے بے تکلف خارج کر دینا ہوگا۔ اُن کا مقابلہ میر سے ہرگز نہیں کیا جا سکتا اور جو لوگ اُن کو میر کا ہم پلہ سمجھتے ہیں وہ یقیناً میر کا رتبہ نہیں پہچانتے۔

قطع نظر اس سے کہ نظیر طبعاً غزل کے برخلاف نظم کے شاعر تھے، اُنھوں نے نظموں کے رواج کی ابتدا اُس وقت کی جب غزلیں مقبول عام تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آواز بے وقت کی راگنی تصور کی گئی۔ ہر چند کہ نظموں کے لکھنے کا رواج اگر اُسی وقت ہو گیا ہوتا تو ہماری شاعری اُن منازل کو مدتوں پہلے طے کر چکی ہوتی جس سے وہ آج گذر رہی ہے۔ لیکن نظیر کی اس ادبی بغاوت سے جو یقیناً قبل از وقت تھی اُن کی شہرت و مقبولیت کو بڑا صدمہ پہونچا۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اُن کی یہ بغاوت مناسب تھی یا نہیں لیکن یہ کوشش اُن کی نامقبولیت کی بڑی حد تک ذمہ دار ہے زمانہ بہت بڑا مصلح ہے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ نظیر اپنے وقت سے قبل پیدا ہوا تھا، اُن کو مرزا غالب کی مثال پیش نظر رکھنا چاہیئے، وہ بھی اپنے وقت سے پہلے پیدا ہو گئے تھے۔ اسی سبب سے اپنے بلند اور نادر خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کے لئے اُنھیں ایک ایسی زبان تشکیل کرنی پڑی جس کی متحمل اُس زمانہ کی زبان ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اُن کے معاصرین نے اس پر کافی واویلا مچایا بہت سوں نے اُنھیں مہمل گو بھی کہا لیکن غالب ہوا کا رُخ دیکھ چکے تھے، اُنھوں نے محسوس کیا کہ عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے اُنھیں اپنی زبان کو ذرا آسان بنانا ہوگا۔ اور اگرچہ وہ خواص کے شاعر تھے اور یہی اُن کا مطمح نظر تھا اُنھوں نے عوام کے مطالبات کو یکسر نظرانداز نہیں کیا اور کچھ غزلیں صاف اور سادہ زبان میں بھی کہیں، اور اس طرح کم سواد لوگوں میں بھی مقبول ہوئے لیکن ارباب نظر سے یہ نکتہ مخفی نہیں ہے کہ اُن کی سادہ غزلیں خیالات کی اُس ندرت، نزاکت و لطافت اور اسلوب بیان کی اُس طرفگی سے جو اُن کی مشکل اور پُرانی غزلوں میں ملتی ہے۔ اگر یکسر عاری نہیں تو بڑی حد تک محروم ضرور ہیں۔ وجہ ظاہر ہے، اُن کے فلسفیانہ خیالات جن کا دفینہ اُن کا تیز اور روشن دماغ تھا اُس صاف اور سادہ زبان سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے تھے جو عوام کو پسند تھی، اور جس کا بہترین اظہار شاہ ظفر اور ذوق کی شاعری میں ہوتا ہے۔ تاہم مدعا یہ ہے کہ غالب نے وقت کا دھارا اپنے خلاف دیکھتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش نہ کی۔ نظیر نے زمانہ کے مطالبات کی پروا نہ کی، چنانچہ وقت نے بھی اُن کا ساتھ دیا اور خس و خاشاک کی مانند اُن کے گھنے اور تناور درخت کو بیخ و بن سے اُکھاڑ کر

مقدم تسلیم کر دیا۔

شاعری آرٹ ہے آتا ہی اہم اور نازک جتنا نقاشی، مصوری یا بت تراشی۔ شاعری کی ظرف میں نہ صرف حقائق و معارف اور اسرار و حکم کی دنیا شامل ہے بلکہ نفسِ انسانی کی وہ گہرائیاں بھی جن کی عکاسی سے مصور کا موقلم عاری ہے۔ اس کی سرحد میں داخل ہیں۔ شاعر اپنے تخیل کی مدد سے ایک نشۂ بے کیف کو پیکرِ الفاظ دیکر پیش کرتا ہے۔ اور اپنے نغمۂ جاں نواز سے روح میں سرور و انبساط کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اس اعتبار سے شاعر کا کام بت تراش یا مصور دونوں سے زیادہ مشکل ہے۔ مصور کے سامنے ایک نمونہ موجود رہتا ہے۔ شاعر کو صرف اپنے تخیل پر بھروسا کرنا پڑتا ہے لیکن جس طرح ہر فن کے کچھ نہ کچھ اصول موضوعہ ہوتے ہیں فنِ شعر کے بھی چند اصول ہیں۔ مصور یا بت تراش کی ان اصولوں سے روگردانی جیسے اس کی تصویر کو بھونڈی اور بدنما بنا دیتی ہے۔ شاعری کے اصولوں کا انحراف بھی شاعر کے کلام کو پست اور مکروہ صورت بنا دیتا ہے۔ افسوس ہے کہ نظیر کا کلام اگر اس کسوٹی پر کسا جائے تو وہ مطلقاً شاعر کہلانے کے مستحق نہیں رہتے۔ اور ان کی شاعری کم و بیش اس مصرع کی مصداق بن کر رہ جاتی ہے کہ ع

نہ انشا معنیِ مضموں، نہ املا صورتِ موزوں

کیونکہ بے معنی الفاظ کا استعمال انھیں مرغوب تھا، روزمرہ اور محاورہ کی غلطیوں کی طرف ان کی توجہ تھی الفاظ کے صحیح تلفظ کی طرف سے وہ بے پرواہ تھے۔ بھونڈے اور موسیقیت سے معرا الفاظ لکھنے پر گویا ان کی روح وجد کرتی تھی۔ رکاکتِ خیال ان کا وصفِ خاص تھا، نہ رکات کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ دیہاتی زبان، نامانوس اور غیر متین الفاظ کے استعمال کو اپنے لئے سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے۔ فنِ شعر کے نکات سے بے خبر تھے۔ ان بے اعتدالیوں کا جو انجام ہونا چاہیئے تھا وہی ہوا۔ آئیے اب ذرا کلیاتِ نظیر کی ورق گردانی بھی کر لیجئے، اور بہ نفسِ نفیس دیکھ لیجئے کہ نظیر کیسے بے راہ رو شاعر تھے اور ان کا کلام رطب و یابس اور اغلاط سے کس قدر پُر ہے۔

(۱) بے معنی الفاظ کا استعمال:-

کتنے دلوں تو روز ہی ہم رازیاں ہوئیں الفت کی تازہ تازہ تر اندازیاں ہوئیں

رِندِ قلیس نرم ہیں دیکھو اس کے سرِ انگشتوں سے رشتۂ ربط نے لی راہ کفِ دستوں سے

کفِ دست آپ نے پڑھا ہوگا لیکن آج نظیر کی زبان سے کفِ دستوں کی نئی ترکیب بھی سن لیجئے اور اپنی فارسی دانی میں اضافہ فرما لیجئے۔

(۲) روزمرہ اور محاورہ کی غلطیاں

مکتب کے بیچ گل کی طرح سے کھلے رہے تازہ و نیاز کیا ہی گھُلے اور ملے رہے

ہمارے روزمرہ میں گھگھنا چلنا استعمال ہوتا ہے، نظیر نے "اور" کا لفظ بیچ میں داخل کر کے اجتہاد فرمایا ہے۔

کوئی دم میں دیکھیں گے پھر وصل کی بہار   پھرتا کبھی یہ کہتا وہ گھبرا کے بے قرار

قطع نظر اس سے کہ مصرع اوّل میں کوئی کا لفظ ایسے پڑھا جائیگا جیسے "کئی" "اور" "دیکھیں گے" اس طرح گویا "دیکھ کے" لکھا گیا ہے، بے قرار کہنا کیا عمدہ روزمرہ ہے۔

بتوں کے زرد پیراہن میں عطر چمپا جب مہکا   ہوا نقشہ عیاں ہولی کی کیا کیا رسم اور رہ کا

اسے رسم اور راہ کے رسم اور رہ کا استعمال روا رکھا گیا ہے، کیونکہ بغیر "اور" کے مصرع پورا نہیں ہوتا۔

ہنس ہنس کے لگا جس دم وہ نازو ادا کرنے   جی اُس کی لگاوٹ سے ہر لحظہ لگا ڈرنے

اُردو کا محاورہ ناز و ادا دکھانا تھا، نظیر نے اس کو ناز و ادا کرنا کر دیا۔

دف بجتے ہیں، سب ہنستے ہیں اور دھوم ہے بالکل   ہولی کی خوشی میں تو نہ کر ہم سے تغافل

سمجھ میں نہیں آتا کہ بالکل کا لفظ یہاں مصرع کو پورا کرنے، اور قافیہ بہم پہونچانے کے علاوہ اور کیا خدمت انجام دے رہا ہے۔

ہر آن جھمکتا ہے جب عیش کا چرچا   ہولی کو نظیر اب تو کھڑا دیکھتا ہے کیا

عیش کا چرچا جھمکنا ایک ایسا اُردو محاورہ ہے جو نظیر سے قبل اور نظیر کے بعد اب تک نہ کہیں دیکھا یا نہ سُنا گیا۔ اندھیری رات کے بیان میں نظیر کا ارشاد ہے:۔

لاتی ہے جب اپنا یہ شروعات اندھیری   کرتی ہے اُجالے کے تئیں مات اندھیری

قطع نظر اس سے کہ شروعات لانا کوئی اُردو محاورہ نہیں، بجائے شروع، شروعات کے لفظ کا استعمال سوائے قافیہ پیمائی کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اسی نظم میں آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

گر اس میں کہیں شور و یا غل ہوا اک بار   ادھر سے اُدھر ہو گئے دو چار قدم مار

بجائے یکبار، اکبار کے استعمال کو مناسب اور بامعنی سمجھا گیا، اور مصرع کو پورا کرنے کی غرض سے شور و غل کو واؤ عطف سے ملا دیا گیا جس کا یہ محل نہ تھا نہ ضرورت۔ پھر کہتے ہیں:۔

جب یار چلا اوڑھ کے کالا سا دوشالا   کمبل کو اُدھر ہم نے بھی کاندھے پہ سنبھالا
جا مل گئے اور دل کا بھی ارمان نکالا   منہ اپنے رقیبوں کا کیا خوب سا کالا

علاوہ ازیں کہ پہلے اور چوتھے مصرع میں سا کا لفظ محض زائد ہے کیونکہ سا کے بغیر بھی مفہوم پورا ہو جاتا ہے، مل گئے بجائے جا ملے استعمال ہوا ہے، شاید اس لئے کہ بغیر جا مل گئے مصرع کا وزن پورا نہیں ہوتا۔ یہ حال ہے نظیر کا جس کی قادرالکلامی کے ترانے گائے جاتے ہیں۔

باتیں کوئی بیٹھا ہوا کرتا ہے کتابی
بیتا ہے کوئی کیفتہ کوئی سے کی گلابی

اِس شعر میں کتابی غالباً عالم کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جو ہمارے روزمرہ کے خلاف ہے۔ اسی طرح کیفتہ پینا معلوم نہیں اُردو میں کونسا محاورہ ہے۔

شوخ دل میں ناز سے کھولے تھا زلف کا لپا
خوش ہو لپیٹ لپٹ کے دیتا تھا میٹھی گالیاں

گالی کی جگہ گالیاں استعمال کر دیا ہے۔

عیش و طرب کی لہر میں رات جب آدھی ڈھل گئی
اس میں کہیں سے ہے غضب نکلی جو مکر چاندنی

مصرعۂ ثانی میں ہے بجائے ہوا استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ سیاق و سباق سے ہوا کا آنا لازمی ہے۔

کیا ہی نظیر رات کو عیش کے تھے مقابلے
مے کے نشے اُبل چلے، دل کے فراخ حوصلے

عیش کا مقابلہ ہونا نیا محاورہ ہے، جس سے اُردو زبان اب تک ناواقف ہے۔

چھپتے پھرے ہیں لوگ بھی، جاتے ہیں وہ جدھر
ٹھٹھا ہنسی دمبدم تماشے جدھر تدھر

بجائے ہنسی ٹھٹھا کے ٹھٹھا ہنسی کا استعمال صحیح سمجھا گیا۔

ایک مصرع ہے:- "راہِ مولیٰ میں خوشی ہو کے دیا اپنا سر"
خوشی ہو کے غلط ہے۔ خوش ہو کے ہونا چاہیئے تھا۔

یہ روپ جہاں میں کوئی واں دل نہیں میلا
اُجلے ہیں بچھے فرش، نہیں کچھ بھی کچیلا

اب تک "کچیلا" کا لفظ اکیلا استعمال نہ ہوتا تھا، بلکہ میلا کچیلا بولتے تھے، لیکن نظیر نے "کچیلا" کو منفرد استعمال کیا ہے۔ جو صریحاً غلط ہے۔

(۳) تذکیر و تانیث کی طرف سے بے پروائی:-

کچھ تو جاتا دل سے خارِ بے قراری کا خلش
کاش وہ نوکِ مژہ دیتی قرار اِک پل ہمیں

خلش کا لفظ مؤنث ہے جس کو مذکر باندھ دیا گیا ہے۔ اسی طرح خار کہ در اصل مذکر ہے اس کو مؤنث باندھا ہے۔

گلگشتِ چمن کرتے ہو جب ہم رو یار اں
واں بھی غرض آتی ہے تمھیں کار ہمیں سے

(۴) بعض حروف تقطیع میں وزن سے گر جاتے ہیں، لیکن نظیر کو اس کی پروا نہیں۔ یہ سقم نظیر کے کلام کی خصوصیت ہے۔ میں صرف چند مثالوں پر اکتفا کروں گا

اُس گلبدن کے دل میں پھیا ہجر کا جو خار
مکتب میں جاتی وہ جو کچھ ہوتا تھا اختیار

تقطیع میں ہوتا کی "ہ" وزن سے گرتی ہے۔

دیکھو عقد ثریا میں انگور کی شوخی   کیوں بادہ کشو ہم کو بھی کیا دور کی سوجھی

عقد کی عین تقطیع میں گر جاتی ہے۔ جس کا گرانا اصول شاعری کے اعتبار سے جائز نہیں۔

کام عیش کا لاتی ہے لگا سات اندھیری   کام آتی ہے عاشق کے بہت رات اندھیری

عیش کی عین بھی مثل سابق گرتی ہے۔

یکتا شجاع، بہادر، صفدر رہوا تو پھر کیا

شجاع کی عین وزن سے ساقط ہو جاتی ہے۔

ایسی نہ شب برات نہ بقرعید کی خوشی   جیسے ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

اس شعر میں بھی حسب معمول بقرعید کی عین وزن سے گر گئی۔

اسی طرح حسب ذیل اشعار دیکھیے کہ ان کو موزوں پڑھنا بھی مشکل ہے۔

اور باغباں سے بلبل کھڑی یہ کہتی ہے   نہ چھیڑ مجھ کو تو لے بد شعار ہولی میں
پھر گاڈروں کے تئیں رت جگا مناتی ہے   چھچھوندر اور بھی گھی کے دیئے جلاتی ہے
پھر اپنے حال سے جوڑے کو چھیڑ کر اس رنگ   کہا کہ دونوں رہو شامل حال ہولی میں   وغیرہ وغیرہ

(۶) بعض ہندی الفاظ کو مثل فارسی کے باندھ دیا گیا ہے جو غلط ہے۔

پیتے تھے مئے پھل پھل لیتے تھے بوسے پل پہ پل   اس میں نظیر یک بیک آ کے بہ پچ گئے خلل

پل ہندی لفظ ہے جس کے ساتھ بہ کا فارسی لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا

(۷) تعقید کا عیب نظیر کے کلام میں بکثرت ملتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

کہتے ہیں یاں کہ مجھ سا کوئی مہ جبیں نہیں   پیارے جو مجھ سے پوچھو تو یاں کیا کہیں نہیں

پہلے مصرع میں یاں کا لفظ مہ جبین سے اتنی دور جا پڑا ہے کہ مفہوم سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ اسی طرح اس شعر میں

گر دل میں کسی شوخ پری کی ہوئی ٹک چاہ   اور ناز نیں کرنے لگی اس وقت وہ اکراہ

نازنیں سے وہ کا لفظ بہت دور جا پڑا ہے۔ یا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

کیونکر نکلیں نہ دل میں مرے حسرتوں کے تیر   دن عید کے بھی مجھ سے ہوا وہ کنارہ گیر

بجائے "عید کے دن" کے "دن عید کے" کا استعمال نہایت مکروہ ہے۔ اور

"نکلے تھی آغا آغا کی منہ اُس کے سے سدا"

میں "اس کے منہ سے" کی بجائے "منہ اُس کے سے" بہت برا معلوم ہوتا ہے۔

(۸) الفاظ کے صحیح تلفظ کی طرف سے بے پروائی۔

لیلیٰ کی شکل پھرتی تھی آنکھوں میں ہر قسم   واں ایک پل قرار نہ یاں چین ایک دم

ہر قسم، یہ معنی طرح استعمال کرنا مقصود تھا، مگر نظیر قسم کو بروزن قسم باندھتے ہیں۔

ہولی کے بیان میں ارشاد ہوتا ہے:۔

کہیں ہوتی ہے خینگا مستی، کہیں ٹھہری کھینچا تانی ہے   کہیں لٹیاں جھکتی زنگ بھری، کہیں جوتا کیچڑ پانی ہے

ہر جا ہر طرف خوش حالی کا، یہ برس بڑھایا ہولی نے

ملاحظ فرمائیے کہیں کو کئیں کے انداز پر باندھا ہے اور برس (یعنی سال) کو درس کا ہم وزن سمجھ کر لکھا ہے۔

برسات کی بہار میں لکھتے ہیں:۔

ہم سے غریب غربا کیچڑ میں گر پڑے ہیں   ہاتھوں میں جوتیاں ہیں اور پائنچے چڑھے ہیں

لفظ "غُربا" تھا نظیر کے کلک جواہر رقم نے اس کو "غرُبا" بنا دیا۔

"کل عالم تیری یاد کرے" میں فرماتے ہیں:۔

اس ارض و سما کے عرصے میں یہ جتنا کچھ کھچا ہے   یہ ٹھاٹھ تجھی نے باندھا ہے، یہ رنگ تجھی نے رچا ہے

صحیح لفظ "رَچا" تھا نظیر نے خواہ مخواہ اس کو مشدد بنا کر کھچا کا ہم قافیہ کر لیا۔

ایک نظم میں کہتے ہیں:۔

نہ خواہش پاس بٹھانے کی، نہ حاجت لطف کھلانے کی   نہ غرض مسی کے ملنے کی، نہ حاجت پان چبانے کی

صحیح لفظ غرض تھا مگر ہمارے شاعر نے اپنی بے پروائی سے اس کو ارض (یعنی زمین) کا ہم قافیہ بنا دیا۔

کم خوراک اور ناتوانی کے گلے جب میں کئے   تب تو وہ منھ دیکھ میرا ہنس کے یوں کہنے لگے

خوراک کو بالکل خُراک بنا دیا گیا ہے جو غلط ہے۔

"آٹے کے بورے سلا، کھتے کھدا، کنویں بھی بھر"

لفظ کنواں تھا، نظیر اس کو کوواں بناتے ہیں۔

ماہی علم، مراتب، پُر زر ہوا تو پھر کیا   نوبت نشان نقارہ در پہ ہوا تو پھر کیا

صحیح لفظ "نقارہ" تھا لیکن نظیر نے قاف کی تشدید اڑا دی، اسی طرح ایک مصرع ہے ع

"کافر نے کلیجہ میں گویا تیر سا مارا"

گویا کو شاعر نے بالکل گیا بنا دیا۔

اس قسم کی غلطیاں نظیر کے کلام میں عامۃ الورود ہیں، بخوف طوالت صرف چند مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

[illegible] حشو و زوائد سے نظیر کا کلام پُر ہے، چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:۔

لاتا تھا باپ کھینچ کے اُس کو گھڑی گھڑی　　　　بیٹی اُس کے دل کو گھر میں آتا تھا اک ذری

مصرعہ ثانی میں "ذری" کا لفظ بجائے "ذرا" لکھا ہے۔ دوسرا سقم یہ ہے کہ "اِک" کا لفظ محض برائے بیت ہے مفہوم اُس کے بغیر بھی پورا ہو جاتا ہے۔

بعض ایسے کلمات استعجاب بھی نظیر کے یہاں پائے جاتے ہیں جن کو اگرچہ ہم گفتگو میں بولتے ہیں لیکن تحریر میں خصوصاً شاعری میں کبھی استعمال نہیں کرتے۔ ایسے الفاظ سوائے قافیہ بہم پہونچانے کے اور کوئی خدمت انجام نہیں دیتے۔ اور دراصل اُن کا شمار حشو و زوائد میں ہے۔ نظیر لکھتے ہیں ؎

اس شوخ ستمگر نے غمزہ سے جو نہیں چاہا　　　　کی یار دل پہ کچھ پھرتی، کیا کہیئے اہاہاہا

(یا)

یہ گھات یہ چنچل پن، کب یاد پری کو ہو　　　　اس ڈھب کے تئیں یارو دیکھو تو اہوہوہو

دونوں اشعار میں اہاہاہا اور اہوہوہو بیکار اور زائد ہیں۔

یہ سخن تو سب نشہ بازوں میں اب ہوگا مچا　　　　یعنی سبزی کا نشہ اب سونشوں کا ہے پچا

ہے گا میں گا بالکل زائد ہے۔ یہاں ضرورت دراصل صرف ہے کی ہے۔

آتی ہوں تیری خاطر آرے میں ٹھیکتی ہوں　　　　کچھ تو ترس تو مجھ پر کھارے میں بھیگتی ہوں

قطع نظر اس سے کہ پہلے مصرع میں بجائے آرے شاعر نے آرے استعمال کیا ہے، دوسرے مصرع میں ضرورت اس بات کی تھی کہ شاعر بجائے کھارے کے صرف کھا استعمال کرتا اور اس اعتبار سے رے کا لفظ بے محل اور زائد ہے۔ اسی طرح ذیل کے شعر میں ؎

کہتا ہے کوئی گر کر یہ اے خدائے لیجو　　　　کوئی ڈگمگا کے ہر دم کہتا ہے وائے لیجو

پہلے مصرع میں خدائے کی جگہ صرف خدا ہونا چاہیئے۔ خدائے بالکل مہمل اور بے معنی ہے لیکن نظیر کو وائے کا قافیہ بہم پہونچانا تھا۔ چنانچہ لفظ خدا کے بعد ئے بڑھا دیا گیا۔

ایک مصرع ہے۔　　"اس آندھی میں اہاہاہا عجب ہم نے مزے لوٹے"

یہاں اہاہاہا بالکل زائد ہے۔ اسی طرح ذیل کے مصرع میں:-

"بیٹھ گھر میں چین سے دن رات اور شام و سحر"

دن رات لکھ دینے کے بعد "شام و سحر" لکھنا بالکل غیر ضروری اور زائد ہے۔

تین دن رات کا پیاسا وہ بہادر یکتا　　　　لشکرِ شام کو للکار کے تنہا وہ لڑا

ضمیر "وہ" جب پہلے مصرع میں استعمال کیا جا چکا تھا تو دوسرے مصرع میں "وہ" کی تکرار بالکل زائد ہے۔

ہر آن اپنے سر کو پٹک کر کے چشم نم　　　پھر جوں کو اس طرح وہ اُٹھاتی تھی دمبدم

پٹک کر لکھ دینے کے بعد "کے" کا اضافہ بیکار ہے۔

(۱۰) بعض الفاظ کا استعمال نظیر غلط معنوں میں کرتے ہیں، مثلاً

کچھ کہنے پاتے کیونکہ عذر ہوش کھوتا تھا　　　باتوں کے بدلے واں اُسے رو دینا ہوتا تھا

"عذر" کے معنی پرہیز ہیں۔ نظیر اپنی کم علمی کے باعث اس کو خوف کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

اس کی مثل میں کرتا ہوں یار و جواب بیاں　　　پنہاں نہیں غرض ہے یہ مشہور درجہاں

یہاں "مثل" بمعنی مثال استعمال کیا گیا ہے جو غلط ہے:۔

میں ہنس کے اس لئے منہ چومتا ہوں غنچہ کا　　　کہ کچھ نشانی ہے اس میں ترے دہن کی سی

نظیر نشانی کے معنی غلطی سے شباہت سمجھے ہوئے ہیں، حالانکہ نشانی کے معنی یادگار ہیں جیسا غالب نے ایک شعر میں لکھا ہے۔

کافی ہے نشانی تری، چھلے کا نہ دینا　　　خالی مجھے دکھلا کے بوقت سفر انگشت

(۱۱) بعض تنگ نظر اور عصبیت پرست دماغ یہ سمجھتے ہیں کہ نظیر کا شمار شعراء کے زمرہ میں اس لئے نہیں کیا گیا کہ وہ ہندو تہواروں کا ذکر اور ہندی الفاظ کا استعمال بکثرت کرتے تھے۔ اگر ہندی الفاظ کا استعمال نظیر کو مرغوب تھا تو اُن کی کوشش یہ بھی ہونی چاہیئے تھی کہ وہ ایسے الفاظ صحیح باندھتے خصوصیت سے تلفظ کا بڑا خیال رکھنا چاہیئے تھا لیکن اُن کی یہ بے پروائی صرف فارسی عربی الفاظ ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ وہ ہندی الفاظ کو بھی نہایت غلط باندھتے ہیں۔ اس لئے اگر نظیر کو شعراء میں شمار نہیں کیا گیا تو اس کی ذمہ دار الفاظ کا غلط تلفظ اور اُن کی دوسری بدعنوانیاں ہیں۔ بہر حال آیئے اور چند لمحوں کے لئے ہندی الفاظ کے اس مقتل کا نظارہ بھی دیکھ لیجئے جہاں میاں نظیر اکبرآبادی نہایت بیدردی کے ساتھ اپنی کُند چُھری سے لفظوں کا گلا کاٹ رہے ہیں۔ معلوم نہیں ہندی الفاظ کے اس غلط استعمال پر نظیر کے حامیان تنگ نظر تحسین و آفریں کے نعرے بلند کریں گے یا نہیں

"دنیا بھی کیا تماشا ہے" میں نظیر کا ارشاد ہوتا ہے:۔

اُڑتے ہیں مچھلیاں، مرغی کھڑی نہاتی ہے　　　جنگل کے ریت میں مرغابی غوطے کھاتی ہے

دیکھا آپ نے جنگل کو کہ دراصل بروزن منگل ہے، نظیر نے کس بیدردی سے عسل اور فعل کا ہم وزن بنا دیا ہے۔ آدمی والی نظم میں ایک شعر ہے:۔

حیراں ہوں یارو دیکھو تو یہ کیا سوانگ ہے　　　اور آدمی ہی چور ہے اور آپ ہی تھانگ ہے

ہندی میں سوانگ کا صحیح تلفظ स्वांग ہے لیکن آپ نے اس کو सवांग کر دیا۔

گا بجا پیٹے سے ہوگا ترا شعور ہرا ۔۔۔ اور چرس کے پیٹے سے تجھ کو لگے گا کھرا

صحیح لفظ چرس بہ فتح ر تھا لیکن شاعر نے ر پر جزم دیکر اس لفظ کو درس کا ہم قافیہ بنا دیا۔

پھل پات کہیں، شاخ کہیں، پھول کہیں بیل ۔۔۔ نرگس کہیں، سوسن کہیں بیلا کہیں رابیل

رابیل رائے بیل کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ چنانچہ اُردو کا ایک دوسرا شاعر کہتا ہے:۔

کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا ۔۔۔ گلاب اور چمپا کہیں موتیا

نظیر کا ایک اور شعر ہے:۔

حوریں کہیں، غلماں کہیں، پریاں کہیں جنّات ۔۔۔ اوجڑ کہیں بستی کہیں، جنگل کہیں دیہات

اُجاڑ ہم نے اُردو میں استعمال ہوتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے نظیر اوجڑ لکھتے ہیں

پوجا، کتھا، بکھانی، کیا کیا سُسْبد نکالا ۔۔۔ کچھ بن سکا نہ، آیا جب جان لینے والا

صحیح لفظ "شُبد" تھا اور ب پر جزم تھا، مگر نظیر اس کو آسدْ کا ہم وزن سمجھتے ہیں۔

تھے جب تلک ایامِ جوانی کے ہرے رُوکھ ۔۔۔ محبوب وہ ملتے تھے نہ دیکھیں جنھیں بھوکھ

بھوک کو نظیر رُوکھ کا ہم قافیہ سمجھتے ہیں، حالانکہ در اصل لفظ "بھوک" ہے۔

چاندنی رات کی نظم میں ارشاد ہوتا ہے:۔

چاندنی واہ چاندنی کرتی تھی کیا جھلک جھلک ۔۔۔ چہک رہی تھیں بلبلیں باغ رہا تھا سب مہک

چہک بہ فتح چے اگرچہ مہک کا ہم وزن ہے لیکن نظیر اس کو بھی دہر اور قہر کا ہم وزن سمجھتے ہیں۔

غرض کہاں تک مثالیں دی جائیں، ناظرین خود کلیات نظیر کا مطالعہ فرمائیں۔ بعض کوتاہ بیں یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو شعراء نے جان بوجھ کر ہندی الفاظ کو غلط استعمال کیا ہے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں۔ نظیر تو خیر غلط لکھنے والے تھے ہی۔ باقی اُردو شعراء نے ہندی الفاظ کو اپنی نظموں میں اسی طرح استعمال کیا جس طرح وہ بولے جاتے تھے، اور چاہے ان الفاظ کا تلفظ غلط ہی کیوں نہ ہو، غلط العام فصیح سمجھ کر اُن کا استعمال جوں کا توں جائز رکھا۔ یہاں پر یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ غلط العام سے مراد غلط العوام نہیں ہے بلکہ صرف وہ الفاظ مقصود خاطر ہیں جو جمہور فصحا کی زبان پر ہیں چاہے اصلاً وہ غلط ہوں۔ چنانچہ اسی اصول پر بعض فارسی اور عربی الفاظ کا غلط تلفظ بھی جائز قرار دیا گیا۔ جیسے فند کہ در اصل بہ سکون دال ہے اور بند کا ہم وزن و ہم قافیہ ہے یا انگریزی لفظ لالٹین کہ در اصل لین ٹرن ہے۔ سید انشاء اللہ خاں نے بھی اپنی کتاب دریائے لطافت میں یہی لکھا ہے۔

(۱۴) دیہاتی زبان لکھنے کا نظیر کو بہت شوق ہے۔ اُن کی دیکھا دیکھی اُس عہد کے بعض شعراء نے بھی اُن کی

تقلید کی ہے لیکن یہ فعل مستحسن نہیں ہے۔ ذیل میں صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

جس کوچہ میں جا ہا وہیں ہونے لگی پھیری — بیٹھے کہیں اُٹھے، کہیں جلدی کہیں دیری
پیسہ ہو پاس یارو یا مفلسی سہیں گے — پر سنبروں کے یاں تو دریاؤ ہی بہیں گے

پہلے شعر میں دیری بجائے دیر اور دوسرے شعر میں دریاؤ بجائے دریا کا استعمال ہرگز جائز نہیں۔

(۱۳) بعض ایسے الفاظ کا استعمال بھی جو اگرچہ گفتگو میں بولے جاتے ہیں لیکن شاعری میں استعمال نہیں کئے جاتے نظیر کے یہاں مل جاتا ہے، مثلاً ایک شعر لکھتا ہوں:۔

کوئل کی کوک میں بھی تیرا ہی نام ہے گا — اور مور کی زٹل میں تیرا پیام ہے گا

مور کے نغمہ کو زٹل کہنا نظیر ہی کی ایجاد ہے۔

(۱۴) نظیر کے یہاں بعض ایسے محذوفات بکثرت ملتے ہیں جو نامناسب ہیں، جیسے:۔

دونوں دلوں میں لذتیں، دونوں جنوں میں عیش تھا — مئے کی گلابی ہاتھ میں، آنکھوں میں چھارہا نشا

"آنکھوں میں چھارہا نشہ" کہنا کافی نہیں، بلکہ "آنکھوں میں نشہ چھا رہا تھا" کہنا ضروری ہے، کیونکہ شاعر ایک کیفیت کو بیان کر رہا ہے جو اس کے سامنے تھی۔

(۱۵) ہندی اور فارسی یا دو ہندی الفاظ کا استعمال بہ واو عطف اردو میں ناجائز قرار دیا گیا ہے لیکن افسوس ہے کہ نظیر کے یہاں اس قسم کی مثالیں بہت ہیں۔ چند درج ذیل کی جاتی ہیں:۔

ادھر آن واداکیٹی، کرشموں نے ادھر گھیرا — ادھر پلکوں کی ڈکوں نے چھبویا دل میں نشتر سا
باغ میں شب کو واہ وا، کیا ہی نہروں کے گھور تھے — طوطی و بگلے، مور تھے، فاختوں کے بھی شور تھے
یار رہا را چاند تھا، چاند کے ہم چکور تھے — دونوں چکبی چکور تھے، دونوں پتنگ و دور تھے
کیا ابر و ہوا، جنگل و کوہ، ارض و سماوات — اک بھونک میں اڑ جائیں گے جوں نقش طلسمات
ہاتھی و گھوڑے، بیل رتھ، و اونٹ کی قطار — غل شور بالے بھولے کھلونوں کی ہے پکار
دل لگا الفت میں اور کر لے پریزادوں کی چاہ — چاند سے کھڑوں سے مل، سورج و شسوں سے کر نگاہ

آخری شعر میں سورج و شش کی ترکیب غلط ہے۔

(۱۶) قافیوں کے استعمال میں نظیر اکبر آبادی بے حد بے پروائی سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ اُن کے کلام میں ایسی مثالیں لاتعداد ہیں جہاں زبردستی ایک لفظ کو دوسرے کا ہم قافیہ بنا دیا گیا ہے۔ نہ اُن کے استعمال کے لئے کوئی سند موجود ہے نہ جواز۔ ذیل کے ایک بند کو ملاحظہ فرمائیے:۔

منت سے رُلاتا ہے بھلا کب وہ کسی کو — جو ٹلنے دغا باز جیا ہے، بدخو

ہم نے تو بہت اُس کی سمجھ رکھی ہے خُو بُو   ملنے کا پیام اُس سے کہو جا کے عزیزو
جو اس کے ہو وصل کے پیغام سے واقف

خُو اور بُو کا قافیہ بھلا عزیزو اور کو کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی نظم کا دوسرا بند یہ ہے :-

جا ہو کہ پھر اب بیچ میں تو تم ہمیں اس آن   اب آہ ! یہ ہوتا نہیں اے خسرو خوباں
ناحق دلِ صد چاک کو کرتے ہو پریشاں   اوروں سے قسم کھائیے اور ہم تو مری جاں
ہیں خوب تمہاری قسم اقسام سے واقف

اس میں آن کا قافیہ خوباں، پریشاں، جاں وغیرہ کیسے ہو سکتا ہے، جب کہ آن میں نون کا اعلان ضروری ہے، اور اگر سب قافیوں کو بہ اعلان نون پڑھا جائے تو خسرو خوباں کی ترکیب قابل اعتراض ہے۔ دوسرے ٹیپ کے مصرع میں قسم (بہ فتح قاف بمعنی عہد) کی جمع اقسام صرف نظیر ہی کی ایجاد ہے ورنہ اب تک قسم (بکسر قاف بہ سکون سین) کی جمع اقسام سنی گئی تھی۔

بعض جگہ نظیر نے قافیہ سرے سے ندارد ہی کر دیا، مثلاً برسات کی بہاروں والی نظم میں کہتے ہیں :-

مارے ہے موج ڈابر، دریا اُمنڈ رہے ہیں   مور و پپیہے، کوکل کیا کیا اُمنڈ رہے ہیں
جھڑ کر رہی ہیں جھڑیاں، نالے اُمنڈ رہے ہیں   برسے ہے مینہ جھڑا جھڑ بادل اُمنڈ رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اس بند میں پہلے دو مصرعوں میں قافیہ موجود ہے لیکن تیسرے اور چوتھے میں ندارد ہے۔

(۱۷) کلیات نظیر اکبرآبادی میں بھونڈے مصرعے اور موسیقیت سے معرّا اشعار بڑی کثرت سے ملتے ہیں۔ کاش لوگ اس کو تمام و کمال پڑھنے کی زحمت گوارا کریں۔ میں صرف چند مثالیں لکھتا ہوں۔ اور جن الفاظ سے مصرع مکروہ صورت ہو گیا ہے اُن پر خط کھینچے دیتا ہوں۔

تشریف تم نہ لائے جو کر کر بسنتی پوشش   کہئے گناہ ہم نے کیا کیا بسنت کا
زردار کی تو ان میں ہے بچھ رہی پلنگڑی   دلبر پری سی بیٹھی، جھمکائے جوڑے کُرتی
مفلس کی ٹوٹی پٹی یا ٹاٹ کی جھلنگڑی   منڈی ملی تو کالی، یا گنجی، لولی، لنگڑی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بڑھاپے کی تعریف میں رقم طراز ہیں :-

تھے ہم بھی جوانی میں بہت عشق کے پورے   وہ کون سے گُر ہیں، جو ہم نے نہیں گھورے
پر جب سے بڑھاپے کے پڑے دھورے   سب جھڑ گئے، دُم اُڑ گئی، پھرتے ہیں ننڈورے

چوتھا مصرع دیکھیے شاعری کا کیا عمدہ نمونہ ہے۔ لیکن شاید ابھی آپ کی طبیعت شاعری کے اس لالہ زار سے سیر نہ ہوئی ہو۔ ایک نمونہ نظیر کی شاعری کا اور دیکھ لیجیے۔ فرماتے ہیں ؎

چلائے مور، سارس اور بھڑ بھڑائے گھگھو　　گدھ اور چغد دہاڑے اور بھڑ بھڑائے اُلّو
کتے بھی بھونکے بھو بھوں گیدڑ پکارے ہو ہو　　بھڑ بھڑے گدھے بھی رینگے کر اپنی ڈھینچو ڈھینچو
سو سو طرح کی دھومیں اک دم میں کر دکھائیں
اس ڈھب سے ہم نے یارو کل بلبلیں لڑائیں

ان نامانوس اور غیر متین الفاظ سے قطع نظر جو اس بند میں استعمال کئے گئے ہیں، کیا اردو کا بڑے سے بڑا شاعر ایسا نادر اور عجوبۂ روزگار نمونہ اپنے تخیل کا نظیر اکبر آبادی کے اس بند کے مقابلہ میں پیش کر سکتا ہے۔ اسی طرح ذکرِ مرغاں کے بیان میں جو نظم ہے اُس کا پہلا بند ملاحظہ کیا جائے۔

(۱۸) نظیر کے یہاں بعض الفاظ کی جمع غلط استعمال ہوتی ہے، کوئی ادیب یا شاعر اس کا استعمال پسند نہیں کرتا بخوفِ طوالت صرف ایک مثال دی جاتی ہے

اور جن کو اب مہیا حسنوں کی ڈھیریاں ہیں　　سرخ اور سنہرے کپڑے عشرت میں گھیریاں ہیں

حسن کی جمع حسنوں غلط ہے۔

(۱۹) رکاکت کلام کے لئے نظیر کافی مشہور ہیں میں اہل ذوق کے سامنے اس قسم کے نمونے پیش کر کے اُن کی طبیعت مکدر کرنا نہیں چاہتا لیکن مشتے نمونہ از خروارے دیکھ لیجیے۔ ایک غزل کا شعر ہے ؎

دیکھو کہا مانو، مت خالی سلائی سے رکھو　　ورنہ کہے گی ہمیں یہ سرمہ دانی آپ کی

برسات کی بہار کا ایک شعر ہے ؎

کھا پوریاں کسی کو ہیں لگ رہے مروڑے　　آتے ہیں دست جیسے دوڑیں عراقی گھوڑے

اسی میں ایک اور شعر ہے جس میں تلقین فرماتے ہیں

برسات بھر تو مل کے، سنتے ہو جان پیارے　　احمق ہو جو پلنگ سے اب موتنے کو اُترے

آگے چل کر بوالہوسی کی حد کر دی ہے، فرماتے ہیں :-

کیا مینھ برس رہا ہے، تو کچھ ذرا نہالے　　جاتی نہیں تو پیارے، کھٹ بیٹھ ہی ملالے

گالی گفتار کوئی شاعر اپنی نظم میں لکھنا پسند نہ کرے گا۔ لیکن اوباشانِ اکبر آباد کی صحبت سے نظیر کو کافی فیض پہونچا، چنانچہ بے تکلف ارشاد ہوتا ہے:-

کھڑکی میں ڈال سر کو، جب ناکہ ستا دے　　کیا غل مچا رہا ہے، سن بچے مال تا دے

نظیر کی بوالہوسی کا ایک تماشہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں کہ معشوق سے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا تو "تک بیٹھے ہی والے" کی ترغیب فرماتے ہیں، اب دوسرا مظاہرہ بھی دیکھئے۔ اتفاقیہ طور پر ایک روز آندھی آگئی اور معشوق راستہ میں گھر گیا ؎

لگے پھر عیش و عشرت جب تو ہونے اس قرینے پر   کبھی بوسہ، کبھی انگیا پہ ہاتھ اور گاہ سینے پر

لگے کیسے مزے کے سنگترے اور بیر آندھی میں

اسی پر بس نہیں :-

پیار سے جب ہے وہ تربوز کبھی منگواتا   چھلکا اس کا مجھے ٹوپی کی طرح دے ہے پنہا

اور یہ کہتا ہے کہ پھینکا تو چکھاؤں گا مزا   کیا کہوں یارو میں اس شوخ کے ڈر کا مارا

دو دو دن رکھے ہوئے پھرتا ہوں سر پہ تربوز

بعض بے بصر لوگوں کا خیال ہے کہ "گلہری کا بچہ" جیسی نظمیں بچوں کو بہلانے کے لئے لکھی گئی ہیں، حالانکہ یہ نظمیں نہایت فحش اور رکیک ہیں. لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں نہ صرف شعر سمجھنے کی مطلقاً اہلیت نہیں بلکہ خدا نے عقل سلیم سے بھی ان کو محروم ہی رکھا ہے، ورنہ ایسی بے سر و پا بات کہنے کا اور کیا مطلب ہے. مرتب کلیات نظیر کو ایسی نظموں کو نقل کرنے میں جا بجا اذیت ہوئی ہے اور انھوں نے بعض رکیک اور فحش الفاظ کو نقطے لگا کر حذف کر دیا ہے. مگر یہ لوگ نہ اس نکتے کو سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے. میں اور نظموں کو تو نظر انداز کرتا ہوں، اور گلہری کے بچّے والی نظم کا صرف ایک بند نقل کرتا ہوں اور ارباب نظر سے دریافت کرتا ہوں کہ یہ نظم نظیر اپنے جذبات بوالہوسی کو تسکین دینے کے لئے لکھ سکتے تھے یا بچوں کو بہلانے کے لئے۔

جو ہیں اتنے میں ہم کو اس بُرے احوال سے دیکھا   کہا اس نے کہ پھنستا ہوگا ان سے کس طرح...

نظر سے اس کی میں نے جب تو واں اس بات کو تاڑا   کمر کو دیکھ، ڈھونڈی جیب، پگڑی کو ٹٹول اس جا

وہیں ہم نے نکالا ڈھونڈ کر بچہ گلہری کا

غرض کہاں تک ایسی مثالیں دی جائیں لیکن اس سے ناظرین نے بخوبی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ نظیر زبان کے کتنے پھوہڑ ہیں۔ ایک بند "چوہوں کے اچار" کا بھی سن لیجئے۔

اول تو چوہے چھلتے ہوئے قد کے بڑے ہیں   اور سیر سوا سیر کے مینڈک بھی پڑے ہیں

چکھ دیکھ مرے یار یہ اب کیسے کڑے ہیں   چالیس برس گزرے ہیں جب ایسے کڑے ہیں

کیا زور مزے دار ہے اچار چوہوں کا

(۴۰) میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ نظیر فن شعر سے قطعاً نابلد تھے لیکن یہ دعویٰ بے دلیل رہے گا اگر چند مثالیں نہ

ذیل ذکی گئیں۔ اعلانِ نون کسی ترکیب کی صورت میں اُستادانِ فن نے جائز نہیں رکھا مگر نظیر اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ایک غزل جس کا مطلع ہے ؎

رُخ پری، زلف پری، چشم پری، آن پری — کیوں نہ اب نام خدا ہو ترے قربان پری

اس غزل میں یہ شعر ہیں:۔

حسن گلزار، قمر شکل، صراحی گردن — مہ جبیں سیب ذقن، چاہِ زنخدان پری
ناز و غمزہ کی بلا، تیر نگہ، دستِ سناں — تیغِ ابرو کی ستم، ترکشِ مژگان پری
مُسکرانے کی ادا جیسے چمک بجلی کی — آن ہنسنے کی قیامت، لبِ دندان پری

تینوں جگہ اعلانِ نون نادرست ہے۔ یہی غلطی ایک دوسری جگہ کرتے ہیں

ملنے کا ترے رکھتے ہیں ہم دھیان ادھر دیکھ — بھاتی ہے بہت ہم کو تری آن ادھر دیکھ
ہم چاہنے والے ہیں ترے، جان ادھر دیکھ — ہولی ہے صنم، ہنس کے تو اک آن ادھر دیکھ
اے رنگ بھرے نوگلِ خندان ادھر دیکھ

اعلانِ نون کے سلسلہ میں مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ اُردو کے ایک موقر رسالہ میں حال ہی میں نظیر کے متعلق ایک مضمون دیکھا۔ صاحبِ مضمون نے نظیر کی تعریف کرتے ہوئے ایک نظم کے چند بند بطور اقتباس درج کئے۔ شاعر کی نگاہ اگر اعلانِ نون کی طرف نہیں گئی تو چنداں تعجب خیز نہیں کہ میاں نظیر کی یہ بے پروائی عادتِ ثانیہ میں داخل ہے۔ مگر حیرت اس بات پر ہے کہ صاحبِ مضمون اپنے آپ کو نقادِ شعر سمجھنے کے باوجود اس راز کو نہ سمجھ سکے کہ اعلانِ نون نے اُن کے محبوب شاعر پر کیا ستم ڈھایا اور بجائے اس کے کہ ناظرین کے دل میں اُن کے شاعر کی کوئی وقعت قائم ہوتی اُن کے اس انتخاب نے شاعر کی بھی مٹی خراب کی اور خود اُن کی بھی۔ شاید اسی موقع کے لئے ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے ع

"شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے"

وہ بند یہ تھا ؎

جو نوجواں ہیں اُن کے دل میں گمان کیا ہے — جو ہم میں کس ہے اُنمیں تاب اور توان کیا ہے
بوڑھا، ادھیڑ، اُمکا ڈھمکا، فلاں کیا ہے — ہم سے جو ہو مقابل پٹھے میں جان کیا ہے
اب بھی ہمارے آگے یارو جوان کیا ہے

میں اُس استقام کو نظر انداز کرتے ہوئے جو اس بند کے دوسرے مصرعوں میں ہیں ناظرین کی توجہ صرف تیسرے مصرع کے قافیہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے، اعلانِ نون نہ کرنے میں کیا

بات تھی اور آداب اخلاق نون کر دینے سے معانی کہاں کے کہاں جا پہونچے بدسلیقگی کی آخر کوئی حد ہونی چاہئیے۔

غرض یہ نقائص تھے نظیر کی شاعری کے جنھوں نے اہل نظر اور سخن فہم حضرات کو مجبور کیا کہ وہ اُن کی شاعری کی طرف مطلق توجہ نہ کریں۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ نظیر کے باکمال شاعر ہونے کے لئے یہ کافی ضمانت ہے کہ "فقیروں کی صداؤں میں آج تک اُس کی نظمیں سنی جاتی ہیں" لیکن اگر کمال شاعری کے لئے یہ معیار صحیح مان لیا جائے تو غالباً وہ شعرا جو واقعی قدرت کی طرف سے شاعرانہ دماغ لے کر آئے تھے اور جن کو نقادانِ فن اور صحیح ذوقِ شعر رکھنے والے حضرات نے ادب میں ممتاز اور اعلیٰ درجہ دیا ہے سب کے سب ادھورے اور خام کار سمجھے جائیں گے، اور ضرورت پڑے گی کہ اُن کو شعراء کی فہرست سے خارج کر دیا جائے۔ علاوہ ازیں اگر نظیر کی نظمیں فقیروں اور عامیوں کی صداؤں میں نہ سنی جائیں تو پھر اور کہاں سُنی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ نظیر نے جو شاعری کی وہ عامیوں کی زبان میں کی اور عامیوں کے لئے کی۔ اگر وہ خواص کے لئے کچھ لکھتے تو ممکن تھا کہ اُن کا کوئی درجہ اونچے طبقہ کے لوگوں میں بھی ہوتا۔

اسی طرح بعض لوگوں کا یہ خیال کہ چونکہ ڈاکٹر فیلن نظیر کو شیکسپیئر اور چاسر کا ہمسر سمجھتے ہیں، اور شاعری میں اُن کو اعلیٰ درجہ دیتے ہیں، اس لئے ہم کو بھی اُن کی رائے مان لینی چاہیئے، بالکل غلط ہے۔ ڈاکٹر فیلن ایک غیر ملکی آدمی تھے۔ وہ اپنے آپ کو اُردو زبان کا کتنا ہی بڑا ماہر کیوں نہ سمجھتے ہوں، وہ اہل زبان کی برابر ہرگز واقفیت نہیں رکھ سکتے۔ اُنھوں نے نظیر کی یہ تعریف اس لئے کی کہ اُنھیں اپنی لغت کی تدوین میں الفاظ کا سب سے زیادہ ذخیرہ اسی شاعر کے کلام سے ملا لیکن میں کہتا ہوں کہ ڈاکٹر فیلن کی نظر اتنی وسیع نہیں ہو سکتی کہ وہ غیر زبان کے اُن رموز سے بھی کماحقہٗ واقف ہوں جن سے صرف ایک اہل زبان ہی واقف ہو سکتا ہے۔ وہ نظیر کے استعمال کردہ تمام الفاظ کو صحیح سمجھتے ہوں گے۔ لیکن نظیر زبان سے جتنے نابلد ہیں ظاہر ہے، اور اُنھوں نے زبان کو صحیح استعمال کرنے میں جتنی ٹھوکریں کھائی ہیں، اُردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں اتنی مثالیں نہیں مل سکتیں۔ ہندوستان اگر محض غلام ہو تو اتنا افسوس نہیں، لیکن سب سے زیادہ رنج اس بات کا ہے کہ انگریزی جبروت و اقتدار نے ہماری ذہنیتوں کو بھی غلام بنا دیا ہے۔ جہاں کسی انگریز نے ایک بات کہی خواہ اس کو معاملہ متعلقہ کا کماحقہٗ علم ہو یا نہ ہو ہم نے اس پر آمنّا و صدقنا کہہ کر اپنی مہر توثیق ثبت کر دی یہ باتیں اور بھی زیادہ تکلیف دہ اُس وقت معلوم ہوتی ہیں جب ایسے لوگوں کے منہ سے نکلتی ہیں جو ہندوستان کو آزاد دیکھنے کے متمنی، آزاد کرانے کے ساعی اور اپنے وطن کو تمام غیر ملکی عناصر سے پاک رکھنا چاہتے ہیں یہاں تک کہ اگر زبان میں فارسی یا عربی وغیرہ کے الفاظ شامل ہیں تو اُن کو محض اپنے بیجا تعصب سے خارج کر دینا ضروری سمجھتے ہیں لیکن اگر وہ حریت دکھانے کے لئے آزادیِ ہند کے خواہاں ہیں اور دماغ اُن کے لیے ہی

غلام ہیں تو میں عرض کروں گا کہ

اے وائے بہارے اگر این است بہارے

قصہ کوتاہ یہ کہ نظیر اپنی اس بے راہ روی کی بدولت جادۂ مستقیم سے بہت دُور جا پڑے، اور انھوں نے خود اپنی شاعری کا ستیاناس کیا، نہ کہ زمانہ کے بیجا تعصب نے، اور اسی وجہ سے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اپنے تذکرہ گلشن بیخار میں اُن کی شاعری کے متعلق یہ رائے ظاہر کرنے پر مجبور ہوئے کہ "اشعار بسیار دارد کہ بر زبان سوقیش جاری است و نظر بہ آں ابیات، در اعداد شعرا نشایدش شمرد"۔ نواب مصطفےٰ خان شیفتہ اپنے زمانہ میں ایک ممتاز شاعر اور اعلیٰ سخن فہم تھے۔ چنانچہ مرزا غالب جیسا شاعر اُن کی سخن فہمی کا قائل ہے اور فخریہ لکھتا ہے ؎

غالب بہ فنِ شاعری نازد بدیں شیوہ کہ او　　　نسوشت در دیوان غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

اگر مرزا غالب اور شیفتہ کسی دیہاتی زبان کے عاشق کے نزدیک شاعر یا سخن فہم نہیں ہیں تو ہمیں کچھ کہنا نہیں بجز اس کے کہ

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را　　　تحسینِ ناشناس و سکوتِ سخن شناس

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ وہ شاعر جس کا کلام اغلاط سے اس قدر لبریز ہو دست بردِ زمانہ سے اب تک کیونکر محفوظ رہ سکا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر چند نظمیں مثلاً روضۂ تاج گنج، مفلسی، "سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ"، "آدمی نامہ"، "دنیا بھی کیا تماشہ ہے" وغیرہ اُن کی تصنیفات نہ ہوتیں تو زمانہ اُن کو کبھی کا بھلا چکا ہوتا لیکن ان نظموں سے اُن کے اصلی شاعرانہ جوہر کھلتے ہیں، اور باوجود تمام نقائص کے یہ نظمیں سفارش کرتی ہیں کہ چاہے نظیر کو اعلیٰ درجہ نہ دیا جائے مگر شعرا کی انجمن میں باریابی کی اجازت ضرور دی جائے۔

نظیر ہر طبقہ میں اُٹھنے بیٹھنے کے عادی تھے، ہر قسم کے لوگوں سے میل جول تھا، ہر کھیل کود میں شرکت کرتے تھے، اس پر قوتِ مشاہدہ تیز پائی تھی، نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دنیا کا تجربہ جتنا اُن کو ہوا اُردو کے کسی شاعر کو نہیں ملا۔ عالم آب و گل کی حقیر سے حقیر شے پر اُن کی نظر رہتی تھی اور انسانی فطرت کا مطالعہ نہایت عمیق تھا۔ اسی وجہ سے معمولی انسانی کمزوریوں اور انسانی اوصاف کا تذکرہ اُن کی بعض نظموں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ اس کا ہرگز قائل نہیں کہ اُن کا مقابلہ کسی حیثیت سے بھی شیکسپیر سے کیا جا سکتا ہے۔ چند باتیں دونوں کے یہاں یقیناً مشترک پائی جاتی ہیں، مثلاً اغلاطِ زبان کے سلسلہ میں دونوں بے پروا ہیں، دونوں کے یہاں انسانی فطرت کا تجزیہ پایا جاتا ہے۔ مگر شیکسپیر اس بھونڈے پن پر بہت کم اُترتا ہے جو نظیر کے یہاں کثرت سے نظر آتا ہے۔ وہ ادنیٰ و اعلیٰ ہر طبقہ کا نقشہ کھینچ سکتا ہے لیکن نظیر کی واقفیت نی

عالمگیر نہیں ہے کہ وہ چور اور بادشاہ کا نقشہ کھینچنے میں یکساں قدرت رکھتے ہوں۔
نظیر جوانی میں نہایت رند مشرب تھے بلکہ مولوی کریم الدین (صاحب طبقات الشعرائے ہند) تو راز کو اور زیادہ فاش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "لڑکوں پر بہت عاشق ہوتا تھا اور رات دن اسی خیال میں رہتا تھا شعر بھی اس لئے اس نے کہنے شروع کئے تھے۔ اس کے شعر بازاری لوگوں کو بہت یاد ہیں۔" یہ بات ان کے اشعار سے بھی واضح ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ "ریچھ کا بچہ" اور "گلہری کا بچہ" وغیرہ جیسی نظمیں اسی زمانہ کی یادگار ہوں۔ لیکن آخر زمانہ میں وہ سنبھل گئے تھے اور تمام مکروہات سے تائب ہو کر صوفی صافی بن گئے تھے چنانچہ اس زمانہ کی جو نظمیں اُن کی ہیں وہ زیادہ تر دُنیا کی بے ثباتی اور بُرے کاموں سے بچنے کی تلقین پر مبنی ہیں۔ یہ نظمیں اگرچہ اسقام سے خالی نہیں لیکن اپنے موضوع کے اعتبار سے پڑھے جانے کی مستحق ہیں ایک نظم "دنیا مکر و فریب کی جگہ ہے" کے کچھ بند نقل کرتا ہوں۔

کیا کیا فریب کہئے دنیا کی فطرتوں کا ۔۔۔ مکر و دغا و دزدی ہے کام اکثروں کا
جب دوست مل کے لوٹیں اسباب مشفقوں کا ۔۔۔ پھر کس زباں سے کیجے اب شکوہ دشمنوں کا
ہشیار! یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا
یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

نادان کو پلا کر اک بھنگ کا پیالا ۔۔۔ کپڑے بغل میں مارے اور لے لیا دوشالا
دو نا ملا تو اس میں گھولا دھتورا کالا ۔۔۔ ہوتے ہی غافل اس کو پھانسی میں کھینچ ڈالا
ہشیار! یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا
یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

"دنیائے غدار" بھی ایک اچھی نظم ہے۔ اس کے چند بند ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

اے دل ذرہ تو عالم ہستی میں بے خبر ۔۔۔ غفلت میں اپنی عمر نہ کھو شام اور سحر
اوقات زیست لہو و لعب میں نہ کر بسر ۔۔۔ دنیا ہے اک نگاہ فریبندہ جلوہ گر
الفت میں اس کی کچھ نہیں جز کلفت و خسر

دل کے فریب دینے کو کر مہر و التفات ۔۔۔ ناز و ادا میں رکھتی ہے کیا کیا تعینات
بدلے ہے رنگ روپ ہزار دن اور رات ۔۔۔ آج اس پہ تھی کمیں تو لگائی کل اُس پہ گھات
حسرت فزا و ہوش ربا و شکیب بر

آگے لکھتے ہیں۔

جس دل کو اس نگار کی آئی ادا پسند — اک دم وہ شاد ہو کے رہا پھر الم میں بند
رکھتی ہے اپنے دوش پہ ہر دم نئی کمند — لینے کو نقدِ عمر کے شیریں ہے مثلِ قند
جیسے بکی کو ہوتی ہے حنظل سے تلخ تر

تو اس نگار عہد شکن سے لگا نہ دل — حاصل نہیں کچھ اس سے بجز رنجِ جاں گسل
زنہار اس کے میٹھیو جا کر نہ متصل — جو اس سے دل لگاتے ہیں آخر ہو منفعل
ملتے ہیں اپنے دستِ تاسف بہ یک دگر

اک دن بھی تو کرے گا جو اس بے وفا کی چاہ — برسوں تلک کرے گی یہ پُر فن تجھے تباہ
ہرگز کسی کے ساتھ یہ کرتی نہیں نباہ — میں تجھ کو اس کے ربط سے کرتا منع آہ!
لیکن کروں میں کیا تجھے درپیش ہے سفر

نظیر کی ایک بڑی صفت یہ ہے کہ وہ محاکات کا بادشاہ ہے۔ قوتِ مشاہدہ کی تیزی کے باعث وہ باقاعدہ نقشہ کھینچتا ہے کہ نظروں کے سامنے سماں بندھ جاتا ہے۔ لیکن محاکات تخیل کے بغیر الفاظ گورکھ دھندے ہیں۔ اس لئے اُن کی محاکاتی شاعری ناظرین کے دماغ پر اپنا کوئی مستقل اثر نہیں چھوڑتی۔ علاوہ ازیں اُن کی اس قسم کی نظموں میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ جب وہ کسی منظر کا نقشہ پیش کرتے ہیں تو پوری تصویر سامنے لے آتے ہیں لیکن شاعر پورا مصور نہیں ہوتا، اس کے یہاں اشارات و کنایات سے تصویر کی کمی کو پورا کیا جاتا ہے، ورنہ شاعر اور مصور میں کوئی فرق نہیں رہتا اور شاعری مصوری سے ہرگز برتر نہ ہوگی۔ نظیر ایک چابک دست مصور کی طرح تصویر کے بعض نقوش کو دھندلا رہنے کے بجائے تمام خطوط اُجاگر کر دیتے ہیں، اور اس طرح تمام تصویر کو بھونڈی اور بدنما بنا دیتے ہیں۔ برسات کی بہاریں کے عنوان سے اُن کی ایک نظم ہے جس کی ابتدا یوں ہوتی ہے ؎

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں — سبزوں کی لہلہاہٹ، باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھماہٹ، قطرات کی بہاریں — ہر بات کے تماشے، ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر ہو مست، چھا رہے ہیں — جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا، جل تھل بنا رہے ہیں — گلزار بھیگتے ہیں، سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

یہاں تک معاملہ غنیمت تھا، تصویر کا کوئی رخ بدنما نہیں ہوا تھا لیکن اب تصویر مکروہ ہونی شروع ہوئی ہے۔ کہتے ہیں

پھسی کسی کے تن میں سر پر کسی کے پھوڑے — چھاتی پہ گرمی دانے اور پیٹھ میں ردوڑے
کھاپریاں کسی کو ہیں لگ رہے ہیں مروڑے — آتے ہیں دست جیسے دوڑیں عراقی گھوڑے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

مانا کہ یہ بھی برسات کی ایک کیفیت ہے لیکن ایک ہوشیار مصور بجائے اس رُخ کے چمکانے اس پر پردہ ڈالنا زیادہ پسند کرتا، کیونکہ طبیعت میں اس کی وجہ سے کراہت پیدا ہوتی ہے اور مصور کا مقصد کیفیت سرور پیدا کرنا ہے۔ اسی طرح ایک اور نظم برسات کے متعلق ہے جس کا آغاز یوں کرتے ہیں ؎

برسات میں جہان کا لشکر پھسل پڑا — بادل بھی ہر طرف سے ہوا پر پھسل پڑا
جھڑیوں کا مینھ بھی آ کے سراسر پھسل پڑا — چھتا کسی کا شور مچا کر پھسل پڑا
کوٹھا جھکا، اٹاری گری، در پھسل پڑا

بیچ کا ایک بند ہے۔

جھڑیوں نے اس طرح کا دیا آ کے جھڑ لگا — سُنیئے جدھر اُدھر کو دھڑکے کی ہے صدا
کوئی پکارے ہے مرا دروازہ گر چلا — کوئی کہے ہے ہائے کہوں اب میں تم سے کیا
تم در کو جھینکتے ہو مرا گھر پھسل پڑا

برسات میں جو کیفیت ہوتی ہے اُس کا یہ بہت صحیح نقشہ ہے لیکن آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

چکنی زمیں پہ یاں تئیں کیچڑ ہے بے شمار — کیسا ہی ہوشیار پہ پھسلے ہے ایک بار
ذکر کا لیں کچھ اس میں نہ آقا کا اختیار — کوچے گلی میں ہم نے تو دیکھا ہے بار بار
آقا جو ڈگمگائے تو نوکر پھسل پڑا

کوچہ میں کوئی اور کوئی بازار میں گرا — کوئی گلی میں گر کے ہے کیچڑ میں لوٹتا
رستے کے بیچ پاؤں کسی کا رپٹ گیا — اِن سب جگہ کے گرنے سے آیا جو بچ بچا
وہ اپنے گھر کے صحن میں آ کر پھسل پڑا

ہر چند کیچڑ کے ہو جانے سے جو تصور دماغ میں قائم ہوتا ہے اور جو کیفیت پیدا ہوتی ہے کچھ اچھی نہیں لیکن یہاں تک بھی سب کچھ درست تھا، اب اس کے آگے جو کیفیت بیان کی گئی ہے وہ ہرگز قلمبند ہونے کے لئے موزوں نہیں تھی۔ بلکہ ناظر کو اپنے تخیل پر زور دینے کے لئے بھی کچھ موقع دینا چاہیئے تھا۔ تاہم نظیر اس کو ضروری نہیں سمجھتے بلکہ صاف صاف لفظوں میں کہتے ہیں۔

وہ لعل جو ہو رہی ہے ہر ایک جا پہ رسمسی — مر مر اُٹھا ہے مرد تو عورت رہی پھنسی

کیا سخت مشکلات ہے، کیا سخت بے کسی   اُس کی بڑی خرابی ہوئی اور بڑی ہنسی

جو اپنی جا ضرور کے اندر پھسل پڑا

اول تو یہی دلدل بجائے خود ایک کریہہ منظر پیش کرتی ہے، لیکن برسات کے موسم میں جائے ضرور کی خراب ترین کیفیت اور بدقسمتی سے کسی کا وہاں گر کر لت پت ہو جانا اس قدر تکلیف دہ نظارہ ہے کہ ہمارے تصور کی آنکھ بھی اس منظر کو دیکھنا گوارا نہیں کر سکتی۔ اگر نظیر ایک عمدہ فن کار ہوتے تو اس تصور کی منظر کشی کی زحمت گوارا نہ کرتے۔ بہرحال اُن کی محاکاتی شاعری کا نقص کہ وہ ضرورت سے زیادہ بیانیہ ہے۔ اُن کا رتبہ شاعری کی حیثیت سے ضرور کم کر دیتا ہے، کیونکہ شاعری بھی فن کاری کا دوسرا نام ہے۔

الغرض نظیر کو تمام شاعروں سے برتر ماننا نہ صرف غلط ہے بلکہ اپنی نسبت یہ مصرع چسپاں کرانا ہے کہ

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

جہاں تک بیانیہ شاعری کی ابتدا کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ شاعری ولی ہی کے زمانہ سے رائج ہے چنانچہ ولی نے شہر سورت کا حال اپنی ایک مثنوی میں بیان کیا ہے۔ اور میر کی مثنویات تو آج تک مشہور ہیں۔ سودا کا شہر آشوب بھی بیانیہ شاعری میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ البتہ یہ نظیر ہی کا حصہ ہے کہ اچھے مضامین اور عنوانات کو چھوڑ کر گلہری کا بچہ، ریچھ کا بچہ، تل کے لڈو، آگرہ کی ککڑی، کورا برتن، فضولیات لکھا کریں۔ اب اگر اس شاعری میں بے شمار الفاظ جائز اور ناجائز، صحیح اور غلط آ گئے ہیں تو یہ کوئی شاعرانہ عظمت کی دلیل نہیں، اُن کے کلام کو نہ استناد کا درجہ حاصل ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ رہی فحش گوئی تو اُس کو پڑھ کر ہمارے بعض موجودہ افسانہ نگار اور ترقی پسند شعرا بھی جو عریانی کے دلدادہ ہیں شرم سے آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ نظیر کا بہترین کلام قابلِ عزت و احترام ہے اور ہم لوگوں کو چاہیئے کہ مبالغہ کو چھوڑ کر اعتدال کے ساتھ رائے قائم کریں جو کلام قابل تعریف ہے اس کی تعریف کریں اور جس کلام میں نقائص ہیں اس کی تعریف کرنے سے پرہیز کریں۔ یہ طریقہ ناپسندیدہ ہے کہ جب نظیر پر کچھ لکھنے کے لئے بیٹھے تو ایک طرف شیکسپیئر کا مدِمقابل بنا دیا اور دوسری طرف میر اور انیس کا ہم پلہ کر دیا۔ اس بدمذاقی سے بہت سے خطرات ہیں اور فنِ شاعری کی مٹی خراب ہوتی ہے۔ آج کل صاحبِ فہم اپنے تعلقات یا ذاتی پسندیدگی کی بنا پر اس طرح فن کو نقصان نہیں پہونچاتے۔ جیسا کہ بعض اصحاب کا رویہ ہے۔ حقیقتاً فن کا درجہ بلند ہے اور اس کو بلند ہی رہنا چاہیئے۔

رباعی

اندرجیت شرما:۔

ماضی کی کوئی چال پہ شرمندہ ہے   فردا کی تمنا میں کوئی زندہ ہے

دنیا تو فقط حال کی ہے متوالی   کچھ قدر گذشتہ ہے نہ آئندہ

جوشؔ کا ایک قنوطی خط پڑھکر

(از سید اختر علی اختر تلہری)

یہ بات ہے کیا جوشؔ سخندان و سخنور — ہنستے ہوئے الفاظ میں روتا ہوا مفہوم
یہ رمز ہے کیا اے ارم آرائے معانی — گلگشت چمن اور تو افسردہ و مغموم
یہ زندگی نغمہ و مے اور تو دل ریش — یہ جوشؔ بہار اور مسرت سے تو محروم
وہ کون سا نشتر ہے جو ہے دل میں کھٹکتا — کیوں سلک طرب آج نہیں ہے تری منظوم
ابنائے زمانہ نہیں ہمدرد تو کیا غم — عالم میں تو یہ چیز ہے داناؤں کا مقسوم
دنیا ہے یہ دنیا ہے یہاں رنگ یہی ہے — کہتے ہیں جسے قدر وہ ہے دہر میں معدوم
اے مالک صد کان گہر ہائے معانی — تو اور پریشاں ہو پئے عزت موہوم
فردوسیؔ خوش ذوق کی کیا قدر ہوئی تھی — اس بارے میں تنہا ہے نہیں تو ہی تو مظلوم
کافی ہے ترے واسطے یہ بخشش فطرت — اقلیم معانی ہے ترے فکر کی محکوم

ریاکار انسان

محفلوں میں اور تنہائی میں اور — واہ رے میں اور مری پرکاریاں
منبروں پر ہو رہا ہے ذکر رب — خلوتوں میں اور ہیں تیاریاں
یوں بظاہر ہوں بہت تقویٰ شعار — ہیں مگر دل میں بھری رنگینیاں
یوں تو جلوت میں ہوں مرد پارسا — ہیں مگر خلوت کے اندر مستیاں
تسبیح گردانی ہے ظاہر میں مگر — ہو رہی ہیں چھپ کے بادہ خواریاں
دل میں ہے اک اور طوفاں جوش زن — ہیں مگر ظاہر میں قرآں خوانیاں
کاٹتا پھرتا ہوں جیبیں قوم کی — ہوں مگر منجملۂ روحانیاں
اپنی آسایش کی فکریں ہیں مگر — ناچتی ہونٹوں پہ ہیں قربانیاں
شہد ظاہر میں مگر باطن میں سم — زندگی ہے اور ظاہر داریاں
ادعائے صلح جوئی ہے مگر — دل میں ہیں موجود فتنہ زائیاں
باطنی رخ دیکھتا ہی کون ہے — ظاہری رخ پر تو ہیں گلکاریاں

نوائے سروش

(از پروفیسر یوگ دھیان اہوجہ ایم. اے. ایم. او. ایل. جالندھر)

ہر سلطنت میں مختلف طرح کے سکّے رائج ہوتے ہیں، تانبہ. نکل. چاندی. اور سونے کے. کاروبار کے لئے سب سکّے یکساں طور پر ضروری اور اہم ہیں. لیکن ان سب کی قیمتوں میں فرق ہوتا ہے. شعر و سخن کی ولایت میں بھی شعر سکّوں کی طرح مختلف قیمتیں رکھتے ہیں، اور ان کی قیمت کا اندازہ اُن کی شہرت کی مدت سے ہو سکتا ہے.

بعض شعر ایسے ہی پامال ہوتے ہیں جیسے کہ پت جھڑ کے موسم میں خشک پتّے. کچھ ایسے ہوتے ہیں (اور اُن کی تعداد بھی کم نہیں) جن کی قیمت ایک ہی بار پڑھنے یا سُننے میں ختم ہو جاتی ہے، دوبارہ اُنھیں کوئی نہیں پڑھتا کیونکہ وہ ایسے بے کیف معلوم ہوتے ہیں جیسے کہ ایک دُہرائی ہوئی کہانی. لیکن بازارِ سخن میں اشعار کے ایسے سکّے بھی رواں ہیں جن کی قدر و قیمت مذکورہ اشعار کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے عام سکوں کے مقابلہ میں سونے کی اشرفی کی. یہ ادبی خزانے کے بیش بہا جواہرات میں گنے جاتے ہیں.

آدم اور حوّا کی اولاد کے بیشمار افراد کائنات کو اپنی عقل اور شعور کے مطابق مختلف پہلوؤں سے دیکھتے ہیں اور اسی سے حسن، لذت اور مسرت کے مختلف تاثرات حاصل کرتے ہیں. انھیں تاثرات کی تصویر کو جب شاعر اپنے الفاظ میں ملبوس پیش کرتا ہے تو اُس کے اس فعل کو شاعری سے موسوم کرتے ہیں. شاعر جو کچھ لکھتا ہے کسی نہ کسی احساس یا جذبہ کے زیر اثر لکھتا ہے لیکن احساسات اور تخیل میں فرقِ مراتب ہوا کرتا ہے.

زمین کی سطح پر عام بطیر میں کھڑے ہو کر دیکھنے سے ہماری نگاہ ایک محدود دائرے میں ہو کر واپس آجاتی ہے ذرا اونچا اُٹھنے سے ہماری آنکھ اور دُور تک دیکھنے لگتی ہے. اسی طرح فضا میں ہم جس قدر اونچے اُٹھتے جائیں گے ہماری حد نظر اتنی ہی زیادہ وسیع ہوتی جائے گی شاعر کا تخیل فضا کی بیکراں اور لامحدود بلندیوں میں پرواز کرنے والے پرندے کی طرح ہے. یہی باعث ہے کہ اس کا دل پاکیزہ اور لطیف احساسات اور بلندترین جذبات کا حامل ہوتا ہے.

بوڈلیئر (Baudelaire) کہتا ہے کہ شاعرانہ کیفیت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب تمام حواس نہایت درجہ اثر پذیر اور ذکی الحس ہو جاتے ہیں منظر پردۂ ابد تک پہونچ جاتی ہے. پُر شعور مقامات میں خفیہ

سے خفیف آواز کو کان سننے لگتے ہیں مگر شور سے بالکل ناآشنا رہتے ہیں۔ اختلالِ خیالات واقع ہوتا ہے، بسا اوقات جملہ اشیائے عالم کی اصلی صورت منقلب ہوکر ایک نئے رنگ میں جلوہ گر ہوجاتی ہے، منقلب خیالات میں ناقابلِ حل اطلاقی تغیر پیدا ہوجاتا ہے۔ آوازیں رنگین معلوم ہونے لگتی ہیں اور رنگ میں نغمہ پیدا ہوجاتا ہے[1]۔

شیخ عراقی نے بھی نغموں اور کیف کے اسی عالم کا نقشہ یوں پیش کیا ہے:۔

کند چشم تو کارِ گوش و گوشت کارِ چشم آنجا — تنت رنگِ روان گیرو روانت رنگِ جسمانی

شاعرانہ کیفیت کے یہ ناقابلِ بیان لمحات کچھ ایسی لطافت اور دلآویزی کے ساتھ آتے ہیں جیسے صبحدم گلاب کے پھولوں پر اوس کی ننھی ننھی بوندیں نامعلوم فضاؤں سے آہستہ آہستہ آکر جمع ہوجاتی ہیں یا ایسے جیسے کسی معصوم چہرے پر بادِ بہاری کے ہلکے ہلکے خوشگوار جھونکے۔ زبان ان کی کیفیت کو بیان نہیں کرسکتی۔

ایسے الہامی لمحات میں لکھی ہوئی نظمیں ہی وہ نظمیں ہیں جنھوں نے شاعری کو جملہ اصنافِ سخن کی کرسئ صدارت پر متمکن کردیا۔ ایسی نظمیں صرف اپنی مخصوص زبان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے ادبی خزانے کا قیمتی سرمایہ ہوا کرتی ہیں۔ یہ سدا بہار پھولوں کی طرح خزاں کی دسترس سے ہمیشہ باہر رہتی ہیں، اور وقت کی رفتار ان کی شادابی اور آب و تاب کو ماند نہیں کرسکتی۔ ان میں وہ تازگی ہوتی ہے جو کلوپیٹرا کے حسن و جمال کو دی گئی تھی۔

شعر کی دنیا میں بھی بہتر انسان بستے ہیں اور ایسے لمحات انھیں کی زندگی میں رونما ہوکر کاشانۂ ادب کو اپنے جلووں سے ایسے ہی معمور کردیتے ہیں جیسے تیرہ خاکدان کو فرشتۂ رحمت نے منور بنا دیا تھا ایسے ہی لمحات میں لکھے ہوئے اشعار کے متعلق کہا گیا ہے کہ

شاعری جزویست از پیغمبری

انھیں وجد و حال کے لمحات کا جب خواجہ شمس الدین محمد حافظ پر نزول ہوتا ہے تو وہ انھیں فارسی کی غزل کے اس بلند رتبے پر پہنچا دیتے ہیں جو آج تک کسی کو نصیب نہ ہوا اور یہی روحانی کیف و سرور کی حالت جب فارسی کے ایک دوسرے صوفی شاعر عراقی کے دل پر طاری ہوتی ہے تو اس کے قلم سے آبِ حیات ٹپکنے لگتا ہے۔ فارسی کے بابائے شاعری دو ہیں، ایک حافظ اور دوسرے عراقی۔

ابتداءً حافظ ایک محل تک بند تھے، شاعری کا شوق کچھ بے طرح چرایا تھا ناموزونیِ طبع یاران ...

---

[1] محاسن کلام غالب۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مطبوعہ انجمن ترقی اردو ص ... [2] میخانہ عبدالنبی مرتبہ پرنسپل محمد شفیع ایم اے ص ...

تفریح اور دل لگی کا سامان بنی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ اُن کی لغو گوئی کا چرچا سارے شہر میں پھیل گیا، لوگ اُنھیں بلاتے اُن کے شعر سنتے، اور مذاق اڑاتے۔ آخر لوگوں کے تمسخر اور استہزا سے بہت آزردہ ہوئے شہر کے قریب ہی بابا کوہی کا مزار تھا، لوگ مرادیں حاصل کرنے کے لئے اس مزار پر چلّے کھینچا کرتے تھے حافظ نے بھی وہاں ریاضتیں کیں اور چلّے کھینچے کئی بیدار راتوں کے بعد ایک دن صبح کو ان پر روحانی نیند طاری ہوئی۔ کہتے ہیں کہ خواب میں ایک بزرگ[۱] نے انھیں کچھ کھانے کو دیا، اس سے ان کا سینہ نورِ معرفت سے معمور اور دیدۂ دل روشن ہوگیا۔ کچھ ہی ہوا اس دن انھیں فارسی غزل کے خزانے کی کنجی مل گئی، اور اُس وقت اُن کے قلم نے فارسی ادب کی یہ لاثانی اور لافانی غزل لکھی[۲]۔

دوش وقتِ سحر از غصّہ نجاتم دادند ۔۔۔ واندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند
بے خود از شعشعۂ پرتوِ ذاتم کردند ۔۔۔ بادہ از جامِ تجلّیِ صفاتم دادند
چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے ۔۔۔ آں شبِ قدر کہ ایں تازہ براتم دادند
بعد ازیں روئے من و آئینۂ وصفِ جمال ۔۔۔ کہ در آنجا خبر از جلوۂ ذاتم دادند
من اگر کامرواگشتم و خوشدل چہ عجب ۔۔۔ مستحق بودم وایں ہا بزکاتم دادند
ہاتف آں روز بمن مژدۂ ایں دولت داد ۔۔۔ کہ برآں جور و جفا صبر و ثباتم دادند
ایں ہمہ شہد و شکر کز سخنم مے ریزد ۔۔۔ اجرِ صبریست کزاں شاخِ نباتم دادند
ہمتِ حافظ و انفاسِ سحر خیزاں بود ۔۔۔ کز بندِ غمِ ایامِ نجاتم دادند

استادِ غزل خواجہ حافظ سے پوری ایک صدی پہلے فارسی کے صوفی شاعر شیخ فخرالدین عراقی پر ایسا ہی ایک لمحہ گزرا، وہ ملتان پہنچے اور شیخ بہاءالدین ذکریا سے بیعت کی۔ صوفی کے لئے راہِ سلوک میں پہلی منزل نفس کشی ہے۔ پیرِ طریقت نے انھیں چلّہ کھینچنے کی ہدایت کی، وہ ریاضت اور نفس کشی کی منزلیں طے کرنے لگے لیکن مرشد نے جس فاصلے کو طے کرنے کے لئے چالیس دن دیئے تھے اُسے انھوں نے بہت پہلے ختم کر لیا۔ رہبر کے قیاس اور اندازے سے شاید یہ کہیں زیادہ تیز رو واقع ہوئے تھے۔ ابھی گیارھواں ہی دن تھا کہ یہ مرشد کی بتائی ہوئی سرحد سے پار نکل گئے تھے۔ اور اگر ہم خواجہ عطّار کی بیان کردہ "وحی" کی تعریف پیشِ نظر رکھیں کہ

---

[۱] "حضرت علی" براؤن جلد سوم صفحہ ۲۷۴ میخانہ صفحہ ۲۰ وغیرہ۔
[۲] میخانہ صفحہ ۲۰ فقط مطلع دیا ہے۔
[۳] مرآۃ الخیال تالیف امیر شیر علی خاں لودی مطبوعہ بمبئی صفحہ ۴۹ و میخانہ عبدالنبی ۔۔۔ خانہ ۔۔۔ پبلشنگ ۔۔۔ صفحہ ۳ وغیرہ
[۴] منقول از تاریخ ادبیات ایران تالیف پروفیسر براؤن جلد سوم صفحہ ۱۲۵

عراقی چہ بود در سر آنچہ سر دل تو | سر بر زند از نتائج اسرار

تو کس نے پُوچھے گا کہ عراقی کے دل سے بھی نتائج اسرار زبان تک آئے۔ چلّہ کشی کے گیارھویں دن عالمِ مستی و بے خودی میں عراقی کی طبع موزوں یوں زمزمہ سنج تھی

نخستیں بادہ کاندر جام کردند | زچشم مست ساقی وام کردند
چو با خود یافتند اہل طرب را | شراب بے خودی در جام کردند
لب میگون جاناں جام در داد | شراب عاشقانش نام کردند
بہ زلف بتاں آرام نگرفت | زلیس دلہا کہ بے آرام کردند
بمجلس نیک و بد را جاسے دادند[1] | بجامے کار خاص و عام کردند
چو گوئے حسن در میداں فگندند | بیک جولاں دو عالم رام کردند
ز بہر نقل مستاں از لب و چشم | مہیا شکر و بادام کردند
ازاں لب کز وی جبہ دہاست | نصیب بے دلاں دشنام کردند
دلی را تا بدست آرند ہر دم | سر زلفین خود را دام کردند
بغمزہ صد سخن گفتند با جاں | بدل زابرو دو صد پیغام کردند
نہاں با محرمی رازی بگفتند | جہانی را ازاں اعلام کردند
بعالم ہر کجا درد و غمے بود | بہم کردند و عشقش نام کردند

چو خود کردند راز خویشتن فاش
عراقی را چرا بد نام کردند

اور مریدوں نے جا کر شیخ سے شکایت کی کہ بجائے ذکر و تلاوت کے عراقی محوِ نغمہ سرائی ہے اور [illegible] غزل سنائی۔ کہتے ہیں کہ جب مقطع پر پہونچے، عراقی کی حالتِ انقیاد سے شیخ پر رقت اور گریہ کا عالم طاری ہو گیا اور فرمایا "بس اُس کے کام کی تکمیل ہو چکی" وہ اُٹھے اور اُسی وقت عراقی کی خلوت گاہ میں پہنچے اور فرمایا "عراقی خرابات میں یہ مناجات کیسی؟ خلوت سے باہر آ" عراقی نے باہر آ کر اپنا سر پیرِ طریقت کے قدموں

---

[1] نسخۂ کلیات کتب خانۂ شاہی ریاست کپور تھلہ: نہاں با محرمی رازے بگفتند۔
[2] اشعار [illegible] نسخۂ کلیات مجموعہ پروفیسر شیرانی (پنجاب یونیورسٹی لائبریری) میں موجود نہیں۔
[3] نسخۂ کلیات [illegible] کتب خانۂ شاہی ریاست کپور تھلہ میں یہ شعر زائد ہے:
ز بہر صید دلہا بے محابا | کمند زلف خود را دام کردند
[4] در نسخۂ کلیات ریاست کپور تھلہ اور پروفیسر شیرانی کے نسخہ میں یہ شعر زیادہ ہے:
جمالِ خویشتن را جلوہ دادند | بیک جلوہ دو عالم رام کردند

میں رکھ دیا۔ مرشد نے انھیں خاک سے اُٹھایا، گلے لگایا اور اپنے تنِ مبارک سے خرقہ اُتار کر پہنا دیا۔ ایک مرشد اپنے مرید کے اعجاز کا قائل ہو رہا تھا!

عراقی کی صرف یہ غزل ہی اسے ادب تاریخ فارسی میں ایک لازوال شہرت دلانے والی ہے لیکن اسے اتفاق سمجھیے یا ادبیات فارسی کی بدنصیبی پر محمول کیجیے کہ اس کے جملہ مطبوعہ کلیات میں اس غزل کا ایک شعر بھی نہیں ملتا۔ حالانکہ اس کے حالاتِ زندگی لکھنے والے، قدیم و جدید، کم و بیش سب مصنفین نے یہ غزل اور اس سے متعلق حکایت بیان کی ہے۔ بعض نے اس غزل کا مطلع اور مقطع ہی تحریر کر دیا ہے۔ ان میں سے مجمع الفصحا[2]۔ ریاض العارفین[3] اور آتشکدہ[4] نے صرف ایک دو اشعار دینے پر اکتفا کی ہے تاریخ فرشتہ[5]۔ تذکرۂ حسینی[6] اور مخزن الغرائب[7] نے نسبتہً تفصیل سے کام لیا ہے۔ نفحات[1] الانس۔ مرآۃ الخیال تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی[8]۔ ہفت اقلیم۔ دیباچہ عشاق نامہ۔ مجالس العشاق[9] اور میخانہ نے ساری صورت واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے۔

عراقی سے پہلے بھی ایک صوفی گذرے ہیں جنھوں نے اسی بحر میں ایک غزل لکھی تھی، اور بقول ایران جدید کے مشہور ادیب میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی عراقی کا یہ شعر:

بعالم ہر کجا درد و غمے بود ... بہم کردند و عشقش نام کردند

انھیں کے ایک شعر کا پرتو ہے۔ وہ صوفی امام صفی یزدی تھے جن کے متعلق محمد عوفی مولف لباب الالباب[10] لکھتے ہیں کہ دل و طبیعت کی صفائی میں خورشید کے لئے باعثِ رشک تھے۔ جادۂ وفا اور سجادۂ صفا کے بغیر نہ رہتے تھے۔ ملک طغان شاہ کے عہد میں واصل بحق ہوئے۔ ہر وقت لباس ائمہ اور صوفیوں کی پوشاک میں رہا کرتے تھے۔ عوفی نے ان کی یہ غزل نقل کی ہے[11]:-

چہ دردست ایں کہ عشقش نام کردند ... وزو آشوب خاص و عام کردند

ہر آنچہ اندر زمانہ درد دل بود ... یکے کردند و عشقش نام کردند

---

[1] نفحات الانس نولکشور پریس صفحہ ۴۹۲ - مرآۃ الخیال صفحہ ۱۴۶ ہفت اقلیم۔ نسخۂ خطی کتاب خانۂ شاہی ریاست کپورتھلہ صفحہ ۱۰۰ دیباچۂ عشاق نامہ مرتبۂ ڈاکٹر اے۔ جے۔ آربری وغیرہ وغیرہ) [2] مجمع الفصحا تالیف رضا قلی ہدایت صفحہ ۳۴۹ [3] ریاض العارفین تالیف ہدایت صفحہ ۱۷۲-۱۷۳۔ [4] آتشکدہ تالیف حاجی لطف علی بیگ آذر مطبوعہ بمبئی صفحہ ۲۷۱۔ [5] تاریخ فرشتہ تالیف محمد قاسم فرشتہ مطبوعہ نولکشور پریس صفحہ ۴۰۵-۴۰۶۔ [6] تذکرۂ حسینی تالیف حسین دوست نسخۂ خطی پنجاب پبلک لائبریری۔ [7] مخزن الغرائب۔ نسخۂ خطی پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ [8] تذکرہ دولت شاہ سمرقندی مؤلفہ پروفیسر براؤن صفحہ ۲۱۵۔ [9] مجالس العشاق تالیف سلطان حسین ابن سلطان منصور ابن بایقرا مطبوعہ نولکشور پریس صفحہ ۱۲۱ [10] لباب الالباب محمد عوفی مرتبہ پروفیسر براؤن صفحہ ۲۳۶ تعلیقات میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی۔ [11] صفحہ ۶۹-۲۷۰

خرابا تیست اندر عشق کانجا ۔ — زخون دل مے اندر جام کردند
بیک ساغر درآں بت خانہ مارا — چنیں سرمست و بے آرام کردند
بیا توسن نمائے تند پندار — کہ زیر بار عشقش رام کردند

عراقی کے بعد ہندوستان کے ایک اور صوفی نے عراقی کی اس غزل کا تتبع کیا، وہ صوفی مولانا محمد معروف بہ شاہ ولی اللہ محدث ہیں جو کہ امین تخلص کیا کرتے تھے ۔مولوی مظفر حسین صبا اُن کے تذکرہ میں لکھتے ہیں" امین عربی اور فارسی کی نظم و نثر میں مہارت کامل رکھتے تھے" پندرہ سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے اور علوم ظاہریہ اور باطنیہ میں بے نظیر تھے ۔اُن کے خوارق اور کرامات کا بھی ذکر کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ "آیتی از آیات اللہ بودند" ایسے برگزیدہ اور خدارسیدہ صوفی نے عراقی کی اس غزل کا تتبع کیا اور ان کا پہلا مصرعہ تو بعینہٖ عراقی کا ہی ہے :۔

نخستیں بادہ کاندر جام کردند — ز راجش عکس آں گلفام کردند
ز دریائے قدم موجے برآمد — مر او را بحر امکاں نام کردند
شراب وحدت از خمخانۂ غیب — مرا صبح ازل در کام کردند
امیں رمزے و قیقے با تو گویم — بجود آغاز و ہم انجام کردند

عراقی کی یہ غزل، فارسی کی الہامی (Inspired) شاعری کا ایک بیش بہا جزو ہے جن لمحات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے ان میں لکھے ہوئے شعر خواہ کسی بھی معیار پر پرکھے جائیں ہمیشہ کامل العیار پائے جائیں گے اور انھیں جن صفات کا بھی حامل سمجھا جائے وہ ان میں موجود ہونگی ۔ غالب نے شاید ایک ایسے ہی لمحہ کے زیر اثر ایسی ہی شاعری کے متعلق کہا ہے ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

تصحیح ہمیں افسوس ہے کہ زمانہ ستمبر کے پہلے مضمون میں بعض غلطیاں رہ گئی ہیں ۔مثلاً صفحہ ۹۸ پر لکھا ہے :۔" اگر شاعر اپنے تاثرات و واردات قلب کو بیان کرے گا تو وہ خارجی ہوگی" اس کے بجائے یوں پڑھیے :۔" اگر شاعر اپنے تاثرات و واردات قلب کو بیان کرے گا تو وہ داخلی شاعری ہوگی اور اگر وہ غیر کے تاثرات بیان کرے گا تو وہ خارجی ہوگی"
صفحہ ۹۹ پر آخری بند سے پہلے بند کے تیسرے مصرعہ میں لفظ "بچھڑا" چھپ گیا ہے ،اس کے بجائے "بچھڑا" صفحہ ۱۰۰ پر" جو خوش ہیں وہ خوشی میں" کے بجائے " جو خوش ہیں وہ خوشی میں" پڑھیے۔
(ا۔ز)

لے تذکرۂ روشن مؤلفہ مولوی مظفر حسین صبا صفحہ ۷۵

"امرت"

(از آطہر فتحپوری، بی۔اے)

"تیرے جانے سے پہلے صرف اتنا کہہ دو کہ معاف کیا" رمیش نے شوہرانہ نیکاری سے نیک سیرت بیوی کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔

ساوتری آج خلاف معمول اپنے شوہر کو شرعت کے ساتھ باتیں کرتا ہوا سن رہی تھی۔ اس کو کچھ کچھ حارس ہو چلی تھی، کیونکہ اس وقت وہ اپنے آپ ہی سنجیدگی کے ساتھ اپنے پچھلے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے رہا تھا:۔

"میں پاپی ہوں، میں شرابی ہوں — میں نے تم جیسی دیوی کو ٹھکرا کر ان کوٹھوں کی سیر کرنے میں باپ دادا کے گاڑھے پسینے کی کمائی اور اپنی انمول جوانی گنوائی ہے، جسے لوگ عصمت فروشی کا گھناؤنا اڈا کہتے ہیں، جہاں پاپ ہوتے ہیں، جہاں چند کاغذی سکوں کے عوض تن فروشی کی جاتی ہے، جہاں کی فضا میں مطلب پرستی کی بو آتی ہے — میں نے شاید دنیا کی گندگی ہی کا مزہ چکھنے کے لئے بی۔اے تک پڑھا تھا؛ جانتی ہو مجھ میں بھی بہت سی حسرتیں تھیں، لیکن قدرت کے کھیل ہی نرالے ہیں — مجھے کیا معلوم تھا کہ دنیا کی ساری گندگی مجھی میں سما جائیگی — خیر جو ہونا تھا سو ہوا مجھے معاف کرو — اب میری آنکھیں کھل گئیں — پردیس میں ہر وقت مجھے تمہاری اور سریش کی فکر لگی رہے گی۔"

آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے ساوتری نے سادہ لہجے سے کہا؛

"پران ناتھ! گندی باتوں کو بھول جائیے، بھگوان کی یہی مرضی تھی، اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں، مگر میں اتنا ضرور کہوں گی کہ آج نہ جائیے، میں نے بہت برا سپنا دیکھا ہے۔"

رمیش نے ہنس کر کہا۔ "تمہیں ڈر ہے کہ پردیس جا کر میں تمہیں بھول جاؤں گا؟"

"یہ تو نہیں معلوم کہ میں کیوں ڈرتی ہوں، لیکن اتنا جانتی ہوں کہ میں نے برا سپنا دیکھا ہے۔ ہاں میں نے دیکھا ہے کہ جب آپ گھر لوٹے ہیں تو بال پک چکے ہیں۔"

"یہ تو اچھا خواب ہے" رمیش نے کہا "ایک شگون ہے، دیکھنا میں بہت سا روپیہ کما کر تمہارے لئے

پردیس سے اچھی اچھی چیزیں لاؤں گا۔"

ساوتری یہ باتیں سُن تو رہی تھی، مگر اس طرح گویا سُن ہی نہ رہی ہو۔ ٹھیک اس بہاری لڑکی کی طرح جو اپنا گلا بھرنے کے نیچے رکھ دیتی ہے اور کسی خیال میں محو ہو کر اسے چھلکتا ہوا تکتی تو ہے مگر یوں ہی پڑا رہنے دیتی ہے۔ آخر ساوتری نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "آہ! میرا جی تو نہیں چاہتا ویسے آپ کو اختیار ہے جیسا مناسب سمجھئے۔"

رمیش نے رخصت ہوتے ہوئے کہا "پران پیاری! تو بشاش ہو جاؤ، اطمینان رکھو، سریش کی دیکھ بھال کرنا، میں جلد ہی خرچ بھیجوں گا، میری طرف سے کوئی اندیشہ نہ کرو، میرا جانا ضروری ہے، اگر اب بھی میری طرف سے کوئی ڈر ہے تو اس چیز کو بھگوان پر چھوڑ دو، اس کے قبضہ میں سب کچھ ہے، اگر ایشور نے سُن لی تو ہولی تک آ جاؤں گا۔"

رمیش کو پردیس گئے اب دس سال ہو چکے تھے، کئی بار ہولی آئی اور گذر گئی، مگر رمیش نہ تو خود ہی آیا اور نہ اُس نے خط یا خرچ ہی بھیجا۔ ساوتری تھوڑے ہی دنوں کے بعد سمجھ گئی کہ اس کا سُپنا سچا تھا۔ بیچاری مصیبت کی ماری سلائی کڑھائی کر کے اور ٹوپیاں بنا کر اپنا اور اپنے بچہ کا پیٹ پال رہی تھی۔ اس کا لڑکا سریش اب گیارہ سال کا تھا، پاس کے پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس کی ساری اُمیدیں اُسی سے وابستہ تھیں، ہاتھ میں سلائی کا کپڑا ہوتا اور دل میں سریش کا خیال، اور اس سے وابستہ اُمیدیں۔ کبھی وہ بابو بن کر اُس کی نگاہوں کے سامنے آتا، کبھی حاکم، ساوتری کی مصیبتوں کا خاتمہ سریش کی خوشحالی پر ہوتا، بیٹے کا بیاہ رچا کر بہو گھر لاتی، اُس کے کئی لڑکے بھی ہوتے اور سب بڑھاپے میں اُس کی سیوا کرتے۔ یہی تھے وہ ہوائی قلعے جنھیں وہ دن رات بنایا کرتی اور انھیں کے سہارے اپنے دُکھ کے دن بتانے کی کوشش کرتی۔

سریش بڑا ہی نیک اور سمجھدار بچہ تھا۔ ابھی سے اپنی ذمہ داری محسوس کرنے لگا تھا، بچوں کی سی کوئی شرارت اُس میں نہ تھی۔ اسکول سے چھٹی پا کر ماں کے پاس ہی بیٹھا سبق یاد کیا کرتا تھا۔ بعض اوقات ساوتری اس خیال سے کہ کہیں اس کا دل چھوٹا نہ ہو جائے ایک آدھ پیسہ دے دیتی کہ بیٹا جا مٹھائی لے آ۔ مگر وہ وقت ضرورت کے لئے پیسہ کو جمع رکھتا۔

ایک دن وہ مدرسے سے بخار میں ہانپتا کانپتا ہوا آیا، ساوتری نے جلدی سے پلنگ پر لٹا کر چادر اُڑھا دی۔ شام تک سریش کی حالت اور بگڑ گئی۔ بخار کی تیزی سے بدن توا سا جل رہا تھا۔ ساوتری رات بھر اس کی پٹی سے لگی [illegible] دوسرے دن بھی اُس کی طبیعت نہ سنبھلی۔ بے چینی کی حالت میں کبھی وہ کراہتا اور کبھی [illegible]

اتیں بچھاڑ کر چھت کو تکتا۔ غرضکہ اسی طرح تین دن اور تین راتیں گذر گئیں۔ ساوتری نے دن کا کام اور رات کی نیند اس کی تیمارداری پر قربان کر دی تھی۔

چوتھے دن سریش نے نیم بیہوشی کی حالت میں کہا "ماں! بڑی بھوک لگی ہے ایک ٹکڑا دے دو۔"

اپنے بچے کی دکھ بھری آواز سن کر ساوتری بے چین ہو گئی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ جی میں آیا کہ چھینکے سے روٹی اتار کر اپنے بھوکے بچے کو دیدے لیکن پھر خیال آیا کہ اسے چار دن سے بخار ہے اس وقت روٹی زہر کا کام کرے گی۔ وہ اپنا کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔

سریش نے پھر آواز دی "ماں! بھوک کے مارے جان تو نکل رہی ہے، کچھ کھانے کو دوگی یا بھوکا ہی مار ڈالو گی؟"

"بیٹا ایسی باتیں نہ کرو تمھیں کھانے کو دوں گی" ساوتری نے ٹھنڈی سانس بھر کر بچے کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

سریش کا چہرہ جو بخار کی شدت اور بھوک کی تیزی سے کملایا ہوا تھا چمک اٹھا۔ بولا "—— تو ماں پھر دیر کیوں کر رہی ہو؟"

ساوتری سوچنے لگی، سریش کو بخار ہے بھوک سے بے چینی بھی ہے ممکن ہے پیٹ کو کچھ سہارا مل جانے سے طبیعت سنبھل جائے۔ اگر اسی طرح بھوکا رہا تو کہیں جلدی ہی —— نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا — میں ضرور اسے کچھ کھانے کو دوں گی —— وہ دودھ پی سکتا ہے، چائے پی سکتا ہے، پھل کھا سکتا ہے پر یہ سب آئے کہاں سے؟ اس وقت تو میرے پاس کانی کوڑی بھی نہیں، میں تو غریب ہوں، مجھے تو پیٹ بھر روٹی بھی میسر نہیں۔ تو —— تو کیا سریش کو باسی روٹی ہی دیدوں؟ مگر باسی روٹی دی تو اس کی جان پر بن جائے گی۔ پھر دودھ۔ چائے اور پھل؟ آہ! یہ سب چیزیں تو امیروں کے لئے ہیں ہم سے غریبوں کو کہاں نصیب؟ ہم ان کی برابری نہیں کر سکتے۔ تو پھر کیا سریش کو یوں ہی بھوک سے تڑپنے کے لئے پڑا رہنے دوں اور........؟ مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ شدت غم سے ساوتری کا دل پھٹنے لگا۔ آج پہلی بار اسے اپنی غریبی کے احساس سے وہ تکلیف ہوئی جس کا تعلق روح سے تھا۔ اس کے چہرہ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مہینوں کی بیمار ہے اس کی بادام جیسی آنکھوں کو حلقوں نے گھیر لیا تھا۔

سریش نے پھر آواز دی "ماں! کیا کر رہی ہو؟ روٹی نہ ہو تو تھوڑا سا پانی ہی پلا دو۔"

سریش کے منھ سے یہ الفاظ کچھ اس درد کے ساتھ نکلے کہ ماں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ وہ گلاس

میں پانی بھر کر ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ خالی پیٹ پانی پلانا بھی تو ٹھیک نہیں، کہ اتنے میں سریش نے نقاہت سے کراہتے ہوئے کہا "پانی" ساوتری نے بے اختیار پانی کا گلاس اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اور وہ غٹ غٹ سب پانی پی گیا۔ پانی پلانے کے بعد ساوتری بولی:۔

"بیٹا میں دودھ کا بندوبست کرنے جا رہی ہوں، جلد ہی آ جاؤں گی، تم چپ چاپ لیٹے رہنا۔"

سریش کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی ساوتری نے گلاس اُٹھا لیا اور باہر چل دی۔ سڑک پر آ کر سوچنے لگی، کہاں جاؤں؟ کیا ٹھیکیدارن کے گھر؟ ہاں ٹھیک ہے اُن کے یہاں گائے ہے، بھینس ہے، دودھ کی کیا کمی؛ بیچاری ٹھیکیدارن مجھے بہت مانتی ہیں، پھر پاؤ بھر دودھ اُن کے لئے کوئی بڑی بات نہیں، مگر میرے بچے کے لئے امرت ہے۔ اسے ذرا سا دودھ جِلا سکتا ہے۔ اِن کے ہاں تو سیروں دودھ بلی ہی پی جاتی ہے، کسی کے پاؤں کی ٹھوکر سے پاؤ، آدھ سیر دودھ یوں ہی گر جاتا ہے۔ مگر اس وقت میرا بچہ ایک ہی دودھ کے لئے تڑپ رہا ہے۔ وہ ضرور مجھے تھوڑا سا دودھ دیدیں گی۔ بڑا اچھا مزاج ہے، ایشور کا دیا گھر میں سب کچھ ہے مگر ذرا بھی غرور نہیں، مجھے اپنی بہن کی طرح سمجھتی ہیں، تبھی تو میں بھی ضرورت ہونے پر تن من سے اُن کے کام میں لگ جاتی ہوں، میں نے اُن کی تھوڑی بہت سیوا بھی کی ہے۔ وہ امیر ہیں، امیروں کا دل بھی بڑا ہوتا ہے۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی جو اب تک اُن کے پاس نہ گئی۔ اگر چلی گئی ہوتی تو میرے بچے کو اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ جب بیچاری سُنیں گی کہ سریش اتنا بیمار ہے تو تڑپ جائیں گی۔

ساوتری کے قدم جلدی جلدی ٹھیکیدارن کے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔ گر دروازے پر آ کر وہ کچھ ٹھٹک گئی۔ ہمت جواب دے رہی تھی کہ اندر جا کر دودھ مانگے۔ آج تک اُس نے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا تھا خودداری نے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر اُسے آگے بڑھنے سے روکنا چاہا۔ مگر جب خیال نے سریش کا سرسوں کے پھول کی طرح زرد اور کمھلایا ہوا چہرہ اُس کے سامنے کر دیا تو ہمت کر کے اُس نے دروازہ کو دھکا دیا اور اندر چلی گئی۔

ٹھیکیدارن نے اُسے دیکھتے ہی کہا "آج تو بہت دنوں میں دکھائی دیں، بہن؟"

ساوتری نے چپکے سے گلاس والا ہاتھ ساری کے آنچل میں چھپا لیا اور اپنے حواس مجتمع کر کے بولی:

"کیا کروں بہن! آجکل ......" بچوں نے ساوتری کو دیکھتے ہی خوشی سے شور مچانا شروع کر دیا، اور سب کے سب آ کر چمٹ گئے۔

ساوتری کچھ دیر تک تو ٹھیکیدارن سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی، پھر اپنا مطلب بیان کرنے کے لئے مناسب الفاظ سوچنے لگی۔ ٹھیکیدارن نے اُسے چپ چاپ دیکھ کر کہا:۔

"بہن کیا سوچ رہی ہو؟"

اس وقت دیکھنے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا وہ بہت ہی پریشان ہے۔ یکایک ساوتری کے منہ سے نکل گیا "اب گھر جاؤں گی۔"

"ارے! اتنی جلدی کیوں؟" ٹھیکیدارن نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"سریش بیمار ہے، اس کے لئے دودھ لانا ہے۔" ساوتری نے اپنا مطلب ادا کرنے کی کوشش میں ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ وہ سوچنے لگی کہ اب ٹھیکیدارن کسی نوکر کو بلا کر دودھ لانے کے لئے کہے گی۔ مگر جب اس نے یہ کورا جواب سنا "تو لے لینا دودھ، ذرا پان تو کھالو۔" تو اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ساوتری کا دماغ سریش کی حالت کا نقشہ کھینچنے لگا۔ اس کو خیال آیا کہ وہ پان کے لئے بیٹھے اور وہاں سریش کو ایک ایک منٹ...... نہیں اب زیادہ دیر کرنا ٹھیک نہیں۔ پھر سوچنے لگی کہ شاید ٹھیکیدارن ابھی تک اس کا مطلب نہیں سمجھ سکی۔ ماتا نے اس کے دل کی تمام منتشر قوتوں کو یکجا کر کے اسے حرف مطلب زبان پر لانے کے لئے مجبور کیا۔

"بہن، کیا ذرا سا دودھ دے سکو گی، سریش بہت بیمار ہے، صرف دودھ ہی پی سکتا ہے، گھر میں اسے اکیلا چھوڑ آئی ہوں، جب تک بازار سے لوٹوں گی اس کا پیاس سے بُرا حال ہو جائیگا، دم بدم پانی مانگتا ہے۔"

ساوتری کے ان الفاظ کو سن کر ٹھیکیدارن کی ہمدردی و محبت بالکل کافور ہو گئی، کچھ دیر بعد وہ بولی "بہن، اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو بچا رکھتی، اب تو چائے کے لئے ذرا سا دودھ بچا ہے، بُرا نہ ماننا۔ بہن۔ ٹھیکیدار صاحب بازار کے دودھ کی چائے نہیں پیتے، نہیں تو ضرور دیدیتی۔ بھگوان سریش کو اٹھ کھڑا کریگا بڑا بھولا اور ہونہار بچہ ہے۔ گھبرانا نہیں۔ بہن ساوتری۔ ایشور کی دیا سے وہ جلد ہی اچھا ہو جائے گا۔"

ٹھیکیدارن کی باتوں سے ساوتری کے بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ وہ دل ہی دل میں پچھتا رہی تھی کہ ناحق میں نے ایسی منحوس عورت کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ دیکھا نہ زبان خالی گئی۔ جی میں آیا کہ کہے، "چھٹانک ہی بھر دیدو، اتنے لوگوں کی چائے میں چھٹانک بھر دودھ کی کمی تو معلوم بھی نہ ہوگی" مگر کچھ سوچ سمجھ کر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا، اور اپنے دل ہی دل میں کہنے لگی۔

فضول بےعزتی کرانے سے فائدہ، ٹھیکیدارن پر بڑا ناز تھا۔ سب سے کہتی پھرتی تھی کہ وہ تو مجھے بہن سمجھتی ہیں۔ اب تو دیکھ لیا ٹھیکیداروں کا قاعدہ جس کو کسی مادی چیز کی ضرورت ہوتی صرف الفاظ سے تسلی دیا کرتے ہیں۔ اسے دودھ کی ضرورت تھی اور ٹھیکیدارن ہمدردی کے کھوکھلے الفاظ اس کے کانوں

میں ٹھونس رہی تھی۔ شہر میں بجلی والے کمرہ میں انسان پڑا سسک رہا ہو کوئی سننے والا نہیں، آنکھوں کے سامنے لوگ وہ دوا داروں کو ترستے ہوئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں، پر کیا مجال کہ امیری کے گھمنڈ سے اکڑنے والوں کے کان پر جوں بھی رینگ جائے۔ یہاں لوگ صرف اپنے سکھ اور آرام کے پیچھے دن رات دیوانے رہتے ہیں۔ دنیا جہنم میں جائے انھیں اپنی عیش پرستی سے غرض۔ سچ ہے وہ انسانیت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔

ساوتری چلنے کے لئے تیار ہو گئی، ٹھیکیدارن نے روکنا چاہا۔ پان آ گئے تھے۔ ساوتری نے پان اٹھالیا اور اپنے جذبات میں ڈوبی ہوئی چل کھڑی ہوئی۔ اتنی دیر میں سریش کی کیا حالت ہوئی ہو، یہ سوچ کر وہ تلملا اٹھی۔ گھبراہٹ میں اس کی سانس بھی تیز ہو گئی۔ جی میں آیا کہ اور ہی کہیں جا کر دودھ کا انتظام کرے مگر ہمت جواب دے چکی تھی، وہ سیدھی گھر چلی آئی۔

بخار اور بھوک کی شدت نے سریش پر غنودگی طاری کر دی تھی، اس کی آنکھیں بند تھیں، ساوتری نے پیار سے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"کیسی طبیعت ہے بیٹا؟"

سریش نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے بہت ہی نحیف آواز میں کہا "دودھ"۔ اس سے زیادہ وہ نہ بول سکا۔ ساوتری دم بخود ہو کر وہیں بیٹھ گئی۔ ایک طرف خودداری تھی، اور دوسری طرف اکلوتے اور چہیتے بیٹے کی زندگی کا سوال، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔

اچانک اسے ایک بات سوجھی، اس نے سریش کے خشک حلق کو تر کرنے کے لئے اسے تھوڑا سا پانی دیا۔ پھر ہاتھ میں دبے ہوئے پان پر نظر پڑی، اس نے پان کوٹ کر تھوڑا سا عرق اس کے منہ میں ڈال دیا اس کے بعد چولھا جلایا، مگر اب سوال یہ تھا کہ آخر پکائے کیا، پھر وہی پریشانی، ادھر خالی پیٹ میں پانی اور پان کا عرق پڑنے سے سریش کی حالت اور بھی بگڑ گئی۔ اب اسے اکیلا چھوڑنے کی بھی ہمت ٹوٹتی تھی، مگر پان کے عرق نے انجکشن کا کام کیا۔ سریش نے تھوڑی دیر میں آنکھیں کھول دیں اور کہا۔ "دودھ!"

ساوتری کا دل گھائل ناگن کی طرح تڑپ اٹھا، وہ اپنے کو سنبھالتی ہوئی بولی۔

"ابھی آیا نہیں تم لیٹے رہو، گھبرانا مت میں جا کر دیکھتی ہوں، اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟"

ساوتری پھر گلاس لے کر چلدی، ہاں اس مرتبہ اس نے چھینکے سے باسی روٹیاں اتار کر آنچل میں چھپالیں، اور سوچا کہ اگر کوئی بکری دکھائی دے گی تو روٹی دکھا کر پکڑ لوں گی اور دودھ دوہ لوں گی۔ بچے کی جان بچانے کے لئے وہ چوری بھی کرنے کو تیار تھی۔

باہر پہنچتے ہی پھر وہی خیال آیا کہاں جائے ؛ اِس بار وہ غریبوں کے گھر کی طرف مڑ گئی "ایسرولی کو تو وہ آزما چکی تھی ۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد اُس نے دیکھا کہ ایک کمہارن اپنی بکری دوہ رہی ہے ، اُس کے تین بچے اُسے گھیرے کھڑے ہیں ۔ ساوتری وہیں ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی ۔ کمہارن نے اُس کے ہاتھ میں گلاس دیکھتے ہی پوچھا ۔

" مالکن ! کیا دودھ چاہیئے ؟ "

ساوتری نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا ، " ہاں ، سرکشن بیمار ہے ، دودھ کی فکر میں نکلی ہوں "

" تو خبر کیوں نہ کر دی ، گھر میں بکری اور دودھ کی پریشانی ! گلاس لاؤ میں لگا دوں ۔" کمہارن نے شکایت کرتے ہوئے کہا ۔

ساوتری نے گلاس دیدیا ، کمہارن دودھ دوہنے لگی ۔

ساوتری دل ہی دل میں تعجب کر رہی تھی ۔ " آہ ! یہ چھوٹے آدمی کہلاتے ہیں ، ان کے دل میں دیا ہوتی ہے ، یہ دوسروں کا دُکھ سُکھ سمجھتے ہیں اور اُن کے کام بھی آتے ہیں ۔ مگر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جس کا دل چھوٹا ہو وہ بڑا کہلائے اور جس کا دل بڑا ہو وہ چھوٹا سمجھا جائے ۔

اتنے میں کمہارن کا ایک بچہ بول اُٹھا " ماں ! کیا دودھ انہیں دو گی ؟ "

" ہاں تم سے مطلب " کمہارن نے بگڑ کر جواب دیا ۔

بچے نے مچل کر کہنا شروع کیا " نہیں ماں دودھ ہم پئیں گے ، ہمیں بہت بھوک لگی ہے ۔"

گلاس بھر چکا تھا ، ساوتری کے روکتے روکتے کمہارن نے گلاس بھر دیا اور بولی " مالکن ! اس چھوکرے کی باتوں کا بُرا نہ ماننا ، نہ جانے یہ ہمارے کن کرموں کا پھل ہے کہ تمہارے آنے سے ہمارے بھاگ کھُل گئے ۔ سرکشن بھیا بیمار ہیں ، یہ بچے ہٹے کٹے ہیں ، انھیں دودھ کی کوئی ضرورت نہیں ، بھوک لگے گی تو روٹی کھالیں گے ، ہم بیمار ہی کس لائق ؟ "

اتنے میں مری بچہ پھر جھنجلا کر بولا " ایک تو روٹی ہے اور تین تین بھوت کھانے والے ۔"

کمہارن نے بچے کو ڈانٹ کر چپ تو کر دیا مگر ساوتری سے نہ رہا گیا ، اُس نے بچے کو پیار کیا اور آنچل سے روٹی نکال کر دیتے ہوئے بولی :

" تو بیٹا یہ روٹی کھا لینا ، تمہارے سرکشن بھیا بیمار ہیں وہ تمہارے حصہ کا دودھ پئیں گے اور تم ان کے حصہ کی .... کہتے کہتے [illegible] میں آنسو بھر آئے ۔

کمہارن ساکت کھڑی تھی ۔ تھوڑی دیر میں دل کڑا کر کے بولی " مالکن [illegible] تو ایک بات کہوں ؟ "

ساوتری نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "کیا؟"

کمہارن نے انتہائی پر خلوص لہجہ میں کہا، "جب تک بھیا کی طبیعت خراب ہے، روز تھوڑا سا گھر کا دودھ لے آیا کروں؟"

ساوتری نے الفاظ کے بجائے آنسوؤں سے اُس کا شکریہ ادا کیا، اور سریش کا خیال آتے ہی جلدی جلدی گھر آئی۔ چولھے پر دودھ چڑھا کر سریش کو پکارا، مگر کوئی جواب نہ ملا، یہ سوچ کر کہ شاید وہ سو رہا ہو، اُس نے سریش کو ہلایا، مگر اس پر بھی وہ نہ بولا، آنکھیں بند تھیں، بدن برف کی طرح سرد، ساوتری کی گھبراہٹ کی کوئی انتہا نہ رہی، اُس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔ ڈری کہ کہیں سریش..... پھر خیال کیا کہ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ بدحواسی کے عالم میں وہ سریش کا بدن ٹٹولنے لگی۔ مگر خود اُس کا دل بہت ہی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ تیر کی طرح جا کر دودھ اُٹھا لائی، اور سریش کے منھ میں بوند بوند ٹپکانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر سریش کے دانت کچھ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک بوند بھی پیٹ میں پہنچانا محال تھا۔ بڑی مشکل سے ایک ایک بوند کر کے تھوڑا سا دُودھ پلا سکی۔ تھوڑی دیر میں سریش کی سانس میں کچھ تیزی پیدا ہوئی، اور دس منٹ بعد اُس نے آنکھیں بھی کھول دیں۔ اُس وقت ساوتری کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی، وہ اتنی مگن تھی جیسے اُسے کوئی بہت بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ اُسکی بے نور آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔

ساوتری بیٹے کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔ دروازے پر تانگہ رکا، مگر ساوتری نے ادھر دھیان نہ دیا، رمیش نے باہر کے کمرہ میں تانگے والے سے سامان رکھوایا، مگر وہ اب بھی بے خبر تھی اور جب وہ خود ساوتری کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا تو بھی وہ یہی سمجھی کہ اس کی نگاہ دھوکا کھا رہی ہے۔ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔

رمیش نے جب سریش کو چارپائی پر چادر اوڑھے لیٹا دیکھا تو بدحواس ہو کر پوچھا:۔

سریش کی طبیعت کیسی ہے، کیا وہ بیمار ہے؟

ساوتری کے منھ سے نکلا "ہاں، مگر آپ سے مطلب؟"

کتنے دن سے؟" رمیش سے نہ رہا گیا اور اُس نے پھر پوچھا۔

ساوتری نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "آج چار دن ہوئے۔ دیکھو! ذرا سا منھ نکل آیا ہے۔ دودھ کے لئے بھی پیسہ نہ تھا۔ آج کمہارن نے اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کے گلاس بھر دودھ دیا ہے، جب سے پیا ہے میرے بچے کے جان میں جان آگئی۔ وہ کمہارن نہیں دیوی ہے، وہ میرے سریش کے لئے امرت دے گئی ہے۔

اُسے بھی کرو وہ ضرور اچھا ہو جائے گا۔"
رمیش نے پوچھا "کون کمہارن؟"
"وہی رامو کی ماں جو نیم کے پیچھے رہتی ہے" ساوتری نے جواب دیا۔
سریش نے بھی کہا "ہاں"
باپ نے دیکھا بخار کم ہو رہا تھا۔

عہدِ حاضر

(از بابو شیاما شنکر بسریا بی-اے، ایل ایل-بی۔ بریلی)

یہ کش مکش یہ شدّتِ آلامِ روزگار مخلوق ہر طرح سے پریشاں ہے شہر میں
انساں کے ظلم و جور سے آنکھیں ہیں اشکبار اپنوں سے آہ مجھکو شکایت ہے دہر میں

ہوتی لڑائیاں ہیں یہاں بات بات پر افسانے کشت و خوں کے میں سنتا ہوں روز و شب
ذاتی مفاد پر ہے ہر اک شخص کی نظر اگلی سی دوستوں میں وہ الفت کہاں ہے اب

وہ آ رہا ہے کون سیہ رو و غم نصیب حسرت ٹپک رہی ہے رُخِ پُر ملال سے
بیدردیِ بشر کا ہے مارا ہوا غریب مترشح ہو رہا ہے یہی چال ڈھال سے

شاید یہ دل گرفتہ ہے مزدور ناتواں شاداب جس کے دم سے ہے گلزار خواجگی
گو خوں بہا رہا ہے مگر ہائے رائیگاں محنت کا ہے صلہ وہی فقر و گداگری

مزدور ہی نہیں ہے گرفتارِ پیچ و تاب اس غم کدہ میں کشتۂ دوراں ہیں اور بھی
سب کو رُلا رہا ہے زمانہ کا انقلاب دنیا میں آہ بے سر و ساماں ہیں اور بھی

دفتر کا ہے کلرک بھی ناشاد و نامراد اس کا فسانہ رنج و محن کا فسانہ ہے
کثرت یہ کام کی ہے کہ بھولا ہے گھر کی یاد لطفِ سحر ہے کچھ نہ نشاطِ شبانہ ہے

انساں کی سرد مہری و بیداد دیکھکر سرشارِ آرزو دلِ شیدا نہیں رہا
دنیا سے پہلے مجھکو محبت تھی بیشتر اب میرے سر میں زیست کا سودا نہیں رہا

تنقید کتب

ناصر جنگ شہید

یہ کتاب حضرت آصف جاہ نظام اول بانی ریاست حیدرآباد دکن کے فرزند میر احمد ناصر جنگ کے سوانح حیات و دیگر حالات پر ایک معتبر و مستند تصنیف ہے جو ابن منظر قاضی معین الدین رہبر فاروقی کے زور قلم کی رہین منت ہے۔ واقعات کے اندراج اور حالات کی تدوین میں کافی تلاش و تجسس اور روایت و درایت دونوں سے کام لیا گیا ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ خود غرضوں اور جاہ پسندوں کے کہنے سننے میں آکر کس طرح ایک بیٹا اپنے شفیق باپ سے بغاوت کرتا ہے، اور بیٹے کی بغاوت فرو کرنے کے بعد باپ اپنے نافرمان بیٹے سے باقتضائے مہر پدری کس حسن سلوک سے پیش آتا ہے جس زمانہ کی یہ تاریخ ہے، اُس زمانہ میں قلمروئے آصفیہ کے حدود یہ نہیں تھے جو آجکل ہیں۔ ریاست ٹراونکور اور بعض چھوٹے چھوٹے دیگر علاقوں کو چھوڑ کر تمام جنوبی ہند نظام دکن کے زیر نگیں تھا۔ اس طرح یہ کتاب صرف نواب ناصر جنگ ہی کی نہیں بلکہ تمام جنوبی ہند کی تاریخ ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے نواب انوار الدین خاں، چندا صاحب، مظفر جنگ اور مرہٹوں کے حالات بھی معلوم ہونگے۔ کیونکہ اسی زمانہ میں کرناٹک کے تنازعات رونما ہوئے تھے؛ اور اسی سلسلہ میں آپ کو دول مغرب کی ریشہ دوانیاں بھی معلوم ہوں گی جنھوں نے سیاسیات ہند میں دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ فاضل مصنف نے واقعات کی تلاش و تجسس میں کافی محنت کی اور تقریباً چار درجن مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کے مطالعہ کے بعد یہ کتاب لکھی ہے۔ اسلوب نگارش پر جذباتیت کا رنگ غالب ہے جو قدرتی بات ہے۔ بعض بعض جگہ عبارت کسی قدر اُلجھی ہوئی ہے۔ مثلاً صفحہ ۱۱ کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیے:-

"حضور نظام کے ماتحت ہونے کے باوجود (جس سے آگے چل کر اُنھوں نے انکار کرنا شروع کیا) جو علاقے اُن کے اپنے نہ تھے اور بطور خود کسی کارروائی کے مجاز نہ تھے، حاکم وقت سے منظوری لئے بغیر، اپنے اقتدار سے اپنے استحکام کے لئے جو کچھ کیا اُس کا کچھ اور نتیجہ نہ سہی، مگر یہ "مکافات" کیا کم ہے کہ نوابان کے خاندان سے کرناٹک کی حکومت جس عبرتناک طریقہ سے ختم ہوگئی، اُسے ارکاٹ کی تاریخ پر نظر رکھنے والے خوب جانتے ہیں۔"

اس کے علاوہ کتاب میں بہت سے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً غیاب، منضبط،

قیمہ پوسی مقالیہ عمدہ وغیرہ یقین ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں یہ باتیں ٹھیک کر دی جائیں گی۔

افادیت کے اعتبار سے کتاب بہت اچھی ہے اور اس کے مطالعہ نیز لائبریریوں کے کتب خانجات میں رکھے جانے کی سفارش کی جاسکتی ہے۔ کتاب میں آصف جاہ اول اور ناصر جنگ کی تصاویر شامل ہیں۔

کتابت، طباعت و کاغذ سب عمدہ، ضخامت متوسط سائز کے ۱۸۷ صفحات قیمت دو روپیہ آٹھ آنے مجلد۔

ملنے کا پتہ: بیرون یاقوت پورہ، املی بن مکان ۱۳۵۷/۵ یاسمن برج ہاؤس عابد بلڈنگ مصطفیٰ بازار حیدرآباد دکن

انشاء

یہ چھوٹی سی کتاب ہندوستان کے مشہور شاعر انشاء اللہ خاں انشاء کی سوانح عمری ہے، جسے مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی نے اپنے طرز خاص میں تحریر فرمایا ہے۔ تدوین واقعات میں شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کی طرح صرف روایت ہی سے کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ بعض بعض واقعات کو جو مختلف تذکروں میں انشاء کی طرف منسوب ہیں درایت کی کسوٹی پر بھی کسا گیا ہے۔ انشاء اللہ خاں کی اپنے ہمعصر شعراء سے معرکہ آرائیاں بہت پر لطف ہیں، اور اُن کی بذلہ سنجی و حاضر جوابی حیرت انگیز، سوانح حیات کے علاوہ انشاء کے کلام کا انتخاب درج کر کے اس پر مفصل تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ سرورق دیدہ زیب اور انشاء کی قلمی تصویر کا حامل ہے۔ بعض بعض جگہ کتابت کی غلطیاں بھی ہیں۔ لکھائی چھپائی، کاغذ بہتر، ضخامت ۷۰ صفحات۔ قیمت بارہ آنے۔

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔ نئی دہلی۔ لکھنؤ، لاہور، بمبئی۔

ابن خلدون کی عظمت

مغربی افریقہ کے مشہور و معروف مورخ علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون اسلام کے وہ مایۂ ناز فرزند ہیں جن پر فن تاریخ نویسی ہمیشہ ناز کرے گا۔ کیونکہ یہی بزرگ تھے جنہوں نے فلسفۂ تاریخ ایجاد کیا تھا۔ یہی وہ مسلمان مصنف و مورخ تھا جس نے تاریخ کو جو اس کے وقت تک صرف اخبار ماضی کا ایک فرسودہ انبار سمجھا جاتا تھا اور جس کا مقصد پرانے واقعات معلوم کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ حال و استقبال کے لئے دُوررس نتائج کا ماخذ قرار دیا، اور دنیا کے واقعات کو منتشر و پراگندہ سمجھنے کے بجائے، ان میں نتائج کی یکسانی کا نظریہ پیش کیا اور بتایا کہ اقوام و ملل اور ملوک و دول کو جو تاریخی ادوار پیش آتے ہیں، وہ اتفاقی نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ یکساں اصول و اسباب کے مطابق بنتے بگڑتے اور اُٹھتے گرتے ہیں۔ چنانچہ ان جملہ اسباب و اُصول کی تحقیق و تعیین اس فلسفی مؤرخ نے اپنے مقدمۂ تاریخ میں کی۔ اسی مقدمہ میں اس نے ان طبعی و جغرافیائی اثرات کی تلاش کی ہے جو اقوام عالم میں کارفرما ہیں۔ اس حکیمانہ مقدمۂ تاریخ کا جواب آج تک تصنیف نہیں ہو سکا۔ تمام دنیا کے مورخ علامہ ابن خلدون کو فلسفۂ تاریخ کا موجد اور امام مانتے ہیں۔ اس چھوٹی سی کتاب میں فاضل مصنف نے یورپین اہل قلم کی آراء ابن خلدون کے متعلق

درج کی ہیں جس سے اُس کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ اُردو ادب کو واقعی حضرت نگہت شاہجہانپوری کا احسان مند ہونا چاہیئے جنھوں نے یہ چھوٹی سی کتاب لکھ کر خندق کی بے پناہ عظمت سے روشناس کرایا۔ شروع میں علامہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی کا عالمانہ و فاضلانہ دیباچہ ہے جو پڑھنے کے لائق چیز ہے، کتاب میں فاضل مصنف کا دیباچہ

لکھائی چھپائی، کاغذ سب عمدہ، انگریزی جلد مع دیدہ زیب گردپوش، ضخامت تین جزو قیمت ۸/

ملنے کا پتہ:۔ علی بھائی شرف علی اینڈ کمپنی لمیٹڈ، ۳۴۲۔ ابراہیم رحمۃ اللہ روڈ بمبئی ۳

نغمۂ آتشیں

اس خوبصورت اور نظر فریب کتاب میں جناب صباح الدین عمر صاحب نے ہندوستان کے اکثر شعراء کی ایسی نظمیں درج کردی ہیں جن کا تعلق جنگ سے ہے۔ اِن شاعروں میں پُرانے بھی ہیں اور نئے بھی، کانگریسی بھی ہیں مسلم لیگی بھی، کمیونسٹ بھی ہیں اور سوشلسٹ بھی، مثلاً حضرت صفی لکھنوی ہیں تو مسعود اختر جمال بھی۔ جگر مرادآبادی ہیں تو کنیز فاطمہ حیا بھی، نوح ناروی ہیں تو اسرار الحق مجاز بھی۔ الغرض کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت عمدہ ہے۔ کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جن شاعروں کا کلام درج کیا گیا ہے اُن کے فوٹو بھی دیئے گئے ہیں۔ جگر مرادآبادی کا صرف ایک ہی شعر پورے صفحہ پر نہایت عمدہ نقوش کے ساتھ دیا گیا ہے

لکھائی چھپائی، کاغذ سب نفیس، انگریزی جلد، ضخامت بڑے سائز کے ۹۰ صفحات، قیمت کتاب پر درج نہیں ہے محکمہ اطلاعات صوبہ متحدہ کی شائع کردہ ہے۔

"ماہِ لقا"

یہ مسٹر عزیز احمد بی۔اے۔ آنرز (لنڈن) کی تین نظموں "ماہِ لقا" "عمر خیام" اور "فردوس بر روئے زمین" کا مجموعہ ہے۔ اور سلسلۂ مطبوعات ادبیات اردو کی ۱۹ ویں کڑی ہے۔ "ماہ لقا" جو ۱۹۳۵ء میں لکھی گئی تھی، ایک ڈرامائی نظم ہے جس میں فاضل مصنف نے ستاروں کی انجمن قائم کرکے مکالمہ کرایا ہے۔ اس نظم کا رنگ حکیمانہ ہے۔ دوسری نظم "عمر خیام" بھی ڈرامائی ہے جو ۱۹۳۲ء میں لکھی گئی تھی۔ اس میں عمر خیام، نظام الملک اور حسن بن صباح کی کردار خوب دکھائی گئی ہے تیسری نظم "فردوس بر روئے زمین" ۱۹۴۲ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ نظم کسی قدر پیچ دپیچ ہے۔ فاضل مصنف کی طبیعت بہت شگفتہ ہے تینوں نظمیں دلچسپ اور سبق آموز بھی ہیں۔ کتابت، طباعت، کاغذ سب عمدہ۔ ضخامت سو صفحات۔ قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر۔ رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن۔

قدرت کے کرشمے

یہ چھوٹی سی کتاب مختلف دلچسپ مضامین کا مجموعہ ہے جن کا تعلق جغرافیۂ طبیعی سے ہے مثلاً چونہ، بادل

[illegible] ، آتش فشاں پہاڑ۔ ان مجلہ موضوعات پر نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں تحقیق کی ہے جو کم تعلیم یافتہ لوگوں اور کم استعداد بچوں کی سمجھ میں بھی آسکتے ہیں۔ یہ سب مضامین "پیام تعلیم" میں شائع ہو چکے اور مختلف اہل قلم کے زور قلم کے رہین منت ہیں۔ بعض مضامین کا اسلوب بیان بالکل ایسا ہے جیسے کوئی افسانہ [illegible] ہے۔ الغرض کتاب بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے جس کے پڑھنے سے طلبا کو بہت فائدہ پہونچ سکتا ہے۔

لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ۔ ٹائیٹل رنگین و دیدہ زیب۔ ضخامت ۵۷ صفحات۔ قیمت آٹھ آنہ

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔ نئی دہلی۔ لکھنؤ۔ لاہور۔ بمبئی۔

باتیں

یہ کتاب سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات اُردو کی ۸۴ ویں کڑی اور چھ دلچسپ اور مختصر ڈراموں کا ایک دلپذیر مجموعہ ہے جو شجاع احمد صاحب قائد کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ یہ وہ ڈرامے ہیں جو آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد پر براڈکاسٹ ہو چکے ہیں۔ یہ مختصر ڈرامے نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ سبق آموز بھی ہیں۔ مثلاً جس ڈرامہ کا عنوان "کھانا پانی" ہے اُس میں کھانے کے آداب بتائے گئے ہیں۔ الغرض تمام ڈرامے بہت ہی پُرلطف اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ فاضل مصنف نے شروع میں بطور تمہید "باتوں کی باتیں" لکھی ہیں۔ اُن کا اسلوب بیان بھی بہت دلچسپ ہے۔ کہیں کہیں حیدرآبادی زبان اور محاوروں کی بھی چاشنی ہے۔ مثلاً صفحہ ۱۹ پر "دروازوں میں درازیں" لکھا ہے۔ یہاں "درزیں" ہونا چاہیے۔ صفحہ ۴۰ پر لکھا ہے "یار شاید کسی نے نظر ماردی" "نظر لگادی" یا "کسی کی نظر لگ گئی" ہونا چاہیے۔

لکھائی چھپائی، کاغذ سب عمدہ۔ ضخامت ۸۴ صفحات۔ قیمت عہ/ ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن۔

جنگ اور ہندوستان کا قومی قرضہ

جنگ کے جو اثرات دنیا پر قائم ہوتے ہیں وہ نہ صرف ہولناک عبرت انگیز یا سبق آموز ہوتے ہیں بلکہ بسا اوقات تعجب خیز اور حیرت انگیز بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک قوم جو کل آزادی و خودمختاری کی فضا میں سانس لے رہی تھی آج شکست کھا کر دوسروں کی غلام ہو جاتی ہے یا ایک قوم جو پہلے حالات سے نا واقف بھی نہ تھی بام عروج پر پہونچ جاتی ہے۔ قدیم روما اور مسلمانوں کا عروج و زوال اسکی زندہ مثالیں ہیں۔ دوسری عبرت انگیز مثال یہ ہے کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے زمانہ میں امریکہ ایک معمولی اور دنیائے مشرق سے دور افتادہ ملک تھا لیکن جنگ ختم ہونے سے وہ دنیا کا اس قدر دولتمند ملک بن گیا کہ دنیا کی تمام بڑی بڑی سلطنتیں اسکی قرضدار ہو گئیں اور ایسا ہی [illegible] ہے دوسری بات یہ ہے کہ ہندوستان ۱۹۳۹ء تک ایک مقروض ملک تھا مگر موجودہ جنگ کے باعث وہ نہ صرف اپنا تمام قرضہ ادا کر چکا [illegible] کا اربوں روپیہ چاہیے۔ ہندوستان کی یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی کہ وہ قرضدار سے [illegible] ہو گیا [illegible] محمد احمد خاں صاحب بی اے [illegible] نے نہایت [illegible] جنگ [illegible] سے مرتب [illegible]

[illegible] لکھائی چھپائی کاغذ [illegible] ضخامت [illegible] قیمت [illegible]



... ایم۔ اے پبلیشر۔ کلیان رائے سکسینہ ... پرنٹر ...